

دہلی کالج کے صدر مدرس اور روح رواں

استاذ الکل

حضرت مولانا  
مملوک العلی نانوتوی

احوال و خدمات، تصانیف و تراجم، آثار، خاندان اور تلامذہ

تالیف

نور الحسن راشد کاندھلوی

ناشر

مفتی الہی بخش اکیڈمی،

کاندھلہ، ضلع مظفرنگر (یو پی) انڈیا



دہلی کالج کے صدر مدرس اور روح رواں

استاذ الکل

# حضرت مولانا مملوک الاعلیٰ نانوتویؒ

احوال و خدمات، تصانیف و تراجم، آثار، خاندان اور تلامذہ

تالیف

نور الحسن راشد کاندھلوی

ناشر

مفتی الہی بخش اکیڈمی،

کاندھلہ، ضلع مظفرنگر (یو پی) انڈیا

(All Rights Reserved with the Author)

Ustazul Kul Hazrat Molana MAMLOOKUL ALI Nanotvi.

Author:

Noorul Hasan Rashid Kandhlavi

Publisher:

**MUFTI ELAHI BAKHSH ACADEMY,**

KANDHLA (Muzaffar Nagar), U.P., India. Pin: 217775

Price: In India Rs.300/ only.

From other countries: USD 20 only.

Library Edition (Hard Bound): INR 400/= , USD 25 only.

1st Print: March 2009/Rabiul Awwal, 1430 H.

(جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ)

نام کتاب: استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلیٰ نانوتوی

(جس میں صاحب سوانح کے احوال و خدمات، تصانیف و تراجم، مکتوبات و آثار اور تذکرہ تلامذہ کے علاوہ ان کے وطن نانوتہ کی تاریخ، ابا و اجداد اور خاندان کے مختصر حالات، نانوتہ کے مشائخ و علماء، تعلیم کے لئے مولانا کے سفر و اساتذہ کرام، دہلی کالج کے شعبہ تدریس سے وابستگی، کالج کے دیگر علمی و اشاعتی کاموں کی نگرانی، تدریس میں انہماک، گھر پر بھی طلباء کا ہجوم و اسباق، دیگر تعلیمی اداروں سے وابستگی کی روایات، حزب ولی اللہی اور تحریک سید احمد شہید سے تعلق، دینی و اصلاحی خدمات اور فتاویٰ کی تصدیق وغیرہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔)

مؤلف: نور الحسن راشد کاندھلوی

ناشر: مفتی الہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، ضلع مظفرنگر، یوپی

پاکستان میں حق اشاعت: محمد ندیم، دارالکتاب، اردو بازار لاہور

طباعت: بار اول: مارچ ۲۰۰۹ء مطابق ربیع الاول ۱۴۳۰ھ، تعداد: ایک ہزار

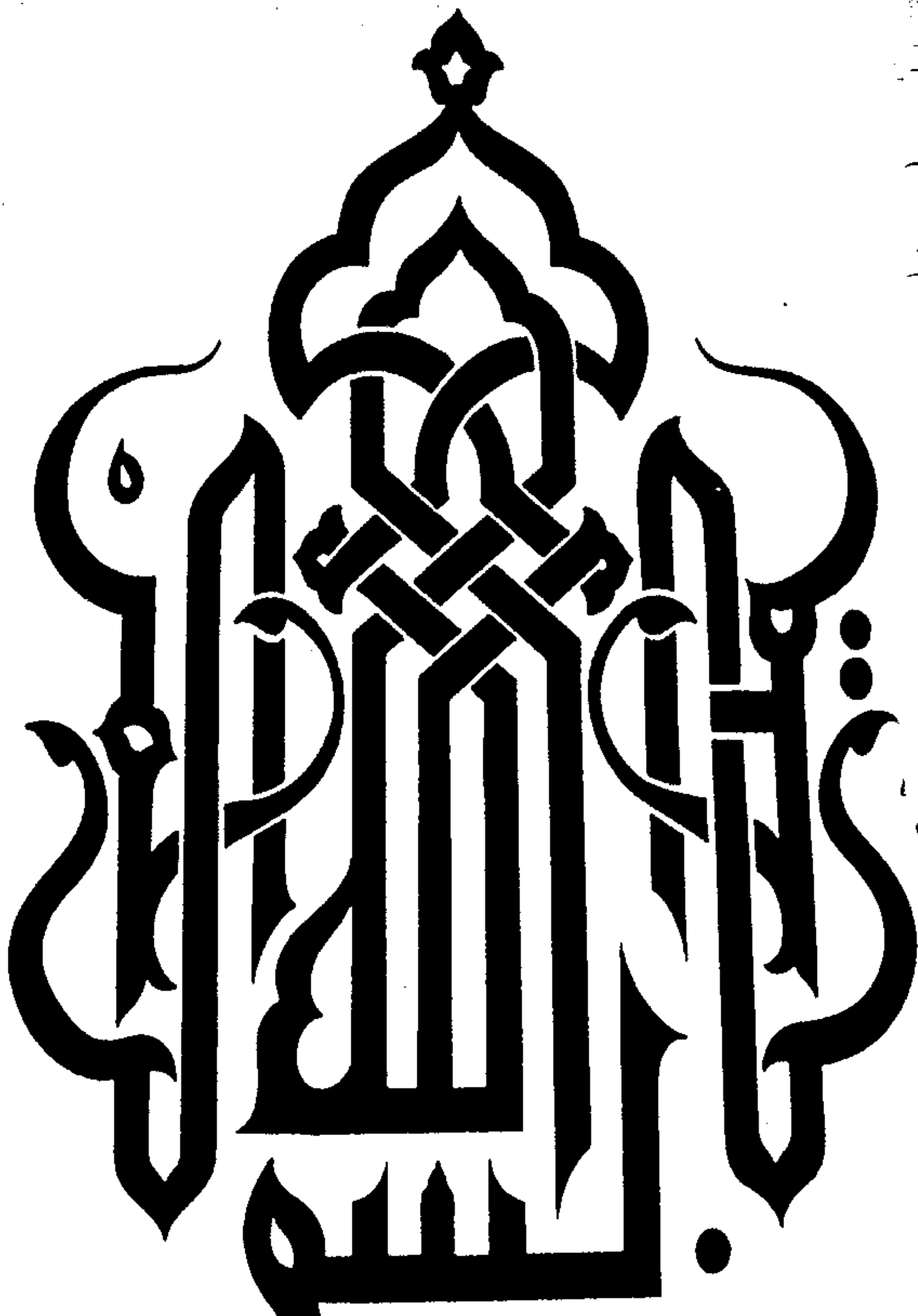
قیمت: ہندستان میں 300 روپیہ، بیرون ہند سے 25 امریکی ڈالر

لابریری ایڈیشن مجلد: 400 روپیہ / 20 امریکی ڈالر

Printer:

۲۲۲۲۲۲۲۲

۲۲۲۲۲۲۲۲





تیری صورت سے کسی کا نہیں ملتی صورت  
 ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں  
 امام بخش ناسخ لکھنوی

نوٹ: یہ شعر (شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے والد ماجد) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی نے اپنی تالیف 'الهدية السنیة فی ذکر المدرسة الديو بنديّة' (مطبع مجبائی دہلی ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء) میں مولانا مملوک العلی کے تعارف میں درج کیا ہے۔ ناسخ کے دیوان (مطبوعہ منشی نولکشور، لکھنؤ ۱۳۲۳ھ) میں یہ شعر (ص ۱۱۱ پر) اسی طرح درج ہے جبکہ 'الهدية السنیة' میں قدرے مختلف درج ہو گیا ہے۔ مؤلف





# فہرست عنوانات

## ابتدائیہ اور متعلقات

۳۶	حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری صدر مدرس و شیخ الحدیث، دارالعلوم دیوبند	ترحب	۱	۱
۳۹	جناب شمس الرحمن صاحب فاروقی الہ آباد	پیش لفظ	۲	۲
۴۲	جناب ڈاکٹر جمیل جالبی کراچی	استقبال	۳	۳
۴۵	ڈاکٹر خلیق انجم صاحب، دہلی	مبارک باد	۴	۴
۴۷	نور الحسن راشد کاندھلوی	عرض مؤلف	۵	۵

۱

## نانوتہ کی مختصر تاریخ اور چند نامور مشائخ اور علماء

۵۱-۵۲	نانوتہ تاریخ کے آئینہ میں	۱	۱
۵۶	نانوتہ کے دو ممتاز خاندان	۲	۲
۵۶	نانوتہ کے چند قدیم نامور جلیل القدر مشائخ اور اہل کمال	۳	۳
۵۷	مولانا شیخ احمد مدنی یا سید احمد نانوتوی	۴	۴
۵۹	شیخ مصطفیٰ نانوتوی	۵	۵
۶۰	سید شاہ غلام نانوتوی	۶	۶
۶۰	مولانا سید شاہ صابر علی نانوتوی	۷	۷
	شیخ جیون نانوتوی	۸	۸

۲

## صدیقی خاندان کی نانوتہ میں آمد اور قیام

۶۳	اس خاندان کے چند ابتدائی بزرگ اور مولانا کے اجداد کرام	۱	۹
----	--	---	---

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۶۶	اس خاندان کی نانوتہ میں آمد اور قیام	۲	۱۰
	قاضی میراں بڑے کی اولاد کی ترتیب مولوی محمد ہاشم تک	۳	۱۱
۷۰	خاندان کا شجرہ و نسب	۴	۱۲
۷۲	حضرت مولانا مملوک العلی اور خاندان صدیقیان نانوتہ کا نسب نامہ	۵	۱۳
	حضرت صدیق اکبرؓ تک		
(۳)			
۷۳	مولانا مملوک العلی		
	ولادت، علاقہ اور وطن کا تعلیمی پس منظر، مولانا کے		
	اساتذہ اور تعلیم کی تکمیل کے لیے دہلی کا سفر		
۷۳	صحیح نام	۱	۱۴
۷۴	سنہ ولادت کے متعلق مولوی کریم الدین پانی پتی کی ایک روایت	۲	۱۵
۷۴	مولانا کی سنہ ولادت کے حوالہ سے فرحت اللہ بیگ کی ایک اطلاع	۳	۱۶
۷۵	مولانا کا سنہ ولادت ۱۲۰۴ھ اہل خاندان کی ایک روایت	۴	۱۷
۷۶	تعلیم	۵	۱۸
۷۶	اس علاقہ کا دینی تعلیمی ماحول اور اس کے حقیقی محرکات	۶	۱۹
۷۷	نانوتہ اور اس علاقہ میں علم کی پرانی روایت	۷	۲۰
۷۷	اس خطہ میں علم کی آبیاری میں حضرت مفتی الہی بخش کا حصہ	۸	۲۱
۸۲	مولانا کا تعلیم کے لیے سفر اور اساتذہ	۹	۲۲
۸۲	ایک اور بے ثبوت روایت	۱۰	۲۳
۸۵	مولانا کے کل اساتذہ اور ان سے تعلیم کی ترتیب	۱۱	۲۴
۸۶	حضرت مفتی الہی بخش سے	۱۲	۲۵
۸۶	مولانا کے حضرت مفتی الہی بخش سے تلمذ کے شواہد و آثار	۱۳	۲۶
۸۸	مفتی صاحب کی بیاض میں درج مولانا کی تحریروں کا تعارف	۱۴	۲۷
۹۲	مفتی صاحب سے کیا پڑھا؟	۱۵	۲۸
۹۳	مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی سے تلمذ	۱۶	۲۹

۹۴	مزید تعلیم کے لیے دہلی کا سفر اور اس کا قیاسی سنہ	۱۷	۳۰
۹۶	مولانا کے سفر دہلی کے متعلق مولانا گیلانی کی اطلاع صحیح نہیں	۱۸	۳۱
۹۷	تعلیم کے لیے دہلی کے سفر میں اور دہلی میں مولانا کے رفقاء	۱۹	۳۲
۹۸	تعلیم کی ابتدائی مشکلات اور حضرت شاہ عبدالعزیز کی دعاء اور توجہ	۲۰	۳۳
۹۹	مولانا عبداللہ خاں علوی	۲۱	۳۴
۹۹	مدرسہ غازی الدین حیدر میں مولانا عبداللہ سے تلمذ	۲۲	۳۵
۱۰۰	مولانا رشید الدین خاں دہلوی سے تکمیل علوم	۲۳	۳۶
۱۰۱	کیا مولانا کو مولانا رشید الدین سے اجازت حدیث حاصل تھی؟	۲۴	۳۷
۱۰۳	مولانا رشید الدین خاں کی شفقت دلی ربط اور عنایات	۲۵	۳۸
۴			
مولانا کے اساتذہ کے مختصر حالات			
۱۰۵			
۱۰۶	مسند ہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی	۱	۳۹
۱۰۹	حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی	۲	۴۰
۱۱۳	حضرت مولانا سید محمد قلندر محدث جلال آبادی	۳	۴۱
۱۱۷	مولانا عبداللہ خاں علوی	۴	۴۲
۱۱۸	مولانا رشید الدین خاں کشمیری	۵	۴۳
۱۲۲	مدرسہ ہلی یاد ہلی کالج کی ملازمت	۶	۴۴
۱۲۳	شیعوں کی کتابوں کے جوابات اور اس موضوع پر مولانا کی تصانیف	۷	۴۵
۱۲۴	دیگر مؤلفات	۸	۴۶
۱۲۶	مولانا کے چند تلامذہ	۹	۴۷
۱۲۷	مولانا کے صاحبزادگان	۱۰	۴۸
۱۲۸	مولانا رشید الدین کا صحیح سنہ وفات	۱۱	۴۹

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۵

### دہلی کالج کاپس منظر اور قیام

مدرسہ غازی الدین حیدر سے دہلی کالج تک مدرسہ دہلی، ابتدائی مدرسین، نظام تعلیم اور طریقہء تعلیم پر مشرقی مدارس کا اثر، مغربی اثرات سے بڑی حد تک حفاظت اور مشرقی شعبہ کا مغربی شعبہ سے امتیاز اور متعلقات

۱۳۱	مولانا مملوک العلی دہلی کالج میں	۱	۵۰
۱۳۱	دہلی کالج کاپس منظر اور تحریک	۲	۵۱
۱۳۳	دہلی کا تعلیمی جائزہ اور دہلی میں ایک کالج قائم کرنے کا فیصلہ	۳	۵۲
۱۳۵	مدرسہ غازی الدین خاں کی تاریخ تعمیر اور اس کا جائے وقوع	۴	۵۳
۱۳۶	مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کا افتتاح اور مولانا کا نائب مدرس اعلیٰ کے منصب کے لیے انتخاب	۵	۵۴
۱۳۷	اس ادارہ کا پہلا نام	۶	۵۵
۱۳۸	مدرسہ کے نظام اور طریقہء تعلیم میں تبدیلی اور مغربی شعبہ کی ابتداء	۷	۵۶
۱۳۹	کالج کی ایک بڑی خصوصیت	۸	۵۷
۱۴۰	دہلی کالج کے مشرقی شعبہ کی مغربی شعبہ سے بہتر کارکردگی	۹	۵۸

۶

### مولانا مملوک العلی کا دہلی کالج میں تقرر

۱۴۲	منصب اور ترقی	۱	۵۹
۱۴۴	تنخواہ	۲	۶۰
۱۴۶	دہلی کالج سے طویل رخصت	۳	۶۱
۱۴۶	دہلی کالج کے انگریز ذمہ داروں سے رہا بط اور اختلافات	۴	۶۲
۱۴۹	مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس اول یا امین کے منصب کے لیے مولانا مملوک العلی کا انتخاب	۵	۶۳

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۱۵۱	ترتیب واقعات، مولانا کی درخواست اور کالج سے اس کی نامنظوری	۶	۶۴
۱۵۳	مولانا کو رخصت نہ دینے کی ایک اہم وجہ	۷	۶۵
۱۵۳	کلکتہ نہ جائیے! علماء اور دوستوں کا اصرار	۸	۶۶
۱۵۴	مولانا نے کلکتہ کے سفر اور ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا	۹	۶۷
۱۵۵	مولانا کی مدرسہ دار لبقاء دہلی میں ملازمت کی روایت پر ایک نظر	۱۰	۶۸
(۷)			
<p>مولانا مملوک العلی کے عہد میں دہلی کالج نصاب تعلیم، درجوں کی کیفیت، امتحانات کے بہتر نتائج، مولانا کے شاگردوں کی اعلیٰ ترین استعداد اور مولانا کی تربیت کے اثرات</p>			
۱۵۹	مدرسہ دہلی میں مولانا کے درجوں کا نصاب تعلیم	۱	۶۹
۱۶۱	سنہ ۱۸۴۳ء میں عربی جماعت کی کتابیں	۲	۷۰
۱۶۱	جماعتوں کی درجہ بندی اور ترتیب	۳	۷۱
۱۶۳	طلبہ کی (عموماً) تعداد	۴	۷۲
۱۶۴	وظیفوں کا نظام	۵	۷۳
۱۶۶	سنہ ۱۸۳۰ء کا اہم ترین امتحان	۶	۷۴
۱۶۶	سنہ ۳۸-۱۸۳۷ء (۱۲۵۲-۵۳ھ) کے امتحانات	۷	۷۵
۱۶۷	سنہ ۴۰-۱۸۳۹ء کی تعلیمی کیفیت	۸	۷۶
۱۶۷	سنہ ۱۸۴۸ء (۱۲۶۴ھ) کا سالانہ امتحان اور اس میں کامیابی	۹	۷۷
۱۶۷	سنہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۱ء تک	۱۰	۷۸
۱۶۸	مولانا مملوک العلی کے شاگردوں کی اعلیٰ استعداد	۱۱	۷۹
۱۷۳	مولانا مملوک العلی کے شاگردوں کا ایک غیر معمولی کمال، جو کتابیں پڑھی ہی نہیں ان کا امتحان اور اس میں اعلیٰ کامیابی	۱۲	۸۰

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۱۷۴	قاری عبدالرحمن پانی پتی کا معقولات کی کتابوں کا پڑھے بغیر امتحان دینا	۱۳	۸۱
۱۷۵	مولانا محمد قاسم نانوتوی کا بغیر پڑھے اقلیدس کا امتحان دینا	۱۴	۸۲
۱۷۶	مولانا کے شاگردوں کا دوسرے مدارس میں اور اہم عہدوں پر تقرر	۱۵	۸۳
(۸)			
۱۷۸	دہلی کالج کے علمی و تعلیمی شعبوں کی نگرانی کالج سے چھپنے والی کتابوں، رسالوں اور اخبارات کی تصحیح، مطبع کی سرپرستی، اس میں حصہ داری اور دیگر علمی مصروفیات		
۱۷۸	دہلی کالج کی دوسری مصروفیات اور نگرانی	۱	۸۴
۱۷۸	شعبہ تصنیف	۲	۸۵
۱۸۰	شعبہ تصنیف کے لیے تحریری خدمات	۳	۸۶
۱۸۲	کالج کے اخبارات کی اصلاح و نگرانی	۴	۸۷
۱۸۵	سید اشرف علی کے پریس مطبع العلوم میں شرکت	۵	۸۸
۱۸۷	مولانا مملوک العلی کی دہلی کالج سے وابستگی کا ایک بڑا فائدہ	۶	۸۹
۱۸۹	مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) کے علاوہ مولانا کی علمی مصروفیات	۷	۹۰
(۹)			
۱۹۰	تحریک سید احمد شہید سے وابستگی حضرت سید احمد شہید کا ایک اہم اور مفصل گرامی نامہ		
۱۹۰	تحریک سید احمد شہید کی علمی تائید اور اس کا تحریری اصلاحی تعاون	۱	۹۱
۱۹۱	تحریک کا آغاز اور حضرت مولانا پر اس کے اثرات	۲	۹۲
۱۹۳	مکتوبات حضرت سید احمد شہید	۳	۹۳
۱۹۶	مکتوب الیہ اصحاب کی وہ فہرست جو قلمی نسخہ میں درج ہے	۴	۹۴
۱۹۷	مکتوب الیہ اصحاب کی وہ فہرست جو مولانا شیخ محمد صاحب نے انوار محمدی میں نقل کی ہے	۵	۹۵

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۱۹۹	اعلام نامہ سید صاحب	۶	۹۶
۲۰۳	تحریک سید احمد شہید کے اثرات	۷	۹۷
۲۰۳	تحریک سید احمد شہید اور شاہ محمد اسماعیل کی دعوت توحید و سنت کی ترویج	۸	۹۸
۲۰۴	نکاح بیوگان کی جدوجہد	۹	۹۹
۲۰۵	شفاعت کی تحقیق میں شاہ محمد اسماعیل کی تائید	۱۰	۱۰۰
۲۰۶	نظریہ شفاعت کی وجہ سے شاہ شہید پر اعتراضات، کچھ پس منظر اور حقائق	۱۱	۱۰۱
۲۰۶	ایک اہم تاریخی حقیقت کا تذکرہ	۱۲	۱۰۲
۲۰۸	اس فتنہ اور تفریق کا ذمہ دار کون تھا؟	۱۳	۱۰۳
۱۰			
۲۰۹	حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کی ہندوستان سے ہجرت ان کی نمائندگی کے لیے علماء کے مشاورتی بورڈ کی مشتبہ روایت		
۲۱۰	حضرت مولانا کی انگریز دشمنی	۱	۱۰۴
۲۱۴	مولانا عبید اللہ سندھی کا ایک بے ثبوت نظریہ یا اطلاع	۲	۱۰۵
۱۱			
۲۲۱	اخلاق و مزاج کی ایک سرسری جھلک حسن کردار، اپنے سے چھوٹے باخدا اصحاب سے محبت و احترام اور نیاز مندی کا معاملہ۔ سادگی، بے تکلفی، خوش طبعی اور دلجوئی کے چند واقعات	۱	۱۰۶
۱۲			
۲۳۱	سفر حج اور اس کا سنہ	۱	۱۰۷
	ضمناً شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کی سنہ کا تعین	۲	۱۰۸

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۲۳۲	شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کا صحیح سنہ	۱	۱۰۶
۲۳۳	قطععات تاریخ سنہ ہجرت شاہ محمد اسحاق	۲	۱۰۷
(۱۳)			
۲۳۶	مولانا مملوک العلی کی تصانیف، مؤلفات، حاشیے اور ترجمے		
۲۳۶	تصنیف و تالیف پر توجہ نہ کرنے کی وجہ	۱	۱۰۸
۲۳۷	حضرت مولانا کی تحریری و تصنیفی خدمات، مؤلفات اور تراجم	۲	۱۰۹
۲۳۸	سنن ترمذی کی تصحیح اور مقابلہ میں مولانا احمد علی کی رفاقت	۳	۱۱۰
۲۳۹	مولانا احمد علی کا اعتراف	۴	۱۱۱
۲۴۰	اس نسخہ کی پہلی طباعت	۵	۱۱۲
۲۴۲	ترجمہ اردو سنن ترمذی	۶	۱۱۳
۲۴۳	تصحیح و حواشی 'تاریخ یمنی'	۷	۱۱۴
۲۴۵	کتاب المختار فی الاخبار والآثار	۸	۱۱۵
۲۴۷	اردو ترجمہ تحریر اقلیدس اور اس کی پہلی طباعت	۹	۱۱۶
۲۴۹	چند طباعتیں اور	۱۰	۱۱۷
۲۵۰	ترجمہ تحریر اقلیدس پر مولانا عبدالحق خیر آبادی کے اعتراضات اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے جوابات	۱۱	۱۱۸
۲۵۱	نتیجہ فکر	۱۲	۱۱۹
۲۵۱	مولانا کا ایک نا تمام کام حاشیہ حماسہ	۱۳	۱۲۰
(۱۴)			
۲۵۳	حضرت مولانا کا ایک عربی مکتوب صنعت مہملہ میں، منقولہ کریم الدین پانی پتی		
۲۵۶	ترجمہ از مولانا عبدالرشید صاحب بستوی و ابوالحسن ارشد کاندھلوی	۱	۱۲۱



۱۵

مولانا مملوک العلی کے اردو کے چند اہم خطوط

۲۶۱	چند وضاحتیں	۱	۱۲۲
۲۶۱	مکتوبات کی ترتیب	۲	۱۲۳
۲۶۲	(جناب محمد اکرام) چغتائی کی ترتیب سے کسی قدر مختلف ہے		
۲۶۳	مکتوب اول مکتوبہ ۲۲ رذیقعدہ ۱۲۶۲ھ	۳	۱۲۴
۲۶۶	مکتوب دوم مکتوبہ ۱۳ رذی الحجہ ۱۲۶۴ھ	۴	۱۲۵
۲۶۸	مکتوب سوم مکتوبہ ۲۶-۲۵ ۱۲۶۵ھ	۵	۱۲۶
۲۷۰	مکتوب چہارم مکتوبہ ۶ رمضان ۱۲۶۶ھ	۶	۱۲۷
۲۷۲	مکتوب پنجم مکتوبہ ۱۲ رمضان ۱۲۶۶ھ	۷	۱۲۸
۲۷۴	مکتوب ششم مکتوبہ ۲۷ شوال ۱۲۶۶ھ	۸	۱۲۹
۲۷۵	مکتوب ہفتم مکتوبہ ۲۷ شوال ۱۲۶۶ھ	۹	۱۳۰
۲۷۶	مکتوب ہشتم مکتوبہ ۱۰ شوال ۱۲۶۶ھ	۱۰	۱۳۱
۲۷۶	ایک وضاحت	۱۱	۱۳۲
۲۷۷	مکتوب نہم	۱۲	۱۳۳

۱۶

چند اہم فتاویٰ اور علمی سوالات کے جوابات

۲۷۸	پہلا فتویٰ	۱	۱۳۴
۲۷۹	فتویٰ نکاح بیوگان	۲	۱۳۵
۲۸۰	اس فتویٰ کا اردو ترجمہ	۳	۱۳۶
۲۸۱	غیر اللہ کی خوشنودی کے لیے جانور ذبح کرنا	۴	۱۳۷
۲۸۱	شفاعت کی تحقیق	۵	۱۳۸

۲۸۲	ایک علمی نحوی صرفی بحث کی تحقیق	۶	۱۳۹
(۱۷)			
۲۸۳	چند اہم کتابوں کی تصنیف و اشاعت میں حصہ		
۲۸۳	مولانا کے اصرار پر مولانا رشید الدین خاں کی بعض تصانیف کی تالیف	۱	۱۴۰
۲۸۵	مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اہم تصنیف 'ازالۃ الاوهام' کی طباعت کا اصرار اور کوشش	۲	۱۴۱
۲۸۷	مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا مولانا نور الحسن کاندھلوی کے نام ایک خط	۳	۱۴۲
۲۹۰	قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کی 'کشاف اصطلاحات الفنون' کے تعارف اور اشاعت کے لیے مولانا کی خدمت	۴	۱۴۳
(۱۸)			
۲۹۳	حضرت مولانا مملوک العلیٰ کا کتب خانہ		
۲۹۷	کلام اللہ وما يتعلق به	۱	۱۴۴
۲۹۷	کتب الحدیث وما يتعلق به	۲	۱۴۵
۲۹۷	کتب الفقہ والاصول	۳	۱۴۶
۲۹۸	کتب الکلام	۴	۱۴۷
۲۹۸	کتب الادب والصرف والنحو واللغة والبلاغة	۵	۱۴۸
۲۹۹	کتب ادعیہ وفنون متفرقہ دیگر	۶	۱۴۹
۲۹۹	کتب المنطق والمنظرہ	۷	۱۵۰
۲۹۹	کتب الحکمة الرياضی	۸	۱۵۱
۳۰۰	کتب متفرقہ از فارسی و طب قانون	۹	۱۵۲
(۱۹)			
۳۰۱	مختصر علالت کے بعد وفات، مسجد مہندیان کے صحن میں تدفین		

## اولاد و احفاد

۳۰۳

۳۰۳

بڑی بیٹی کے گنام شوہر حافظ محمود نانوتوی دختران اور ان کی اولاد

۱

۱۵۳

۳۰۶

فرزند گرامی حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی

۲

۱۵۴

۳۰۷

ولادت

۲

۱۵۵

۳۱۰

درس حدیث

۳

۱۵۶

۳۱۱

حضرت مولانا محمد قاسم سے درس حدیث

۴

۱۵۷

۳۱۲

حضرت مولانا احمد علی سے تلمذ

۵

۱۵۸

۳۱۲

دہلی کالج میں ملازمت کے لیے کوشش

۶

۱۵۹

۳۱۲

دور ملازمت سنہ ۱۸۵۷ء تک

۷

۱۶۰

۳۱۵

۱۸۵۷ء کے بعد ملازمت اور ذرائع معاش

۸

۱۶۱

۳۱۶

مطبع مجتہائی میرٹھ سے وابستگی

۹

۱۶۲

۳۱۷

مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے وابستگی

۱۰

۱۶۳

۳۱۸

مطبع صدیقی بریلی میں

۱۱

۱۶۴

۳۱۸

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی سے بیعت و اجازت و خلافت

۱۲

۱۶۵

۳۲۴

مولانا محمد یعقوب کو مولانا مملوک العلی سے اجازت و خلافت کی روایت

۱۳

۱۶۶

۳۲۴

مدرسہ اسلامیہ (دارالعلوم) دیوبند کی مسند صدارت پر

۱۴

۱۶۷

۳۲۶

مدرسہ میں پہلا سال، تعلیم اور اس کے اثرات

۱۵

۱۶۸

۳۳۲

مولانا کے شاگرد

۱۶

۱۶۹

۳۳۴

علمی خدمات تصانیف، تراجم اور تصحیح کتب

۱۷

۱۷۰

۳۳۴

صحیح بخاری مرتبہ منشی حضرت مولانا احمد علی میں تعاون

۱۸

۱۷۱

۳۳۵

تصحیح مظاہر حق رابع چہارم

۱۹

۱۷۲

۳۳۷

تصحیح احیاء العلوم

۲۰

۱۷۳

۳۳۸

تصحیح شرح وقایہ

۲۱

۱۷۴

۳۳۸

منہاج العابدین امام غزالی کے اردو ترجمہ مولانا محمد منیر میں شرکت

۲۲

۱۷۵

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۳۳۹	ضیاء القلوب تالیف حضرت حاجی امداد اللہ کا عربی میں ترجمہ	۲۳	۱۷۶
	وجہ ترجمہ ضیاء القلوب	۲۴	۱۷۷
۳۴۱	اس ترجمہ کی طباعت	۲۵	۱۷۸
۳۴۳	حاشیہ ضیاء القلوب	۲۶	۱۷۹
۳۴۳	حالات طیب مولانا محمد قاسم	۲۷	۱۸۰
۳۴۴	بیاض یعقوبی	۲۸	۱۸۱
۳۴۵	مکتوبات مولانا محمد یعقوب مرتبہ مولانا محمد قاسم نیاگری	۲۹	۱۸۲
۳۴۶	چند اور مکتوبات	۳۰	۱۸۳
۳۴۸	فقاوی	۳۱	۱۸۴
۳۴۸	مضامین تحریریں اور تقریریں	۳۲	۱۸۵
۳۴۹	زندگی کے آخری الم ناک ایام اور متواتر حادثے	۳۳	۱۸۶
۳۵۱	وفات اور مدفن	۳۴	۱۸۷
	۲۱		
۳۵۵	مولانا مملوک العلی کے چند شاگرد تلامذہ		
	فہرست و تعارف		
۳۵۵	مولانا کے معلوم شاگردوں کی اجمالی فہرست	۱	۱۸۸
	۱		
۳۶۲	مولانا کے وہ تنہا شاگرد، جوان کے ہم استاد بھی ہیں		
۳۶۲	مولانا غشی جمال الدین کتانوی (مدارالمہام ریاست بھوپال)	۱	۱۸۹
۳۶۳	وطن اور خاندان	۱	۱۹۰
۳۶۳	ولادت اور تعلیم	۲	۱۹۱

۲

مولانا مملوک العلی کے وہ شاگرد جو حضرت شاہ محمد اسحاق کے  
بھی شاگرد تھے

مولانا سبحان بخش شکار پوری

۲

۳۶۹	خاندان	۱	۱۹۲
۳۶۹	ولادت	۲	۱۹۳
۳۷۰	تعلیم	۳	۱۹۴
۳۷۲	دہلی کالج میں تقرر	۴	۱۹۵
۳۷۲	کالج میں مولانا کی عمدہ کارکردگی	۵	۱۹۶
۳۷۳	مدرس سوم سے مدرس دوم کے عہدہ پر ترقی	۶	۱۹۷
۳۷۴	۱۸۵۷ء کے بعد کالج کی تجدید، مولانا کا دوبارہ تقرر اور سبکدوشی	۷	۱۹۸
۳۷۵	علمی مرتبہ	۸	۱۹۹
۳۷۷	دینی علمی تصانیف، تراجم اور حاشیے	۹	۲۰۰
۳۷۸	حاشیہ و تصحیح سنن ترمذی مطبوعہ دہلی ۱۲۷۰ھ	۱۰	۲۰۱
۳۸۰	خزینۃ الاسرار ترجمہ مجالس الابرار (مطبوعہ ۱۲۸۹ھ)	۱۱	۲۰۲
۳۸۱	ترجمہ رسالہ فقہ شافعی تالیف ابوشجاع احمد اصفہانی (مطبوعہ ۱۲۸۶ھ)	۱۲	۲۰۳
۳۸۲	فارسی ترجمہ منہیات ابن حجر کندی (مطبوعہ ۱۲۸۸ھ، ۱۸۷۱ء)	۱۳	۲۰۴
۳۸۳	'اعمال الماثورہ فی الایام المشہورہ' ترجمہ ماثبت بالنسہ، مطبوعہ ۱۳۰۹ھ	۱۴	۲۰۵
۳۸۳	تکمیل ترجمہ فلاح دارین	۱۵	۲۰۶
۳۸۴	علمی تصنیفی کام میں مولانا نواب الدین کے ساتھ شرکت اور تعاون	۱۶	۲۰۷
۳۸۵	دہلی کالج کے تحریری و تصنیفی کاموں میں مولانا کا حصہ	۱۷	۲۰۸
۳۸۶	وہ تصانیف و تراجم جو دہلی کالج کے لیے کئے گئے	۱۸	۲۰۹
۳۸۷	الف: ترجمہ تواریح ہند	۱۹	۲۱۰
۳۸۸	ب: ترجمہ تزک تیموری	۲۰	۲۱۱

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۳۸۹	ج: نسخہ رہنمای یعنی قانون مال کار دو ترجمہ	۲۱	۲۱۲
۳۹۰	ترجمہ تذکرۃ الحکماء، ترجمہ تذکرۃ المفسرین اور ترجمہ تذکرۃ الفقہاء	۲۲	۲۱۳
۳۹۲	بیاگرافیکل ہسٹری کا ترجمہ (مطبوعہ ۱۸۲۸ء)	۲۳	۲۱۴
۳۹۴	مولانا کی ایک اور تالیف محاورات ہند (مؤلفہ ۱۳۰۲ھ)	۲۴	۲۱۵
۳۹۶	دہلی کالج کے پریس میں حصہ داری	۲۵	۲۱۶
۳۹۶	مولانا نور الحسن کاندھلوی	۳	
۳۹۶	دہلی کالج میں تعلیم کا اعلیٰ درجہ کا انعام اور مولانا مملوک العلی سے تلمذ	۱	۲۱۷
۳۹۷	مولانا مفتی صدر الدین آزرہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے تلمذ	۲	۲۱۸
۳۹۹	چند شاگرد	۳	۲۱۹
۴۰۰	تالیفات	۴	۲۲۰
۴۰۱	وفات	۵	۲۲۱
۴۰۱	مولانا شیخ محمد تھانوی	۴	
۴۰۱	ولادت	۱	۲۲۲
۴۰۳	مولانا مملوک العلی سے تلمذ اور دہلی کالج میں تعلیم	۲	۲۲۳
۴۰۴	حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں	۳	۲۲۴
۴۰۴	سفر سلوک و معرفت	۴	۲۲۵
۴۰۵	تصانیف	۵	۲۲۶
۴۰۶	وفات	۶	۲۲۷
۴۰۷	حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری	۵	
۴۰۷	خاندان اور نسب	۱	۲۲۸
۴۰۷	ولادت	۲	۲۲۹
۴۰۸	دہلی کا تعلیمی سفر اور مولانا مملوک العلی سے تلمذ	۳	۲۳۰
۴۰۸	اساتذہ	۴	۲۳۱
۴۰۸	دہلی میں قیام	۵	۲۳۲

۴۰۹	مطبع احمدی اور اس کی خدمات	۶	۲۳۳
۴۰۹	سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد سہارنپور و میرٹھ میں قیام	۷	۲۳۴
۴۰۹	کلکتہ سے ترک ملازمت اور سہارنپور میں تدریسی خدمت	۸	۲۳۵
۴۱۶	مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی	۶	
۴۱۹	مرزا حسن علی محدث سے استفادہ	۱	۲۳۶
۴۱۹	ملازمت	۲	۲۳۷
۴۲۱	وفات	۳	۲۳۸
۴۲۱	مولانا سید عالم علی مراد آبادی	۷	
۴۲۲	حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی	۸	
۴۲۲	دور ملازمت	۱	۲۳۹
۴۲۵	مولانا کا ایک بڑا علمی کارنامہ اور یادگار تالیف حاشیہ موطا امام مالکؒ	۲	۲۴۰
۴۲۶	مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا قیام اور اس کی سرپرستی	۳	۲۴۱
۴۲۷	حضرت مولانا محمد قاسم کا مولانا محمد مظہر سے تلمذ	۴	۲۴۲
۴۲۸	سفر حج	۵	۲۴۳
۴۲۸	وفات	۶	۲۴۴
۴۲۹	مولانا حسین احمد رامپوری سہارنپوری	۹	
۴۲۹	علامہ مولانا محمد سعید اندرانی کشمیری	۱۰	
۴۳۰	مولانا عبدالحمید خاں جلال آبادی	۱۱	
۴۳۱	محدث عصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی	۱۲	
۴۳۲	وطن	۱	۲۴۵
۴۳۲	خاندان	۲	۲۴۶
۴۳۳	اجداد	۳	۲۴۷
۴۳۳	تعلیم و استاد	۴	۲۴۸

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۲۳۶	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۵	۲۴۹
۲۳۷	تعلیم کے بعد	۶	۲۵۰
۲۳۸	بیعت و اجازت	۷	۲۵۱
۲۳۹	خدمات و اثرات	۸	۲۵۲
۲۴۲	فقہی خدمات	۹	۲۵۳
۲۴۳	حضرت کا ایک خاص معمول	۱۰	۲۵۴
۲۴۳	مولانا کے فتاویٰ کے مجموعے	۱۱	۲۵۵
۲۴۴	رسائل اور تصانیف	۱۲	۲۵۶
۲۴۵	صحیح بخاری شریف اور ترمذی وغیرہ کی درسی تقریریں	۱۳	۲۵۷
۲۴۸	سلوک و تصوف کے امام	۱۴	۲۵۸
۲۴۹	ایک معاصر مؤرخ کی گواہی	۱۵	۲۵۹
۲۵۰	لطافت مزاج	۱۶	۲۶۰
۲۵۰	آخری علالت اور وفات	۱۷	۲۶۱
۲۵۱	<b>قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی</b>		<b>۱۳</b>
۲۵۲	حضرت مولانا کے والد ماجد	۱	۲۶۲
۲۵۲	ولادت اور ابتدائی تعلیم	۲	۲۶۳
۲۵۳	دہلی میں تعلیم	۳	۲۶۴
۲۵۵	حضرت مولانا احمد علی محدث سے تعلیم و اجازت حدیث	۴	۲۶۵
۲۵۶	حضرت شاہ عبدالغنی سے تلمذ و اجازت حدیث	۵	۲۶۶
۲۵۷	علم و فضل کی وسعت	۶	۲۶۷
۲۵۸	سوں علوم پر ایک تصنیف کا آغاز	۷	۲۶۸
۲۵۹	تربیت و اصلاح	۸	۲۶۹
۲۶۱	بیعت و اجازت	۹	۲۷۰
۲۶۲	اجازت نامہ بیعت مکتوبہ حضرت امداد	۱۰	۲۷۱
۲۶۳	ارشاد و تلقین	۱۱	۲۷۲

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی



۲۶۴	و عظ و تذکیر	۱۲	۲۷۳
۲۶۵	سادگی بے نفسی اور استغناء	۱۳	۲۷۴
۲۶۵	مطالع میں ملازمت اور تصحیح کتب کی خدمت	۱۴	۲۷۵
۲۶۶	اس دور کے مطالع اور ان کی خدمات	۱۵	۲۷۶
۲۷۰	پادریوں اور پنڈتوں سے مناظرے اور دین و شریعت پر اعتراضات کے جوابات	۱۶	۲۷۷
۲۷۱	دہلی میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جوابات اور ایک مناظرہ	۱۷	۲۷۸
۲۷۲	میلہ خدا شناسی چاند پور ضلع شاہجہان پور	۱۸	۲۷۹
۲۷۲	خدا شناسی کے دوسرے میلہ میں شرکت	۱۹	۲۸۰
۲۷۳	رژکی میں سوامی دیانند سے مراسلت	۲۰	۲۸۱
۲۷۵	سب سے بڑا اور زندہ جاوید کارنامہ مدرسہ اسلامیہ کا قیام	۲۱	۲۸۲
۲۷۷	مکتوبات اور تصانیف	۲۲	۲۸۳
۲۷۹	سفر حج	۲۳	۲۸۴
۲۸۰	آخری بیماری اور وفات	۲۴	۲۸۵
۲۸۱	حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی	۱۴	
۲۸۱	مولانا محمد احسن نانوتوی	۱۵	
۲۸۲	ولادت و تعلیم	۱	۲۸۶
۲۸۲	ملازمت بنارس	۲	۲۸۷
۲۸۲	مولانا کی علمی تصنیفی خدمات	۳	۲۸۸
۲۸۵	اردو ترجمے	۴	۲۸۹
۲۸۵	تصحیح و حواشی اور تدوین متن	۵	۲۹۰
۲۸۶	حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کی تصحیح و اشاعت	۶	۲۹۱
۲۸۷	مولانا کا مطبع صدیقی بریلی اور اس کی مطبوعات	۷	۲۹۲
۲۸۸	مولانا کا کفایت روزہ احسن الاخبار، بریلی	۸	۲۹۳

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۴۸۸	مولانا کے قائم کیے ہوئے مدرسے 'مصباح التہذیب اور مصباح العلوم بریلی	۹	۲۹۴
۴۸۹	مدرسہ احسن المدارس نانوتہ	۱۰	۲۹۵
۴۸۹	مولانا کو بنیاد اور نشانہ بنا کر چند لوگوں کی علمائے دیوبند کے خلاف الزام تراشی اور مخالفت جو بریلی اور دیوبند کے قضیہ کی بنیاد ہے	۱۱	۲۹۶
۴۹۱	وجہ اختلاف و معافرت	۱۲	۲۹۷
۴۹۲	بریلی سے واپسی اور وفات	۱۳	۲۹۸
۴۹۳	مولانا قاضی محمد ایوب پھلتی	۱۶	
۴۹۴	مولانا محمد منیر نانوتوی	۱۷	
۴۹۵	مولانا ذوالفقار علی دیوبندی	۱۸	
۴۹۷	مولانا فصیح الدین عثمانی دیوبندی	۱۹	
۴۹۸	مولانا فضل الرحمن عثمانی دیوبندی	۲۰	
۴۹۹	مولانا انصار علی انبہطوی	۲۱	
۴۹۹	مولانا محمد حسن رام پوری	۲۲	
۵۰۰	مولوی حکیم امین الدین دیوبندی	۲۳	
	مولانا محمد یوسف	۲۴	
	خلف مولانا مفتی عبدالقیوم بڈھانوی		
۵۰۲	مولانا سدید الدین دہلوی	۲۵	
۵۰۳	مولانا ڈپٹی نذیر احمد بجنوری دہلوی	۲۶	
۵۰۴	خاندان، ولادت، تعلیم اور استاد	۱	۲۹۹
۵۰۶	تصانیف و تراجم	۲	۳۰۰
۵۰۶	ترجمہ قرآن شریف	۳	۳۰۱

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک اعلیٰ نانوتوی

۹۵۷۲۴

۵۰۶	اس ترجمہ پر شبہات و اعتراضات	۴	۳۰۲
۵۰۸	ڈپٹی صاحب کی اور تالیفات	۵	۳۰۳
۵۰۸	الحقوق و الفرائض	۶	۳۰۴
۵۰۸	ادعیۃ القرآن	۷	۳۰۵
۵۰۸	الاجتہاد	۸	۳۰۶
۵۰۸	امہیات الامہ	۹	۳۰۷
۵۰۹	ادبی تالیفات	۱۰	۳۰۸
۵۰۹	مولوی ضیاء الدین دہلوی (ایل ایل ڈی)	۲۷	
۵۱۰	مولوی غنشی ذکاء اللہ خاں دہلوی	۲۸	
۵۱۱	مولوی سمیع اللہ دہلوی	۲۹	
۵۱۳	مولانا انوار الحق حقی دہلوی	۳۰	
۵۱۳	مولانا سید عبداللہ دہلوی	۳۱	
۵۱۵	مولانا سید ہاشم علی دہلوی	۳۲	
۵۱۵	مولوی علی احمد (برادر ڈپٹی نذیر احمد) بجنوری دہلوی	۳۳	
۵۱۶	کریم الدین یانی پتی دہلوی	۳۴	
۵۱۹	حکیم عبدالرحمن حیرت بھنجنوی	۳۵	
۵۲۲	مولوی کریم بخش دہلوی	۳۶	
۵۲۳	مولانا یعقوب علی بدایونی	۳۷	
۵۲۳	مولانا حکیم مرزا منور علی ہاپوڑی	۳۸	
۵۲۳	قطب الدین دلاور علی طرزی ہاپوڑی	۳۹	

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۵

۵۲۵

حضرت مولانا مملوک العلی کے چند شاگرد جن کے حالات نہیں مل سکے

- (۱) مولانا مشتاق احمد (۲) مولانا وجیہ اللہ (۳) حافظ علم اللہ بجنوری ۴۰  
 (۴) حافظ فخر الدین گنگوہی کے والد (۵) مولوی خدا بخش ۳  
 (۶) عبدالرحمن (۷) شمس الدین (۸) ریاض الدین ۴۸  
 (۹) حاجی احمد علی احراری

۶

مولانا مملوک العلی کے چند شیعہ تلامذہ

۵۲۸

برکت علی تھانیسری

۱

۳۰۹

۵۲۹

علی اکبر سونی پتی

۲

۳۱۰

۵۳۰

علی اصغر سونی پتی

۲

۳۱۱

۲۲

۵۳۱

سر سید احمد خاں کے مولانا مملوک العلی نانوتوی سے تلمذ اور دہلی کالج میں تعلیم کی روایت پر ایک نظر

۲۳

۵۳۶

حضرت مولانا مملوک العلی اپنے عہد کے تذکرہ نگاروں اور سر سید احمد کی نظر میں

۵۳۷

الہدیۃ السنیۃ تالیف، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی مع اردو ترجمہ

۱

۳۱۲

۵۵۲

تذکرہ فراند الدہریا تاریخ شعرائے عرب (اردو)

۲

۳۱۳

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۵۵۴	طبقات شعرائے ہند	۳	۳۱۴
	تالیفات کریم الدین پانی پتی	۴	۳۱۵
۵۵۶	آثار الصنادید، سرسید احمد	۵	۳۱۶
حاشیہ کے چند اہم مندرجات			
تعارف شخصیات			
۷۹	مولانا وجیہ الدین سہارنپوری	۱	۳۱۷
۸۰	حکیم مغیث الدین سہارنپوری	۲	۳۱۸
۸۰	مولانا عبدالرحیم نانوتوی	۳	۳۱۹
۸۱	مولانا محمد حسن رامپوری	۴	۳۲۰
۸۱	مولانا محمد قلندر جلال آبادی	۵	۳۲۱
۸۱	عبدالرحمن جلال آبادی	۶	۳۲۲
۸۲	عبدالرحیم تھانوی	۷	۳۲۳
۸۲	مولانا محمد صادق لوہاروی	۸	۳۲۴
۸۲	مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی	۹	۳۲۵
۸۷	قاضی غلام حسین	۱۰	۳۲۶
۸۷	مولانا غلام حسن تھانوی	۱۱	۳۲۷
۸۸	مولانا غلام نبی امبھوی	۱۲	۳۲۸
۱۹۶	مولانا سید محبوب علی جعفری دہلوی	۱۳	۳۲۹
۱۹۶	حکیم محمد اشرف کاندھلوی	۱۴	۳۳۰
۱۹۶	حکیم محی الدین کاندھلوی	۱۵	۳۳۱
۱۹۶	حکیم رحیم اللہ کاندھلوی	۱۶	۳۳۲
۱۹۶	مولانا احمد اللہ تھانوی	۱۷	۳۳۳
۱۹۷	حکیم غلام سبجانی جھنجھانوی	۱۸	۳۳۴

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۱۹۷	حضرت میا نجیو نور محمد جھنجھانوی	۱۹	۳۳۵
۱۹۸	مولانا نصیر الدین نقشبندی مجاہد	۲۰	۳۳۶
۱۹۸	مولانا عبدالخالق	۲۱	۳۳۷
۱۹۸	حکیم خواجہ حسن	۲۲	۳۳۸
۱۹۸	حکیم غلام حیدر	۲۳	۳۳۹
۲۶۶	مولانا محمد مظہر نانوتوی	۲۴	۳۴۰
۲۶۶	شیخ لطف علی نانوتوی	۲۵	۳۴۱
۲۶۷	ایچ۔ جے ٹیلر	۲۶	۳۴۲
۲۶۸	مولانا احمد علی سہارنپوری	۲۷	۳۴۳
۲۷۲	موٹ فریڈرک جان موٹ	۲۸	۳۴۴
۲۷۳	منشی اشرف علی دہلوی	۲۹	۳۴۵
۲۹۰	مولانا ابوالحسن کاندھلوی	۳۰	۳۴۶
۳۷۰	حکیم نجیب الرحمن کیرانوی	۳۱	۳۴۷
۳۷۹	شیخ اللہ دیا	۳۲	۳۴۸
۴۱۹	مرزا حسن علی محدث	۳۳	۳۴۹
۴۳۴	مولانا محمد حسن رامپوری	۳۴	۳۵۰
۵۴۰	مولانا عبداللہ انصاری کی تاریخ وفات اور مدفن کی تحقیق	۳۵	۳۵۱
<b>چند متفرق حاشیے اور توضیحات</b>			
۵۲	تعارف نانوتہ	۱	۳۵۲
۸۹	تعارف بیاض مفتی الہی بخش	۲	۳۵۳
۱۰۲	علمائے دیوبند کی سندت میں مولانا مملوک العلی کا تذکرہ	۳	۳۵۴
۲۰۴	صولت غنفریہ کے بارے میں ایک وضاحت	۴	۳۵۵
۱۱۶	میا نجیو نور محمد کی خدمت میں حاجی امداد اللہ کی پہلی حاضری کا سنہ	۵	۳۵۶
۱۲۰	رشید المومنین کا مصنف کون ہے؟	۶	۳۵۷

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

۱۲۶	مولانا فضل حق کی دو بیاضوں کا تعارف	۷	۳۵۸
۲۴۱	حاشیہ سنن ترمذی	۸	۳۵۹
۲۶۴	کشاف اصطلاحات الفنون کا تعارف	۹	۳۶۰
۲۶۷	بخاری شریف کا حاشیہ	۱۰	۳۶۱
۲۶۷	حضرت مولانا احمد علی اور مولانا مملوک العلی کی تصحیح کردہ سنن ترمذی	۱۱	۳۶۲
۲۶۸	مکہ میں مولانا النبی کے محل وقوع کا تعارف	۱۲	۳۶۳
۳۶۳	کتابخانہ کا تعارف	۱۳	۳۶۴
۳۶۹	شکار پور کا تعارف	۱۴	۳۶۵
۴۳۲	سرسل کا تعارف	۱۵	۳۶۶
۴۴۶	فقیہ النفس کی وضاحت	۱۶	۳۶۷
(۲۲)			
<p>حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کی مکتوبہ چند اہم تحریرات و تصانیف اور مکان و مدفن کے عکس</p>			
557/1	حضرت مفتی الہی بخش کی بیاض میں مولانا مملوک العلی کی مکتوبہ مفتی صاحب کی تالیف 'شرح رسالہ بہاؤ الدین عالمی' کا پہلا صفحہ	۱	۳۶۸
557/2	'شرح رسالہ بہاؤ الدین عالمی' کا آخری صفحہ، جس پر مفتی صاحب کی ایک علمی یادداشت بھی درج ہے۔	۲	
557/3	مولانا مملوک العلی کی مکتوبہ 'شرح رسالہ بہاؤ الدین عالمی' کے اوپر صفحہ پر درج سفر دہلی کی یادداشت	۳	
558/1	حضرت مولانا مملوک العلی کے قلم سے مکتوبہ 'شرح سببہ معلقات روزنی' کا پہلا صفحہ (مکتوبہ ۱۲۳۰ھ)	۴	۳۶۹
558/2	'شرح سببہ معلقات روزنی' کا آخری صفحہ	۵	

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ

559	’لامیہ صلاح الدین صفدی‘ مکتوبہ مولانا مملوک العلی کا آخری صفحہ۔ تحریر کے آخر میں درج ہے: ’تمام شد الراقم مملوک علی‘	۶	۳۷۱
560	مولانا مملوک العلی کی بیاض میں درج ایک عربی یادداشت، جس پر مولانا کے دستخط مثبت ہیں: ’نوشتہ مملوک الطلباء مملوک علی‘	۷	
561	حضرت مولانا مملوک العلی کی بیاض میں ان کا مکتوبہ قصیدہ کا ایک صفحہ	۸	۳۷۲
562	حضرت مولانا مملوک العلی کی بیاض کا ایک اور صفحہ	۹	
563/1	عربی سے ترجمہ مولانا مملوک العلی کی ’تحریر اقلیدس کے چار مقالہ اول‘ کی پہلی طباعت کا سرورق۔ جیومیٹری کی یہ کتاب ۱۸۴۴ء میں مکتبہ رفاہ عام، دہلی سے باہتمام مولوی کریم الدین شائع ہوئی۔ یہ مسودہ خود مولانا مملوک العلی کا مکتوبہ ہے۔	۱۰	۳۷۳
563/2	’تحریر اقلیدس، چار مقالہ اول‘ کا ایک اندرونی صفحہ جس میں ’مثلث‘ 'مربع' اور 'کثیر الاضلاع' سطحی اشکال کی اقسام بیان کی گئی ہیں۔	۱۱	
564/1	مولانا مملوک العلی کی مرتبہ مصححہ اور تحشیہ ’تاریخ یمینی‘ کی پہلی طباعت کا سرورق۔ یہ کتاب دہلی کالج (مدرسہ دہلی) کے اپنے مکتبہ سے طبع ہوئی۔	۱۲	
564/2	’تاریخ یمینی‘ پہلی طباعت کا اندر کا ایک صفحہ۔	۱۳	
565	دہلی کالج (مدرسہ دہلی) کی ایک نادر یادگار۔ سند تو صیف جو جنوری ۱۸۳۰ء میں مولانا نور الحسن کاندھلوی کو عطا کی گئی۔	۱۴	۳۷۵
566	مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا تحریر کردہ تصفیہ نامہ تازعہ عید گاہ کاندھلہ مکتوبہ ۳ شعبان، ۱۲۸۹ھ، دو شنبہ	۱۵	
567	کشمیری گیٹ، پرانی دہلی کے بڑے ڈاکخانہ سے متصل ’گورو گووند سنگھ اندر پرستھ یونیورسٹی‘ کے احاطہ میں ’لابریری داراشکوہ‘ کی وہ عمارت جس میں دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اب اس عمارت میں محکمہ آثار قدیمہ کی لابریری میوزیم ہے۔	۱۶	۳۷۶



568	قصبہ نانوتہ، ضلع مظفرنگر میں مولانا مملوک العلی کی رہائش گاہ کا ایک عکس، افسوس کہ اب اس مکان کا نشان تک باقی نہیں رہا ہے۔	۱۷	
569/1	میر درد روڈ، دہلی پر واقع قبرستان مہندیان میں مولانا مملوک العلی کے آخری آرام گاہ۔ یہ قبرستان دہلی گیٹ کے پاس واقع ہے۔ اس کا داخلہ کا راستہ دہلی گیٹ سے ترکان گیٹ کی سڑک پر پنت اسپتال والے گیٹ سے ہے۔ اسی قبرستان سے متصل حضرت شاہ ولی اللہ کے خانوادے کا مشہور و معروف قبرستان ہے۔	۱۸	
569/2	مہندیان میں قبرستان کا وہ احاطہ جس میں شیخ عبدالعزیز شکر بار اور مولانا مملوک العلی مدفون ہیں۔	۱۹	
570	بازار چتلی قبر کی گلی کھیر والی میں حضرت شاہ محمد اسحاق کے مدرسہ کی نشانی ایک مہراب۔ اب اس احاطہ میں متعدد خاندان رہائش پذیر ہیں۔	۲۰	
۲۳			
اشاریہ			
۵۷۳	شخصیات	۱	۳۷۷
۵۹۲	مقامات	۲	۳۷۸
۵۹۶	کتابیات	۳	۳۷۹
۶۰۹	فہرست مراجع	۴	۳۸۰

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

اللغة  
أرى  
ع  
م  
ن

## ترجیب

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری

شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

**سورة النمل آیت: ۵۹** میں ارشاد پاک ہے: **قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ، اللَّهُ خَيْرٌ أَمَّا يُشْرِكُونَ**. **ترجمہ:** کہئے تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ اور اس کے ان بندوں پر سلام ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا۔ بتاؤ اللہ تعالیٰ بہتر ہیں، یا بندے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں؟

بے شک اللہ تعالیٰ ہی بہتر ہیں، وہی معبود ہیں، ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ کیوں کہ تمام کمالات انہیں کی طرف دوڑتے ہیں۔ اور تمام صفات حمیدہ ان کی خانہ زاد ہیں۔ پس وہی تمام تعریفوں کے مستحق اور سزاوار ہیں۔ اور جن بندوں میں کوئی دینی کمال پایا جاتا ہے، جیسے رسولوں میں رسالت، نبیوں میں نبوت، علماء میں علیت اور اولیاء میں ولایت..... جن سے دھوکہ کھا کر لوگ ان کو مرتبہ معبودیت پر فائز کرتے ہیں، وہ سب خوبیاں اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہیں۔ ان کمالات کی وجہ سے ان میں شان الوہیت پیدا نہیں ہوتی البتہ ان کمالات کی وجہ سے ان کی شان دو بالا ہوتی ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے امن و سلامتی کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ رسولوں، نبیوں کے ساتھ خاص نہیں، اس کے الفاظ عام ہیں۔ العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص المورد، پس اللہ تعالیٰ کے تمام پسندیدہ بندے آیت کریمہ کے

مصدق ہیں۔

بزرگان دیوبند کے سرخیل حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی، اور حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہما ہیں، انہیں دونوں بزرگوں سے یہ روحانی اور علمی سلسلہ قائم ہوا ہے۔ روحانیت میں ان کے پیشوا حضرت اقدس سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مکی قدس سرہ ہیں اور علمیت میں ان کے استاذ، استاذ الکل حضرت اقدس مولانا مملوک العلی صاحب نانوتوی قدس سرہ تھے۔

حضرت حاجی صاحب سے جماعت دیوبند کسی درجہ میں واقفیت رکھتی ہے، لیکن مولانا مملوک العلی صاحب سے کما حقہ واقف نہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ آپ کی کوئی مفصل سوانح مرتب کی جاتی جو جماعت دیوبند کے لئے سرمہ بصیرت بنتی۔ اس ضرورت و خدمت کا اوروں کے علاوہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کو بھی بہت احساس تھا مولانا زید فضلہ نے اس فرض کفایہ کی تکمیل اور اس سوانح کی تصنیف کے لئے قلم اٹھایا اور محنت شاقہ برداشت کر کے، استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کا بہت عمدہ جامع اور مفصل تذکرہ مرتب کر دیا۔ مولانا راشد دوآبہ (۱) کے علماء و اولیاء کے حالات پر مبصرانہ، بلکہ مجتہدانہ نظر رکھتے ہیں، وہ استنباط احوال کا گرا بھی جانتے ہیں، واقعات کی مفقود کڑیوں کو ملادیتے ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ پیشیں سوانح نگاروں پر انگلی رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

میں نے اس کتاب کا معتد بہ حصہ پڑھا ہے، صاحب سوانح پر ہمہ جہتی روشنی ڈالنے کے

(۲) دوآبہ وہ علاقہ جو بڑے دریاؤں کے بیچ آباد ہو اور یہ دریا اس کے لئے سرحد اور خط فاصل کا کام کرتے ہوں، مغربی یوپی کا دوآبہ دینی علمی حلقوں میں معروف ہے اور عموماً اسی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ دوآبہ ضلع سہارنپور و مظفرنگر کے قصبات و نواح پر مشتمل ہے اور دریائے جمنا و گنگا سے گھرا ہوا ہے۔ مشرقی پنجاب کے اضلاع جالندھر، کپورتھلہ اور نوان شہر کا دوآبہ بھی اپنی شخصیات اور مردم خیزی کے لئے مشہور تھا لیکن اب وہاں ان اکابر و مشائخ کے نام جاننے والے بھی موجود نہیں۔ سدا نام رہے اللہ کا (نور)

استاذ الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی

علاوہ، سوانح نگار نے اس زمانے کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ قاری اس زمانے میں پہنچ جاتا ہے، اور صاحب سوانح کے متعلقات بھی کافی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ جیسے نانوتہ اور اس کے مشائخ کا تعارف، حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کی اولاد اور تلامذہ کا مفصل تذکرہ۔

یہ بات پورے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب صاحب سوانح کی شخصیت سے واقفیت کے لئے کافی وافی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت سے نوازے اور امت کو اس سے فیضیاب فرمائے۔ آمین۔

کتبہ

سعید احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری

خادم دارالعلوم دیوبند

۱۶ جمادی الاول ۱۴۲۳ھ

## پیش لفظ

عامی اور عالم دونوں کے لئے استفادہ اور حوالہ کی کتاب

☆ جناب شمس الرحمن فاروقی

اسلامیات ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ اور مسائل، اور انیسویں صدی میں جن انقلابات سے اردو معاشرے کو دوچار ہونا پڑا آج کے عام اردو حلقوں میں ان معاملات پر کچھ زیادہ گفتگو نہیں ہوتی، اس کا نقصان صرف یہی نہیں کہ ہم اپنے بہت سے بزرگوں کے بارے میں نہیں جانتے جنہوں نے انیسویں صدی کے تہذیبی انتشار کے روبرو قوم کا بکھرتا ہوا شیرازہ مجتمع کرنے کی کوشش کی بلکہ اس کا نقصان یہ بھی ہے کہ ہم نے تاریخی تناظر کھودیا ہے۔ ہم اس بات سے بے خبر ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے پہلے اور بعد انگریز کی ہزار کوشش کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے علم و ادب، سیاست و معاشرت، تحریک و عمل کی دنیا میں پائیدار نقوش چھوڑے اور اس کے مقابل ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد کا منظر ہے کہ اکاڈ کا کو چھوڑ دوں دور تک کسی میدان میں ایک بھی قابل ذکر مسلمان نظر نہیں آتا۔

مولانا مملوک العلی نانوتوی (۱۲۰۴ھ تا ۱۲۶۷ھ) کا نام کچھ بہت غیر معروف نہیں، لیکن اگر کوئی تفصیل پوچھے تو لوگ آسانی سے بتا بھیں ہیں سکیں گی کہ وہ کس رتبہ کے بزرگ تھے اور ان کے کارنامے کیا تھے۔ جن لوگوں کو دہلی کالج کی تاریخ سے کچھ دلچسپی ہے وہ لوگ مولانا مملوک العلی کے نام اور کام سے تھوڑا بہت واقف ہیں۔

ایسا کیوں ہوا، اس کی کئی وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے انیسویں صدی کی تاریخ و تہذیب کو بھلا دیا ہے اور وہ لوگ جن سے یہ تاریخ اور تہذیب عبارت ہے ان میں

☆ نامور ناقد، ادیب، شاعر، مصنف اور محقق

سے بھی اکثر کو بھلا دیا ہے، ایسے ہی بڑے لوگوں میں سے ایک مولانا مملوک العلی نانوتوی بھی تھے۔

مولانا مملوک العلی ان لوگوں میں تھے جنہوں نے انیسویں صدی اور خاص کر اس صدی کے نصف اول کی ہندو اسلامی تہذیب اور معاشرے کو نئے زمانے کا مقابلہ کرنے کی ہمت دی، انہیں علمی متانت اور وقار کی تعلیم دی، ”انہیں پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ“ کا سبق سکھایا۔ انگریزی حکومت اور انگریز کے وجود کو انہوں نے قبول نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ زیست باہمی صورتیں نکالیں۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ اصلاح کی راہ اور علم کی راہ دونوں ایک ہیں، مسلمانوں کو اپنی اصلاح کرنی ہے تو انہیں علم حاصل کرنا ہوگا۔ ”علم“ کی تعریف ان کی نظر میں سراسر وہ نہ تھی جو سرسید کی نظر میں تھی، لیکن وہ اس بات سے واقف بھی تھے کہ بدلے ہوئے زمانے میں بطور مسلمان اور بطور ہندوستانی زندگی بسر کرنے کے لئے صرف پرانی تعلیم کافی نہ ہوگی۔

دہلی کالج میں مولانا مملوک العلی کا وہی مرتبہ تھا جو شہر دہلی میں غالب کا تھا، دہلی کالج کے پرنسپل کو جب فارسی کے استاد کی تلاش ہوئی تو اس نے یہی کہا کہ فارسی میں ہمیں ایسا آدمی درکار ہے جیسے کہ عربی میں مملوک العلی ہیں، چنانچہ غالب کا انتخاب ہوا، بعد میں غالب نے معذرت کر لی اور نوکری قبول نہ کی، لیکن اصول تو قائم ہو گیا کہ فارسی میں غالب اور عربی میں مولوی مملوک العلی کا ہم پلہ کوئی نہیں۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ نور الحسن راشد کاندھلوی نے مولانا مملوک العلی صاحب کی حیات اور کارناموں پر قلم اٹھایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے، لیکن اگر پہلی کتاب نہ بھی ہو تو بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی صاحب کے بارے میں اتنی مبسوط تحریر اردو کیا، عربی اور فارسی میں بھی نہیں ہے۔

نور الحسن راشد نے اس سے پہلے بھی اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے بعض اکابر مسلمان علماء پر عمدہ تحریریں لکھیں ہیں، انہیں اپنے موضوع سے اخلاقانہ دلچسپی ہے اور وہ اپنے رواں اور سلیس اسلوب کی بدولت خشک معلومات کو بھی دلکش بنا دیتے ہیں، ان کی علمی لیاقت اعلیٰ ہے، انہوں نے مولانا مملوک العلی سے متعلق اردو، فارسی اور عربی میں تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔

نور الحسن راشد کاندھلوی کی ایک مدت سے اردو زبان اور ادب کی خاموش اور بے غرض خدمت میں مصروف ہیں، وہ ان نوجوانوں میں سے ہیں جنہیں دیکھ کر امید بندھتی ہے کہ ہماری علمی روایت ابھی برقرار رہے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب عامی اور عالم دونوں کے لئے استفادہ اور حوالہ کا ذریعہ بنے گی۔

شمس الرحمن فاروقی

۲۸ ستمبر ۲۰۰۲ء



# استقبال

وسیع مطالعہ اور موضوع پر گہری نظر کی ترجمان

☆ جناب جمیل جالبی

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی سے میرا پہلا تعارف ان کی تصنیف ”حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی“ کے ذریعہ ہوا۔ کتاب پڑھی تو ان کے علم اور ان کے نظر نے متاثر کیا، اپنی اس تصنیف میں راشد صاحب نے نہ صرف مطبوعہ مواد سے استفادہ کیا ہے، بلکہ ان مخطوطات کو بھی استعمال کیا ہے، جن تک عام طور پر دوسروں کی رسائی نہیں ہوتی۔ مولانا راشد کم و بیش چودہ پندرہ کتابوں کے مؤلف و مصنف ہیں، اور ان کے متعدد مقالات پاکستان و ہندوستان کے بلند پایہ علمی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا راشد صحیح معنی میں محقق ہیں، بال کی کھال نکالنے والے، صحیح و غلط کو الگ الگ کر کے دکھانے والے، علم و ادب کے پارکھ، تاریخ کے فاضل، اب جو مولانا مملوک العلی نانوتوی پر ان کی نئی تصنیف نظر سے گذری تو میں ان کے علم و فضل اور نظر کا مزید قائل ہو گیا۔ میں خود اب تک مولانا مملوک العلی کو سرسید کا استاد سمجھتا رہا تھا، اور فی الواقع یہ سبق میں نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور شیخ محمد اکرام سے پڑھا تھا، لیکن جن دلائل اور حوالوں کے ساتھ مولانا راشد نے زیر نظر کتاب میں ”سرسید کے مولانا مملوک العلی سے تلمذ اور دہلی کالج میں پڑھنے کی روایت پر ایک نظر“ کے عنوان کے تحت اسے بے بنیاد بتایا ہے، وہ ہمہ وجوہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

☆ ممتاز ادیب، محقق، مصنف، مورخ، اور ماہر لسانیات، سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

وسابق صدر مقتدرہ قومی زبان، پاکستان

استاد الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی

وہ دلائل کو دلائل کی سطح پر رکھتے ہیں اور انہیں ذاتیات کی کیچڑ میں نہیں سانٹتے، انہوں نے جہاں کہیں دوسرے علماء و محققین سے اختلاف کیا ہے وہاں بھی، دینی مدارس کی خالص علمی روایت کے زیر اثر، عزت و احترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

وہ ایسے محقق ہیں جو اختلاف کر کے اترتے نہیں، بلکہ معروضی انداز میں دلائل اور حوالوں کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں، مثلاً زیر نظر تصنیف: ”حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی“ میں، مولانا مملوک العلی کی مدرسہ دارالبقا سے وابستگی کے سلسلہ میں، حضرت مولانا شرف علی تھانوی اور زہرۃ الخواطر کے مؤلف و مصنف حکیم عبدالحی سے اختلاف کیا ہے، اور اپنی بات کو نئے اور پرانے مآخذ سے اس طرح مدلل پیش کیا ہے کہ مولانا راشد سے اتفاق کرنا پڑتا ہے۔ راشد صاحب دلائل اور اصل مآخذ کے حوالوں سے، اپنے زاویہ نظر کے لحاف میں ڈورے سے ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ وسیع مطالعہ اور موضوع پر گہری نظر ان کی تحقیق و تحریر کی اصل طاقت ہے۔

مولانا مملوک العلی (متوفی ۱۱۱۱ھ) (متوفی ۱۲۶۷ھ) اپنے وقت کے جید عالم تھے، جنہوں نے شاہ ولی اللہ کی روایت تعلیم و فکر کو نہ صرف اپنے دور میں پھیلایا، اور وسعت دی بلکہ آنے والی نسلوں تک اسے پہنچا کر ایک ایسا استحکام بھی بخشا کہ آج تک ان کا نام زندہ و پابندہ چلا آتا ہے۔ وہ صحیح معنی میں ایک ایسے معلم و استاد تھے جو طلبہ کے دلوں میں اتر کر علم و ادب سے ان کے ذوق و شوق کو زندہ تر کر دیتے ہیں۔ مولانا مملوک العلی استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالعزیز دہلوی ابن شاہ ولی اللہ کے شاگرد رشید تھے، ان کے دوسرے استادوں میں مولانا مفتی الہی بخش کاندھلوی اور مولانا رشید الدین خاں کشمیری جیسے جید علمائے وقت شامل ہیں۔ فاضل مصنف مولانا راشد نے مولوی مملوک العلی کے سچاس شاگردوں کی جو فہرست مع حالات و خدمات مرتب کی ہے، ان میں ایسے ایسے نام آتے ہیں کہ ہر نام پر احترام سے

استاد الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی

دست بستہ کھڑے ہونے کو جی چاہتا ہے، جن میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اور صاحب طبقات الشعراے ہند منشی کریم الدین پانی پتی وغیرہ کے نام نامی شامل ہیں۔ یہ سب لوگ ”دہلی کالج“ کے طالب علم تھے۔

”دہلی کالج“ کا قیام ۱۰ شوال ۱۲۴۰ھ / جون ۱۸۲۵ء کو عمل میں آیا اور مولانا مملوک العلی کا تقریباً کم و بیش اسی زمانے میں عمل میں آیا، اور وہ اپنی وفات ۱۱ رذی الحجہ ۱۲۶۷ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۱ء تک ”دہلی کالج“ سے وابستہ رہے۔ مسلمانوں پر قیامتِ صغریٰ ٹوٹنے اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ابھی چھ سال باقی تھے۔ کالج میں مولانا مملوک العلی نے نہ صرف درس و تدریس سے تعلق رکھا بلکہ ”شعبہ تصنیف“ کے لئے ”اقلیدس“ کے چار مقالوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا، جو نصاب میں شامل تھا۔ اس طرح ”سنن ترمذی“ اور ”تاریخ یمنی“ (یعنی خلاصہ مسعودی) کا بھی اردو میں ترجمہ کیا، یہ دونوں غیر مطبوعہ ہیں۔

میں نے مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کی اس تالیف کو پڑھا تو انیسویں صدی عیسوی کی تاریخ کا ایک دور نظروں کے سامنے آ گیا، ساتھ ہی وہ معلومات بھی سامنے آئیں جنہیں فاضل مؤلف نے بڑی کوشش و کاوش سے مستند مطبوعات اور کینابِ مخطوطات سے حاصل کر کے، حسب ضرورت اس تصنیف میں پھیلا دیا ہے۔

امید ہے جناب راشد کاندھلوی کی زیر نظر تصنیف علمی حلقوں میں قبولیت عام کا درجہ حاصل کرے گی۔ اس کتاب کی تصنیف و اشاعت پر میں مولانا راشد کو دلی مبارک دیتا ہوں۔

☆ ڈاکٹر جمیل جالبی

۲۹ / اگست ۲۰۰۵ء

# مبارک باد

ڈاکٹر خلیق انجم ☆

مولانا مملوک العلی انیسویں صدی کے جید اور بڑے عالم تھے۔ ان کو عربی اور فارسی پر ایسی غیر معمولی قدرت حاصل تھی کہ ان کے زمانے کے لوگ انہیں اس میدان میں بے بدل اور بے مثال کہا کرتے تھے۔ اسلامیات کے تمام شعبوں پر بھی ان کی گہری نظر تھی، سرسید نے ان کے غیر معمولی حافظے کی تعریف کی ہے، شاگردوں میں کچھ تو ایسے تھے، جنہوں نے اردو ادب میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ ان میں سے کچھ کے نام ہیں: مولوی ذکاء اللہ، ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی کریم الدین وغیرہ۔

مولانا مدرسہ دہلی (جس کا نام بعد میں دہلی کالج ہو گیا تھا) میں عربی کے استاد مقرر ہوئے تھے، پھر انہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے مدرسے کے ذمہ داروں کو ایسا متاثر کیا کہ انہیں شعبہ عربی میں میر مولوی کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔

مولانا مملوک العلی نے دہلی کالج میں تقریباً چھبیس سال استاد کی حیثیت سے کام کیا تھا، اس لئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی تھی۔

مولانا مملوک العلی کا آبائی وطن سہارنپور قصبہ نانوتہ تھا۔ یہ وہ سرزمین ہے، جس نے بیسویں صدی میں مولانا قاسم نانوتوی جیسے کئی بڑے عالم پیدا کئے۔

مولانا مملوک العلی کے سوانح، شخصیت، فن اور ان کی علمی کارناموں کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ میں ان کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہندوستان کی عظیم ہستی سرسید کے استاد تھے۔ میں نے دہلی کے قبرستان میں ایک لوح قبر پر ان کا نام پڑھا تھا، بس ان کے بارے میں میری اتنی ہی معلومات تھیں۔ جب میں نے سرسید کی ”آثار الصنادید“ مرتب کی تو

☆ ممتاز محقق و مصنف، سیکریٹری انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی۔

استاد اکل مولانا مملوک العلی نانوتوی

پہلی بار ان کے حالات سے کچھ واقفیت حاصل ہوئی، جب سرسید کی عبارت پر حاشیہ لکھنے کے لئے کچھ مواد حاصل کیا تو ”طبقات شعرائے ہند“ مرحوم دہلی کالج مزارات اولیائے دہلی حکایات اولیاء اور ”فراندالدہر“ میں کچھ حالات پڑھنے کو ملے، اس کے علاوہ اردو چار کتابوں میں مولانا کے حالات بکھرے ہوئے ہیں اور بس۔

پہلی بار نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب نے مولانا مملوک العلی پر ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو جامع اور مستند ہے۔ راشد کاندھلوی صاحب نے اپنی کتاب کا انداز بالکل وہی رکھا ہے جو اعلیٰ درجے کے تحقیقی مقالوں کا ہوتا ہے۔

اگر میں راشد صاحب کی اس کتاب پر تفصیل سے لکھوں تو یقیناً اچھی خاصی کتاب ہو جائے گی، انہوں نے بڑی محنت، دیدہ ریزی سے یہ کام کیا ہے، انہوں نے فارسی، عربی اور اردو زبان کی کتابوں میں مولانا پر محفوظ مواد حاصل کر لیا ہے، جہاں سے جو کچھ ملا وہ بہت مختصر تھا لیکن راشد صاحب نے بڑے سلیقے سے، ان تمام تحریروں سے اس طرح استفادہ کیا کہ ایک مکمل اور مستند کتاب بن گئی ہے۔

آج کل یونیورسٹیوں میں بے شمار تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں لیکن عموماً ان کے موضوعات ایسے سطحی قسم کے ہوتے ہیں کہ ان مقالوں کے لئے زیادہ پڑھنا، تحقیق کرنا، مواد تلاش کرنا اور ان سے نتائج برآمد کرنے ضروری نہیں ہوتا، مگر راشد صاحب نے مولانا مملوک العلی پر ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندو پاکستان کی یونیورسٹیوں میں جتنے تحقیقی مقالوں پر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی جا رہی ہیں۔ ان میں سے ۹۵% مقالوں سے یہ کتاب ہے۔ میں اس اعلیٰ علمی کارنامے پر راشد صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر خلیق انجم

سیکرٹری، انجمن ترقی ہند، اردو گھر، راؤزاوینیو، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

استاد اکل مولانا مملوک العلی نانوتوی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## عرض مؤلف

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ ہندوپاکستان کے علمی تعلیمی اداروں اور کاروان علم و فضل کا ذکر آتے ہی جن علماء اور ممتاز شخصیتوں کے تذکروں سے علمی محفلیں مہک جاتی ہیں اور ان کے کمالات اور علمی احسانات کے ذکر میں ہر اک زبان رطب اللسان ہو جاتی ہے، اور ہر اک ان کا ممنون کرم، گرویدہ اور دلدادہ نظر آتا ہے۔ ایسے ہی بہت نمایاں، ممتاز اور سرفہرست ناموں میں سے ایک نام استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۱۲۰۲ھ، وفات ۱۲۶۷ھ) کا ہے۔ برصغیر کے بہت کم دینی ادارے اور علمی تصنیفی دنیا سے وابستہ بہت کم اصحاب ایسے ہوں گے جو کسی نہ کسی واسطہ سے حضرت مولانا سے وابستہ، مولانا کی فیضیابی کے جرعہ نوش، مولانا کے علمی فیضان سے بہرہ ور اور مولانا کے تلامذہ سے منسلک اور مستفید نہ ہوں۔

بلاشبہ مولانا مملوک العلی کی حیثیت اپنے عہد کے ایک دبستاں اور بڑے مرکز علم و فضل کی تھی۔ مولانا کی ذات بابرکات سے غیر معمولی علمی فیض ہوا۔ مولانا کے حلقہ درس سے ایسے ایسے بلند قامت افراد اٹھے جو اپنے اپنے وقت کے امام، امت کے کھیون ہار اور کشتی ملت کے ناخدا ثابت ہوئے۔ ان کے وجود سے علم کی وہ شمعیں جلیں، وہ آفتاب و ماہتاب روشن ہوئے کہ جن کے نور سے ایک عالم تابناک ہے اور جن کی روشنی میں برصغیر کی ملت اسلامیہ کم سے کم ڈیڑھ صدی سے دین و شریعت، علم و ثقافت اور ادب و کمال کا سفر طے کر رہی ہے۔

اگرچہ حضرت مولانا مملوک العلی کے سلسلہ تعلیم و تلمذ اور مولانا کے علمی احسانات کا کثرت

استاد الکل مولانا مملوک العلی نانوتوی

سے ذکر اور بار بار اعتراف کیا جاتا ہے مگر حیرت ہے کہ مولانا کے احوال و سوانح پر کوئی کتاب، مجموعہ مضامین بلکہ اچھا مفصل مضمون بھی معلوم و دستیاب نہیں۔ میری معلومات کے مطابق حضرت مولانا کے عہد سے آج تک مولانا کے احوال و سوانح کی جمع و ترتیب کی کوئی کوشش نہیں ہوئی، اگر کوئی کوشش ہوئی ہو تو وہ اب تک سامنے نہیں آئی، اس کا کہیں تذکرہ بھی نہیں ملتا۔ اسی بے توجہی اور غفلت کا اثر ہے کہ اگر کوئی شخص حضرت مولانا کے علمی مرتبہ، برصغیر کی علمی ترقی میں مولانا کے مقام اور دینی و علمی خدمات کا اندازہ اور مطالعہ کرنا چاہے تو اس کو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

مولانا کے تعارف پر مختلف تذکروں میں جو اطلاعات ہیں وہ بہت مختصر بلکہ ناتمام اور بکھری ہوئی ہیں، انہیں کا اکثر تذکرہ نگاروں اور اہل قلم نے اپنی مؤلفات و مضامین میں اعادہ کیا ہے مگر ان سے حضرت مولانا کی سوانح و خدمات کی واضح تصویر نہیں ابھرتی۔

اگرچہ برسوں پہلے سیرت یعقوب و مملوک کے نام سے ایک کتاب جو مولانا انوار الحسن شیرکوٹی کی تالیف ہے، ہندو پاکستان دونوں جگہ شائع ہو چکی ہے (۱) مگر اس میں حضرت مولانا مملوک اعلیٰ نانوتوی کا تذکرہ صرف نو صفحات پر مشتمل ہے (صفحہ ۲۶ سے ۳۵ تک) اور مولانا محمد یعقوب کے احوال میں بھی صحیح مستند اطلاعات اور نئی معلومات کا بہت کم اضافہ ہے۔ مولانا یعقوب صاحب کے حالات کے لئے بیاض یعقوبی کے مندرجات کو ترتیب بدل کر شائع کرنا کافی سمجھا ہے، اس لئے اس کتاب سے ان دونوں بزرگوں اور علماء کے مفصل تذکرے بلکہ صحیح تعارف کا مقصد بھی پورا نہیں ہوتا، خصوصاً حضرت مولانا مملوک اعلیٰ کے مفصل تذکرے کی ضرورت بدستور باقی رہی۔

حضرت مولانا مملوک اعلیٰ کے احوال کا غالباً سب سے پہلے جامع مرتب اور کسی قدر مفصل تذکرہ، ڈاکٹر محمد ایوب قادری (وفات ۱۹ صفر ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۵ نومبر ۱۹۸۳ء) نے کیا ہے۔ قادری صاحب نے اپنی کتاب مولانا محمد حسن نانوتوی میں انیس (۱۹) صفحات میں حضرت مولانا

(۱) یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۲ء میں کراچی سے چھپی تھی، بعد میں اس کا عکس ہندوستان میں چھپا۔

مملوکِ اعلیٰ نانوتوی کے حالات لکھے ہیں (۱) جو حضرت مولانا کے احوال پر، اس وقت تک کی سب سے بڑی، سب سے بہتر اور فاضلانہ تحریر ہے۔

قادری صاحب بلکہ حضرت مولانا مملوکِ اعلیٰ کے متعلق دریافت تمام معلومات و روایات پر، ایک وسیع اور مفصل اضافہ پاکستان کے مشہور محقق جناب محمد اکرام صاحب چغتائی کی تالیف ”ایک نادر مجموعہ مکاتیب“ ہے۔ اس کتاب میں حضرت مولانا مملوکِ اعلیٰ اور ان کے ہم عہد چند معروف علماء اور متعارف شخصیتوں، خصوصاً دہلی کالج کے استاذوں اور ممتاز طلبہ کے، اسپرنگر کے نام خطوط شامل ہیں۔

جناب محمد اکرام چغتائی صاحب کی، جرمنی کی قومی لائبریری میں، مشہور فاضل اور مستشرق سپرنگر (Sprenger) کے ذاتی کاغذات و خطوط تک رسائی ہوئی، چغتائی صاحب نے وہاں جو چیزیں دیکھیں، پڑھیں، ان میں سپرنگر کے نام آئے ہوئے خطوط کا قیمتی ذخیرہ بھی تھا، سپرنگر علم دوست شخص اور مشرقی نوادروں و خطوطات کا نہایت شائق تھا اور اپنے ہندوستان کے قیام اور ملازمت کے زمانہ میں (۱۸۴۴ء سے فروری ۱۸۴۸ء تک) دہلی کالج کا پرنسپل رہ چکا تھا، سپرنگر کے حضرت مولانا مملوکِ اعلیٰ نیز دہلی کالج کے اساتذہ و طلبہ، دہلی اور نواح دہلی اور لکھنؤ وغیرہ کے ممتاز علماء اور علمی ذخیرے رکھنے والے اصحاب سے قریبی روابط تھے، ان سے کالج کے متعلقات و مسائل اور کتابوں کی تلاش و دریافت کے موضوع پر خط و کتابت رہتی تھی۔ یہ تمام خطوط سپرنگر کے ذخیرہ میں ایک بڑے ڈبہ (Box) میں محفوظ تھے، ان خطوط میں سپرنگر نیز دہلی کالج، علمائے دہلی اور اس عہد کے متعدد علماء کے متعلق ایسی بہت سی نادر اور قیمتی معلومات ہیں کہ جن کے بغیر ان حضرات کے سوانح اور احوال مکمل نہیں ہو سکتے۔

چغتائی صاحب نے ان خطوط کو بہت محنت سے نہایت تحقیق، بنیادی ضروری ضمنی اور ثانوی معلومات اور اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے، جس میں مکتوب نگاروں کے مفصل حالات کے علاوہ، سپرنگر سے ان کے روابط کی نوعیت اور ان مکتوبات کے مندرجات پر بھی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔



اس مجموعہ مکتوبات کا سب سے پہلا اندراج، سپرنگر کے نام حضرت مولانا مملوک العلی کے خطوط ہیں۔ چغتائی صاحب نے ان مکتوبات کے ضمن میں، حضرت مولانا کا مفصل تعارف کرایا ہے، مکتوبات کے مندرجات پر تفصیلی حاشیے لکھے ہیں اور ان کے متعلقات کی وضاحت کی ہے۔

چغتائی صاحب کی یہ دریافت و کاوش انجمن ترقی اردو کراچی کے سہ ماہی مجلہ اردو میں قسط وار چھپی تھی (۱) مگر سہ ماہی اردو کی اشاعت محدود ہے، خصوصاً ہندوستان میں اور دینی حلقوں میں اس کا نام بھی زیادہ متعارف نہیں، اس لئے اس کا ویسا تعارف اور تذکرہ نہیں ہوا، جس کی ضرورت تھی، اگر تعارف و تذکرہ ہوا بھی ہوتا تو چغتائی صاحب کے اس کام کی ترتیب کچھ ایسی ہے کہ اس سے عام کتاب خواں بہت کم فائدہ اٹھا سکتے ہیں، تاہم یہ بہت اہم اور قابل قدر دریافت و اشاعت ہے۔ جس سے حضرت مولانا مملوک العلی، دہلی کالج اور مولانا کے احباب اور معاصرین کے متعلق بہت سی نادر معلومات سامنے آئی ہیں۔ مذکورہ مضامین و تحریرات کے علاوہ حضرت مولانا مملوک العلی کے احوال و سوانح پر کوئی اور قابل ذکر تحریر شائع نہیں ہوئی۔

حضرت مولانا کا ہندوپاکستان بلکہ اس تختی برصغیر پر جو بہت بڑا دینی علمی احسان ہے، اس کا حق اور تقاضا تھا کہ حضرت مولانا کے احوال و سوانح کی جستجو کی جائے اور مولانا کا ایک صحیح اور جامع تذکرہ مرتب ہو۔ آئندہ صفحات میں اسی ضرورت کو کسی درجہ میں پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس موضوع پر بہت سی معلومات چوں کہ بہت ہی کم دستیاب ہیں، اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس تالیف سے حضرت مولانا کے احوال و سوانح کی ضرورت پوری ہوگئی ہے اور یہ خدمت مکمل طور سے انجام پاگئی ہے، لیکن جہاں تک ناچیز مرتب کی دسترس میں تھا اس نے

(۱) پہلی قسط جس میں حضرت مولانا مملوک العلی کے مکتوبات اور مولانا کے احوال و تعارف درج ہے، سہ ماہی 'اردو کراچی کی جلد نمبر: ۶۰ کے چوتھے شمارہ (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۴ء) میں چھپی تھی، بعد میں چھ قسطیں اور شائع ہوئیں۔ وہ بھی میری نظر سے بھی گزری ہیں۔ تاہم ان کے بعد کی قسطیں راقم کو دستیاب نہیں ہوئیں۔

مطبوعہ وغیر مطبوعہ مآخذ سے استفادہ میں غفلت نہیں برتی اور اس مطالعہ سے حضرت مولانا کو جس طرح سمجھا ہے، اس کو اس طرح جوں کاتوں پیش کر دیا ہے، اس میں کسی طرح کی کمی زیادتی اور رنگ آمیزی نہیں کی، کیونکہ:

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جب میں نے اس کو پہلی مرتبہ لکھا تو یہ بیس بائیس صفحہ کا ایک مضمون تھا، جس کو بعد میں کچھ اور اضافوں کے ساتھ مختصر تہذکرہ کی صورت میں مرتب کر لیا تھا، جو صرف سو سو صفحات پر مشتمل تھا، اس کی اشاعت کا کوئی سر و سامان نہیں ہوا تھا کہ اسی دوران ایک قدر داں عالم کی توجہ فرمائی سے، ایک بڑے دینی ادارہ نے اس کی اشاعت کی پیش کش کی، جو ظاہر ہے کہ راقم کے لئے مسرت کی بات تھی، جب اس ادارہ سے اس مختصر تہذکرہ کی اشاعت منظور ہو گئی اور اس کا مسودہ طباعت کے لئے طلب کر لیا گیا، اس وقت خیال آیا کہ اس کو مزید بہتر اور جامع بنانے کی کوشش کرنی چاہئے، جس کو اس ادارہ کے ذمہ داران نے بخوشی منظور فرمایا۔ اس اجازت کے ساتھ ہی اس تالیف کے ابتدائی مسودہ کو کالعدم کر کے مکمل اس پر نظر ثانی، ابواب و عنوانات میں ترمیم و تغیر، اور وسیع و کثیر اضافوں کے ایک نئے سلسلہ کا آغاز ہوا، جس میں تقریباً ایک سال صرف ہوا، لیکن تماشہ یہ ہوا کہ جب یہ مجموعہ ہر طرح سے مکمل اور کمپوزنگ ہو کر اشاعت کے لئے حوالہ کیا گیا، تو بعض خاص کرم فرماؤں کے اشارے یا مشورہ پر، اس کو رائے دینے کے لئے ایک ایسے صاحب کے سپرد کیا گیا، جو نہ تو مولانا مملوکِ اعلیٰ سے واقف تھے، نہ ان کے مقام و مرتبہ سے آشنا تھے، نہ ہی تاریخ و تذکرہ پر کچھ نظر رکھتے تھے۔ انہوں نے جو رپورٹ لکھی وہ معلومات و بصیرت کے فقدان کا ایک نمونہ، علمی موضوعات تک نارسائی کا ایک مرثیہ تھی جی چاہتا کہ علم و فضیلت کی اس گر انما یہ یادگار کے چند اقتباس یہاں نقل کئے جائیں مگر یہ تذکرہ قارئین کو بے کیف کرے گا اس لئے نظر انداز کرتا ہوں۔

اگرچہ خود اسی ادارہ کی فرمائش پر، چند ممتاز اہل علم و نظر نے ان صاحب کی رائے سے صاف اختلاف کیا اور ان کی علمی بے بضاعتی سے بھی علمی تحریری طور پر آگاہ فرمایا مگر اس توثیق و تصدیق کے باوجود اس ادارہ نے اس کتاب کی اشاعت کی پیش کش واپس لے لی۔ کتاب واپس مل گئی تو ناچیز مرتب کو بہت خوشی ہوئی، اس نے حق تعالیٰ شانہ کا بے انتہاء شکر ادا کیا اور کر رہا ہے کہ یہ مفید کاوش نااہل اصحاب کے ہاتھوں ضائع ہونے اور: ”شعر مرا بدمرہ کے برد“ کا مصداق بننے سے محفوظ رہی۔ فلحمد لله وله الشکر دائماً

کتاب کیسی ہے، اس کے متعلق کچھ عرض کرنا موزوں نہ ہوگا دیدہ و رقارین کرام اس کا خود ہی اندازہ فرمائیں گے۔

اس وقت جب یہ کتاب چند ممتاز علماء کی عنایت سے طباعت کے لئے جا رہی ہے میرا دل اور پیشانی حق تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہے اور میری زبان اس کی حمد و ثنا سے معمور و مسرور ہے۔ یہ اس ذات عالی و برتر (جل جلالہ) کا محض فضل و کرم ہے کہ اس نے مجھ کو کم سواد کو اس کی توفیق عطا فرمائی اور میرے ناچیز اور بے حقیقت قلم سے یہ کتاب وجود میں آگئی: اللہم لک الحمد کله و لک الشکر کله و الیک ترجعہ الامور کله۔

برصغیر ہند کے نامور عالم و مصنف، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث و صدر المدرسین حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم اور اردو دنیا کے افاضل شہرہ آفاق ادیب، شاعر ناقد اور مصنف جناب شمس الرحمن فاروقی اور جلیل القدر مصنف، محقق اور مورخ جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب (کراچی) کا بھی نیز ڈاکٹر خلیق انجم صاحب اور ناچیز مؤلف ان تمام اساطین علم و ادب کا انتہائی ممنون ہے کہ انہوں نے اپنی بے پناہ، ہمہ وقت مصروفیات میں سے، اس کتاب کے مطالعہ کے لئے اپنا قیمتی وقت فارغ کیا اور اپنے گراں قدر تاثرات و تحریرات سے اور تعاون سے نواز کر اس تالیف کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا۔ بہت بہت شکریہ

مرحوم پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب اس پر دس بارہ صفحہ کا منسلق مقدمہ لکھنا چاہتے تھے مگر ان کی جانکاہ بیماری نے اس کا موقع نہیں دیا۔ فاروقی صاحب اپنی بیماری کے آخری دنوں تک اس کا ارادہ کرتے رہے کہ مجھے ذرا سا سکون ملے تو میں اس پر کچھ لکھوں، مگر:

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

امید ہے کہ قارئین کرام خصوصاً اہل علم و ذوق اصحاب اپنی رائے، فروگزاشتوں، مزید معلومات و اطلاعات کی نشاندہی سے ناچیز مؤلف کو بہرہ ور فرمائیں گے۔

نور الحسن راشد کاندھلوی

مولویان۔ کاندھلہ، ضلع مظفرنگر (یوپی)

انڈیا۔ پن: ۲۲۷۷۷۵

۲۷ شعبان ۱۴۲۹ھ ۳۰ اگست ۲۰۰۸ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مدرسہ وہابی (وہابی کالج) کے صدر مدرس،

سب سے بڑے معلم،

اور روح رواں

استاذ الکل

حضرت مولانا مملوک العلیٰ نانوتوی

احوال و خدمات، تصانیف و تراجم،

مکتوبات و آثار اور تلامذہ

اور خاندان وغیرہ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## باب (۱)

### نانوتہ کی مختصر تاریخ اور نانوتہ کے چند قدیم نامور مشائخ اور علماء

نانوتہ (NANAUTA) مغربی یوپی کے ضلع سہارنپور کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو اپنے محل وقوع، آبادی یا تاریخی عمارات و آثار کی وجہ سے چنداں جاذب توجہ اور لائق ذکر نہیں ہے، مگر نظام قدرت اپنی کار فرمائی اور انقلاب آفریں شخصیات کے وجود میں لانے، پیدا فرمانے اور ان سے کام لینے کیلئے کسی چھوٹی بڑی بستی، اسکے امتیاز و گمنامی، شادابی و ویرانی آبادی کی کمی زیادتی، جگمگ ماحول یا ناپرساں احوال ہونے کی ذرہ برابر بھی پابند اور محتاج نہیں ہے، اسکی توشان یہی ہے کہ: **یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی!** اسلئے ایک زمانہ تک نانوتہ کا شمار غیر متعارف بستیوں میں رہا، نہ اسکا اہل علم و کمال کی مجلسوں میں ذکر آتا تھا، نہ مورخین و بادیہ پیما اس کو قابل توجہ سمجھتے تھے، مگر رحمت الہی کا ایک ہی جھونکا اس کو شاداب و مرکز نگاہ بنا گیا۔ اسوقت سے اس بستی پر (بستی کے اہل کمال کے ذریعہ سے) ایسا رنگ، ایسا نکھار اور ایسی تازگی آئی ہے کہ جہاں بھی برصغیر کی گذشتہ دو سو سال کی علمی دینی تاریخ کا تذکرہ ہوگا نانوتہ کے کاروان علم و عمل کی یاد ضرور آئیگی۔

بلاشبہ متاخر عہد میں اس کارواں کے قافلہ سالار استاذ العلماء حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی تھے، لیکن حضرت مولانا سے پہلے بھی نانوتہ میں متعدد علماء، اصحاب درس و افادہ اور مشائخ پیدا ہوئے تھے اور اپنے اپنے دور میں انکی خدمات کے ذریعہ سے دین کا اجالا ہوا اور معرفت و سلوک کی دنیا میں نانوتہ کا نام بلند رہا مگر انکے دینی علمی آثار بہت کم محفوظ رہنے کی وجہ سے ان حضرات کا تذکرہ بھی باب کہیں نہیں آتا۔ اسلئے نانوتہ کے

آخری دور کے اکابر علماء خصوصاً استاذ العلماء مولانا مملوک العلی کے تذکرہ کے وقت یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نانوتہ کی ابتدائی آبادی، قدیم تاریخ اور پرانے دور کے نانوتہ کے علماء و صلحاء اور مشائخ کا کچھ تذکرہ کر دیا جائے، کیونکہ انہیں کے نقوش قدم تھے جنہوں نے بعد کے آئیوالوں کو منزل کار راستہ دکھایا، لہذا یہاں سب سے پہلے نانوتہ کی تاریخ کا اجمالی تذکرہ ہوگا اسکے بعد نانوتہ کے چند قدیم مشائخ کا ذکر کیا جائیگا، پھر حضرت مولانا مملوک العلی کے احوال درج ہونگے۔

نانوتہ کب آباد ہوا اسکی صحیح تاریخ نہیں ملتی۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً آٹھ نو سو سال پہلے نانوتہ نام کے کسی گوجر

### نانوتہ تاریخ کے آئینہ میں

یا جاٹ کے نام پر یہ بستی آباد ہوئی تھی (۱) اگر یہ روایت صحیح ہے تو یہ بستی دہلی میں مسلم حکمرانی کے ابتدائی دور (ایک یا الٹمش کے عہد) کی یادگار ہے، مگر اس وقت اسکی کیا حیثیت تھی، کس قدر آبادی تھی اور اسکی آبادی کی کیا وجہ تھی، کچھ معلوم نہیں۔ غالباً یہ کسی مقامی سردار یا رئیس (نانو) کی گڑھی تھی جس کی آبادی آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور جس نے ایک مشترک بستی یا قصبہ کی شکل اختیار کر لی۔ اور نویں صدی ہجری تک اس آبادی کی ایک قابل ذکر قصبہ کی حیثیت تھی اور مورخین کی نظر میں اپنی کتابوں میں اسکا تذکرہ ضروری معلوم ہوا۔

نانوتہ کے متعلق جو قدیم اور مختصر معلومات دریافت ہیں انکا خلاصہ یہ ہے کہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں تیمور نے اس علاقہ کا خونی سفر کیا اور قتل و غارتگری کرتا ہوا یہاں سے گذرا، ۸۱۷ھ (۱۴۱۴ء) میں سلطان خضر خان نے سہارنپور کا علاقہ سید سالم کے تصرف میں دیدیا

(۱) مولانا مناظر احسن گیلانی نے یہ روایت تاریخ سہارنپور لالہ نند کشور (مطبوعہ باندہ) کے حوالہ سے نقل کی ہے اور یہی جغرافیہ ضلع سہارنپور مرتبہ ذاکر بیگ نانوتوی ص ۲۲ (سہارنپور قبل از ۱۹۱۰ء) میں لکھا ہے مگر مولانا کو یہ وجہ تسمیہ پسند نہیں، فرماتے ہیں کہ: ”میرے نزدیک یہ وجہ تسمیہ انوہی روایات چنداں دلاویز نہیں معلوم ہوتی“ (سوانح قاسمی حاشیہ ص ۵۲ ج ۱) مگر مولانا کا یہ ارشاد بے محل ہے، کیوں کہ اس دور کی آبادیوں اور مقامات کے نام عموماً اسی طرح کے ہوتے تھے، اس میں دلاویزی اور پسندیدگی عوام کا خیال ہی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس طرح کی اکثر آبادیوں اور بستیوں کے نام باقاعدہ رکھے اور طے نہیں کئے گئے، بلکہ کسی جگہ چھوٹی موٹی آبادی ہوگئی اور عوام کی زبان پر اس کا ایک نام آ گیا، وہی چل گیا اسی کو عام شہرت اور مقبولیت ہوگئی۔



تھا، ان لوگوں نے حکومت اور عدالت کے بڑے عہدوں پر تیزی سے اپنا سوخ بڑھایا۔  
راقم سطور کی معلومات میں نانوتہ کا پہلا باقاعدہ ذکر ابوالفضل نے اپنی مشہور کتاب  
آئین اکبری میں کیا ہے۔

اکبر بادشاہ کے دور میں علاقہ کی معاشی اور انتظامی ترتیب و تقسیم میں، سرکار سہارنپور  
کے ماتحت ۳۶ پرگنوں میں سے ایک پرگنہ نانوتہ بھی تھا، ابوالفضل نے لکھا ہے:  
”سرکار سہارنپور، سی و شش محل، چہار دستور، دیوبند وغیرہ بست و شش پرگنہ، یک دستور“  
اس عنوان کے تحت دیوبند اور سہارنپور کے ساتھ نانوتہ کا بھی ذکر ہے۔ دوسری جگہ  
پر اس کی کچھ تفصیل بھی لکھی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

”اس پرگنہ کا آباد رقبہ جس میں کاشتکاری ہوتی تھی انتیس ہزار دوسو چوبیس (۲۹۲۲۲)  
ہیکٹے پر مشتمل تھا، اور سائرات وغیرہ کی زمین آباد رقبہ سے بہت زیادہ تھی، دستور کے مطابق اس  
پرگنہ میں بھی حکومت کی طرف سے چالیس سوار اور تین سو پیادے مقرر تھے، جو عموماً افغان تھے (۱)  
اس وقت سے اکبر بادشاہ کے دور حکومت تک اس علاقہ کا نظام رقبہ اور تقسیم و ترتیب  
اسی طرز پر رہی جو ۸۱ھ (۱۴۱۴ء) کے بعد قائم ہوئی تھی، اکبر کے زمانہ میں یہ علاقہ صوبہ  
دہلی کے ماتحت آیا، جسکے چھتیس پرگنے تھے، ان پرگنوں میں سے پندرہ پرگنے موجودہ ضلع  
منظر نگر کے تھے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ان پرگنوں کی تفصیل لکھی ہے، مغلوں  
کے دور شباب تک یہ نظام اسی طرح قائم رہا، اورنگ زیب عالمگیر کے بعد جب مغل  
اقتدار میں ابتری آئی اس وقت یہاں کے حالات بھی خراب ہو گئے تھے اور یہ علاقہ جس  
میں نانوتہ بھی شامل ہے کئی مرتبہ ظالم حملہ آوروں کے حملوں کی وجہ سے برباد و تاراج  
ہوا تھا، کبھی اسکو جاٹوں گوجروں نے لوٹا، کبھی سکھوں کے حملوں کی زد میں آیا، کبھی مرہٹوں  
کا نشانہ بنا، غرض اس کو پچاس سال کے قلیل وقفہ میں کئی مرتبہ بیرونی حملہ آوروں اور ظالم  
و بے حس طالع آزماؤں کے جبر و تشدد کی وجہ سے خاک و خون میں نہانا اور آتش زنی  
کا شکار ہونا پڑا۔

(۱) آئین اکبری، فارسی۔ ۲۹۰ دفتر اول: سرسید ایڈیشن مطبوعہ ۱۲۷۲ھ

نانوتہ چھوٹی سی بستی اور معمولی آبادی کا رقبہ تھا، یہاں کے رہنے والے بار بار آنے والی ان مصیبتوں اور تباہیوں کی تاب نہ لاسکے، جو لوگ باحیثیت تھے اور اسکی گنجائش رکھتے تھے کہ دوسری جگہ جا کر اپنی رہائش اور معاش کے وسائل کا انتظام کر سکیں وہ نانوتہ سے ترک وطن کر کے چلے گئے تھے، غریب و بے کس افراد میں سے بھی کچھ اپنے والیانِ نعمت کی خدمت کا سہارا لے کر انکے ساتھ ہو گئے اور جو افراد یہاں رہ گئے وہ کمزور و بے مایہ تھے، جسکی وجہ سے اس بستی کی رونق اور تازگی ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئی۔ اہل دولت و ثروت کے اچانک بستی سے چلے جانے کی وجہ سے انکی بڑی بڑی حویلیاں اور ڈیوڑھیاں ویران ہو گئیں، اچھے اچھے رئیس اپنے آباد گھر چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے۔ مکانات موجود تھے مگر سنسان، ہر وقت ایک سناٹا اور ویرانی سی رہتی تھی، جسکی وجہ سے اور تو اور خود اس قصبہ کے رہنے والے بھی اسکو پھوٹا شہر کہتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے بھی اپنے ایک خط میں اسکو اسی شہرت سے یاد کیا ہے:

اور جغرافیہ ضلع سہارنپور کے مؤلف ماسٹر ذاکر بیگ نانوتوی نے بھی یہی لکھا ہے،  
تحریر ہے:

”بہت سے کہنے مکان منہدمہ غیر آباد پڑے ہوئے ہیں، اس وجہ سے اسکو پھوٹا شہر کہتے ہیں“ (۱)  
انگریزوں کی عملداری کے بعد اگرچہ لوٹ مار کے یہ قصبے ختم ہو گئے تھے مگر نانوتہ کی پرانی بہار اور آبادی کی شادابی کبھی واپس نہیں آئی، جناب ظ انصاری نے جن کی تنہیال نانوتہ میں تھی اور ان کا بچپن بھی وہیں گزرا ہے، اپنے بچپن کے مشاہدات کا اور نانوتہ کے کھنڈرات اور ویرانی کا اس طرح ذکر کیا ہے:

”پھوپھی مجھے ماں سے زیادہ پیاری تھیں، سہارنپور کے اجڑے قصبے نانوتہ میں رہتی تھیں، رام پور، نانوتہ، تھانہ بھون، جلال آباد، کاندھلہ، کیرانہ، یہ مسلم زمینداروں کی گڑھیاں تھیں، جمنا کے کنارے کبھی انھوں نے سرحدی چھاؤنیوں کا کام کیا ہوگا، پنجاب کی سرکشی (سکھ خالصہ

(۱) جغرافیہ ضلع سہارنپور ص ۲۲ مؤلف ذاکر بیگ نانوتوی۔ ہیڈ مدرس اسکول سونہ۔ اتحاد پریس سہارنپور (غالباً ۱۹۰۰ء کے

قریب کا چھپا ہوا ہے۔)

تحریک) اور فوجی یلغار کا نشانہ بنتی رہیں۔ نانوتہ تو سرہند کی طرح اینٹ مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ خون اور خاندان کی حفاظت کرنیوالے چند سیدزادے اور پیرزادے اب تک وہیں پڑے تھے، ساہوکاروں کے مقروض، علم اور حوصلہ سے معذور، انہیں میں سے ایک معزز سید خاندان میں میری پھوپھی بیاہی گئیں۔ بیوگی کی پہاڑی زندگی انہوں نے کچھ بھائی کی مدد سے کچھ اپنے سنگھڑپن سے عزت آبرو کے ساتھ بسر کی اور پانچ بچے پال کر بڑے کر دیئے، مجھے اپنے ددھیال کا سیدھا سچا گنوار پن، کھر درالہجہ، بے تحاشا پیار، بھونڈے اطوار، ٹوٹے پھوٹے کھنڈر مکان، اپنی نہیال کے نستعلیق طور طریقوں سے، بریلی اور لکھنؤ کے شہری رکھ رکھاؤ سے، نمائشی سلیقے سے کہیں زیادہ پسند تھے“ (۱)

یہ پورا علاقہ ۱۸۰۳ء (۱۲۱۸ھ) دہلی پر (جنرل) قبضہ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام آ گیا تھا، اس وقت تک سہارنپور کو اس علاقہ کی انتظامی تقسیم میں بنیادی حیثیت حاصل تھی اور موجودہ ضلع میرٹھ و مظفرنگر کا خاص حصہ سہارنپور کا ماتحت تھا، مگر اس علاقہ اور کول (علی گڑھ) وغیرہ کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مقبوضات میں شامل ہونیکے بعد اس پورے خطہ کی ایک نئی تشکیل عمل میں آئی، اسکوئی حصوں یا اضلاع میں تقسیم کر کے ابتدائی طور پر اسکا انتظام ریزیڈنٹ (Resident) کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۲۲ء تک یہی نظام چلتا رہا، اس میں کوئی بڑی انتظامی تبدیلی نہیں ہوئی، جب ۱۸۲۳ء میں مظفرنگر کو مکمل ضلع کی حیثیت دی گئی، اس وقت سہارنپور کے نانوتہ پرگنہ کے بہت سے گاؤں ضلع مظفرنگر میں شامل کر دیئے تھے۔

۱۸۲۲ء میں اس تقسیم میں ایک تبدیلی اور ہوئی، پرگنہ نانوتہ کے متعدد دیہات گنگوہ اور رام پور میں شامل کئے گئے اور سو سے زائد دیہات مظفرنگر کو دے دیئے گئے، اس طرح نانوتہ کی پرگنہ کی حیثیت ختم ہو گئی۔

نانوتہ میں ۱۹۰۵ء (۱۳۲۲-۲۳ھ) میں میونسپل نظام قائم ہوا، ۱۹۱۱ء میں پولیس کا محکمہ قائم کیا گیا تھا، مگر بعد میں کچھ جگہوں کے پولیس تھانے ختم کر دیئے گئے، جن میں

(۱) آپ بیتی خودنوشت ظ (عل حسنین) انصاری (سہارنپوری)۔ آپ بیتی نمبر۔ ۳۹۱ فن اور شخصیت (بہمنی: ۱۹۸۰ء)

نانوتہ تھانہ بھی شامل تھا۔

نانوتہ میں پرانے زمانہ سے پنچایت کا نظام قائم تھا، جس کی ۱۸۱۶ء میں تجدید کی گئی تھی، ۱۸۶۰ء میں ضلع سہارنپور کے اٹھارہ مقامات پر ترقیاتی اسکیم جاری کی گئی اس کا صدر مقام نانوتہ تھا۔ ۱۹۱۴ء میں نانوتہ کو ٹاؤن ایریا (Tawn area) قرار دیا گیا۔ اور ۱۹۷۳ء میں نوٹیفائیڈ ایریا (Notified area) بنا دیا گیا۔ اس وقت نانوتہ کا رقبہ ۲ کلو میٹر مربع تھا۔ نانوتہ کی مردم شماری جو ۱۸۶۵ء میں چار ہزار آٹھ سو ستاسی (۴۸۸۷) تھی ۱۹۷۱ء میں سات ہزار نو سو پینسٹھ (۷۹۶۵) ہو گئی تھی۔ یعنی ایک سو پانچ سال کے طویل عرصہ میں صرف تین ہزار بیاسی (۳۰۸۲) نفوس کا اضافہ ہوا تھا (۱)

نانوتہ میں مسلمان کس دور میں آئے اور یہاں  
نانوتہ کے دو ممتاز خاندان

ہوا، اس کا ذکر نہیں ملتا، مگر قدیم زمانہ سے نانوتہ میں مقیم پرانے خاندانوں میں سے دو خانوادے بطور خاص معروف ہیں، ایک سادات کا، دوسرا صدیقی شیوخ کا۔ یہ دونوں خاندان کئی نسلوں بلکہ صدیوں تک معرفت و ارشاد میں ممتاز اور علم و تربیت میں نامور رہے، مغلوں کے ابتدائی عہد میں خاندان سادات کے اصحاب اوج کمال پر پہنچے اور مغلوں کے دورِ واپس میں صدیقی گھرانہ پر بہار آئی۔

نانوتہ کے چند قدیم نامور جلیل القدر مشائخ اور اہل کمال

سادات یہاں کب وارد ہوئے تھے اس کی تفصیل بھی راقم سطور کو نہیں ملی مگر اکبر کا دور حکومت اس خاندان کے عروج و شہرت کا دور تھا، جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ خاندان دسویں صدی ہجری سے پہلے اس بستی میں آباد تھا۔ اکبر کے دور حکومت میں نانوتہ کے ایک صاحب ارشاد و معرفت بزرگ سید احمد مدنی علم و عرفان کے حلقوں میں نامور اور مرجع خلائق تھے، سید احمد کے صاحبزادہ سید مصطفیٰ نانوتوی بھی روحانی معنوی کمالات کے جامع

(۱) بعض معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: Saharanpur Gusetier, Lucknow 1981

اور والد کی مسند ارشاد کے وارث تھے۔ اس خانوادہ سے وابستہ متاخر علماء اور اہل معرفت میں مولانا سید صابر علی، مولانا سید شاہ غلام محمد نانوتوی کے نام ملتے ہیں۔ گیارہویں صدی ہجری کی ایک باکمال شخصیت شیخ جیون نانوتوی بھی تھے، رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ان بزرگوں کے حالات اور ان کی دینی علمی خدمات کی تفصیل کیا ہے، مختلف تذکروں میں اجمالی ذکر ملتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کا اپنے عہد کی دینی تاریخ اور علمی و اصلاحی خدمات میں خاص حصہ رہا ہوگا، جو مختصر بلکہ مجمل معلومات دستیاب ہیں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا شیخ احمد مدنی یا سید احمد نانوتوی | دسویں صدی ہجری کے مشائخ کبار میں شیخ سید احمد نانوتوی کا بھی ذکر کیا

جاتا ہے، کلمات الصادقین کے مؤلف محمد صادق ہمدانی کشمیری دہلوی نے (جو حضرت خواجہ باقی باللہ وفات ۱۰۱۲ھ کے مرید اور فیض یافتہ ہیں) ان بزرگ کو سید احمد نانوتوی سے یاد کیا ہے اور ہمدانی کے ہم عہد ایک اور نامور تذکرہ نگار، محمد غوثی شطاری ماٹھوی نے گلزار ابرار (مؤلفہ ۱۰۱۳ھ) میں شیخ احمد مدنی نام لکھا ہے، دونوں ہی تذکرہ نگاروں نے شیخ احمد نانوتوی کا بہت محبت اور احترام کیا ہے، خصوصاً صادق ہمدانی کے الفاظ عقیدت و محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں، دونوں کی کتابوں سے سید احمد نانوتوی کے متعلق مفید اور علیحدہ علیحدہ اطلاعات ملتی ہیں، شیخ احمد نانوتوی، شیخ سلیمان بن عفان ماٹھوی دہلوی رحمہم اللہ (وفات ۹۳۳ھ ۱۵۳۷ء) کے خلیفہ اعظم تھے، غوثی شطاری ماٹھوی نے لکھا ہے کہ:

”ایک موضع نانوتہ ہے میان دو آبہ، وہاں گوشہ گزیں تھے شیخ سلیمان منڈوالہ کے خلیفہ خاص ہیں، آپ کو سلوک و جذب دونوں مرتبہ تھے، مشہور سلسلوں کے طریقوں پر قدم استحکام کے ساتھ جما ہوا تھا“ (۱)

اور صادق ہمدانی کشمیری کے پر از محبت الفاظ ملاحظہ ہوں:

”فرزندان معنوی حضرت شیخ ماٹھوی (سلیمان قدس سرہ) بسیار اندک سلسلہ ولایت

(۱) اذکار ابرار ترجمہ گلزار، تالیف محمد غوثی شطاری ماٹھوی۔ ترجمہ فضل احمد جیوری ص ۲۳۳ (لاہور: ۱۳۹۵ھ)

ایشان برابر پائے دارند، اکمل و افضل ایشاں حضرت سید احمد نانوتہ قدس سرہ بودہ اند کہ در جذب طالبان یگانہ روزگار و در کشف و کرامات نظیر نداشتند، و امروز آثار و برکات ایشاں از فرزندان و طالبان ایشاں ظاہر است۔ نشاط عشق و محبت سوز و گداز، ذوق و سماع در طینت ایں بزرگواراں فخر است، و مہربانی بر خلق اللہ خصوصاً بر فضلاء، و صلحاء از لازمہ فطرت ایں جماعت است۔ حق سبحانہ سالہا بسیار ایشاں را بر جاہ آباء کرام خود ثابت و مستقیم دارد“ (۱)

**ترجمہ:** اور حضرت شیخ (سلیمان مانڈوی) کے معنوی بیٹے بہت ہیں، جو انکے سلسلہ کو قائم رکھے ہوئے ہیں ان میں سب سے بہتر اور کامل حضرت احمد نانوتوی تھے، قدس سرہ، کہ جو طالبان معرفت کے رجوع (اور اصلاح و تربیت) میں نادر روزگار تھے اور کشف و کرامات میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس وقت (بھی) انکی قوت تاثیر اور برکات ان کے بیٹوں اور ان سے استفادہ کرنے والوں کے ذریعہ سے ظاہر ہیں۔

عشق و محبت کا سرمایہ سوز و گداز ذوق و سماع ان بزرگوں کی طبیعتوں میں گندھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق خصوصاً علماء اور نیک لوگوں پر عنایت و کرم اس جماعت کے اصحاب کی طبیعت کا خاص جوہر ہے۔ حق تعالیٰ (انکو) برسہا برس اور زمانہ دراز تک اپنے بڑوں کے طریقہ پر ثابت قدم اور جما ہوا رکھے۔ (۲)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صادق ہمدانی اور غوثی شطاری دونوں ہی سید احمد نانوتوی کے فرزندان اور تربیت یافتہ اصحاب کو دیکھنے جاننے والے ہیں، خصوصاً غوثی شطاری شیخ سلیمان کے پوتے شیخ کمال سے ذاتی طور سے واقف ہے، لکھا ہے:

”چند روز ہوئے کہ بنا چاری سپاہیانہ طریقہ اختیار کر لیا ہے“۔ (۳)

(۱) کلمات الصادقین۔ صادق ہمدانی۔ (نسخہ مخزنہ خدابخش لاہوری۔ پٹنہ) ص ۷۰ اس نسخہ کا مکمل نوٹوا سنیت رشید احمد صاحب حیدری، میرٹھ کے پاس موجود ہے۔

(۲) پروفیسر لطیف اللہ صاحب نے اس کا جو ترجمہ کیا ہے اس سے سید احمد نانوتوی کا شیخ سلیمان کے پوتے کا خلیفہ ہونا معلوم ہو رہا ہے، بظاہر ترجمہ میں کچھ فرو گذاشت ہوئی اسلئے یہ اطلاع صحیح معلوم نہیں ہوتی، دیکھئے ترجمہ کلمات الصادقین ص ۱۳۷ (کراچی: ۱۹۹۵ء) رالم سطور نے جو ترجمہ کیا ہے وہ نسخہ خدابخش لاہوری کے مطابق ہے۔ جس کی گلزار برابر سے بھی تصدیق ہو رہی ہے۔

(۳) ترجمہ اردو، گلزار برابر ص ۲۴۲

غوثی شطاری مانڈوکار نے والا ہے اور علماء و مشائخ سے عقیدت و محبت رکھنے والا اور انکا ہم نشین ہے، اسلئے اسکی یہ اطلاع درست ہوگی کہ سید احمد مدینہ منورہ کے رہنے والے (مدنی) اور شیخ سلیمان مانڈو کے خلیفہ تھے۔ ہمدانی کے اندراج سے غوثی شطاری کی اطلاع پر یہ اضافہ ہو رہا ہے کہ شیخ احمد مدنی نانوتوی مریدوں کو توجہ دینے میں یکتائے روزگار تھے۔ اور کشف و کرامات میں بے مثل تھے اور مذکورہ دونوں مصنفوں (شطاری و ہمدانی) کے عہد تک سید احمد نانوتوی کی روحانی تربیت و تاثیر کے اثرات انکے متوسلین اور اولاد میں موجود تھے۔

شیخ احمد مدنی نانوتوی شیخ سلیمان کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے نانوتہ رہتے تھے یا بعد میں تشریف لائے تھے، اس کا علم نہیں، مگر بعض قرائن سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس سلسلہ کے اصحاب کمال کی نظر میں اس خطہ (دوآبہ سہارنپور و مظفرنگر) کی کچھ خاص اہمیت تھی اور وہ تبلیغ و ارشاد نیز اصلاح و تربیت اور یکسوئی کیلئے اسکو پسند کرتے اور مفید سمجھتے تھے اور سلاسل کے چند اکابر و اصحاب ارشاد کے علاوہ شیخ عثمان مانڈوی سے وابستہ جو دوسرے بزرگ یہاں تشریف لائے وہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی (وفات ۹۸۲ھ) ہیں، شیخ عبدالقدوس شیخ سلیمان کی خدمت میں عرصہ تک حاضر رہے، استفادہ کیا اور شیخ سلیمان سے قرآن شریف اور تجوید پڑھی تھی (۱) اس لئے ممکن ہے کہ شیخ عبدالقدوس کی اس نواح میں تشریف آوری کا ایک سبب شیخ عبدالقدوس کے سید احمد نانوتوی سے مراسم اور روابط رہے ہوں۔ (۲)

سید احمد مدنی اور انکے صاحبزادے سید مصطفیٰ کے مزارات نانوتہ میں صدیوں تک معروف رہے، نانوتہ میں سید احمد مدنی کے مدفن کو داد امیر انجی کا مقبرہ کہا جاتا ہے۔ (۳)

**شیخ مصطفیٰ نانوتوی | سید احمد نانوتوی کے فرزند، تربیت یافتہ، جانشین اور اپنے**

(۱) شیخ عبدالحق نے لکھا ہے: "شیخ عبدالقدوس پیش او (شیخ سلیمان) تجوید کردہ" اخبار الاخبار ص ۲۵۵ (مطبع احمدی، دہلی: ۱۳۷۲ھ)  
 (۲) اس دور میں اس علاقہ کے مختلف قصبات بڈولی، جھنجھانہ، کیرانہ وغیرہ میں متعدد بڑے مشائخ اپنے اپنے وطن یا مشائخ کی خانقاہوں سے یہاں تشریف لائے اور تا عمر یہیں رہے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔  
 (۳) تمہید بیاض یعقوبی (مرتبہ حکیم امیر احمد شرعی نانوتوی) ص ۶ (دہلی: ۱۹۲۹ء)

والد کی مسند ارشاد کی رونق تھی۔ عہد جہانگیری کے معروف علماء اور مشائخ میں تھے، ذاکر بیگ نانوتوی نے لکھا ہے:

”اس کے بیٹے سید مصطفیٰ جہانگیر بادشاہ کے وقت میں معزز درویش تھے۔“ (۱)

سید مصطفیٰ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے اور ان کا ایک مجموعہ کلام بھی تھا مگر اب اس کا سراغ نہیں ملتا، سید مصطفیٰ نانوتوی کے متعلق اس کے علاوہ کوئی اور اطلاع راقم سطور کو نہیں ملی، تاہم ان کے اخلاف کا فردوسیہ چشتیہ کے مصنف نے ضمناً ذکر کیا ہے۔ (۲)

سید غلام محمد کا بھی غالباً اسی خانوادہ اور گھرانہ سے تعلق تھا، سید غلام محمد بھی اپنے اجداد کی طرح معرفت و سلوک اور ارشاد و تربیت میں مشہور و ممتاز تھے، سید غلام محمد کا شاہ کمال سنبھلی نے اپنی کتاب اسرار یہ (مؤلفہ ۱۰۶۹ھ) میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ سماع کا ذوق رکھتے تھے:

”صاحب ذوق و وجد بود، سماع و ذوق اود لکش بود“ (۳)

کمال سنبھلی نے ہندی کے وہ چند شعر اور دوہے بھی نقل کئے ہیں، جو شاہ کمال پڑھا اور سنا کرتے تھے۔ شیخ کمال سنبھلی کی سید غلام محمد نانوتوی سے راہ و رسم اور ملاقات تھی، وہ سید صاحب سے ملاقات کیلئے نانوتو بھی آتے تھے، سید غلام محمد کا درگاہ حضرت نظام الدین (دہلی) میں ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۰ء) میں انتقال ہوا، اس وقت شاہ کمال سنبھلی وہاں موجود تھے۔

مولانا صابر، شاہ غلام محمد کے بھائی تھے اور اپنے عہد کے ممتاز ترین علماء اور نامور اہل تقویٰ میں گنے جاتے تھے، شاہ صابر علی کے اپنے دور کے معاصر بڑے علماء اور مشائخ سے روابط تھے، اور شاہ محمد صادق گنگوہی (نبیرہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی وفات ۱۰۵۱ھ) سے بھی

(۱) جغرافیہ ضلع سہارنپور ص ۳۲

(۲) تذکرہ فردوسیہ چشتیہ، خانوادہ شیخ بدرالدین پرتاوی (برناوہ ضلع میرٹھ) خلیفہ اعظم شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی (وفات ۷۸۸ھ کے خلفاء اور اصحاب خاندان کے احوال پر مشتمل مفصل و معتبر تذکرہ ہے۔ راقم سطور کے سامنے اس نسخہ کا فوٹو اسٹیٹ

ہے جس کی غلام محمد نام کے ایک فاضل اور خوش قلم شخص نے ۱۳۱۸ھ میں مصنف کے نسخہ سے تصحیح اور مقابلہ کیا ہے ص ۶۶

(۳) اسرار یہ۔ (نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ: بلاسنہ) متعلقہ صفحات کا فوٹو اسٹیٹ راقم کے پاس ہے۔



ملاقات و مراسم تھے، شاہ صادق گنگوہی کے وقائع اور ملفوظات کے ایک مرتب نے (جس کا نام معلوم نہیں) سید صابر علی کا ”اعظم علمائے عصر اور اتقیائے دہر“ میں شمار کیا ہے۔

مولانا صابر علی صاحب شاہ محمد صادق گنگوہی کی وفات (محرم ۱۰۵۱ھ) کی تعزیت کے لئے گنگوہ گئے تھے اور شاہ صادق کے صاحبزادگان اور خلفاء کو وعظ و نصیحت فرمائی تھی، شاہ صادق کے ایک تذکرہ نگار نے وہ کلمات نقل کئے ہیں جو مولانا صابر علی نے اس موقع پر فرمائے تھے، شاہ صابر علی نے فرمایا:

”گفت کہ محبوب الہی شمارا جامہ خلافت دادہ، برائے آں دادہ کہ برمسند فیض گستری نشیند و خلق را بخدا خواہند و ہدایت دلالت راہ حق:..... شد آں بکنید، نہ برائے مجاورت قبر خود فرمودہ“ (۱)

ترجمہ: فرمایا کہ محبوب الہی (شاہ محمد صادق) نے تمہیں خلافت کی خلعت عطا فرمائی ہے یہ اس لئے دی ہے کہ فیض پہنچانے کی مسند پر بیٹھ جائیں اور مخلوق کو خدا تک پہنچائیں اور حق تعالیٰ کی جانب راستہ کی رہنمائی فرمائیں، یہ کام کیجئے! اپنی قبر کا مجاور بنانے کیلئے تمہیں اجازت و خلافت نہیں دی ہے۔

مذکورہ نصیحت و کلمات سے مولانا سید صابر علی کے مزاج و مذاق کا بھی خفیف سا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا شاہ صابر علی کا اس نواح کے علماء و مشائخ میں کس قدر اونچا مقام تھا، اور ان کا بڑے دینی عرفانی حلقوں میں بھی کس درجہ احترام کیا جاتا تھا۔ شیخ کمال سبھلی نے بھی مولانا سید صابر علی کی ذہانت و کمال کا ضمناً ذکر کرتے ہوئے، لکھا ہے کہ:

”سید صابر علی برادر وے (سید غلام نانوتوی) کہ از فضلائے و ظرفائے وقت خود بود“

لیکن یہ نامور خاندان جس میں صدیوں تک معرفت و ارشاد کا غلغلہ اور عالی مرتبہ

(۱) وقائع و ملفوظات شیخ محمد صادق گنگوہی۔ ص ۷۱۔ افسوس ہے کہ اس پر کتاب اور مؤلف دونوں کا نام درج نہیں، اور مؤلف نے ضمناً بھی اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ بظاہر اس کا مؤلف کیرانہ کار بنے والا تھا شاید اس وجہ سے اس کتاب میں اصحاب کیرانہ سے متعلق وقائع، کیرانہ آنے اور یہاں کے متعلقین کا کثرت سے ذکر ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک نسخہ جس کی مولانا نور الحسن کاندھلوی (وفات ۱۲۸۵ھ) نے شعبان ۱۲۶۶ھ (جون ۱۸۵۰ء) مصنف کے نسخہ سے تصحیح کی ہے، ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

افراد اور اہل کمال پیدا ہوتے رہے بعد میں اپنے بزرگوں کے راستہ سے دور ہوتا چلا گیا، اکابر و سلف کے محاسن و کمالات سے عاری، علم و معرفت سے بے خبر بلکہ انکے عقیدہ اور دینی راہ سے بھی منحرف ہو گیا تھا اور خدمت دین کے جذبہ سے محروم اور علم کی دولت کے فقدان کی وجہ سے بُری طرح زوال کا شکار ہوا، یہ لوگ دنیاوی فائدوں کے لالچ میں اپنے بزرگوں کے طریقہ سے دور ہوئے، پھر ان کا مذہب چھوڑ کر شیعہ ہو گئے تھے۔ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی کی اطلاع (ہے کہ تقریباً ۱۹۰۹ء میں)

”نانوتہ میں سید صاحبان کے گروہ ہیں (یا تھے؟) بخاری، ترمذی، سبزواری، بیشتر سب اہل تسنن تھے، زمانہ فرخ سیر سے شیعہ ہونا شروع ہوئے اس وقت جملہ صاحبان شیعہ ہیں“ (۱) ماسٹر ڈاکر بیگ نانوتوی نے بھی اس خاندان کے تغیر و زوال کا ذکر کیا ہے:

”ان (مشائخ نانوتہ) کی اولاد قصبہ میں اور ضلع مین پور (ی) میں بحالت خستہ موجود ہے۔“ (۲) اس خاندان کے مشائخ اور علماء کے علاوہ اس زمانہ میں نانوتہ میں انکے علاوہ اور بھی متعدد اصحاب کمال اشخاص موجود تھے مگر اس نواح کے قصبات اور بستیوں کے مشائخ و علماء اور اہل کمال کے تذکرے بہت کم مرتب ہوئے اسلئے بڑے بڑے حضرات جن کا ایک عالم میں چرچا تھا اور جو اپنے عہد اور خدمت میں مرجع و مسند سمجھے جاتے تھے گننام اور بے نشاں ہو گئے، ایسے ہی اصحاب میں شیخ جیون نانوتوی بھی تھے۔

شیخ جیون نانوتوی اہل دل اصحاب میں سے تھے، سید ظہ کتانوی (وفات ۱۰۸۲ھ) سے ارادت و بیعت کا تعلق رکھتے تھے (۳) بہت سادگی سے معمولی حال میں رہتے تھے،

(۱) تمہید مکتوبات یعقوبی۔ مرتبہ امیر احمد عشرتی (مطبع احمدی علی گڑھ)

(۲) جغرافیہ ضلع سہارنپور ص ۲۳ (سہارنپور: تقریباً ۱۹۱۰ء)

(۳) حضرت سید ظہ خلف سید محمود شہیدان کا سلسلہ نسب سات واسطوں سے مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے سلسلہ نسب سے مل جاتا ہے، اس خاندان کی ایک شاخ کتانہ (بردوت ضلع میرٹھ، یوپی) آتی تھی، سید ظہ کی رسمی تعلیم معمولی تھی مگر سینہ علم لدنی سے مالا مال تھا۔ سید ظہ کا وسیع حلقہ ارادت تھا۔ تفسیر سورہ منزل اور مجموعہ کلام تحریری یادگار ہیں۔ تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۰۸۲ھ میں وفات ہوئی۔ مفصل معلومات اور تعارف کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون، سہ ماہی احوال و آثار

کاندھلہ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۸ء

سید طاقتانوی کے سلسلہ کے ایک عالم (اور تذکرہ نگار) شیخ عبدالرشید قادری کیرانوی کا مشاہدہ اور اطلاع ہے کہ:

”شیخ جیون متوطن نانوتہ از مریدان خاص بندگی حضرت سید العاشقین سید طاقت قطب الدین گزراں ایساں مانند گزراں اصحاب صفہ بود“ (۱)

**ترجمہ:** شیخ جیون نانوتہ کے رہنے والے تھے (جو) عاشقوں کے سردار، حضرت سید طاقت قطب الدین (کتانوی) کے خاص مریدوں میں سے تھے، ان کی بسراوقات حضرات اصحاب صفہ کے اوقات و گزراں کی طرح تھی۔

مذکورہ بالا اصحاب اور دوسرے اہل علم و کمال کے علاوہ نانوتہ میں ایک بڑا علمی خاندان اور مقیم تھا، یہ صدیقی خاندان تھا جس میں خاص طور سے آخری دور میں ایک کے بعد ایک متعدد بڑے ممتاز علماء اور صاحب کمال دینی علمی شخصیتیں پیدا ہوئیں، اسی خانوادہ کے گل سرسبد اور گویا آخری عہد کے سب سے بڑے اور مشہور علمی رہنما حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی تھے۔

(۱) تذکرۃ الصالحین تالیف: شیخ عبدالرشید قادری، کیرانوی (مؤلفہ ۱۱۶۳ھ) ص: نقل شدہ از نسخہ مؤلف (فوٹو اسٹیٹ مملوکہ راقم - طور)

## باب (۲)

### صدیقی خاندان کی نانوتہ میں آمد اور قیام

اس خاندان کے چند ابتدائی بزرگ اور

مولانا مملوک العلی (وغیرہ) کے اجدادِ کرام

نانوتہ کا صدیقی خاندان جیسا کہ اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے ہندوستان آنے کے وقت بلکہ غالباً اس سے بھی پہلے سے علم و عمل کی دنیا میں اپنی علمی و دینی شخصیتوں کی وجہ سے محترم رہا ہے۔ اس خاندان کی قدیم تفصیلات میری دسترس میں نہیں، مگر اہل نانوتہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے پہلے بزرگ جو ہندوستان تشریف لائے شیخ مظہر الدین تھے، بعد کی اطلاعات میں کچھ اختلاف اور الجھاؤ سا ہے، راقم سطور جو کچھ سمجھ سکا وہ یہ ہے۔

شیخ مظہر الدین کی نویں صدی ہجری کے آغاز پر، ۸۰۵ھ (۱۴۰۲-۳ء) میں ولادت ہوئی، تعلیم اور اساتذہ کا تذکرہ دریافت نہیں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے علم و کمال میں بڑا مرتبہ پایا تھا اور وہ اپنے وطن کے علماء میں خاص امتیاز اور احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، یہاں تک کہ قاضی صاحب کے کمالات علمی اور بلند مقام (اور غالباً دینی رسوخ) کی شہرت ہندوستان پہنچی، اس وقت یہاں بہلول لودھی تخت نشین تھا اور اس کا بیٹا سکندر لودھی شہزادگی کے زمانہ سے علماء اور اہل کمال کی رفاقت و صحبت کا خوگر تھا اور چاہتا تھا کہ ایسے منتخب علماء ہندوستان تشریف لائیں اور وہ ان کی صحبت و مجلس میں وقت گزارے۔ سکندر لودھی کے دینی مزاج اور علماء کی عزت افزائی کی وجہ سے بہت سے اہل کمال خود ہندوستان آئے تھے، اور بہت سے سکندر لودھی کی دعوت

و درخواست پر یہاں پہنچے، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے تحریر فرمایا ہے:

”وزمانہ دولت سکندر زمان صلاح و تقویٰ دیانت و امانت و حلم و وقار بود اور ابا علماء و صلحاء و اکابر و اشرف میلے عظیم شد، لہذا از اکناف عالم از عرب و عجم بعضے بسابقہ استدعا و طلب، و بعضے بے آں در عہد دولت او تشریف آورده و توطن ایں اختیار کردند، چنانچہ اکثر بزرگان کہ دریں طبقہ مذکور می شونند از اں قلیل اند۔ (۱)

ترجمہ: سکندر لودھی کا عہد نیکی، تقویٰ، دیانت و امانت اور حلم و برداشت کا زمانہ تھا، اس (سکندر) کو علماء صلحاء اور بڑے اور شریف لوگوں سے خاص لگاؤ اور مناسبت تھی اسی وجہ سے دنیا کے مختلف خطوں سے، عرب سے عجم سے بعض حضرات ان کی درخواست اور بلاوے پر اور بعض اس کے بغیر ان کے زمانہ میں ہندوستان تشریف لائے اور یہاں قیام اختیار کیا، بہت سے وہ حضرات جو اس طبقہ میں ذکر کئے جاتے ہیں اس جماعت کا معمولی سا حصہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سکندر لودھی نے جب شیخ مظہر الدین کے علم و کمالات کی شہرت سنی تو انکو ہندوستان آنے کی دعوت دی، شیخ مظہر الدین تقریباً تہتر سال کی عمر میں ۸۷۸ھ (۷۳-۱۲۷۳ء) میں ہندوستان آئے، سکندر لودھی نے قاضی صاحب کی پذیرائی کی اور انکو جہاں آباد کا قاضی مقرر کر دیا، قاضی مظہر کی جہاں آباد میں وفات ہوئی، وہیں دفن ہوئے (۲) اس خاندان کے اجداد میں سب سے پہلے قاضی مظہر الدین ہندوستان آئے تھے، اس اطلاع پر تو حکیم امیر احمد عشرتی (تمہید بیاض یعقوبی) اور مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی متفق ہیں، مگر بعد کی اطلاعات میں اختلاف اور خاصاً الجھا و پایا جاتا ہے۔

حکیم امیر احمد نے قاضی مظہر کے ہندوستان آنے کا سنہ ۸۷۱ھ لکھا ہے۔ مفتی محمود احمد نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، حکیم امیر احمد، قاضی صاحب کے جہاں آباد میں تقرر اور مدفن کا ذکر کرتے ہیں مگر مفتی محمود قاضی مظہر کا سنہ وفات ۸۷۸ھ اور مدفن دہلی لکھتے ہیں۔ ایک اور بڑا اختلاف یہ ہے کہ حکیم صاحب کی اطلاع کے مطابق سکندر لودھی نے قاضی

(۱) اخبار الاخبار ص ۲۶۱ (مطبع احمدی دہلی ۱۲۷۲ھ) ترجمہ راقم سطور نور الحسن راشد۔ نیز ملاحظہ ہو: سلاطین دہلی کے

مذہبی رجحانات از ڈاکٹر خلیق احمد نظامی ص ۳۳۷ تا ۳۷۰ (دہلی: ۱۹۸۱ء)

(۲) نسب نامہ صدیقیان نانوتہ مفتی محمود احمد نانوتوی، ص: ۲

مظہر کو طلب کیا تھا، مفتی محمود احمد نے لکھا ہے کہ بہلول لودھی نے انکے صاحبزادے میراں بڑے کو مدعو کیا تھا، مفتی محمود نے قاضی میراں بڑے کے جو حالات لکھے ہیں اس کے بعض اور پہلو بھی مشتبہ ہیں، مگر راقم سطور کے خیال میں حکیم امیر احمد عشرتی کی اطلاعات زیادہ صحیح ہوں گی، کیوں کہ وہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور انکے معاصر علمائے نانوتہ کے دیکھنے والے اور انکی صحبتوں سے مستفید تھے اور جب حکیم امیر احمد صاحب نے (۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں) یہ تحریر لکھی تھی اس وقت قدیم معلومات، مستند ذرائع معلومات اور پرانے دستاویزات و تحریرات کا بھی خاصا ذخیرہ موجود تھا، مفتی محمود نے اسکے پچاس سال بعد شجرہ مرتب کیا، اس وقت پرانے سب بزرگ اور ۱۹۴۷ء کے حوادث کی وجہ سے اکثر تحریرات و دستاویزات منتشر اور ضائع ہو چکی تھیں، لہذا حکیم امیر احمد عشرتی کی اطلاعات درست ہونی چاہئیں۔ (۱)

اس دور میں نانوتہ اور اسکے اطراف  
اس خاندان کی نانوتہ میں آمد اور قیام | میں جو برادریاں یا قبیلے آباد تھے وہ

نہایت سرکش اور حکومت وقت کے باغی تھے، بار بار حکومت کے خلاف سراٹھاتے رہتے تھے، ایسے قبیلوں کی قوت توڑنے اور انکی سرکشی ختم کرنے کیلئے بادشاہ وقت نے قاضی مظہر الدین کے صاحبزادہ، قاضی میراں عرف قاضی بڑے کو نانوتہ کا علاقہ سپرد کیا تھا، قاضی میراں بڑے نے یہاں پہنچ کر علاقہ کا انتظام درست کیا اور سرکشوں کا مقابلہ کر کے ان کو بے حیثیت اور کمزور بنایا اور سرکار کا قبضہ اور اقتدار بحال کر دیا۔

قاضی میراں بڑے کی ۱۴ رجب ۹۰۲ھ (مارچ ۱۴۹۷ء) کو نانوتہ میں وفات ہوئی، نانوتہ کے قبرستان شیخ زادگان میں (جو بھکا والا کے نام سے مشہور ہے) قاضی صاحب کی قبر ہے۔

(۱) یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بیاض یعقوبی (جو اشرف الطالع تھانہ بھون سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۹ء میں چھپی تھی) پر جو تمہید درج ہے وہ مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے اس نسخہ کیلئے لکھی گئی تھی جو مطبع احمدی علی گڑھ سے ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں چھپا تھا وہی اشاعت راقم کے سامنے ہے۔

قاضی میراں بڑے کے پانچ بیٹے تھے۔ نظام الدین عرف عباد اللہ اور عبدالغنی، یہ دونوں تعلیم حاصل کرنے کیلئے پورب (مشرقی یوپی) گئے تھے اور تعلیم کے بعد وہیں رہ گئے تھے اور مفتی محمود احمد نانوتوی کی اطلاع کے مطابق ”(ان کا) بکثرت سلسلہ نسب کڑہ مانک پور، قصارہ، غازی پور وغیرہ میں موجود ہے۔“ (۱)

قاضی میراں بڑے کے سب سے چھوٹے بیٹے کمال الدین تھے، جو لکھنوتی (بنگال) چلے گئے تھے۔ انکے حالات بھی معلوم نہیں۔ دو بیٹے قاضی حبیب اللہ اور جمال الدین نانوتہ میں رہے اور ان کی اولاد بھی یہیں آباد ہے۔

چوں کہ یہ خاندان لودھی حکومت کا ہم نوا تھا، اس لئے لودھی خاندان کی حکومت ختم ہونے کے بعد قاضی میراں بڑے کی اولاد کو سخت مصیبتوں کا سامنا ہوا، مخالفین نے جن کی قوت و سرکشی کو قاضی میراں بڑے نے ختم کر دیا تھا، لودھیوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد قاضی میراں بڑے کی اولاد سے سخت بدلہ لیا اور اس خاندان کے چھوٹے بچوں تک کو قتل کر دیا، جس کی وجہ سے اس خاندان کی حیثیت خاصی کمزور ہو گئی تھی، جو کئی سو برس گزرنے کے بعد اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں (رمضان ۱۰۶۸ھ کے بعد) بحال ہوئی (۲) اس زوال و اقتدار کا حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

”بعد زوال حکومت لودھیان قاضی میراں بڑے کی اولاد پر مصائب جانکاہ پیش آئے لیکن انہوں نے اپنی علو ہمتی اور اپنی قدیمی دلیری و جوانمردی کے باعث نہایت صبر و استقلال کے ساتھ ان تمام مصائب کو برداشت کیا۔ منجملہ انکے ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ انھیں اقوام ہنود کاٹھانے جو بوجہ قدیمی تعصب مذہبی کے مسلمانوں سے عموماً اور متوسلان حکومت لودھیان سے خصوصاً خصومت شدید رکھتے تھے، اولاد قاضی میراں بڑے کے استیصال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ رکھ چھوڑا۔ یہاں تک کہ صغیر سن بچوں تک کو قتل کر دیا، اپنے نزدیک انہوں نے ایسا نہیں چھوڑا کہ کوئی تنفس بھی کسی وقت میں مد مقابل ہو سکے۔ لیکن قدرت خداوندی اس امر کی مقتضی تھی کہ

(۱) نسب نامہ صدیقیان نانوتہ مرتبہ مفتی محمود احمد نانوتوی، ص ۲

(۲) ملاحظہ ہو، تمہید بیاض یعقوبی مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی، اور نسب نامہ (صدیقیان نانوتہ) مرتبہ مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی، ص ۲-۳ (طبع اول دہلی، بلاسنہ: غالباً ۱۳۷۹ھ)

اولاد قاضی میراں بڑے کا سلسلہ مٹنے نہ پائے، کیوں کہ اس کو ان سے مولانا محمد یعقوب مرحوم وغیرہم جیسی صورتیں جلوہ ظہور میں لانی مقصود تھیں۔ (۱)

حکیم امیر احمد نے اسی سلسلہ تحریر میں لکھا ہے کہ:

پس ایک عرصہ دراز بعد انقلابِ زمانہ نے دوسرا دور پلٹا، یعنی شدہ شدہ دور حکومت شاہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہِ خلد آشیاں کا آپہنچا، اس وقت میں ایک صاحب نے اولاد قاضی میراں بڑے سے جو نہایت زبردست خوش الحان حافظ قرآن تھے فریادی بن کر لشکر عالمگیر میں پہنچے اور ایک سردار لشکر کے یہاں رہ کر متلاشی وقت رہے اور کسی فرد بشر پر انکشاف نہ فرمایا کہ میں کون ہوں اور کس واسطے آیا ہوں، حتیٰ کہ ۱۰۶۸ھ کا مہینہ رجب ختم ہو کر شعبان شروع ہو گیا، اس وقت بادشاہ نے سردارانِ لشکر کو جمع فرما کر ارشاد فرمایا، چونکہ ماہ رمضان المبارک قریب ہے اور صعوبت سفر شبانہ روز بدستور قائم ہے، آئندہ سامان قیام بظاہر معلوم نہیں ہوتا، ہم کو نماز تراویح میں کلام مجید کا سننا ضروری امر ہے، اس لئے مناسب ہے کہ بہت جلد ایسا حافظ تلاش کیا جائے جو مابدولت کو صرف ایک شب میں کلام مجید کامل سنا دیوے، چنانچہ بفور استماع ارشاد شاہی تلاش شروع ہو گئی۔

باوجودیکہ اس وقت ہزار ہا حافظ قرآن مجید موجود تھے لیکن کسی کو ہمت و جرأت نہ ہوئی کہ شاہ عالمگیر کا پیش امام ہو کر ایک شب میں پورا قرآن شریف سنا دیوے۔ یہاں تک کہ شعبان قریب ختم و رمضان شروع ہونے پر ہوا، اس وقت دوبارہ تاکید شاہی شدید ہوئی جس سے لشکر میں سخت اضطراب و بے چینی پیدا ہوئی، ہر شخص خائف تھا کہ بوجہ نہ ملنے ایسے حافظ کے دیکھئے کیا عتاب شاہی نازل ہوتا ہے۔ اس حالت سرا سیمگی میں جبکہ تاریخ ۲۸ شعبان ۱۰۶۸ھ کو نواح گوالیار چنبل کے کنارے لشکر عالمگیر پڑا ہوا تھا تو ان حافظ صاحب نے اپنے سردار سے عرض کی کہ آپ اس قدر کیوں پریشان ہیں، میں ایک شب کی تراویح میں بادشاہ کو کلام مجید سنا دوں گا، آپ اطلاع کر دیجئے کہ حافظ آ گیا ہے۔ چنانچہ یکم تاریخ کو اپنے نہایت خوش الحانی کے ساتھ پورا کلام مجید بلا عاید ہونے متشابہ کے بادشاہ کو سنا دیا، بادشاہ نہایت خوش ہوئے، اب وہ موقع

(۱) ملاحظہ ہو، تمہید بیاض یعقوبی مرتبہ حکیم امیر احمد عسرتی نانوتوی، اور نسب نامہ (صدیقیان نانوتہ) مرتبہ مولانا مفتی

محمود احمد نانوتوی۔ ص ۲-۳ (طبع اول دہلی، بلاسنہ: غالباً ۱۳۷۹ھ)



جس کی حافظ صاحب کو دشمنوں سے انتقام لینے کیلئے تلاش تھی ہاتھ آیا۔ شاہ عالمگیر سے گذشتہ واقعات راجپوتانہ و گوجران کاٹھا کے ظلم و ستم کا بیان کر کے دادخواہ ہوئے، چنانچہ فی الفور بحکم شاہی ایک دستہ فوج ہمراہ حافظ صاحب آیا اور ان سب کا قلع قمع کیا۔ (۱)

اس واقعہ کے بعد میراں بڑے کی اولاد کو اطمینان و سر بلندی ملی اور وہ عزت و آبرو کے ساتھ نانوتہ میں مقیم ہو گئی۔ قاضی میراں بڑے کے فرزند قاضی جمال الدین صاحب تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا

قاضی میراں بڑے کی اولاد  
کی ترتیب مولوی ہاشم تک

ہے، انکے بیٹے قاضی امان اللہ، انکے مفتی مبارک، انکے قاضی طہ، انکے شاہ محمد اور انکے مولوی محمد ہاشم۔ مولوی ہاشم صاحب علم و کمال شخص تھے، نانوتہ کے آخری دور کے اکثر مشہور اور بڑے علماء ان ہی کی اولاد میں تھے۔

شیخ مولوی محمد ہاشم کی اولاد کی متاخر شاخوں کو اللہ تعالیٰ نے خوب نوازا، شیخ ہاشم کے فرزند عبدالمسیح تھے، ان کے بیٹے شیخ محمد مفتی، ان کے شیخ ابوالفتح، آخر الذکر کے تین صاحبزادے ہوئے: حکیم عبداللہ، شیخ محمد عاقل اور شیخ علاؤ الدین، تینوں سے نسل چلی اور تینوں شاخوں میں جید علماء، خادمانِ دین و شریعت، اہل فضل و کمال اور فاضل طبیب پیدا ہوئے جیسا کہ نسب نامہ میں درج فقروں اور کلمات سے اندازہ ہوتا ہے۔

اس خاندان اور شیخ میراں بڑے کی اولاد میں نانوتہ اور نواح کی قضاات وغیرہ رہی مگر مغلوں کے عہد زوال میں جب شیعیت کا فروغ ہوا تو قضاات پر تقرر کے لئے شیعہ ہونے پر اصرار کیا گیا، اس لئے خاندان کی وہ شاخ جس میں عہدہ قضاات رہتا تھا اس نے شیعہ ہونے سے انکار کر دیا اور عہدہ قضاات سے سبکدوش ہو کر اس منصب سے علیحدہ ہو گئے۔

مگر افسوس اور بے شمار ممتاز علمی گھرانوں کی طرح اس خاندان کے حالات جمع اور مرتب کرنے پر بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی، یہی وجہ ہے کہ اس خاندان کی قدیم تاریخ، مستند حالات اور اسکے اکابر و علماء کے تذکرے تقریباً مفقود ہیں، یہاں تک کہ مولانا مملوک العلی

(۱) تمہید مکتوبات یعقوبی، مرتبہ حکیم امیر احمد عسرتی (مطبع احمدی علی گڑھ) نیز مشمولہ بیاض یعقوبی (تھانہ بھون۔ بلاسنہ)

اور ان کے زمانہ کے علماء کے حالات بھی قلم بند نہیں کئے گئے مگر اس خاندان کے بڑوں کے مفصل حالات کا نہ ملنا اس کی علامت و شہادت نہیں کہ نانوتہ کے صدیقی خانوادہ میں:

”علم پدر کی طرف زیادہ دنوں تک توجہ باقی نہیں رہی تھی“ (۱)

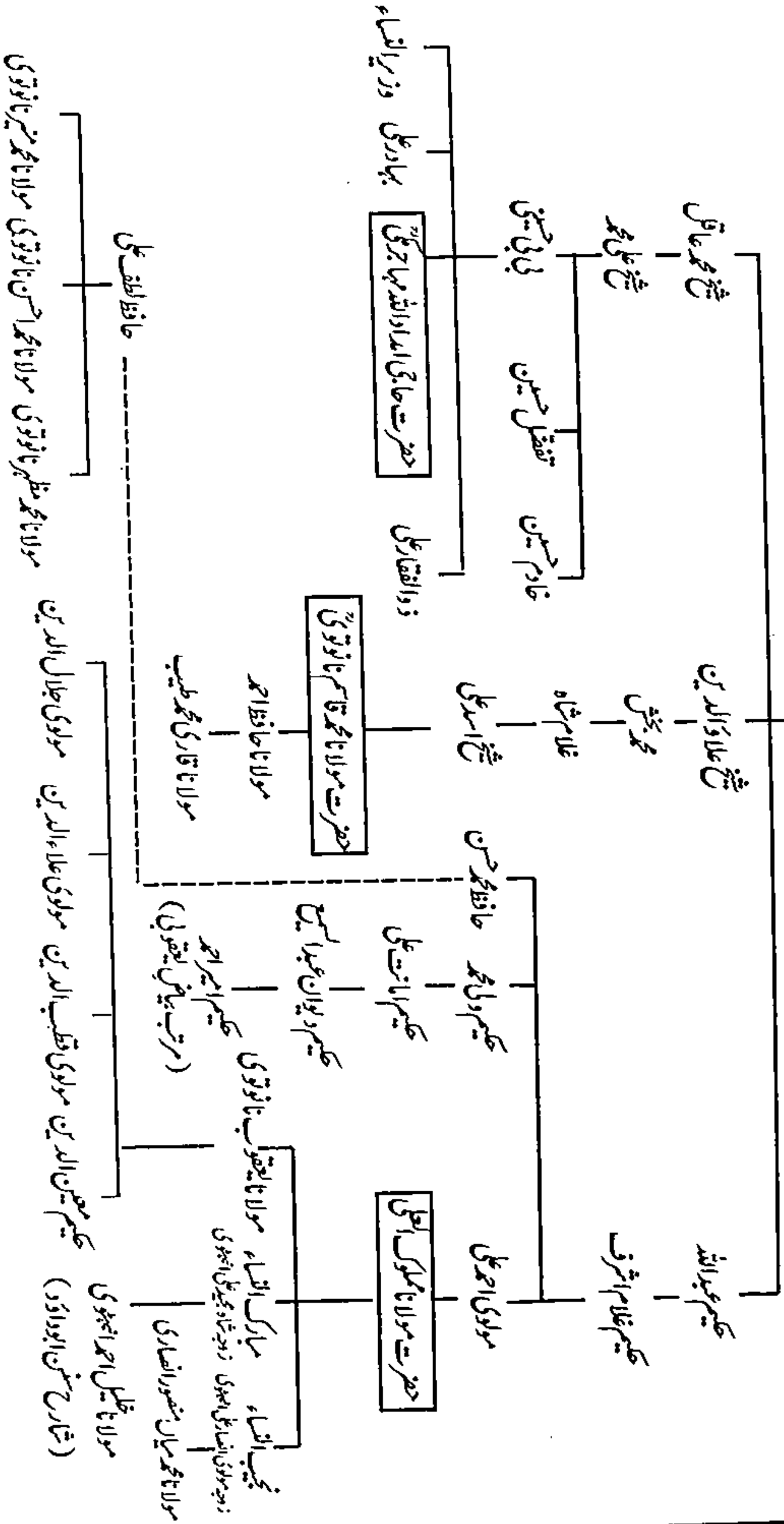
جو مختصر معلومات موجود ہیں وہ اشارہ کر رہی ہیں کہ اس خاندان کی پرانی شاخوں میں علم کی روایت موجود تھی، جس کو مولانا مملوک العلی کے عہد میں حق تعالیٰ نے خاص فضل و کرم سے نوازا، اور اس کو ایسی وسعت اور پذیرائی عطا فرمائی کہ اس کے اثرات و فوائد کل ہند بلکہ عالم گیر ہو گئے۔

خانوادہ صدیقیان نانوتہ کے مختصر تعارف کے بعد اس خانوادہ کے مختصر شجرہ کا اندراج مناسب ہوگا جس سے نانوتہ کے متاخر دور کے مشہور علماء کے آباء و اجداد کے نام اور انکے آپس میں رشتوں کی تفصیل بیک نظر سامنے آجائے گی۔

[نوٹ: یہ شجرہ مقدسہ بیاض یعقوبی، مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی (جو مولانا مملوک العلی کے بھتیجے اور مولانا محمد یعقوب کے چچا زاد بھائی تھے ص: ۳) طبع دوم تھانہ بھون: بلاسنہ) اور تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی مرتبہ محمد ایوب قادری صاحب ص: ۱۸ (کراچی: ۱۹۱۶ء) نیز شجرہ فاروقیان تھانہ بھون، مرتبہ مولانا ناظر حسن صاحب تھانوی (نسخہ مولف) سے لیا گیا ہے۔ اگرچہ نسب نامہ (صدیقیان نانوتہ) مرتبہ مفتی محمود احمد نانوتوی (دہلی: ۱۳۷۹ھ) میں بھی اس کا کچھ تذکرہ ہے مگر اس کی اطلاعات میں فروگذشتیں ہیں اور بعض شاخوں، رشتوں کا ذکر ہی نہیں، اس لئے اس سے استفادہ تو کیا گیا ہے اس کو جوں کا توں نقل نہیں کیا گیا۔]

(۱) یہ فقرہ مولانا گیلانی کی طویل عبارت کا حصہ ہے، مفصل عبارت کے لئے دیکھئے سوانح قاسمی مؤلفہ مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۱۷۱ ج ۱۔ (دیوبند: ۱۳۷۳)

شیخ ابو الفتح بن شیخ محمد مفتی بن شیخ عبدالسمیع بن مولوی محمد ہاشم



## مولانا مملوک العلی اور صدیقیاں نانوتہ کا مکمل نسب نامہ

### حضرت صدیق اکبر تک

مولانا محمد یعقوب اور مفتی محمود نانوتوی صاحبان نے اپنی اپنی تحریرات و مولفات میں اگرچہ خاندان کے پس منظر اور اجداد کا خاصا ذکر کیا ہے، جس کا خلاصہ گذر گیا ہے، مگر دونوں صاحبان نے قاضی مظہر یا قاضی میراں کے اوپر سے اصحاب کا تعارف نہیں کرایا بلکہ تفصیلی نسب نامہ بھی نہیں لکھا، لیکن مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک موقع پر شیخ محمد ہاشم کے اوپر کی تمام کڑیوں کا (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ایک تحریر کے حوالہ سے) ذکر کیا ہے، جس کے ذریعہ شجرہ کی روداد مکمل ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں سے مولانا مملوک العلی سے مولوی محمد ہاشم تک کے واسطے اوپر گزر چکے ہیں مولانا محمد ہاشم سے حضرت صدیق اکبر تک شجرہ اس طرح ہے:

”محمد ہاشم، بن شیخ شاہ محمد، بن قاضی طہ، بن شیخ مفتی مبارک، بن امان اللہ، بن جمال الدین، بن قاضی شیخ میراں بڑے، بن قاضی مظہر الدین، بن نجم الدین، بن نور الدین بن حسام الدین، بن ضیاء الدین، بن نور الدین، بن رکن الدین، بن رفیع الدین، بن ضیاء الدین، بن شہاب الدین بن خواجہ یوسف، بن شیخ جلیل، بن صدر الدین، بن شیخ رکن الدین سمرقندی، بن صدر الدین حاجی، بن اسماعیل شہید، بن نور الدین قتال، بن شیخ محمود، بن شیخ بہاء الدین، بن عبد اللہ، بن زکریا، بن شیخ نور، بن سراج الدین، ابن شیخ سادھن صدیقی ابن حبیب الدین، ابن مسعود، بن عبدالرزاق، بن قاسم، بن محمد ابی بکر بن ابی قافہ“۔ (۱)

حکیم عبداللہ کے صاحبزادے حکیم غلام شرف تھے، ان کے فرزند مولوی احمد علی اور ان کے صاحبزادہ والا مرتبت حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی تھے۔

(۱) حاشیہ سوانح قاسمی صفحہ ۱۲۷ جلد اول (طبع اول دیوبند ۱۳۷۳ھ)

## باب (۳)

### مولانا مملوک العلی

ولادت، علاقہ اور وطن کا تعلیمی پس منظر  
مولانا کے اساتذہ اور تعلیم کی تکمیل کے لئے دہلی کا سفر

صحیح نام | مولانا مملوک العلی کا نام عام طور سے مملوک علی لکھا جاتا ہے لیکن صحیح نام مملوک العلی (الف لام کے ساتھ) ہے۔ مولانا زمانہ طالب علمی میں اپنا نام مملوک علی بھی لکھا کرتے تھے۔ اگر ابتداء میں یہی نام تھا تو اسکی وجہ شیعیت کے بڑھتے ہوئے وہ اثرات تھے جس سے مولانا مملوک العلی کا وطن نانوتہ اور خاندان بھی خاصا متاثر ہوا تھا۔ ذکر آچکا ہے کہ نانوتہ کے متعدد سنی شیعہ ہو گئے تھے اور یہ وہی دور ہے جب مولانا مملوک العلی تولد ہوئے تھے، اسلئے ممکن ہے کہ مولانا کا نام مملوک علی رکھا گیا ہو مگر بعد میں جب مولانا اور ان کے اہل خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے اور تحریک سید احمد شہید کا غلغلہ بلند ہوا تو اس غلطی کا احساس ہوا اسوقت اس غلطی کی اصلاح کر لی گئی تھی، آخر میں مولانا اپنا نام صرف مملوک العلی ہی لکھتے تھے۔ مولانا کے جو چند دستخط اور تحریریں ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں ان میں سے اکثر میں مولانا نے اپنے دستخط مملوک العلی ہی کئے ہیں۔ اور یہ نسبت (جیسا کہ بعض اصحاب کو غلط فہمی ہوئی) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نہیں، بلکہ حضرت حق جل مجدہ سے ہے: **وہو العلی الکبیر!**

مولانا کے سنہ ولادت کے متعلق مولوی کریم الدین پانی پتی کی ایک روایت مولانا کی تاریخ اور سنہ پیدائش کی صراحت کسی معاصر تحریر و تذکرہ یا مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی بیاض میں نہیں ہے، دریافت مآخذ میں مولانا کی عمر کے حوالہ سے سب سے پہلی اطلاع کریم الدین پانی پتی کی ہے (جو مولانا کاشاگرد اور دہلی کالج کا طالب علم تھا) پانی پتی نے طبقات شعرائے ہند (مؤلفہ ۱۸۴۷ء) میں لکھا ہے کہ:

”عمر ان کی (۱۸۴۷ء میں) قریب ساٹھ سال کی ہوگی“ (۱)

مولانا کے سنہ ولادت کے حوالہ سے فرحت اللہ بیگ کی ایک اطلاع اگرچہ کریم الدین پانی پتی نے ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں مولانا مملوک العلی کی عمر تقریباً ساٹھ سال لکھی ہے اور مرزا فرحت اللہ بیگ نے دہلی کے ایک یادگار مشاعرہ کے انعقاد کے وقت بھی جو طبقات شعرائے ہند کی تالیف سے دو سال پہلے (۱۸۴۵ء-۱۲۶۱ھ میں) منعقد ہوا تھا، مولانا مملوک العلی کی عمر کا یہی اندازہ ساٹھ برس کا کیا ہے۔ (۲)

مگر فرحت اللہ بیگ کی یہ اطلاع ان کا مشاہدہ یا تحقیق نہیں، بلکہ سبھی جانتے ہیں کہ فرحت اللہ بیگ کی تالیف ”دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ“ صرف ایک تمثیل اور ادبی شاہکار ہے تحقیق یا سوانح نہیں، فرحت اللہ بیگ نے کریم الدین پانی پتی اور محمد حسین آزاد کی آب حیات کی عبارتوں اور مندرجات کو اپنی اس تالیف کی بنیاد بنایا ہے، مرزا فرحت اللہ بیگ نے دونوں کی کتابوں سے شعراء کے خاکے لئے، دہلی کا ۱۲۶۱ھ کا مشاعرہ دیکھنے والوں سے کچھ قصے سنے اور ان تمام معلومات کو ایک یادگار پیکر میں ڈھال دیا، جس کا فرحت اللہ بیگ نے ان الفاظ میں اعتراف بھی کیا ہے:

(۱) طبقات شعرائے ہند ص ۴۶۴ (لکھنؤ: ۱۹۸۳ء) کریم الدین کا یہ تذکرہ ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں مرتب ہوا اور ۱۸۴۸ء میں مدرسہ دہلی (دہلی کالج) سے چھپا، راقم سطور کو اس کی پہلی طباعت سے بھی استفادہ کا موقع ملا ہے۔

(۲) کریم الدین نے فرائد الدھر (تذکرہ شعرائے عرب، مؤلفہ ۱۸۴۷ء) میں بھی مولانا مملوک العلی کا ذکر کیا ہے، مگر اس میں مولانا کی عمر کے متعلق کچھ نہیں لکھا، ص ۴۰۲ تا ص ۴۰۶ (طبع اول: مطبع العلوم، دہلی: ۱۸۴۷ء)۔ اس نہایت کمیاب تذکرہ کا ایک عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرہ کتب میں موجود ہے۔

”لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال نے دل میں مشاعرے کا خیال ڈالا، ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات شعرائے ہند کے طبقہ چہارم نے رجب ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرے کا پتہ دیا، اب کیا تھا دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی اس کی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں، البتہ اچھے برے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ (۱)

واقعہ یہ ہے کہ فرحت اللہ بیگ کی پیکر تراشی غضب کی ہے مگر اسکو تاریخی استناد اور حوالہ کی حیثیت حاصل نہیں، فرحت اللہ بیگ کا ۱۲۶۱ھ کے مشاعرے کے وقت مولانا مملوک العلی کی عمر ساٹھ سال لکھنا، کریم الدین کی روایت کی جوں کی توں نقل ہے، فرحت اللہ بیگ کی تحقیق یا مشاہدہ نہیں ہے اسلئے فرحت اللہ بیگ کی یہ اطلاع لائق استدلال نہیں۔

### مولانا کا سنہ ولادت ۱۲۰۴ھ اہل خاندان کی ایک روایت

مولانا مملوک العلی کے سنہ ولادت کے متعلق ایک اور روایت مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی کی ہے، مولانا انوار الحسن شیرکوٹی نے لکھا ہے:

”مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی ابن مولانا محمد اسماعیل صاحب نانوتوی (رفیق خاص مولانا محمد قاسم صاحب) نے میرے لئے (انوار قاسمی جلد اول کی تالیف کے وقت بوساطت مولانا قاری محمد طیب صاحب) ایک تحریر لکھ کر بھیجی تھی، اس میں مفتی صاحب لکھتے ہیں، مولانا مملوک العلی صاحب سنہ ۱۲۰۴ھ ۱۷۸۹ء میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ (۲)

مگر مفتی محمود نے اپنی اس اطلاع کا ماخذ نہیں لکھا، اور کریم الدین پانی پتی نے ۱۲۶۳ھ میں مولانا کی عمر کا اندازہ جو ساٹھ برس کا کیا ہے، وہ بھی اس کے قریب ہی کا ہے، کریم الدین نے مولانا کو دیکھ کر عمر کا اندازہ کر لیا ہے اور لکھ دیا ہے، مولانا یا ان کے گھرانے کے کسی شخص سے دریافت نہیں کیا، اور ایسے اندازہ میں کسی قدر غلطی کا ہمیشہ امکان رہتا ہے، مگر اس صورت میں بھی کریم الدین کی یہ اطلاع مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی کی روایت کی

(۱) دہلی کی آخری شمع ص ۱۲-۲۹

(۲) انوار قاسمی از مولانا انوار الحسن شیرکوٹی ص ۸۴ (لاہور: ۱۳۸۹ھ) نیز، سیرت یعقوب و مملوک از مولانا انوار الحسن

شیرکوٹی ص ۲۶ (کراچی: ۱۳۹۳ھ)

گویا تائید کر رہی ہے، اس لئے مولانا مملوک العلی کا سنہ ولادت ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء تقریباً متعین سمجھنا چاہئے۔

**تعلیم** | مولانا کی ابتدائی تعلیم کے متعلق معلومات مفقود ہیں، چونکہ مولانا کے والد مولوی احمد علی (جیسا کہ) نام کے ساتھ مولوی کے لاحقہ سے معلوم ہو رہا ہے (۱) عالم تھے، نیز اس خاندان اور گھرانہ میں اور بھی متعدد اصحاب طب وغیرہ کے فاضل تھے اور یقیناً ایسے اہل علم بھی موجود ہوں گے کہ جن کا اس وقت دستیاب نا تمام تحریری سرمایہ میں ذکر نہیں ہے، اسلئے قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر خاندان کے بزرگوں اور اہل علم سے حاصل کی ہوگی۔

تعب ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں اس علاقہ میں علم کے ذوق اور چرچوں کو حضرت سید احمد شہید

اس علاقہ کا دینی تعلیمی ماحول اور اس علاقہ میں علمی چرچوں کے حقیقی محرکات

کے دورے کا اثر اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے وابستگی کا ثمرہ بتایا ہے (۲) حالانکہ مولانا گیلانی اس علاقہ کی تاریخ اور علماء سے واقف تھے۔ بیاض مولانا یعقوب نانوتوی اور اس علاقہ کے علماء پر متعدد تالیفات (جو سوانح قاسمی کی تالیف سے برسوں پہلے چھپ گئی تھیں) مولانا کی نظر سے گذری ہونگی، مگر مولانا نے پھر بھی اس بعید خیال کو قابل بحث و گفتگو سمجھا اور اس خانوادہ اور علاقہ میں علم و عمل کا جو ذوق تھا، اس کا اصل منبع اور سرچشمہ کہاں تھا، اس پر مطلق توجہ نہیں فرمائی۔

(۱) مقدمہ مکتوبات یعقوبی از امیر احمد عشرتی نانوتوی ص ۳ (طبع اول علی گڑھ: ۱۳۲۷ھ)

(۲) سوانح قاسمی (سوانح مولانا محمد قاسم نانوتوی) ص ۸۱-۹۱ (طبع اول دیوبند: ۱۳۷۳ھ طبع دوم دیوبند: ۱۳۹۵ھ)

مولانا کی اس بے بنیاد قیاس آرائی کی ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۱۷۰ (کراچی: ۱۹۶۶ء)

میں، مولانا محمد انوار احسن شیرکوٹی فاضل دیوبند نے انوار قاسمی ص ۶۲ ج ۱ (لاہور: ۱۳۸۹ھ) میں اور محمد اکرام چغتائی

صاحب نے ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۲۹ (سہ ماہی اردو، کراچی۔ مارچ ۱۹۸۵ء) میں بجا طور پر تردید کی ہے۔



نانوتہ اور اس علاقہ میں علم کی پرانی روایت | واقعہ یہ ہے کہ اس پورے علاقہ (دوآبہ گنگا و جمننا) میں علم کی

روایت قدیم تھی اور یہاں کئی سو سال سے تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری تھا، بڑھانہ، تھانہ بھون، جھنجنھانہ، دیوبند، گنگوہ، کاندھلہ، کیرانہ، وغیرہ میں سے کون سی جگہ ایسی تھی جہاں ۱۲۰۰ھ سے پہلے علم کے چشمے جاری اور تدریس و تعلیم کا ذوق زندہ نہیں تھا۔ نانوتہ کے شیوخ اور سادات میں بھی علم و مشیخت کا سلسلہ پرانا تھا اور وہ خانوادہ بھی جس سے حضرت مولانا مملوک العلی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی (رحمہم اللہ تعالیٰ) وغیرہ وابستہ ہیں قدیم علمی روایات رکھتا تھا، اس میں متعدد علماء اور تعلیم یافتہ اصحاب گزرے تھے اور آخر تک ان کے اثرات محفوظ تھے، مولانا مملوک العلی کے والد ماجد مولوی احمد علی بھی عالم تھے، اور حضرت مولانا محمد قاسم کے والد بزرگوار شیخ اسد علی بھی دہلی کے تعلیم یافتہ اور فارسی کے فاضل تھے، اس کے علاوہ اطراف و نواح کے قصبات میں بڑے بڑے علماء کی موجودگی اور علمی چہل پہل سے بھی اس خانوادہ کے سعید افراد کے ذوق علم کو ہمیزگی ہوگی اور اس کے اثر سے بزرگوں کے علم اور خدمت دین کی روایت انکی اولاد اور خاندان میں دوبارہ زندہ اور تازہ ہوئی اور بعد کے لوگوں کیلئے بھی علمی منزلوں کی پہچان آسان ہوگئی۔

اس خطہ میں علم کی آبیاری میں | خاندان کے ماحول اور قدیم روایات کے علاوہ اس کارواں کے آگے بڑھنے کیلئے دو طاقتور محرکات اور بھی تھے، یہ محرکات حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کا فیضان اور حضرت مفتی

الہی بخش کاندھلوی کے حلقہ تعلیم و تربیت اور شاگردوں کا اثر تھا۔

اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ کے دور میں اور اس سے پہلے بھی یہاں علمی روایات جاری اور تعلیم و تعلم کے قافلے آمادہ سفر رہتے تھے، مگر حضرت شاہ صاحب کی ذات گرامی سے جو اک بے پناہ آبشار پھوٹا اور اس سے علم و عمل کے جو دریا جاری ہوئے، شریعت و سنت کی

کار فرمائی اور طریقہ نبوت کو چراغِ راہ بنانے کی جو قدیم روایت شدت و قوت سے تازہ ہوئی، اسکی قریب کے دور میں کوئی مثال نہیں تھی۔ پھر یہ علاقہ حضرت شاہ صاحب کی خدمات اور انکے شاگردوں کی علمی تگ و تاز کا خاص مرکز تھا، یہاں کے متعدد قصبات اور بستیوں میں حضرت شاہ ولی اللہ سے براہِ راست مستفید قابل قدر شاگرد (۱) مسند علم بچھائے علم و ہدایت کے جام لٹا رہے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد انکے فرزند جلیل، حضرت شاہ عبدالعزیز کی ذات گرامی سے جو بحر بیکراں جاری ہوا، اس کی وسعت و ثروت کا اندازہ بھی آسان نہیں۔ اس علاقہ کی کون سی بستی اور آبادی ایسی تھی، جہاں اسکا براہِ راست اثر نہیں پہنچا اور اس سے بے شمار اصحابِ علم و صلاحیت سیراب نہیں ہوئے۔

اس علاقہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے (حضرت شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے بعد) سب سے بڑے اور ممتاز ترین شاگرد حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی (ولادت ۱۱۲۰ھ۔ وفات ۱۲۴۵ھ) قیام فرماتے تھے اور ان کے علم کا وسیع فیضان جاری تھا۔

مفتی صاحب کے شاہ عبدالعزیز کے ممتاز ترین شاگرد ہونے کا شاہ صاحب کی حیات سے چرچا تھا، متعدد علماء اور تذکرہ نگاروں نے اس کی صراحت کی ہے۔ سب سے بڑھ کر خود حضرت شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں اس کا ذکر اور اعتراف ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

”از شاگردان من دو کس خوب بودند، چنانچہ مولوی رفیع الدین و مولوی الہی بخش زندہ، و مراد علی در کلکتہ، لیکن شغل این گذاشتہ در تجارت مشغول است باقی مردند“ (۲)

(۱) پھلت، بڈھانہ نیز تھانہ بھون میں حضرت شاہ ولی اللہ کے براہِ راست شاگرد موجود تھے، جو درس و افادہ اور تصنیف و تالیف میں مشغول تھے، منگلوں کے بعض اصحاب کی بھی شاہ ولی اللہ سے نسبت ذکر کی جاتی ہے، اور بھی چند علماء تھے جن کے متعلق خیال ہے کہ وہ حضرت شاہ صاحب سے مستفید تھے۔ تفصیلات مفصل مضمون کی طالب ہیں۔

(۲) ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز۔ فارسی طبع اول، بھبھائی، میرٹھ: ۱۳۱۳ھ

اس مجموعہ ملفوظات کا اکثر حصہ شاہ رفیع الدین کی زندگی میں مرتب ہوا، اس کی ترتیب کے دوران شاہ رفیع الدین کی (۶/شوال ۱۲۳۳ھ۔ ۱۹/اگست ۱۸۱۸ء) کو وفات ہوئی تھی..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

ترجمہ: میرے شاگردوں میں دو شخص خوب ہوئے ہیں، مولوی (شاہ) رفیع الدین اور مولوی الہی بخش، یہ زندہ موجود ہیں اور مراد علی کلکتہ میں، مگر انہوں نے علمی مشغلہ چھوڑ دیا تجارت میں مشغول ہیں، اور اچھے شاگرد انتقال کر گئے۔

جن کی علمی اصلاحی، تربیتی خدمات کا دائرہ اور اثر اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ اس علاقہ کے قصبات اور شہروں سے گزر کر اطراف لکھنؤ، راجستھان، بھوپال وغیرہ تک براہ راست پہنچا ہوا تھا۔

سہارنپور نانوتہ اور اس سے ملحق قصبات اور اس علاقہ میں بھی مفتی الہی بخش کے علمی دینی اثرات دور تک پھیلے ہوئے تھے، حضرت موصوف کے فیوض و کمالات کا خاص چرچا تھا، مفتی صاحب سے تلمذ و انتساب کی بہت وقعت و اہمیت تھی اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس خطہ میں اس وقت جن علماء کے اثرات سب سے وسیع اور ان کا حلقہ درس بے پناہ تھا ان میں حضرت مفتی الہی بخش کا نام نامی سب سے نمایاں اور مرجع کل کی حیثیت رکھتا تھا۔ مفتی صاحب کے حلقہ درس میں شرکت کیلئے دور دور سے آئے ہوئے طلباء کا ہجوم رہتا تھا نواح کے جو علماء اس وقت درس و تعلم کیلئے معروف اور نمایاں تھے (یا مولانا مملوک العلی کے عہد میں ممتاز ہوئے) وہ بھی زیادہ تر مفتی صاحب کے شاگرد تھے، مثلاً سہارنپور میں (حضرت مولانا احمد علی محدث کے استاد) مولانا وجیہ الدین (۱) اور حکیم مغیث الدین

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... آخری تقریباً ایک تہائی ملفوظات (ص ۸۴ تا ص ) شاہ رفیع الدین کی وفات کے بعد ارشاد فرمائے اور قلم بند کئے گئے۔ مگر اس مجموعہ کے مرتب کا نام معلوم نہیں اس مجموعہ ملفوظات کے بعض مندرجات اور دوسرے قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ اس کا مرتب میرٹھ کارہنے والا تھا۔

(۱) مولانا وجیہ الدین سہارنپوری صدیقی محسنی خاندان کے فرد اور قضات سہارنپور سے تعلق رکھتے تھے، حزب ولی اللہی کے بڑے ممتاز عالم، نامور فقیہ، بلند پایہ مصلح اور محدث تھے۔ حضرت مفتی الہی بخش کے شاگرد تھے بخاری شریف کا سلسلہ اجازت و سند مولانا عبدالحی بڈھانوی سے ہے، مولانا احمد علی نے بخاری شریف مولانا وجیہ الدین سے پڑھی، مولانا احمد علی نے مقدمہ صحیح بخاری میں مولانا وجیہ الدین کے حوالہ سے یہ سند تحریر فرمائی ہے۔

”قرأت اکثر هذا الجامع الصحيح للبخاری رحمہ اللہ تعالیٰ، علی الفاضل الفقیہ الالمعی، الشیخ وجیہ الدین المحسنی الصدیقی السہارنپوری فی البلدة السہارنپور، صانہا اللہ عن الآفات. وحصل له الاجازة والقراءة عن الشیخ العالم الربانی..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر“

سہارنپوری (۱) نانوتہ میں مولانا عبدالرحیم (۲) (استاذ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... مولانا عبدالحی عن الشیخ الماہرفی علم الباطن والظاهر مولانا عبدالقادر،

عن اخیه الشیخ عبدالعزیز، عن ابیہ الشیخ ولی اللہ الدہلوی“

**ترجمہ:** میں نے اس کتاب، امام بخاری کی جامع صحیح کا اکثر حصہ محقق، فقیہ، ماہر شیخ وجیہ الدین محسن صدیقی سہارنپوری سے شہر سہارنپور میں (اللہ تعالیٰ اس کو آفات سے بچائے رکھے) پڑھا، ان کو بخاری شریف کی اجازت اور پڑھنے کی سعادت عالم ربانی مولانا عبدالحی سے ہوئی، انھوں نے علم ظاہر و باطن کے ماہر مولانا عبدالقادر سے پڑھی، اور انھوں نے اپنے بھائی شیخ عبدالعزیز سے، انھوں نے اپنے والد شاہ ولی اللہ سے پڑھی۔

مولانا وجیہ الدین کے مفتی صاحب سے تلمذ کے گواہ مولانا وجیہ الدین کے وہ افادات، حاشیے یا تحریریں ہیں جو مفتی الہی بخش کی بیاضوں اور بعض تصانیف اور مملوکہ کتابوں پر درج ہیں۔ مفتی صاحب مولانا کو میاں وجیہ الدین لکھتے ہیں مثلاً تحریر ہے، ”مرقوم میاں وجیہ الدین“

مولانا وجیہ الدین اپنے عہد کے ممتاز اہل فتویٰ میں تھے، حضرت شاہ محمد اسحاق مولانا وجیہ الدین کے فتوؤں کو اپنے فتاویٰ سے زیادہ لائق اعتماد فرماتے تھے، مولانا کے متعدد فتوے اور مختلف افادات اور تحریریں (بفضلہ تعالیٰ ہمارے ذخیرہ میں) موجود ہیں۔ مولانا وجیہ الدین سید احمد شہید سے بیعت ہوئے اور سید صاحب کے قافلہ کے ساتھ ۱۲۳۷ھ میں حج کی سعادت حاصل کی۔ ربیع الاول ۱۲۶۰ھ (اپریل ۱۸۴۲ء) سے پہلے کسی وقت وفات پائی۔ صحیح تاریخ اور سنہ وفات معلوم نہیں۔

(۱) مولانا حکیم مغیث الدین: بن محمد بخش بن غلام شرف سہارنپور کا صدیقی، محسن، قاضی خاندان سے تعلق تھا۔ مفتی الہی بخش کاندھلوی سے تعلیم حاصل کی۔ حکیم صاحب بڑے عالم، نہایت متقی، عابد و زاہد، حدود شریعت کا نہایت خیال رکھنے والے اور لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی کا معاملہ کرنے والے تھے۔ حضرت سید احمد شہید سے بیعت ہوئے اور اپنے علاقے کے نمایاں اصحاب میں شامل تھے۔ سید صاحب سے بیعت کے بعد سید صاحب کی خدمت میں حاضر رہے۔ ۱۲۳۷ھ (نومبر ۱۸۲۱ء) میں حضرت شاہ محمد اسماعیل وغیرہ کے ساتھ سفر حج کے لئے نکلے، شاہ محمد اسماعیل نے گڑھ ملکپور سے روانگی کے وقت حضرت سید صاحب کو جو خط لکھا تھا اس میں اپنے ممتاز رفقاء میں حکیم مغیث الدین اور مولانا وجیہ الدین کے نام بھی لکھے ہیں۔ حکیم مغیث الدین کو حضرت سید احمد شہید اور شاہ عبدالرحیم ولایتی سے (جو حضرت میاں جی نور محمد کے بھی پیر و مرشد تھے) اجازت بیعت حاصل تھی۔ حج سے واپسی کے بعد سید صاحب کے ہمرکاب اور سفر جہاد میں شریک رہے، سہارنپور میں جنگ بالاکوٹ (۱۲۳۶ھ، ۱۸۳۰ء) کے بعد وطن واپس آ گئے تھے، سہارنپور میں ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں وفات ہوئی۔ مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہو: نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحی محسن ص ۵۰۰ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۳۹۹ھ) سیرت سید احمد شہید، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (لکھنؤ: ۱۳۹۷ھ) اور جسر انساب صدیقیان سہارنپور (فوٹو اسٹیٹ نزد راقم سطور)۔

(۲) مولانا عبدالرحیم نانوتوی: افسوس ہے کہ ان کے والد کا نام، خاندان اور احوال دریافت نہیں۔ مولانا عبدالرحیم

حضرت مفتی الہی بخش کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ کے استاد تھے۔ باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

مہاجر کی) رام پور منہیاران (نزد نانوتہ) میں مولانا محمد حسن رامپوری (۱) جلال آباد میں استاذ العلماء مولانا سید محمد قلندر (۲) اور مولانا عبدالرحمن خان (۳) تھانہ بھون میں مولانا

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... حاجی امداد اللہ نے فقہ اکبر، حصن حصین مولانا عبدالرحیم سے پڑھی تھیں، حاجی صاحب فرماتے تھے: ”حصن حصین و فقہ اکبر امام الائمہ سراج الائمہ امام اعظم ابی حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ قراءۃ حضرت مولانا عبدالرحیم مرحوم نانوتوی سے اخذ کیا اور یہ ہردو بزرگوار ارشد تلامذہ، عارف مستغرق حضرت مولانا مفتی الہی بخش کاندھلوی کے تھے۔ (شائم امدادیہ ص ۱۱ مرتبہ حاجی مرتضیٰ خاں قنوجی (لکھنؤ: ۱۳۱۴ھ)

(۱) مولانا محمد حسن: بن غلام مصطفیٰ انصاری رام پوری (رام پور منہیاران نزد نانوتہ) ضلع سہارنپور کے باشندے تھے حکیم مغیث الدین سہارنپوری اور حضرت مفتی الہی بخش سے تعلیم حاصل کی۔ بڑے عالم اور اپنے عہد کے ممتاز فاضل تھے، درس واقادہ میں مشہور تھے، سید احمد شہید سے بیعت اور مجاز طریقت ہوئے، سید صاحب کے ساتھ جہاد میں گئے، سید صاحب کے قافلہ میں مولانا عبدالحی اور شاہ محمد اسماعیل کے بعد مولانا محمد حسن علم و صلاحیت اور حسن انتظام وغیرہ میں سب سے اول اور نمایاں تھے۔ منظورۃ السعداء میں کئی جگہ مولانا محمد حسن کا تذکرہ ہے، ایک جگہ لکھا ہے: ”مولوی محمد حسن رام پوری کہ در خاکساری و عجز و علم و قابلیت بعد مولانا محمد اسماعیل نظیر خود نداشتند“ (ص ۷۰-۷۱۔ نسخہ قلمی مخزونہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ) ایک اور موقع پر تحریر ہے: ”مولانا محمد اسماعیل و مولوی محمد حسن رام پوری بجائے وزیر آجیناب بودند“ (ص ۷۵۰)۔

مولانا محمد حسن، سید صاحب کے اہم مشوروں میں بطور خاص شریک کئے جاتے تھے، چند موقعوں پر سید صاحب کے نمائندے اور سفیر بھی رہے، پھولڑہ کی جنگ میں شہید ہوئے۔ مولانا محمد حسن کو شاہ احسان علی پٹنی اور مفتی الہی بخش سے بھی اجازت بیعت حاصل تھی۔ مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: سیرت سید احمد شہید مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (لکھنؤ: ۱۹۷۷ء) کاروان ایمان و عزیمت: مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۱۱۹ (لاہور: ۱۹۹۰ء) جماعت مجاہدین ص ۲۷۲۔ مولانا غلام رسول مہر (لاہور: ۱۹۵۵ء) بیاض دلکشا: مولانا نصر اللہ خویشگی ص ۱۲۷ (فتح الاخبار: کول)

(۲) مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی: بہت بڑے عالم، عارف، محدث، تبحر سنت اور غیر معمولی کمالات کے بزرگ تھے کسی قدر تعارف عنقریب آ رہا ہے۔

(۳) مولانا عبدالرحمن خاں جلال آبادی: حضرت مفتی الہی بخش کے شاگرد اور بلند پایہ عالم تھے، حضرت حاجی امداد اللہ نے ان کے فضل و کمال کا ذکر فرمایا ہے اور مولانا نصر اللہ خویشگی نے مولانا عبدالرحمن خاں کا نام بہت ادب و احترام اور القاب و آداب کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:

”علامہ زماں، فہامہ دوراں، جامع علوم عقلیہ، مجمع فنون نقلیہ، صوفی باصفا، عالم بے ریا، صراف نقد و توحید، نقاد مبالغہ تفرید، مقبول حضرت سبحان مولوی عبدالرحمن جلال آبادی“

مولانا عبدالرحمن خاں شاہ احسان علی پٹنی کے خلیفہ اول تھے، اور شاہ احسان علی اپنے دور کے بہت ممتاز مشائخ اور عارفین میں تھے۔ حضرت میاں جی نور محمد سب سے پہلے ان ہی سے بیعت ہوئے، تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: سہ ماہی احوال آثار کاندھلہ (شمارہ جنوری فروری مارچ ۱۹۹۵ء ص ۳۸ تا ۷۹) باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

عبدالرحیم (۱) (استاد مولانا شیخ محمد تھانوی) لوہاری میں مولانا محمد صادق (۲) جھنجھانہ میں مولانا عبدالرزاق (۳) یہ بھی حضرت حاجی امداد اللہ کے استاذ ہیں۔

کاندھلہ اور اطراف میں ان حضرات کے علاوہ حضرت مفتی صاحب کے اور بھی کئی شاگرد اور خاص تربیت یافتہ اصحاب موجود تھے جن کے دم سے علم کی شمع روشن اور تعلیم و

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... مولانا عبدالرحمن کے مختصر تعارف کیلئے دیکھئے: بیاض دلکشا ص ۴۹، ۵۰۔

مولانا عبدالرحمن آخر میں جمال شاہ نامی ایک مجذوب کے معتقد ہو گئے تھے، ان کی توجہ سے مجذوبیت کا کچھ اثر ہو گیا تھا اسی کیفیت میں وفات پائی۔ شام امدادیہ (ملفوظات حضرت حاجی امداد اللہ) مرتبہ حاجی مرتضیٰ خان۔ ص ۱۵۴-۱۵۵ (لکھنؤ: ۱۳۱۴ھ)

(۱) مولانا عبدالرحیم تھانوی: خلف عبدالحکیم (بن غلام فرید بن مالک بن محمد رضا)۔ مولوی عبدالرحیم صاحب بھی مفتی الہی بخش کے شاگرد، جامع معقول و منقول عالم، نہایت متقی و پرہیزگار شخص تھے، دنیا کے معاملات اور قصوں سے کچھ سروکار نہیں رکھتے تھے۔ طویل عمر پائی۔ ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون پرائگریز دستوں کی یلغار کے وقت شہید کر دیئے گئے تھے۔ (استفادہ از تاریخ تھانہ بھون، قلمی)

(۲) مولانا محمد صادق لوہاری: مفتی الہی بخش کے شاگرد، معقول اور منقول کے جامع اور معرفت و سلوک میں کامل تھے۔ مولانا صادق اور میا نجو نور محمد صاحب کی چالیس سال سے زیادہ دوستی اور رفاقت تھی اور میا نجو صاحب مولانا صادق سے مراسم کی وجہ سے مولانا کی طلب پر لوہاری گئے تھے، نامور عالم و مرشد مولانا شاہ عبدالعلیم لوہاری مولانا محمد صادق کے شاگرد تھے۔

(۳) مولانا عبدالرزاق: (خلف شیخ امام بخش بن شمس الدین) جھنجھانوی، مفتی الہی بخش کے نواسے اور عزیز شاگرد تھے، علوم درسیہ میں کمال حاصل کیا، طب پڑھی اور مثنوی مولانا روم کے اسرار و موز کی گرہ کشائی فرمائی اور اس کے مرجع و امام سمجھے گئے، خطاطی کا فن محمد امیر پنچہ کش دہلوی سے حاصل کیا، فنون سپہ گری، بنوٹ وغیرہ میں بھی غیر معمولی دسترس تھی۔ تمام عمر مثنوی شریف کی تعلیم دی، تقریباً ساٹھ سال تک درس مثنوی کی خدمت جاری رہی، بقول حکیم الامت مولانا تھانوی ”کم سے کم سو مرتبہ تو پڑھائی ہوگی بلکہ زیادہ“ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی نے تین مرتبہ پوری مثنوی شریف مولانا عبدالرزاق سے پڑھی، حاجی صاحب نے فرمایا: ”میں نے تین مرتبہ مثنوی شریف حضرت مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی پر عرض کی“ شام امدادیہ ص ۱۰۰۔ حضرت حاجی صاحب کی اہلیہ بی بی خیرا، نیز مولانا فتح محمد تھانوی اور ان کے علاوہ اندازاً کئی سو علماء اور اہل معرفت نے مولانا عبدالرزاق صاحب سے مثنوی پڑھی تھی۔ مولانا عبدالرزاق کو حضرت مفتی الہی بخش سے اجازت بیعت حاصل تھی۔ مولانا عبدالرزاق مفتی صاحب کی ہدایت پر شاہ احسان علی پٹی سے بیعت ہوئے اور استفادہ کیا۔ مولانا عبدالرزاق کی ربیع الاول ۱۲۹۳ھ اپریل ۱۸۷۵ء میں کاندھلہ میں وفات ہوئی۔ مفتی الہی بخش وغیرہ کے قریب ان کے خاندانی قبرستان میں دفن کئے گئے۔ مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی، ضمیمہ امداد المشاق (مکتبہ برہان، دہلی: ۱۹۸۱ء)

تربیت کے حلقے شاداب و پر بہار تھے، پھر ان شاگردوں کے متوسلین کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس طرح مفتی صاحب کے وابستگان کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ حضرت مفتی صاحب کے چند شاگردوں کی خدمات ممتاز ترین تلامذہ کی طویل فہرست اور ان سے مستفیدین کے درج بالا چند نام ہمارے اس خیال کی تصدیق کر رہے ہیں (۱) مذکورہ تفصیلات سے یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ اس علاقہ میں دینی علمی ماحول بنانے اور گھر گھر عام کرنے میں حضرت شاہ ولی اللہ کے خانوادہ گرامی کے بعد سب سے بڑا حصہ حضرت مفتی الہی بخش کی خدمات و اثرات اور شاگردوں کا ہے۔ مفتی صاحب کے وسیع اور طویل حلقہ درس نے اس علاقہ کی ایک ایک بستی میں علم و فضل کے چرچے، تعلیم و تدریس کے حلقے عام کر دیئے تھے اور اطراف کے بڑے بڑے علماء اور اہل درس و افادہ، مفتی صاحب کے فیض یافتہ تھے، ان علماء سے استفادہ کے بعد باذوق طلبہ حضرت مفتی الہی بخش کی خدمت میں حاضری کو سعادت سمجھتے تھے اس وقت کے طلبہ کے اس معمول کے مطابق مولانا مملوک العلی نے بھی پاسداری کی، ابتدائی یا متوسط تعلیم کے بعد مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مفتی صاحب سے استفادہ کیا۔

گذر گیا ہے کہ مولانا مملوک العلی کے زمانہ تعلیم میں حضرت مفتی الہی بخش کے سلسلہ درس و افادہ کی شہرت و مقبولیت عام تھی، مولانا مملوک العلی کے وطن نانوتہ اور اس کے اطراف میں بھی مفتی صاحب کے متعدد شاگرد موجود اور طلبہ کی تعلیم و تربیت میں مشغول تھے، نانوتہ میں مولانا عبدالرحمن اور مولانا عبدالرحیم کی مسند درس پچھی ہوئی تھی (نانوتہ سے ملحق قصبہ) رام پور منہیاران میں بھی مفتی صاحب کے ممتاز شاگرد مولانا محمد حسن تبحر عالم، صاحب درس و تحقیق شخص اور مرجع طلبہ تھے۔ عین ممکن اور ہر طرح سے قرین قیاس ہے کہ مولانا مملوک العلی صاحب نے ابتدائی تعلیم کے لئے سب سے پہلے مقامی علماء خصوصاً مذکورہ حضرات میں سے کسی سے رجوع کیا ہوگا، اور بظاہر خاندان کے اہل علم اور مقامی علماء سے تعلیم کے بعد وطن سے نکلے ہوں گے۔

(۱) مفتی صاحب کے براہ راست شاگردوں اور ان کے چند مستفیدین کے متعلق اجمالی معلومات کے لئے ملاحظہ ہو: ”شجرہ فیض علم و کمال حضرت مفتی الہی بخش“ مرتبہ نور الحسن راشد کاندھلوی۔

مولانا کا تعلیم کے لئے سفر اور اساتذہ | اگرچہ مولانا مملوک العلی کے زمانہ  
تعلیم اور اساتذہ کی تفصیل دستیاب

نہیں، مگر یہ طے ہے کہ مولانا مملوک العلی نے حضرت مفتی الہی بخش اور ان کے ممتاز  
شاگرد (عارف باللہ) مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی کی خدمت میں وقت گزارا ہے  
اور دونوں سے تعلیم حاصل کی ہے اور مختلف علوم و فنون میں دونوں کے سامنے زانوئے تلمذ  
طے کیا ہے۔ اور ان دونوں کے علاوہ مولانا مملوک العلی کے کم سے کم تین استادوں کے نام  
اور دستیاب ہیں، اس لئے مولانا مناظر احسن گیلانی کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ مولانا مملوک  
العلی نے صرف مولانا رشید الدین خاں سے تعلیم پائی ہے اور مولانا رشید الدین خاں کے  
علاوہ مولانا مملوک العلی کا کوئی اور استاد نہیں ہے۔ مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ:

”مولانا مملوک العلی کے سوانح نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ انھوں نے اول سے آخر تک  
جو کچھ بھی پڑھا ان ہی مولانا رشید الدین خاں صاحب سے پڑھا“ (۱)

اسی سلسلہ گفتگو میں چند سطروں کے بعد مزید تحریر ہے:  
”اس کے بعد اول سے آخر تک مولانا مملوک العلی نے سب کچھ مولوی رشید الدین  
خاں صاحب سے پڑھا“ (۲)

آئندہ تفصیلات سے واضح ہوگا کہ مولانا گیلانی کا یہ قول قطعاً درست نہیں۔

ایک اور بے ثبوت روایت | مذکورہ معلومات اور اس نواح کی نہایت تروتازہ وسیع  
علمی فضا کی موجودگی میں اس روایت کی کیا حقیقت  
باقی رہ جاتی ہے جو مولانا مفتی محمود احمد نانوتوی نے بعض بزرگوں کے حوالہ سے نقل کی ہے،  
جس میں کہا گیا ہے کہ:

”مولانا جب قریب البلوغ تھے کوئی نیک مرد بزرگ مسافرانہ انداز میں نانوتہ وارد  
ہوئے جن کی نظر مولانا پر پڑی جو مسجد سے باہر کھیل میں مشغول تھے، بزرگ مسافر نے دریافت  
فرمایا کہ: صاحبزادہ کیا پڑھ رہے ہو؟ یہ جواب میں خاموش رہے۔ انہوں نے فرمایا تعجب ہے کہ

(۲) سوانح قاسمی ص ۹۳ ج ۱

(۱) سوانح قاسمی ص ۹۲ ج ۱



کوئی شریف زادہ پڑھنے کے استفسار پر خاموش رہے، انہوں نے عرض کیا کہ کوئی پڑھانے والا قصبہ میں نہیں، مسافر نے فرمایا پڑھنے والا ہو تو پڑھانے والوں کی کمی، آو چلو میں پڑھواؤں، یہ ساتھ ہو لئے، دہلی پہنچ کر کسی مدرسہ میں داخل کر دیئے گئے اور تمام علوم کی تحصیل سے فارغ ہو کر ہی نانوتہ ایک عالمانہ شان میں واپس ہوئے“ (۱)

مفتی محمود احمد کی اس روایت کی مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی اس صراحت سے بھی ضمانت دیدہ ہو رہی ہے کہ:-

”مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی) کے والد شیخ اسد علی صاحب ہر چند جناب والد مرحوم کے ساتھ دہلی گئے تھے اور شاہنامہ وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں اور اپنے پڑھنے کے زمانے کی ہمارے سامنے حکایات بیان فرمایا کرتے تھے، مگر حال ایسا تھا گویا علم سے کچھ مناسبت نہیں“ (۲)

کیا شیخ اسد علی بھی مولانا مملوک العلی کے ساتھ راستے میں کہیں کھڑے ہوئے تھے جن کو وہ درویش بغیر کسی اطلاع کے اچانک پکڑ کر دہلی لے آئے تھے؟ اس لئے مولانا گیلانی کی اطلاع اور مفتی محمود احمد کا یہ اندراج صحیح نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک دریافت معلومات کے مطابق حضرت مولانا مملوک العلی نے اپنے خاندان کے علماء اور افراد کے علاوہ کم سے کم درج ذیل پانچ حضرات سے تعلیم حاصل کی تھی۔

مولانا کے کل اساتذہ اور ان سے تعلیم کی ترتیب

(۱) حضرت شاہ عبدالعزیز (ایک سبق تبرکاً)

(۲) حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی

(۳) حضرت مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی

(۴) حضرت مولانا عبداللہ خاں علوی، مرشد آبادی، دہلوی

(۵) حضرت مولانا رشید الدین خاں کشمیری دہلوی

(۱) نسب نامہ صدیقان نانوتہ ص: ۴

(۲) تذکرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی مصنف مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص ۳ (بھاول پور: ۱۲۹۷ھ)

حضرت مفتی الہی بخش سے تلمذ

حضرت مولانا مملوک العلی کے احوال و سوانح پر اس وقت تک دریافت کسی بھی تحریر میں حضرت مولانا کے اساتذہ میں حضرت مفتی الہی بخش کا تذکرہ نہیں، مگر خود مولانا مملوک العلی کی تحریروں سے یہ بات واضح اور عیاں ہو رہی ہے کہ مولانا مملوک العلی حضرت مفتی الہی بخش کے شاگرد تھے، مولانا نے مفتی صاحب کی خدمت میں وقت گزارا ہے، اور مفتی صاحب سے تلمذ و استفادہ کیا ہے۔

مولانا مملوک العلی مفتی صاحب کی خدمت میں کب حاضر ہوئے کس قدر قیام کیا اس کی واضح شہادت تو نہیں ملی مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا تقریباً ۱۲۲۰ھ

مولانا کے، حضرت مفتی الہی بخش سے تلمذ کے شواہد و آثار

(۱۸۰۶ء) میں یا اس کے بعد مفتی صاحب کے کاندھلہ اور تھانہ بھون میں قیام کے زمانہ میں، (یانواب احمد خاں سہارنپور کے یہاں ملازمت کے دوران جس کا تقریباً ۱۲۲۲ھ، ۱۸۰۸ء میں آغاز ہوا تھا) حضرت مفتی صاحب سے تلمذ ہوا ہے۔ مفتی صاحب کی ایک بیاض (۱) میں رام پور منہیاران (۲) میں اپنا سامان چھوڑنے اور وہاں کے چند افراد کے پاس قرض کی یادداشت لکھی ہے، جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مفتی صاحب کا رام پور میں بھی کچھ قیام رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس دوران مولانا مملوک العلی مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر رہے ہوں، بہر حال دہلی جانے سے پہلے مولانا مملوک العلی مفتی الہی بخش کی خدمت میں حاضر اور مفتی صاحب کے زمرہٴ خدام و مستفیدین میں شامل تھے، جس کی مفتی صاحب کی ایک بیاض سے صاف تصدیق ہو رہی ہے۔

ممتاز علماء اور مدرسین کا ہمیشہ یہ معمول رہا ہے جو اب بھی جاری ہے کہ وہ اپنے خاص شاگردوں اور زیر تربیت طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کیلئے، انکی حیثیت و صلاحیت

(۱) اس بیاض کا مفصل تعارف مفتی صاحب سے مولانا مملوک العلی کے تلمذ کے تذکرہ میں ملاحظہ ہو۔

(۲) رام پور منہیاران ضلع سہارنپور نانوتہ کا قریب ترین قصبہ ہے۔

کے مطابق، ان سے مختلف علمی کام اور خدمات کراتے رہتے ہیں، جس میں مختلف مضامین و مؤلفات، مسائل و فتاویٰ کی نقل، ان کی شرح یا ترجمہ وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح مفتی صاحب بھی اپنے خاص طلبہ سے اس قسم کے کام لیتے رہتے تھے، مختلف کتابوں کے اقتباسات، فتاویٰ اور ضروری تحریریں طلبہ سے اپنی بیاضوں میں یا علیحدہ نقل کرایا کرتے تھے، مفتی صاحب کے ممتاز شاگردوں کے قلم سے مفتی صاحب کی بیاضوں میں اس طرح کی متعدد تحریریں اور منتخبات درج ہیں۔

ایسے شاگردوں جن کی تحریریں مفتی صاحب کی بیاضوں میں راقم سطور کی نظر سے گذری ہیں حضرت مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی (۱) مولانا محمد حسن رام پوری (۲) مولانا وجیہ الدین محدث سہارنپوری (۳) مولانا غلام حسین سہارنپوری (۴) مولانا غلام حسن (۵) خلف نور محمد تھانوی، مولانا غلام نبی انبھٹوی کے نام اس وقت سامنے ہیں۔ (۶) اسی فہرست کا ایک اور اہم اور خاص نام مولانا مملوک العلی نانوتوی کا ہے۔ مفتی

(۱) مولانا قلندر کے مختصر حالات مولانا مملوک العلی کے مولانا سے تلمذ کے تذکرہ میں آرہے ہیں۔

(۲،۳) دونوں علماء کا مختصر تعارف گذر چکا ہے۔ مولانا سید محمد قلندر کے مفصل حالات آئندہ صفحات میں آرہے ہیں۔

(۴) مولانا قاضی غلام حسین: اسلام نگر ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے، مفتی الہی بخش سے تعلیم حاصل کی، مفتی صاحب کی بیاضوں میں ان کے قلم کی نقل کی ہوئی درجنوں تحریریں اقتباسات وغیرہ موجود ہیں اور مولانا کا مفتی صاحب کے نام ایک خط بھی مفتی صاحب کی ایک بیاض میں چپکا ہوا ہے۔ مولانا غلام حسین نے شاہ احسان علی پٹنی سے بیعت کی اور ان کے خلیفہ مجاز ہوئے۔ مولانا نصر اللہ خاں خویشگی نے بیاض دلکشا (مولفہ ۱۲۶۶ھ) میں لکھا ہے کہ چار سال گزرے (یعنی تقریباً ۱۲۶۲ھ میں) قاضی صاحب نے انتقال فرمایا۔ اور اسلام نگر میں دفن کئے گئے۔ بیاض دلکشا ص ۶۱ مولانا نصر اللہ خاں خویشگی (طبع اول: ۱۲۷۳ھ)

(۵) مولانا غلام حسن: خلف نور محمد تھانوی، ان کے حالات معلوم نہیں مگر مفتی الہی بخش کی متعدد بیاضوں اور بعض کتابوں پر مختلف یادداشتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا غلام حسن مفتی صاحب کے چہیتے اور عزیز شاگرد تھے، غالباً انھوں نے مفتی صاحب کی خدمت میں کئی سال گزارے ہیں، مفتی صاحب کی بیاضوں میں مفتی صاحب کے جن شاگردوں کی تحریریں ہیں ان میں سب سے زیادہ تحریریں مولانا غلام حسن کی ہیں۔ مولانا، مفتی صاحب کے خادم خاص اور سفر و حضر کے رفیق بھی معلوم ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ذاتی گھریلو معاملات کی جو یادداشتیں اور اپنا سامان کہیں رکھنے چھوڑنے کی جو تحریریں لکھی ہیں اس میں بھی مولانا غلام حسن کا جگہ جگہ نام آیا ہے۔ باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

صاحب کی متفرقات اندراجات کی ایک بیاض میں حضرت موصوف کے اور شاگردوں کے علمی باقیات و آثار کے ساتھ مولانا مملوک العلی کے قلم سے بھی متعدد تحریرات و اوراق (خاص طور سے عربی ادب کے قصائد و منتخبات) لکھے ہوئے ہیں، جو اس بات کی یقینی علامت ہے کہ مولانا مملوک العلی بھی حضرت مفتی الہی بخش کی خدمت کے حاضر باش اور ایسے معتمد اور خاص شاگردوں میں سے تھے جن پر حضرت مفتی صاحب اعتماد کرتے تھے اور ان سے اپنے تحریری تصنیفی کاموں اور نقل و اقتباس وغیرہ میں مدد لیتے تھے اور استاذ کا اپنے کسی شاگرد سے اس قدر گہرا ربط اسی وقت ممکن ہے جب یہ طالب علم متعلقہ استاذ یا عالم سے خاص طور سے وابستہ اور مانوس ہو، استاذ کی خدمت میں اکثر حاضر رہتا ہو، اور استاذ کے سپرد کئے ہوئے کاموں کو انجام دینے میں سعادت و مسرت محسوس کرتا ہو، اور ایسے کاموں کیلئے استاد کو اس طالب علم کی لیاقت اور صلاحیت پر کسی قدر اعتماد بھی ہو اور استاذ اس شاگرد کو اس کام کیلئے موزوں بھی سمجھتا ہو، اپنے استادوں کے پاس کبھی کبھی کے آنے جانے والے غیر معتمد طلبہ کو علماء اور اساتذہ اس طرح کی خدمات کب سپرد فرماتے ہیں؟ اس لئے حضرت مفتی الہی بخش کی یہ بیاض اور اس میں مولانا مملوک العلی کے قلم سے لکھے ہوئے اوراق اس کا ثبوت ہیں کہ مولانا مملوک العلی کو حضرت مفتی صاحب سے تلمذ حاصل تھا اور مولانا نے خاصا وقت مفتی صاحب کی خدمت و تلمذ میں گزارا تھا۔

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... مولانا غلام حسن کے قلم سے نقل آٹھ کتابیں ہمارے ذخیرہ میں اور متعدد کتابیں اور کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔ مولانا غلام حسن کا خوبصورت پاکیزہ قلم تھا وہ بہت صحت اور اہتمام سے نقل کرتے تھے۔ مولانا کی نقل کی ہوئی جو کتابیں راقم سطور کی نظر سے گزری ہیں وہ سنہ ۱۲-۱۱-۱۰ھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ افسوس ہے کہ مولانا کے حالات نہیں ملتے۔

(۶) مولانا غلام نبی انبھٹوی: کی بہت سی تحریریں مفتی الہی بخش کی بیاضوں میں موجود ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو بھی حضرت مفتی صاحب سے بہت قربت ہے اور وہ بہت توجہ اور کثرت سے مفتی صاحب کی تحریریں اور اقادات قلم بند کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ مولانا غلام نبی کی تحریر بھی بہت پاکیزہ اور خوبصورت ہے، ان کے لکھے ہوئے بھی متعدد رسائل موجود ہیں۔ غلام نبی (خلف عبدالصمد بن عبدالواحد بن قاضی محمد زاہد) انصاری انبھٹوی، کا نام و نسب تحفہ صادقہ (نسب نامہ انصاریان ابہٹہ) مرتبہ مولانا مشتاق احمد انبھٹوی میں درج ہے۔ ص ۷۰ و ما قبل (لاہور: ۱۳۲۹ھ)

یہ بیاض جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے مفتی صاحب کی اور بیاضوں کی طرح ایک جامِ جہاں نما اور گنجینہٴ علوم ہے، جس میں مختلف ذاتی یاد

مفتی صاحب کی بیاض میں درج مولانا مملوک العلی کی تحریروں کا تعارف

داشتوں کے علاوہ فقہ، حدیث و تفسیر، نحو، معانی، بدیع و کلام، تاریخ، رجال شخصیات نیز طب و عملیات کے علاوہ اور موضوعات پر بھی درجنوں کتابوں کے سینکڑوں اقتباسات اور منتخبات درج ہیں۔ اس بیاض میں اور ماخذ کے علاوہ قاضی القضاات قاضی نجم الدین خاں کاکوری (وفات ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء) کی بیاض سے بھی کثرت سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جس میں اگرچہ اکثر کام مفتی صاحب کے قلم سے ہے، مگر مفتی صاحب کے شاگردوں کے قلم سے بھی مختلف صفحات لکھے ہوئے ہیں (۱) اور یہ سب انتخابات و اقتباسات یقیناً مفتی صاحب کی ہدایات کے مطابق اور مفتی صاحب کی رہنمائی میں درج کئے گئے ہوں گے۔

اس بیاض میں مولانا مملوک العلی کی جو تحریریں موجود ہیں ان کو تین حصوں پر تقسیم اور متعارف کرایا جاسکتا ہے۔

اول: وہ کہ انکے اختتام پر کاتب (یعنی مولانا مملوک العلی) کا نام صاف لکھا ہوا ہے۔  
دوم: وہ کہ اگرچہ ان پر مولانا مملوک العلی کا نام درج نہیں، لیکن ان میں مولانا کی تحریر کی وہ خصوصیات اور نشانات و کلمات صاف موجود ہیں جو مولانا کی تحریروں کی پہچان اور امتیاز ہیں۔

سوم: وہ تحریریں کہ جن کے آخری صفحات موجود نہیں مگر طرزِ تحریر وغیرہ سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی مولانا مملوک العلی کے قلم سے ہیں۔

(۱) یہ بیاض خاصی ضخیم تھی مگر اس وقت اس کا جو حصہ موجود ہے، اس میں صفحات کا شمار کا آخری اندراج (مفتی صاحب کے شمار کے مطابق) ۲۳۳ ہے، مگر افسوس ہے کہ پیش نظر نسخہ خاصاً ناقص ہے، جگہ جگہ سے اوراق غائب ہیں (جو ممکن ہے کہیں موجود ہوں، یا ضائع ہو گئے ہوں۔ بہر حال راقم سطور کو ان کا علم نہیں) اس وقت مذکورہ دو سو پینتالیس اوراق میں سے ایک سو پچاس ورق محفوظ ہیں، نوے ورق غائب ہیں۔ لیکن یہ اوراق اپنی افادیت اور امتیازات کے علاوہ اس وجہ سے بھی قابلِ قدر ہیں کہ ان کے متعدد حصے مولانا مملوک العلی کے قلم سے ہیں۔

اول قسم کی دو تحریریں ہیں جن پر مولانا کے دستخط موجود ہیں:

الف: حضرت مفتی صاحب نے محمد مؤمن شیرازی (وفات ۱۱۱۸ھ ۱۷۰۶ء) کی شرح طیف الخیال سے بدلیج کا ایک انتخاب کیا تھا، جس کا عنوان یہ ہے:

”فہذا مائة وثمانون نوعاً من البدائع، يحلى بها الكلام والعيوب التي يحترز عنها معرفت جميع ذاك للارتكاب والاجتناب“

یہ انتخاب مفتی صاحب کی اس بیاض کے دس اوراق پر مشتمل ہے (۱۷۸ سے ۱۸۸ تک) اسکے بعد تین مضمون متفرق معلومات کے ہیں، ایک صفحہ پر فقہی مسائل ہیں، دوسرے صفحہ پر تفصیل بست و شش باب وزن جمع مکسر، تیسرے صفحہ پر فقہ الیمن (تالیف شیخ احمد بن محمد یمنی) اقتباسات ہیں۔ اس کے بعد درمیان میں عربی ادب کے بعض اور منتخبات ہیں (۱) ورق ۱۹۲ سے ۱۹۶ تک صلاح الدین صفدی کلامیہ ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

الجد فی الجد والحرمان فی الکسل . فانصب نصب عن قریب غایة الامل

یہ تمام اوراق خصوصاً لامیہ صفدی شروع سے آخر تک مولانا مملوک العلی کے قلم سے ہے، آخر میں لکھا ہے:

”تمام شد، الراقم مملوک علی۔ نقل من فقہ الیمن“

اس کے بعد اسی قلم سے شرح طیف الخیال کا ایک اقتباس اور ہے۔

ب: اسی مجموعہ میں عربی کا رسالہ امثال حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نقل ہے، جس کا مکمل نسخہ چھبیس اوراق پر مشتمل تھا (جیسا کہ مفتی صاحب کے لکھے ہوئے صفحات سے معلوم ہو رہا ہے) مگر اب اس کتاب کے ابتدا کے صرف دو (۱۹۷ تا ۱۹۸ ب) اور آخر کے صرف تین ورق (ورق ۲۱۹، الف ۲۲۱ ب تک) موجود ہیں، اختتام پر یہ الفاظ درج ہیں:

(۱) ورق (۱۹۱ ب قدیم) سے طغرائی (ابی اسماعیل حسن بن علی الطغرائی) کلامیہ العجم ہے جو ۱۹۳ ب پر قاضی القضاة قاضی نجم الدین کا عربی کا ایک منظوم خط ہے، اس کے نیچے تمام شد تحریر ہے۔ (ورق ۱۹۳۔ الف) پر جو اسباب اللطیف بن ابراہیم سابطا آلسابطا (جو ۱۲۲۳ھ میں کلکتہ میں مقیم تھا) کے عربی اشعار ہیں۔

”تمت تمام شد۔ نوشتہ مملوک الطلبةاء مملوک علی“

قسم دوم: جن پر وہ خاص علامتیں اور کلمات لکھے ہوئے ہیں جو مولانا کی اکثر تحریروں میں آئے ہیں، یہ دو قسم کی علامتیں ہیں: مولانا کی نقل کی ہوئی کتابوں میں پہلے صفحہ کی پیشانی پر سب سے اوپر درود شریف لکھا ہوا ہوتا ہے، جس کے یہ خاص الفاظ ہیں:

”اللهم صل علی محمد وعلی آل محمد واصحاب محمد وبارک وسلم“

اس کے نیچے دوسری سطر میں: یافتاح

تیسری سطر میں: بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس کے بعد کتاب کا آغاز ہوتا ہے، مذکورہ بالا درود شریف سب سے پہلے صفحہ کے علاوہ ایک دو متفرق مقامات پر بھی پہلے صفحہ کی طرح صفحات کی پیشانی پر درج رہتا ہے، مولانا مملوک العلی اپنی لکھی تحریروں یا کتاب کے آخر میں ”تمت هذه القصيدة“ یا ”تمت بعون الملك الوهاب“ لکھتے ہیں۔ مؤخر الذکر فقرہ لکھنے کا بھی ایک خاص انداز ہے جو اس طرح ہے:

تمت بعون الملك الوهاب

یعنی! تمت بعون الملك الوهاب ، هذه القصيدة بعون تمت .  
اس بیاض میں اس طرح کی کئی تحریریں جن پر اگرچہ مولانا کے دستخط نہیں مگر یہ اشارات موجود ہیں، جو اوپر ذکر ہوئے۔ ان تحریروں کا مختصر احوال درج ذیل ہے:

الف: سب سے پہلی تحریر حضرت مفتی الہی بخش کی تالیف شرح رسالہ بہاء الدین عالمی کی نقل ہے، یہ رسالہ عربی میں ہے اور اس بیاض کا (جس کا ذکر ہو رہا ہے) سب سے پہلا اندراج ہے۔ ورق ۲۱ سے اصل رسالہ خود حضرت مؤلف (مفتی الہی بخش) کے قلم سے درج ہے، یہ نسخہ غالباً ورق ۴۴ مکمل ہوا ہوگا۔ مگر اس وقت اس بیاض میں ورق چار موجود نہیں، ۳ اور ۵ موجود ہیں۔ چند اوراق کے بعد (اسی بیاض میں) اس رسالہ کی صاف نقل

مولانا مملوک العلی کے قلم سے ہے، اس نسخہ کے پہلے صفحہ کی پیشانی پر وہ تینوں خاص عبارتیں درج ہیں جو مولانا کی تحریر کا نشان امتیاز ہیں:

اللہم صل علی محمد وعلی آل محمد وعلی اصحاب محمد و  
بارک وسلم.

یافتاح. بسم اللہ الرحمن الرحیم.

یہ نسخہ ورق ۱۲ اب سے آغاز ہو کر ورق ۱۸ پر مکمل ہوا ہے، مگر عجب اتفاق ہے کہ اس نسخہ کا بھی آخری ورق (۸) غائب ہے، ۱۷ اور ۱۹ موجود ہیں۔

ب: قصیدہ بانیہ ذی الرمہ

اس کی پیشانی پر بھی درود شریف، یافتاح اور بسم اللہ الرحمن الرحیم درج ہے اور آخر میں محولہ بالا انداز میں 'تمت هذه القصيدة لکھا ہوا ہے (ورق ۶۶ الف تا ۷۲ ب)۔

قسم سوم: میں وہ تحریریں آتی ہیں کہ ان پر نہ یہ اشارات درج ہیں نہ مولانا مملوک العلی کا نام لکھا ہے، مگر یہ تحریرات مولانا مملوک العلی کی اور تحریروں سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ ان کو بلا تامل مولانا مملوک العلی کی تحریریں کہا جاسکتا ہے۔

بہر حال مفتی صاحب کی اس بیاض میں مولانا مملوک العلی کی یہ تحریرات ضمناً اس حقیقت کو واضح کر رہی ہیں کہ مولانا مملوک العلی حضرت مفتی صاحب کے شاگردوں میں شامل اور مفتی صاحب کے حلقہ درس کے حاضرین میں سے تھے۔

مولانا مملوک العلی نے مفتی صاحب کی خدمت میں کیا کیا پڑھا اور کن علوم میں کس قدر استفادہ

مفتی صاحب سے کیا پڑھا؟

کیا اور کس قدر وقت مفتی صاحب کی خدمت میں گزارا، مجھے اسکی کوئی وضاحت یا اشارہ نہیں ملا، مگر محولہ بالا بیاض میں درج تمام نقول و تحریرات مولانا مملوک العلی کے عربی کے اعلیٰ ادبی سرمایہ سے دلچسپی اور مناسبت کی مظہر ہیں، اس لئے قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ اس



بیاض میں درج تحریرات نقل کرنے کے زمانہ میں مولانا مملوک العلی حضرت مفتی صاحب سے عربی ادب کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں خصوصاً عہد اول کے شعراء اور ادیبوں کی مصنفات و منظومات پڑھ رہے ہوں گے۔

مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی سے تلمذ | مولانا مملوک العلی کا مفتی الہی بخش سے تلمذ بلا واسطہ بھی ہے (جیسا کہ

مذکورہ بالا تحریروں سے عیاں ہے) اور واسطہ سے بھی، یہ ذریعہ مفتی صاحب کے ایک نہایت ممتاز شاگرد، اپنے عہد کے جلیل القدر عالم، عارف، اور محدث و مدرس مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی کا ہے۔ مولانا سید قلندر مفتی صاحب کے شاگردوں میں اپنی علمی حیثیت اور درس و افادہ میں ممتاز تھے، خصوصاً مولانا کا درس حدیث مشہور تھا، بعد کے زمانہ کے متعدد بلند پایہ علما اور اصحابِ درس و تالیف کو مولانا محمد قلندر کی خدمت میں حاضری اور تلمذ کی سعادت میسر آئی ہے جس میں حضرت قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا غوث علی قلندر پانی پتی (۱) کے علاوہ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کا نام نامی بھی آتا ہے۔ مولانا مملوک العلی نے مولانا محمد قلندر سے کیا تعلیم پائی، اس کی تفصیل نہیں ملی لیکن مولانا عاشق الہی میرٹھی کی ایک عبارت سے اس روایت کی مجمل تصدیق ہو رہی ہے، مولانا لکھتے ہیں:

”نیز سنا ہے کہ اپنے معقول کا کچھ حصہ مولوی قلندر بخش صاحب سے بھی پڑھا ہے“ (۲)

مولانا محمد قلندر کا حلقہ درس پرانے جید علماء اور مدرسین کی طرح ہمہ جہت اور وسیع درس تھا جس میں ابتدائی کتابوں سے اعلیٰ کتابوں تک تمام درسیات اور جملہ علوم و فنون کے اسباق جاری رہتے تھے، جس میں نحو و صرف کی ابتدائی کتابیں اور معقولات (منطق،

(۱) حوالے مولانا سید محمد قلندر کے تعارف میں آئیں گے۔

(۲) تذکرۃ الرشید، حاشیہ ص ۲۷ ج ۱ (سہارنپور: ۱۹۷۷ء) مولانا محمد قلندر صاحب (غالباً تحریک سید احمد شہید سے وابستگی سے) پہلے اپنا نام قلندر بخش بھی لکھتے تھے، حضرت تھانوی کے بعض ملفوظات میں بھی مولانا کا نام قلندر بخش آیا ہے، نیز مولانا عبدالحی حسنی نے بھی مولانا محمد قلندر کو قلندر بخش لکھا ہے، ملاحظہ ہونہیہ الخواطر تذکرہ مولانا شیخ محمد تھانوی ص ۲۲۲ ج ۷۔ اور تذکرہ حاجی امداد اللہ ص ۷۰ ج ۸۔

فلسفہ اور کلام وغیرہ) بھی شامل تھی، مگر مولانا سید محمد قلندر کا اصل مشغلہ اور ذوق درس حدیث کا تھا۔ متعدد علماء او اہل کمال نے اپنی اپنی صلاحیت اور ترتیب کے مطابق مولانا سے استفادہ کیا، مولانا عاشق الہی کی اطلاع کے مطابق مولانا مملوک العلی نے مولانا محمد قلندر سے معقول کا بھی کچھ حصہ پڑھا تھا، اس اطلاع کی (شیخ الہند کے ایک معتمد شاگرد) مولانا احمد اللہ صاحب کیرانوی بھی توثیق فرمایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ:

”میں نے اپنے استاذ حضرت شیخ الہند سے سنا ہے کہ مولانا مملوک العلی نے حدیث کی چند کتابیں مولانا محمد قلندر سے پڑھی تھیں“۔ (۱)

مولانا مملوک العلی نے حضرت  
مزید تعلیم کیلئے دہلی کا سفر اور اس کا قیاسی سنہ مفتی الہی بخش اور مولانا محمد

قلندر سے کسب کمال کے بعد علمائے دہلی سے استفادہ اور تکمیل علوم کیلئے دہلی کا سفر کیا، یہ سفر کب ہوا اس کی صراحت مجھے نہیں ملی، مگر بعض قرائن سے تاثر ملتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب یا مولانا محمد قلندر سے استفادہ کے بعد (غالباً مولانا کی اجازت و مشورے سے) تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر یوپی) سے دہلی کا سفر ہوا ہوگا، ممکن ہے کہ مولانا مملوک العلی کے اس سفر کے وقت مفتی صاحب یا مولانا محمد قلندر تھانہ بھون میں مقیم ہوں۔ یہ تاثر حضرت مفتی صاحب کی بیاض کے ایک اور اندراج سے ملتا ہے، اسی بیاض میں مفتی صاحب کی تالیف شرح رسالہ بہاء الدین عالی کے پہلے صفحہ پر ایک یادداشت تحریر ہے جس کا عنوان یہ ہے:

”یادداشت اسباب کہ در تھانہ بھون گذارشتہ بوقت رفتن دہلی“

اس یادداشت میں جس سامان کا ذکر ہے، وہ ہر وقت کی ضرورت کی چند چیزیں اور پہننے اور ہننے کے نئے اور پرانے کپڑے ہیں۔ اور اس کے الفاظ سے جھلکتا ہے کہ یہ

(۱) یہ روایت راقم سطور نے جناب توفیق احمد علوی کیرانوی مرحوم سے بارہا سنی، وہ بچپن سے مولانا احمد اللہ کی خدمت کے حاضر باش، خاص خادم اور گویا شاگرد بھی تھے۔ ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی مشمولہ، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر کی کے اساتذہ (ضمیمہ امداد المشتاق تالیف مولانا تھانوی دہلی: ۱۹۸۰ء)

یادداشت دہلی کے طویل قیام کے ارادے سے سفر کے موقع پر لکھی گئی ہے، چند روزہ سفر یا قیام کے لئے اس قسم کی یادداشت لکھنا یوں بھی غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے اس زمانہ میں تقریباً ۱۲۲۰ھ کے بعد سے مفتی صاحب کے دہلی میں طویل قیام کی کوئی اطلاع راقم کے علم میں نہیں ہے، اس لئے خیال ہے کہ یہ یادداشت مولانا مملوک العلی نے اس وقت لکھی ہوگی جب وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے تھانہ بھون سے دہلی جا رہے تھے، مگر افسوس ہے کہ اس یادداشت پر اس روانگی کی تاریخ درج نہیں، اس لئے سفر دہلی کی تاریخ اور سنہ دریافت طلب ہے۔

مولانا مملوک العلی کے تعلیم حاصل کرنے کیلئے دہلی کے سفر کی تاریخ کا اندازہ کرتے ہوئے (پاکستان کے مشہور محقق) جناب محمد اکرام چغتائی صاحب نے لکھا ہے کہ:

”سوانح مملوک (مولانا مملوک العلی) کے مآخذ میں کوئی ایسی روایت منقول نہیں ملی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ مولانا کی دہلی میں آمد کون سے سنہ میں ہوئی، قرین قیاس یہی ہے کہ وہ ۱۸۱۵ء (۱۲۳۰ھ) کے لک بھگ دہلی آئے۔“ (۱)

مگر چغتائی صاحب نے بھی کوئی ایسا قرینہ یا حوالہ ذکر نہیں کیا جس سے ان کے اس خیال کی تائید ہو سکتی، راقم سطور کے خیال میں یہ فیصلہ درست نہیں کہ مولانا مملوک العلی ۱۸۱۵ء (۱۲۳۰ھ) میں تعلیم کیلئے دہلی گئے تھے، صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا شروع ۱۸۱۵ء ۱۲۳۰ھ میں دہلی میں موجود تھے۔ اس کی تصدیق مولانا کی ایک اور علمی یادگار سے ہو رہی ہے، جو مولانا نے دہلی میں اسی زمانہ میں نقل کی تھی۔ یہ عربی ادب کی مشہور تالیف سبہ معلقات اور اس کی مشہور شرح زوزنی (تالیف حسین ابن احمد بن حسین زوزنی) ہے۔ اسکے آخر میں مولانا مملوک العلی کے قلم سے یہ الفاظ درج ہیں:

”تمت هذه القصائد السبعة المعلقة على باب الكعبة الشريفة المعروفة بالفصاحة والبلاغة بين الناس، مع تحشيتها من شرحها القاضي الامام ابي

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب (مکتوبات مشاہیر) بنام اسیر نگر، مرتبہ محمد اکرام چغتائی ص ۲۹۱ (سہ ماہی اردو، کراچی: جنوری، مارچ ۸۴ء)

عبدالله الحسن بن احمد الزوزنی رحمہم اللہ (۱) فی حدود سنة الف ومائتين وثلثين فی شهر صفر فی بلدة الدهلی صانه الله عن الآفات. بيد الفقير المذنب الراجی الی رحمة الله العلی، المدعوبه مملوک العلی غفر الله له ولو الیدیہ“ (۲)

صفر ۱۲۳۰ھ جنوری فروری ۱۸۱۵ء کے مطابق ہے، جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا اس وقت دہلی میں موجود تھے مگر اس تحریر سے اس سلسلہ میں کچھ رہنمائی نہیں ملتی کہ مولانا دہلی کب پہنچے تھے اور اس وقت وہاں مولانا کی کیا مصروفیات تھیں۔

تعب ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے یہ لکھا ہے کہ:

”۱۷۹۲ء میں جو مولوی عبدالحق کی تحقیق کی رو سے اس کالج کے قیام

مولانا مملوک العلی کے سفر دہلی کے متعلق مولانا گیلانی کی اطلاع صحیح نہیں

کا سنہ ہے اس وقت مولانا مملوک العلی کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی۔ اس لئے تسلیم کرنا چاہئے کہ دہلی پہنچ کر مولانا رشید الدین خاں کے حلقہ درس میں مولانا مملوک العلی اسی زمانہ میں شریک ہوئے، جب دہلی کالج میں مولانا رشید الدین کام کر رہے تھے۔ (۳)

افسوس ہے کہ مولانا گیلانی کی اس اطلاع کے تمام مندرجات مشتبہ ہیں۔ وجوہات درج ذیل ہیں:

الف: مولوی عبدالحق نے دہلی کالج کے قیام کا سنہ ۱۷۹۲ء (۷-۱۲۰۶ھ) ہرگز نہیں

(۱) مولانا مملوک العلی کے قلم سے زوزنی (شرح سبغہ معلقہ) کے مؤلف کا نام حسن بن احمد لکھا ہوا ہے، مگر صحیح نام حسین بن احمد (متوفی ۱۲۸۶ھ ۱۰۹۳ء) ہے۔ زوزنی کے صحیح نام اور تعارف کے لئے ملاحظہ ہو:

بغیة الوعاة فی طبقات اللغویین والنحاة. علامہ جلال الدین سیوطی تحقیق: ابوالفضل ابراہیم۔ ص ۵۳۱ ج ۱ بیروت: ۱۳۹۹ھ) ب: الاعلام۔ خیر الدین الزرکلی۔ ص ۲۳۱ ج ۲ بیروت: ۱۹۷۹ء) ج: شرح المعلقات السبع للزوزنی۔ (دار صادر بیروت: ۱۳۸۲ھ)

(۲) یہ قیمتی اور اہم نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

(۳) سوانح قاسمی: مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۱۰۱ ج ۱ (طبع اول، دیوبند: ۱۳۷۳ھ)

لکھا، یہ سنہ مدرسہ غازی الدین خاں کی تعمیر کا ہے۔ (۱) مولوی عبدالحق اور دیگر اہل نظر کی تصریح کے مطابق دہلی کالج سنہ ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) میں قائم اور شروع ہوا تھا (۲) اس سے پہلے اس کالج کے وجود کی اگر کوئی روایت ہے تو وہ بے بنیاد ہے۔

ب: مولانا رشید الدین خاں مدرسہ غازی الدین حیدر میں کبھی ملازم و مدرس نہیں رہے۔  
ج: اور یہ بات بھی ناقابل تسلیم ہے کہ مولانا مملوک العلی پانچ سال کی عمر میں پڑھنے کے لئے دہلی آگئے ہوں اور اسی وقت ان کا مدرسہ غازی الدین میں داخلہ ہو گیا ہو، اور وہ کم سنی بلکہ طفولیت کے زمانہ میں ملک کے ایک ممتاز عالم مولانا رشید الدین خاں کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے ہوں۔ اس لئے مولانا گیلانی کی یہ اطلاع قابل قبول نہیں ہے۔  
د: ۱۷۹۳ء میں مولانا مملوک العلی کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی (ولادت ۱۲۰۲ھ، ۱۷۷۹ء) اس وقت تک دہلی کالج کے قیام کا ارادہ بھی نہیں ہوا تھا، کالج کا آغاز تو بہت بعد کی بات ہے۔ مولانا مملوک العلی اس زمانہ میں غالباً اپنے وطن میں یا نواح کے علماء سے پڑھ رہے ہوں گے۔

دہلی کے تعلیمی سفر کے موقع پر مولانا کے اور رفقاء کون کون تھے اس کا بھی تذکرہ نہیں ملتا، صرف شیخ اسد علی (والد گرامی حضرت مولانا

تعلیم کیلئے دہلی کے سفر میں اور دہلی میں  
مولانا مملوک العلی کے رفقاء

محمد قاسم نانوتوی) کا ذکر آتا ہے کہ وہ اس سفر میں مولانا کے ساتھ تھے۔ (مولانا مملوک العلی کے نامور خلف الرشید) مولانا محمد یعقوب صاحب نے لکھا ہے:  
”مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم) کے والد شیخ اسد علی ہر چند جناب والد

(۱) ملاحظہ ہو: سیر المنازل، مرزا سنگین بیگ۔ ص ۱۱۹ مرتبہ ڈاکٹر شریف حسین قاسمی (دہلی: ۱۹۸۲ء)

ب: آثار الصنادید، سرسید احمد ص ۷۳ باب سوم (دہلی: ۱۸۴۷ء)

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۶-۷۳ (دہلی: ۱۹۳۵ء) قدیم دہلی کالج، مالک رام ص ۲۳ (دہلی: ۱۹۷۶ء) مسٹر رام چندر،

ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی۔ ص ۱۲ (دہلی: ۱۹۶۱ء)

مرحوم کے ساتھ دہلی گئے تھے اور شاہنامہ وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں اور اپنے پڑھنے کے زمانہ کی ہمارے سامنے حکایات بیان فرمایا کرتے تھے۔ (۱)

دہلی کے زمانہ تعلیم میں مولانا کے کئی ہم جماعت اور دوست ہونگے مگر تذکرہ مولانا محمد قاسم اور موجودہ تحریری ذرائع میں انکا ذکر موجود نہیں، تاہم ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کا قول ہے کہ انکی دادی کے والد (مولانا وزیر علی بجنوری) مولانا مملوک العلی کے ہم سبق تھے۔ (۲)

دہلی میں تعلیم کی ابتدائی مشکلات اور حضرت شاہ عبدالعزیز

### کی دعاء اور توجہ سے اس کا علاج

مولانا مملوک العلی نے دہلی میں کئی علماء اور مدرسین سے پڑھنا چاہا مگر جس عالم کی خدمت میں بھی جاتے، وہ ایک سبق پڑھانے کے بعد آئندہ کے لئے تعلیم کی خدمت سے انکار کر دیتے تھے، مولانا مملوک العلی اس بات سے بہت پریشان تھے کہ اگر یہی حال رہا تو میری تعلیم کا کیا ہوگا؟ اس پریشانی میں مولانا، حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض حال کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا اکل آنا، مولانا مملوک العلی دوسرے دن خدمت میں پہنچے، اسکے بعد کیا ہوا اس کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے الفاظ میں پڑھئے، حضرت مولانا گنگوہی اس کا یوں تذکرہ فرماتے تھے کہ:

”حضرت شاہ صاحب نے ہدایۃ النحو کا ایک سبق پڑھا دیا اور فرمایا کہ جاؤ! اب جس استاذ سے پڑھو گے وہ پڑھانے سے انکار نہ کرے گا“ (۳)

اس سبق یا دعاء اور توجہ سے مولانا مملوک العلی کیلئے تعلیم کا دروازہ کھل گیا۔ اسکے بعد مولانا پھر جس عالم کے پاس گئے اس نے پڑھانے سے انکار نہیں کیا، مگر یہ علماء کون کون تھے اسکی تفصیل دریافت نہیں، صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا مملوک العلی نے اس وقت دہلی

(۱) حالات طیب مولانا محمد قاسم، ص ۳ (بھاول پور: ۱۲۹۷ھ)

(۲) عمر ایگان۔ آپ بیتی خواجہ احمد فاروقی۔ مشمولہ، نذر فاروقی۔ مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ص ۳۲-۳۱ (دہلی: ۱۹۸۷ء)

(۳) ارواح ثلاثہ۔ (بحوالہ روایات الطیب) (طبع اول، امداد الغربا، تھانہ بھون ص ۹۲ طبع جدید ص ۱۸۹-۱۹۰۔ مگر یہ

حکایت روایات الطیب تالیف مولانا قاری محمد طیب (تاج المعارف، دیوبند: ۱۹۳۵ء) میں موجود نہیں۔

میں موجود علماء میں سے دو بڑے اور نامور اساتذہ یعنی مولانا عبداللہ خاں علوی اور رشید الدین خاں دہلوی سے پڑھا، اول الذکر سے غالباً کم اور عارضی دوسرے سے طویل اور مسلسل۔

مولانا عبداللہ خاں علوی | مولانا مملوک العلی کے مولانا عبداللہ خاں سے تلمذ کا

صرف امیر شاہ خاں خورجوی کی ایک روایت میں ذکر آیا ہے۔ امیر شاہ خاں صاحب نے تقویۃ الایمان (حضرت شاہ اسماعیل شہید) کی تالیف کا واقعہ نقل کرتے ہوئے مولانا عبداللہ خاں علوی (وفات ۱۲۶۲ھ) کو مولانا مملوک العلی کا استاذ کہا ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

”مولوی اسماعیل صاحب نے تقویۃ الایمان اول عربی میں لکھی تھی، چنانچہ اس کا ایک نسخہ میرے پاس اور ایک نسخہ مولانا گنگوہی کے پاس اور ایک نسخہ مولانا نصر اللہ خاں خورجوی کے کتب خانہ میں بھی تھا۔ اسکے بعد مولانا نے اسکوار دو میں لکھا اور لکھنے کے بعد اپنے خاص لوگوں کو جمع کیا جن میں سید صاحب، مولوی عبدالحی صاحب، شاہ اسحاق صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب، مولوی فرید الدین صاحب مراد آبادی، مؤمن خاں، عبداللہ خاں علوی (استاذ امام بخش صہبائی و مولانا مملوک العلی صاحب) بھی تھے اور ان کے سامنے تقویۃ الایمان پیش کی اور فرمایا۔ (۱)

اگرچہ اس حکایت میں ایک بڑی غلطی ہے اور اسکے حوالہ سے تقویۃ الایمان کا جو نسخہ تالیف متعین کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں، کیوں کہ امیر شاہ خاں جس وقت کا یہ واقعہ نقل کر رہے ہیں تقویۃ الایمان اس سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی، تاہم یہ ممکن ہے کہ مولانا عبداللہ خاں مولانا مملوک العلی کے استاد ہوں اور مولانا مملوک العلی نے مولانا سے کچھ پڑھا ہو۔

مدرسہ غازی الدین حیدر میں مولانا عبداللہ سے تلمذ؟ | مولانا مملوک العلی کی تعلیم کا ذکر

کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ مولانا مملوک العلی نے مولانا رشید

(۱) امیر الروایات مجموعہ قصص و حکایات (روایات امیر شاہ خاں خورجوی) مرتب مولانا حبیب احمد کیرانوی ص ۸۹، ۳۷، طبع اول، ماہنامہ الہادی جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ (جنوری ۱۹۲۷ء) نیز ارواح ثلاثہ طبع اول ص: ۶۱، (امداد الغریب، سہارنپور بلاسنہ) طبع جدید ص ۸۰

الدین خاں سے دہلی کالج میں پڑھا ہے، تحریر ہے:

”۱۷۹۲ء میں جو مولوی عبدالحق کی تحقیق کی رو سے اس کالج کے قیام کا سنہ ہے اس وقت مولانا مملوک العلی کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی۔ اسلئے تسلیم کرنا چاہئے کہ دہلی پہنچ کر مولانا رشید الدین خاں کے حلقہ دُرس میں مولانا مملوک العلی اسی زمانہ میں شریک ہوئے، جب دہلی کالج میں مولانا رشید الدین کام کر رہے تھے۔ (۱)

مگر اس اطلاع کا یہ پہلو تو قطعاً درست نہیں کہ مولانا مملوک العلی نے مولانا رشید الدین خاں سے دہلی کالج میں پڑھا ہے، کیونکہ دہلی کالج کا آغاز وافتتاح رمضان المبارک ۱۲۴۰ھ (جنوری ۱۸۲۵ء) میں ہوا تھا، اس سے پہلے کالج کیلئے مدرس اول (یعنی صدر مدرس اور نائب صدر مدرس) کا انتخاب ہو چکا تھا، مدرس اول کیلئے مولانا رشید الدین خاں اور نائب مدرس کے عہدہ پر مولانا مملوک العلی کا تقرر ہوا تھا۔ جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت مولانا مملوک العلی کا تعلیمی دور ختم ہو چکا تھا، وہ جید فاضل تھے، ایسے کہ دہلی کے حلقوں میں ان کا ذکر اور چرچا تھا اور ان کو دہلی کالج کے مدرس دوم کے موقر عہدہ پر بے تکلف مقرر کر دیا گیا۔

ہو سکتا ہے کہ مولانا مملوک العلی کا کسی وقت مدرسہ غازی الدین حیدر سے تلمذ اور استفادہ کا رشتہ رہا ہو، مگر اس کی تفصیلات دریافت نہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا عبد اللہ خان علوی مدرسہ غازی الدین حیدر میں پڑھاتے ہوں مگر اس کی تفصیلات بھی مفقود ہیں۔ صرف یہ معلوم ہے کہ دہلی کالج شروع ہونے سے ایک سال پہلے (۱۲۳۹ھ ۱۸۲۴ء) میں مدرسہ غازی الدین حیدر میں مولانا عبد اللہ نام کے ایک عالم سبق پڑھاتے تھے، ان کے طلبہ میں مولانا مملوک العلی بھی ہوں یہ تو قرین قیاس نہیں، مگر ممکن ہے کہ اس سے پہلے کسی وقت مولانا مملوک العلی اس مدرسہ کے طالب علم رہے ہوں۔

مولانا رشید الدین خاں دہلوی سے تکمیل علوم | جس وقت مولانا مملوک العلی  
تعلیم حاصل کرنے کیلئے

(۱) سوانح قاسمی: مولانا مناظر حسن گیلانی ص ۱۰۱ ج ۱ طبع اول، دیوبند: ۱۳۷۳ھ



دہلی گئے تھے اس وقت خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ کے فیضان سے دہلی علم و کمال کا ایک گلستاں بنی ہوئی تھی، جہاں ہر طرف علم و عمل کے گل بوٹے کھلے ہوئے تھے، اور درس و تعلیم کے زمزمے جاری تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز ان کے بھائیوں کے دریائے علوم کے علاوہ (جو ایک عالم کا مرجع تھا) متعدد اکابر علماء کے درس اور تعلیم کی شہرت تھی اور حضرت شاہ صاحب کے خاندان کے متعدد شاگرد بھی اپنے اپنے طور پر علم کی جوت جگائے ہوئے تھے ان میں سے ہر ایک کی ذات مجمع علماء اور مرکز علوم تھی، یہاں بھی درس ہو رہا ہے، وہاں بھی سبق جاری ہے، ادھر بھی طلباء کا جمگھٹا ہے، ادھر بھی اہل ذوق جوق در جوق جا رہے ہیں۔ شاہ صاحب کے ایسے ہی ممتاز شاگردوں اور اصحاب درس میں سے ایک ممتاز نام مولانا رشید الدین خاں کشمیری دہلوی کا ہے۔ مولانا رشید الدین حضرت شاہ عبدالعزیز کے اہم شاگردوں میں شمار کئے جاتے تھے، اور ان کا خانوادہ ولی اللہی اور مدرسہ شاہ عبدالعزیز سے علیحدہ اپنا حلقہ درس تھا، مولانا مملوک العلی نے اعلیٰ ترین درسیات مولانا رشید الدین سے مکمل کیں، مگر گذشتہ معلومات کی طرح مولانا رشید الدین سے پڑھی ہوئی کتابوں کی تفصیل اور مولانا سے پڑھنے کا زمانہ بھی معلوم نہیں ہے۔

مولانا مملوک العلی نے مولانا رشید الدین کے حلقہ درس میں اعلیٰ ترین کتابوں کا درس لیا اور جو علوم اب تک پڑھے

کیا مولانا مملوک العلی کو مولانا رشید الدین سے اجازت حدیث حاصل تھی؟

تھے ان میں خاص مہارت بہم پہنچائی، مگر مولانا مملوک العلی کے مولانا رشید الدین خاں سے تلمذ کے تذکرہ میں یہ سوال بہت اہم ہے کہ مولانا مملوک العلی کو مولانا رشید الدین خاں سے اجازت و سند حدیث حاصل تھی یا نہیں، اس کی صراحت مجھے نہیں ملی۔ اور اس کا بھی ذکر نہیں ملتا کہ مولانا رشید الدین نے کسی اور عالم سے حدیث پڑھی ہو یا حدیث کی سند اور اجازت لی ہو۔ اور تا حال اس کا بھی کوئی ثبوت دریافت نہیں ہوا کہ مولانا مملوک العلی نے اپنے کسی شاگرد کو حدیث کی اجازت و سند عطا فرمائی ہو۔ کیا

مولانا مملوک العلی کا سلسلہ حدیث مولانا رشید الدین کے علاوہ کسی اور عالم سے متصل ہے جس کا ہمیں علم نہیں یا اس کا کوئی اور سبب ہے۔ بہر حال اس وقت تک معلوم مولانا کے عام و خاص شاگردوں میں سے کسی ایک شاگرد کی بھی سند حدیث مولانا کے واسطے سے نہیں ہے (۱) اور یقیناً اس کا بھی کوئی سبب ہے کہ مولانا کے عزیز ترین شاگردوں نے بھی (جن میں سے چند مولانا کے خانوادہ کے بھی ہیں) مولانا سے حدیث نہیں پڑھی، اور یہ سب حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کے حلقہ درس میں اجازت حدیث کے لئے حاضر ہوئے، حالاں کہ یہ بھی محقق ہے کہ دلی کالج میں حدیث کی تعلیم ہوتی تھی، پہلے باقاعدہ درس ہوتا تھا، بعد میں خطبات ہونے لگے تھے۔ (۲)

(۱) علمائے دیوبند کی سندات کے مجموعوں میں مولانا مملوک العلی سے اجازت حدیث کا کہیں ذکر نہیں ہے، اور دوسرے مآخذ میں بھی اس کی صراحت نہیں ملی۔ اس وقت ایسی تقریباً تیس کتابیں راقم سطور کے سامنے ہیں، جن میں مولانا مملوک العلی کا مفصل یا مجمل تذکرہ ہے، حضرت مولانا کے شاگردوں کے احوال و مؤلفات پر درجنوں مضامین و تالیفات کا ذخیرہ علیحدہ ہے۔ مگر مولانا مملوک العلی سے اجازت حدیث کی کوئی روایت و اطلاع مذکورہ مآخذ اور اس وقت تک دستیاب معلومات میں موجود نہیں ہے۔

اگرچہ التمہید میں مولانا مملوک العلی کے واسطے سے اکابر علمائے دیوبند کی چند سندیں ذکر کی گئی ہیں مگر وہ سب معقولات و فنون کی ہیں، حدیث شریف کی سند و اجازت کا ان میں اشارہ تک نہیں۔ بلکہ مولانا سندھی اور مولانا مفتی محمد شفیع دونوں نے صراحت کی ہے کہ مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے مولانا مملوک العلی (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے صرف ادب، معقولات اور فقہ پڑھا تھا، حدیث نہیں پڑھی۔ التمہید میں ہے:

”ان شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم و شیخ الاسلام رشید احمد کانا متحدین فی الطريقة الولی اللہیة اخذوا الفنون الادبیة والعقلیة والفقہیة عن شیخ واحد مولانا مملوک العلی النانوتوی الدہلوی“ (ص ۱۵۳)

اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی یہی کہا ہے:

”وہما (ای النانوتوی و الگنگوہی) قد اخذ سائر الفنون والکتب الدرسیة خلا علم الحدیث“

(سلسلہ الزبرجدنی اسناد الشیخ حسین احمد ص ۱۱)

مزید معلومات کے لئے رجوع فرمائیے۔

الف: التمہید لتعریف ائمة التجدید لمولانا عبید اللہ سندھی المؤلفہ بعد ۱۳۳۵ھ تصحیح و حواشی مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی (جام شہر سندھ: ۱۳۹۶) باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

مولانا مملوک العلی دہلی کالج کی خدمت سے فارغ تمام وقت (بلکہ رات کے بڑے حصہ میں) طلبہ کو گھر پر پڑھاتے تھے، جس میں حدیث کے اسباق کا معمول اگرچہ متوقع اور قابل قبول ہے، لیکن مولانا کے شاگردوں کے معلوم حالات اور تحریرات میں مولانا مملوک العلی کے حوالہ سے اجازت حدیث کا ذکر نہ ہونا حیرت انگیز ہے اور یہ صرف اتفاق نہیں۔

مولانا مملوک العلی کے مولانا رشید الدین سے تلمذ کی مدت اور تفصیل جو بھی رہی ہو مگر مولانا رشید الدین کی مولانا کے حال پر ہمیشہ شفقت

مولانا مملوک العلی پر مولانا رشید الدین  
خاں کی شفقت، ربطِ دلی اور عنایات

و عنایت کی نظر رہی اور مولانا بھی ہمیشہ استاد محترم کی خدمت میں حاضر رہے، مولانا رشید الدین مولانا مملوک العلی کی اعلیٰ صلاحیت اور نیاز مندی کے رشتہ کی وجہ سے مولانا

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... ب: مجموعہ اسانید (علمائے دیوبند) مرتبہ و مکتوبہ مولانا محمد ناصر بلیاوی ص ۱۷ (شاگرد علامہ انور شاہ کشمیری مکتوبہ و مؤلفہ رجب ۱۳۵۰ھ) اس میں بھی مولانا مملوک العلی کے واسطے سے حدیث کی کوئی سند موجود نہیں۔

ج: الازدیاد السنی علی الیانع الجنی جو مولانا مفتی محمد شفیع کے ان چار رسائل کا مجموعہ ہے: (۱) الدر المنضود فی اسانید شیخ الہند محمود (۲) المسک الازفر فی اسانید لشیخ محمد انور (۳) سلسلۃ الزبرجد فی اسانید الشیخ حسین احمد (۴) الاعرف الجلی من اسانید شیخ اشرف علی .

طبع اول (جو کشف الاستار عن رجال معانی لا آثار کے ساتھ چھپی تھی) دارالاشاعت دیوبند: ۱۳۴۹ھ طبع دوم دارالاشاعت دیوبند: ۱۳۶۰ھ

مولانا محمد ثانی حسنی نے لکھا ہے کہ:

مولانا خلیل احمد کے استاذ حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتوی ہیں، انہوں نے استاذ الکل مولانا مملوک العلی سے حدیث پڑھی اور انہوں نے مولانا رشید الدین خاں سے۔ (حیاتِ خلیل ص ۸۴، لکھنؤ: ۱۳۹۶ھ)

اور اس کے لئے مسلسلات شاہ ولی اللہ پر مولانا خلیل احمد کی تمہید کا حوالہ دیا ہے، مگر یہ اطلاع صحیح نہیں، مولانا خلیل احمد صاحب نے مولانا مظہر کے حوالہ سے اپنی جو سند نقل کی ہے وہ مولانا مظہر از شاہ محمد اسحاق ہے، اس میں، بلکہ مسلسلات کی کسی سند میں بھی مولانا مملوک العلی کا نام نہیں آیا، ملاحظہ ہو: مسلسلات مقدمہ مرتبہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا (شائع کردہ مولانا بدر عالم میرٹھی۔ از سہارنپور قبل ۱۳۵۸ھ)

(۲) مکتوب کریم الدین پانی پتی بنام اسپرنگر، محررہ ۴ جولائی ۱۸۵۲ھ (رمضان ۱۲۶۸ھ) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۱۷۹ (مجلد اردو کراچی: ۱۹۸۵ء) نیز، مرحوم دہلی کالج ص ۳۰، ۳۱ (دہلی: ۱۹۴۵ء)

مملوک العلی کی فرمائشوں (یا گذارشات) کی تعمیل کرتے اور مولانا مملوک العلی کیلئے بہتر سے بہتر موقعوں اور ذرائع معاش کی جستجو میں رہتے تھے۔ مولانا رشید الدین خاں کو اپنے اس شاگرد سے کیسی انسیت و محبت تھی اور وہ انکا کس قدر خیال رکھتے تھے اس کا مولانا مملوک العلی کو نائب مدرس دہلی کالج میں تقرر کرانے بلکہ اپنا نائب نامزد کرنے کے علاوہ اس سے بھی خوب اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا رشید الدین نے رد متعہ میں اپنی اہم تالیف ”صولتِ غضنفریہ“ (۱) مولانا مملوک العلی کی فرمائش پر لکھی تھی۔ کریم الدین پانی پتی کا قول ہے:

”صولتِ الضیغم مولانا مملوک العلی مدرس اول حال مدرسہ دہلی کے پاس خاطر سے تصنیف کی تھی“ (۲)

اس تالیف کے تین سال بعد جب دہلی کالج کا قیام ہوا اور اس میں مولانا رشید الدین کا مدرس اول کی حیثیت سے تقرر ہوا تو اسی وقت مدرس دوم کے عہدہ پر مولانا مملوک العلی فائز کئے گئے، ظاہر ہے کہ یہ تقرر مولانا رشید الدین کی ہدایت بلکہ کوشش کے بغیر نہ ہوا ہوگا۔

(۱) صولتِ غضنفریہ (بجواب بارقہ ضیغمیہ) مولانا کی اہم تصانیف میں شمار کی جاتی ہے اور ایک مرتبہ مطبع دارالسلام دہلی سے چھپی تھی، اس طباعت کا ایک صاف نسخہ جو بڑے سائز کے ص ۳۶۴ پر مشتمل ہے، راقم کی نظر سے گذرا ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی مختلف کتب خانوں (خدا بخش لائبریری پٹنہ) مولانا آزاد علی گڑھ اور رضا رام پور میں موجود ہیں، ملاحظہ ہو: فہرست مخطوطات فارسی رضا لائبریری ص ۹۶ جلد اول (رام پور: ۱۳۱۷ھ) نیز فہرست ذخیرہ شیفتہ کلکشن علی گڑھ، مرتبہ محمود حسن قیصر امر وہی۔ اندراج نمبر ۱۲۴ اور غیرہ۔

(۲) فرائد الدھر کریم الدین پانی پتی ص ۴۰۱ (مطبع العلوم مدرسہ دہلی: ۱۸۴۷ء) مگر فرائد الدھر میں مولانا رشید الدین کی اس تالیف کا نام غلطی سے صولتِ الضیغم لکھا گیا ہے، صحیح صولتِ غضنفریہ ہے۔

ایک وضاحت اور: مولوی عبدالقادر چیف رام پوری سفر اجمیر سے واپسی پر دہلی آئے تھے اور دہلی کے ممتاز علماء سے جن میں مولانا رشید الدین خاں بھی شامل ہیں ملاقاتیں کی تھیں، مولانا رشید الدین اس وقت صولتِ غضنفریہ کی تردید کا جواب لکھ رہے تھے جس کا مولانا رشید الدین نے عبدالقادر رام پوری سے ذکر کیا تھا، ملاحظہ ہو: علم و عمل (ترجمہ وقائع عبدالقادر خاں) بحواشی محمد ایوب قادری ص ۲۴۹ ج ۱ (کراچی: ۱۹۷۰ء)

مگر اسکے حاشیہ میں قادری صاحب نے اس ملاقات کے وقت مولانا کی ..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

## باب (۴)

### مولانا کے اساتذہ کے مختصر حالات

مولانا مملوک العلی کے تعلیمی سفر کے مشتملات سے معلوم ہو گیا ہے کہ مولانا نے چار نامور علماء سے تعلیم حاصل کی تھی اور برکت کیلئے ایک سبق حضرت شاہ عبدالعزیز سے بھی پڑھا تھا اسلئے حضرت شاہ صاحب کا نام نامی بھی مولانا کے اساتذہ میں شامل ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے علاوہ حضرت مولانا محمد قلندر جلال آبادی، حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی، مولانا عبداللہ خان مرشد آبادی دہلوی اور حضرت مولانا رشید الدین کشمیری دہلوی (رحمہم اللہ) مولانا کے استاذ ہیں۔ مذکورہ بالا علماء کرام کے علاوہ مولانا مملوک العلی کے کسی اور استاد کا نام اس وقت تک معلوم نہیں اور ان اساتذہ سے تعلیم واقادہ کی صحیح ترتیب اور زمانہ تعلیم بھی محقق نہیں، مگر قیاس چاہتا ہے کہ پہلے مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی سے پڑھا ہو، اس کے بعد حضرت مفتی الہی بخش کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا ہوگا، اور مفتی صاحب سے کسب فیض کے بعد دہلی کا سفر ہوا ہوگا، دہلی میں دو علماء سے

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... زیر تالیف کتاب کا نام صولت غفتر یہ لکھ دیا ہے اور اس کے ضمن میں شیفتہ کلکشن کے مندرجہ بالا نسخہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں صحیح نہیں، جیسا کہ ذکر ہوا، یہ واقعہ عبدالقادر رام پوری کی صراحت کے مطابق ۲۶ شوال ۱۲۳۸ھ ۶ جولائی ۱۸۲۳ء کا ہے اور صولت غفتر یہ ۱۲۳۷ھ میں لکھی جا چکی تھی، جیسا کہ قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں صراحت ہے۔ جس کتاب کا مولانا رشید الدین نے عبدالقادر چیف سے ذکر کیا ہوگا وہ صولت غفتر یہ کے جواب کا جواب یا کوئی اور تالیف ہوگی۔

یہاں یہ اطلاع بے محل نہ ہوگی کہ مولانا رشید الدین کی اکثر تالیفات کے قلمی نسخے خدا بخش لاہوری پٹنہ میں محفوظ ہیں ملاحظہ ہو: ”مراۃ العلوم، فہرست مخطوطات فارسی خدا بخش لاہوری پٹنہ۔ اور مختلف کتب خانوں اور ذخیروں میں مولانا رشید الدین خاں کی تالیفات کے متعدد نسخے موجود ہیں۔

پڑھا ہے آخری استاد مولانا رشید الدین خاں معلوم ہوتے ہیں اور یہ چاروں استاد خاندان ولی اللہی کے فیض یافتہ اور دامن گرفتہ ہیں، ان بزرگوں سے تلمذ و نیاز مندی کے علاوہ حضرت شاہ عبدالعزیز سے براہ راست اجمالی تلمذ بھی حاصل ہوا، اور اس گھرانہ کی محبت و عظمت کا پودا دل میں اگا ہوگا، اور یہی نسبت و نیاز مندی مولانا کو لے گئی ہوگی۔ یہاں مولانا کے مذکورہ بالا چاروں استاذوں کے مختصر حالات ذکر کئے جا رہے ہیں جس کی ابتدا حضرت شاہ عبدالعزیز کے مبارک تذکرہ سے ہو رہی ہے۔

مسند ہند، مرجع کل، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ امام ہمام حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فرزند والا شان تھے، ۲۵ رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ (۱۲ اکتوبر ۱۷۴۶ء) کی شب میں ولادت ہوئی، غلام حلیم تاریخی نام ہے۔

مسند ہند حضرت شاہ

عبدالعزیز محدث دہلویؒ

والد ماجد اور مولانا شاہ نور اللہ بڈھا نوئی سے تعلیم حاصل کی، والد ماجد کی وفات کے بعد درسیات کی چند کتابوں کی حضرت شاہ محمد عاشق پھلتی سے تکمیل فرمائی اور سلوک میں بھی شاہ محمد عاشق پھلتی کی رہنمائی اور سرپرستی مشعل راہ بنی، علم و سلوک کے آخری مرحلوں کی تکمیل جاری تھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) میں رحلت فرما گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز آبا ئے کرام کی مسند علم و ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے اور اپنی غیر معمولی صلاحیت و کمال اور مسلسل کوشش سے اس مسند کی حرمت و عظمت کو غیر معمولی بلندیوں تک پہنچا دیا اور اس میں اس قدر بے پناہ اضافہ فرمایا کہ اس کو قیامت تک کیلئے جاوداں کر دیا اور اس کی بدولت پورا ملک بلکہ سارا برصغیر علم ولی اللہی، افادات ولی اللہی، فکر ولی اللہی اور طریقہ ولی اللہی کا نام لیوا اور دست گرفتہ ہو گیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے علم و سلوک نیز رجال اصلاح و تربیت کی ایسی بڑی جماعت تیار فرمائی اور درس و تعلیم کے حلقوں کو ایسی آب و تاب بخشی اور تربیت و سلوک اور اصلاح رسوم و معاشرہ اور مدارس اسلامیہ کی ایسی جاندار اور شاندار تحریک چلائی اور تعقیق و رسوخ فی الدین کا ایسا نعرہ بلند کیا کہ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک

سلسلہ ولی اللہی کا نام سورج کی طرح منور و تاباں ہو گیا اور یہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے کمال علم اور خدمت و محنت کا ہی اثر ہے کہ برصغیر ہند میں علم و معرفت کے تمام سلسلے اور خدمت حدیث کے تمام حلقے اسی کے اسیر اور خادم بنے ہوئے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز مسند درس کی ثروت و وسعت اور اس کی ہمہ گیری میں منفرد اور علم و فضل کے تمام موضوعات و مباحث بلکہ ایک ایک پہلو اور گوشہ پر بے مثال نادر روزگار نظر رکھنے والے ایسے برگزیدہ علماء میں سے تھے کہ جن کی مثال ہر دور میں انگلیوں پر گنی گئی ہے اور جن کے فیوض و کمالات سے عالم کا عالم ہمیشہ بہتے دریاؤں کی طرح سیراب و مستفید ہوا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے علوم و کمالات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے اور اس طرح صدرنگ پہلوؤں پر پھیلا ہوا ہے کہ اس کا صحیح تذکرہ اور مکمل تصویر کشی تقریباً ناممکن ہے، علوم میں وہ دسترس کہ اللہ اکبر! بڑوں بڑوں کی وہاں رسائی نہ ہو، فیض مآبی اور درس و افادہ کی وسعت کا یہ عالم کہ برصغیر کے اس کونہ سے اس کونہ تک ہی نہیں ہندوستان کی سرحدوں سے گذر کر افغانستان، ترکستان، بخارا اور ماوراء النہر بلکہ مصر و شام تک اس کے قلمرو میں شامل تھے، اور دنیا کے ایک بڑے حصہ پر حضرت شاہ صاحب کی علمی حکمرانی کا پرچم لہرا رہا تھا، اور اک دنیا حضرت شاہ صاحب کے تبحر علمی اور وسعت نظر سے حیران تھی۔ حضرت شاہ صاحب علم و کمال کی جن رفعتوں پر فائز تھے اس کا احاطہ ہی نہیں بلکہ تذکرہ بھی بڑے بڑے اہل نظر کے لئے آسان نہیں۔ حضرت شاہ صاحب کس مرتبہ کے عالم تھے اس کا اس سے اندازہ کیجئے کہ شاہ صاحب خود فرماتے تھے کہ جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور اپنی بساط کے مطابق ان کو یاد بھی رکھتا ہوں، ایک سو پچاس علوم ہیں۔ ارشاد ہے:

” (علمی کہ دیدہ ام و یاد ہم بقدر خود دارم یک صد و پنجاہ علم است کہ و نصف اں مردمان سابق و نصفش دریں است تصنیف شدہ“ (۱)

یعنی شاہ صاحب کو ایک سو پچاس علوم پر ایسی دسترس تھی کہ وہ گویا نوکِ زبان تھے جب ان علوم میں سے کسی علم کے متعلق کوئی مسئلہ یا بحث سامنے آئی اس کے تمام مباحث

(۱) ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۳۶ مرتبہ ۱۲۳۳ھ (طبع اول میرٹھ: ذی قعدہ ۱۳۱۲ھ)

اور تحقیقات یکنخت زبان پر جاری اور گویا دست بستہ حاضر ہو جاتی تھیں۔ حافظہ کی قوت اور ذہن کی براتی کا یہ حال اس وقت کا ہے جب شاہ صاحب کی عمر چوتتر (۷۴) سال تھی اور وہ اپنے بھائیوں کی وفات کے صد مات اور بے شمار بیماریوں کی وجہ سے زار و نزار ہو چکے تھے اور اس کے صرف چھ سال بعد وفات پا گئے تھے۔ جب اس عمر میں اور ایسے حالات میں ذہن کی یہ کیفیت تھی اور علوم کے استحضار کا یہ عالم تھا تو جوانی میں وہ ذہن کیسا ہوگا، اس کے بارے میں سوچنا بھی آسان نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحب کا حلقہ درس حضرت شاہ ولی اللہ کی وفات (۱۱۷۶ھ) کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا، اس وقت شاہ عبدالعزیز کی عمر صرف سولہ سال تھی، یہ حلقہ درس اس وقت سے شاہ عبدالعزیز کی زندگی کے آخری ایام (تقریباً چونسٹھ سال) تک جاری رہا، جس کی نوعیت اگرچہ ہمیشہ یکساں نہیں رہی مگر اس خدمت میں کبھی وقفہ بھی نہیں ہوا۔ شاہ صاحب سے جن اکابر علماء نے استفادہ کیا ان کی علمی قدر و منزلت اور خدمت و کمال کا تذکرہ آسان نہیں ہے، یہ ایک بڑا دریا تھا جو ایک زمانہ تک پوری محنت و قوت سے نہایت روانی اور پورے جوش و خروش سے بہتا رہا اور اس کے قطروں سے سیراب افراد و علماء آج تک امت کی پیاس بجھا رہے ہیں۔

اس کے علاوہ برصغیر میں علم دین کے جس پہلو کو دیکھئے اس کا رشتہ حضرت شاہ صاحب کی ذات گرامی سے جڑا ہوا ہے اور جس اسلامی ملی کام پر نظر ڈالئے وہ حضرت شاہ صاحب کا اثر اور فیضان معلوم ہوتا ہے۔ جس کی روشنی آج تک اسی طرح منور و تابناک ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ صدیاں اور نسلیں بھی حضرت شاہ صاحب کے علوم و برکات سے یوں ہی فیضیاب و سیراب رہیں گی۔

علم و فن کی کونسی وادی ہے جس میں شاہ صاحب کے نقوش قدم عیاں نہیں، تبلیغ دین، اصلاح معاشرہ، تربیت و اخلاق، تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف، شعر و انشاء، وعظ و تقریر، بحث و تحقیق اور جدل و مناظرہ کا کونسا پہلو ایسا ہے جو حضرت شاہ صاحب کی سرپرستی اور ان کے علوم کا ممنون و احسان نہیں۔ بلاشبہ حضرت شاہ صاحب کی ذات گرامی برصغیر کی



علمی دینی تاریخ میں ایک سرچشمہ ہدایت اور منارہ نور کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں آج بھی ویسی ہی فیض مآبی، وہی ہی کشش اور تربیت و اصلاح کی ویسی ہی قوت موجود ہے جیسی سواد و سو برس پہلے تھی۔

حضرت شاہ صاحب کی ایک اور بہت بڑی خدمت اور کارنامہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اسلامی اصول و عقائد کے خلاف اٹھنے والی تمام آوازوں اور فتنوں کا برملا مقابلہ کیا اور ردِ شیعیت پر جو اس زمانہ میں ایک بڑا امتحان اور دینی خدمت تھی خاص طور سے توجہ کی اور شیعوں کی تردید میں بہت سی تحریرات و فتاویٰ کے علاوہ تحفہ اثنا عشریہ جیسی بے نظیر کتاب تصنیف فرمائی، جو آج تک قوت استدلال کے علاوہ علمی وزن اور حسن تحریر میں بھی بے نظیر ہے۔

نیز اس زمانہ میں مسلمانوں کے معاملات و معاشرت میں جو بہت سی خرابیاں در آئیں تھیں، ان کی اصلاح کی بھی مسلسل کوشش فرمائی اور یہی تحریک اصلاح و تربیت تھی جو حضرت سید احمد شہید اور شاہ محمد اسماعیل شہید کیلئے نمونہ اور مشعل راہ بنی۔

شاہ صاحب کی تصنیفات اور مولفات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، سب کتابیں عربی فارسی میں تھیں، اب ان میں سے اکثر کے اردو ترجمے اور توضیحات و حواشی شائع ہو چکے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی اسی سال کی عمر میں ۱۲۳۹ھ (۶ جون ۱۸۲۳ء) کو دہلی میں وفات ہوئی، قبرستان مہندیان میں حضرت شاہ ولی اللہ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی | قصبہ کاندھلہ ضلع مظفرنگر کے ایک پرانے دینی علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں، جس

کا سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور جس کی ابتدائی کڑیاں اس طرح ہیں:

”مولانا مفتی الہی بخش، خلف مولانا حکیم محمد عرف شیخ الاسلام، بن حکیم قطب الدین بن حکیم عبدالقادر بن مولانا محمد شریف بن مولانا محمد اشرف“

۱۱۶۲ھ (۱۷۴۸-۴۹ء) میں پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و درسیات کی تکمیل کے بعد متوسطات اور اعلیٰ درسی کتابوں کی تعلیم و تکمیل کے لئے تقریباً چودہ سال کی عمر میں دہلی پہنچے، یہ حضرت شاہ ولی اللہ کی زندگی کے غالباً آخری ایام تھے اسلئے حضرت شاہ صاحب سے براہ راست تعلیم و استفادہ کا موقع نہیں ملا، لیکن حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد جب حضرت شاہ عبدالعزیز نے درس کا آغاز کیا تھا، اس وقت جو پانچ طالب علم سب سے پہلے تعلیم حاصل کرنے کیلئے شاہ عبدالعزیز کی مجلس درس میں بیٹھے ان میں حضرت مفتی الہی بخش بھی شامل تھے۔ مفتی صاحب نے متوسطات سے اعلیٰ ترین کتابوں تک سب کتابیں حضرت شاہ عبدالعزیز سے پڑھیں، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر متعدد جماعتوں اور سبقوں میں ساتھ تھے، دونوں برادران ساتھ ہی درسیات سے فارغ ہوئے اور حضرت شاہ صاحب نے اعلیٰ درجہ کی سند سے نوازا۔ غالباً تعلیم کے آخری دور میں شاہ عبدالعزیز سے بیعت ہو گئے تھے۔ شاہ صاحب کی خدمت میں رہ کر تصفیہ باطن اور ارشاد و سلوک میں بھی کمال حاصل کیا اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔

مفتی صاحب نے حضرت سید احمد شہید سے بھی استفادہ کیا اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے اور ایک کامل شخص کی رہنمائی اور خاص مشورہ کے بعد اپنے چھوٹے بھائی مولانا کمال الدین سے بھی بیعت ہو کر استفادہ کیا اور اجازت و خلافت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس طرح مفتی صاحب کی ذات میں تصوف کے متعدد سلسلوں اور خانوادوں کے کمالات یکجا ہو گئے تھے، جس کے بے حد منافع و اثرات ظاہر ہوئے، مفتی صاحب کی علمی تدریسی زندگی کا آغاز نواب ضابطہ خاں (خلف نواب نجیب الدولہ) کے مرکز حکومت غوث گڑھ میں ملازمت و قیام سے ہوا، حضرت شاہ عبدالعزیز نے ضابطہ خاں کے اصرار پر مفتی صاحب کو غوث گڑھ جانے کی اجازت عطا فرمائی تھی، مفتی صاحب ضابطہ خاں کی ریاست میں صدر مفتی کے عہدہ پر فائز رہے، اس عہدہ و منصب کی وجہ سے مفتی کا جو خطاب ملا تھا وہ مفتی صاحب کے نام کا گویا ایسا جز بن گیا ہے کہ اب اس کو مفتی صاحب کے نام اور تعارف سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔

مفتی صاحب نواب ضابطہ خاں کی ملازمت سے علیحدہ ہونیکے بعد کوئٹہ، راجستھان، بھوپال اور سہارن پور میں متعدد ملازمتوں پر فائز رہے اور مختلف دینی علمی خدمات انجام دیتے رہے، وطن کے آس پاس چند بستیوں، تھانہ بھون، امیرنگر وغیرہ میں بھی کم یا زیادہ قیام رہا۔ آخر عمر (تقریباً سنہ ۱۲۳۰ھ ۱۸۱۵ء) میں وطن آگئے تھے پھر وفات تک یہیں رہے، تعلیم و تدریس، ارشاد و تبلیغ، تصنیف و تالیف، وعظ و تلقین وغیرہ دینی مشاغل جو زندگی کا مقصد اور تمام ملازمتوں کے باوجود ہمیشہ سب سے بڑی مصروفیت رہی، اس میں ہمہ وقت انہماک رہا اور اسی میں مشغول رہتے ہوئے وفات پائی۔

تعلیم و سلوک سے فارغ ہو کر اپنے وطن اور علاقہ میں وعظ و تلقین اور تحریرات و رسائل و فتاویٰ کے ذریعہ سے طریقہ سنت کی ترویج، رسوم و بدعات کی تردید اور صحیح اسلامی معاشرہ کے قیام کیلئے متواتر اور سخت جدوجہد کی، جس کے نہایت مفید اور دور رس نتائج و اثرات ظاہر ہوئے۔ اس علاقہ میں تعلیم کے احیاء، دینی مراکز کی تجدید اور تعلیم و تدریس کے حلقے عام ہونے میں حضرت مفتی صاحب کا بہت بڑا اور خاص حصہ ہے، اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس خطہ سہارنپور و مظفرنگر اور اس کے قصبات اور بستیوں میں ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد میں جو بڑے علماء، اہل کمال اور مصلحین اٹھے اور گویا برصغیر کے دینی افق پر چھا گئے اور ابر رحمت کی طرح پوری دنیا ان سے فیضیاب ہوئی، ان میں بہت سے حضرت مفتی الہی بخش صاحب کے حلقہ درس کے پروردہ یا مفتی صاحب کے شاگردوں کے تربیت یافتہ اور شاگرد ہیں، اسلئے ہمیں یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ اس خطہ سے احیائے دین اور فروغ و اشاعت علم کی جو طاقتور اور نہایت شاندار اور بھرپور آواز اٹھی اس کے بنیادی مراجع اور سرچشموں میں سے لیک خاص بلکہ اہم ترین سرچشمہ مفتی صاحب کی ذات گرامی تھی، مفتی صاحب کے منجملہ اور بہت سے ممتاز اور اصحاب فیض علماء کے ایک خاص اور ممتاز شاگرد مولانا مملوک العلی صاحب بھی تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

حضرت مفتی صاحب نے غالباً حضرت شاہ عبدالعزیز سے تعلیم کے زمانہ میں ابتدائی اور اوسط کتابیں پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، یہ حلقہ درس بعد میں بذات خود ایک

بڑے مرکز علم اور دارالعلوم کی صورت اختیار کر گیا تھا، جس میں معمول و مروج نصاب کی درسیات کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے علاوہ فقہ، تصوف اور طب کے اسباق نیز ان کی عملی مشق اور ان کے مطابق مزاج کی تربیت اس حلقہ درس کا خاص امتیاز اور اہم حصہ تھی۔

درس و تعلیم اور ارشاد و تربیت کی مصروفیت کے علاوہ مفتی صاحب کی تحریرات و تالیفات کا بھی ایک خاصا بڑا اور وسیع سرمایہ یادگار ہے، جو متنوع موضوعات اور تینوں مشہور اسلامی زبانوں، عربی، فارسی، اردو پر مشتمل ہے۔ مفتی صاحب کو اردو شعر و سخن کا بھی اعلیٰ درجہ کا ذوق تھا، کئی کتابوں کے عربی فارسی اردو میں منظوم ترجمے، تینوں زبانوں میں قصائد و منظومات اور دوسرے عنوانات پر واقع سرمایہ اور کلام کے مجموعے موجود ہیں۔

اس وقت تک حضرت مفتی صاحب کی ایک سو پانچ تالیفات و مصنفات دریافت ہوئی ہیں، جن میں سے سینتیس (۳۷) عربی میں، انسٹھ (۵۹) فارسی میں اور آٹھ (۸) اردو میں ہیں، مگر یہ مفتی صاحب کی کل تالیفات نہیں، خیال ہے کہ مفتی صاحب کی متعدد تالیفات و تراجم وغیرہ ضائع ہو چکے ہیں، اس ذخیرہ میں سے صرف گیارہ کتابیں اب تک چھپی ہیں، جس میں سے اختتام مولانا روم کو سب سے زیادہ شہرت و اہمیت حاصل ہے، حضرت مولانا روم کی مثنوی معنوی جس کو ”ہست قرآن در زبان پہلوی“ تک کہا گیا ہے نا تمام رہ گئی تھی۔ مولانا روم نے مثنوی کے چھٹے دفتر کو ایک قصہ بیان کرتے کرتے اسکا مقصد اور انجام ذکر کئے بغیر اچانک ختم کر دیا تھا اور اپنے خاص مخاطب شیخ بہاء الدین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا، اس داستان کا باقی حصہ ایسے شخص کی زبان اور قلم سے پورا ہوگا جو زندہ و بیدار دل رکھتا ہوگا، اور معرفت میں کامل و مکمل ہوگا، فرمایا:

باقی ایں گفتہ آید بے زباں در دل آں کس کہ دارد نور جاں

مولانا روم کی وفات (۶۷۲ھ) کے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال بعد حضرت مفتی صاحب کے ذریعہ یہ نا تمام قصہ اپنے انجام کو پہنچا اور مثنوی مولانا روم کے چھٹے دفتر کی اعلیٰ درجہ میں تکمیل ہوئی، یہی حصہ یا دفتر اختتام یا تکملہ مثنوی مولانا روم کے نام سے مشہور و معروف ہے اور تقریباً پونے دو سو سال سے متواتر شائع ہو رہا ہے۔

کبرسنی کے باوجود مفتی صاحب کے اوقات دینی علمی خدمات سے گھرے ہوئے تھے کہ اسی میں مولانا کا اچانک وہ وقت آ گیا جس سے کسی ذی روح کو نجات نہیں، مفتی صاحب کی اتوار کی شام ۱۵ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۵ھ (۱۳ دسمبر ۱۸۲۹ء) کو مغرب کے وقت وفات ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دوشنبہ ۱۶ جمادی الاخریٰ مطابق ۱۴ دسمبر کو خاندانی قبرستان میں، جو کاندھلہ کی موجودہ عید گاہ سے ملحق ہے، اپنے بھائیوں مولانا امام الدین، شاہ کمال الدین اور والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ رحمہ اللہ ورضی عنہ

### حضرت مولانا سید محمد قلندر محدث جلال آبادی

حضرت مولانا محمد قلندر جلال آبادی کے حالات بہت کم معلوم ہیں راقم نے کئی سال پہلے مولانا پر ایک مضمون لکھا تھا جس پر کوئی اضافہ نہیں ہوا اس لئے وہی یہاں بھی درج کیا جا رہا ہے۔ نور

ایک زمانہ تھا کہ نجیب آباد (جو آج کل ضلع بجنور یوپی کا ایک قصبہ ہے) مجمع علوم اور مرکز علماء تھا، نواب نجیب الدولہ کی علم پروری اور قدردانی کی وجہ سے دور دراز سے علماء اور شریف خاندانوں نے نجیب آباد کا رخ کیا۔ اور انہیں معزز خانوادوں میں ایک گھرانہ سادات کا بھی تھا جو نجیب الدولہ کی وفات اور ضابطہ خاں کے غوث گڑھ کو مستقر بنا لینے کے بعد غوث گڑھ منتقل ہوا، غوث گڑھ کی تباہی کے بعد یہ خاندان جلال آباد پہنچا اور وہیں کاہور ہا۔ اسی خاندان کے ایک فرد فرید حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی ہیں۔

مولانا محمد قلندر کی ولادت و طفولیت کی نسبت معلومات دستیاب نہیں۔ تعلیم شروع سے آخر تک خاتم مثنوی مولانا روم، حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی سے حاصل کی۔ تمام علوم میں اپنے استاذ کا عکس اور ثنی تھے۔

مولانا محمد قلندر کے یہاں بھی ہر وقت درس و تدریس کا سلسلہ رہتا تھا، خصوصاً مولانا کا سلسلہ درس حدیث اس دور کا ممتاز ترین حلقہ درس تھا، جس میں دور دراز علاقوں کے طلباء

بھی شریک رہتے تھے۔ مولانا محمد قلندر علم و فضل، سلوک و معرفت اور اصلاح و تذکیر میں یکساں بلند پایہ رکھتے تھے اور کشف و کرامات میں شہرہ آفاق تھے۔

مولانا محمد قلندر کا ایک خاص وصف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبتِ حضوری ہے، مولانا محمد قلندر ہر روز شب میں اور بیداری میں بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوتے تھے۔ مولانا محمد قلندر کی علمی و روحانی صلاحیتوں اور دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں شرفِ حضوری کی وجہ سے اس دور کے علماء و مشائخ کی نظر میں خاص احترام اور بے حد وقعت تھی۔

مؤلف تذکرہ رحمانیہ لکھتے ہیں:

”یہ بزرگ بڑے پایہ کے عالم تھے۔ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو نسبتِ حضوری حاصل تھی۔ خواب میں زیارت سے مشرف ہوتے تھے۔ اپنے علاقہ میں نہایت صاحب کشف و کرامات مانے جاتے تھے، علم و فضل کے ساتھ تقویٰ، نیکی اور پرہیزگاری میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔“ (۱)

مولانا محمد قلندر نے طویل علالت کے بعد ۱۲۶۰ھ میں وفات پائی۔ مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی نے بطریق تخریجہ تاریخ کہی:

جو سید محمد قلندر مرا	تو دل غم سے ٹکڑے مرا ہو گیا
وہ تھا سید پاک مقبول حق	ہوا اس کے غم میں ہر اک مبتلا
حسن جب گیا فکر تاریخ میں	تو ہاتف نے بس اس سے اتنا کہا
”فقد فاز فوزاً عظیماً“ حسن	یہ تاریخ ہے اس کی نص خدا
بشرطیکہ اعداد الفاظ نزع	کرے لفظ آیت سے لکھ کر جدا (۲)

آخر میں مولانا سید محمد قلندر کے ان تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی علمی و عرفانی

(۱) تذکرہ رحمانیہ۔ تالیف مولانا عبدالحلیم انصاری، ص ۳۵ (پانی پت ۱۳۵۷ھ)

(۲) ابیاض مولانا ابوالحسن ورق ۹ اب فقد فاز فوزاً عظیماً کے کل عدد ۱۳۸۷ ہوتے ہیں اگر لفظ نزع کے اعداد

۱۲۷، اس میں سے نکال دے جائیں تو کل ۱۲۶۰ باقی رہ جاتے ہیں اور یہی مولانا قلندر کا سنہ وفات ہے۔

خدمات کے گہرے نقوش ہماری ملی تاریخ میں اس طرح مرتسم ہیں کہ ان کا ذکر کئے بغیر ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی، مذہبی اور روحانی تاریخ کا ہر جائزہ نامکمل و نامکمل رہے گا۔ یہ نامور تلامذہ ہیں، استاذ العلماء مولانا مملوک العلی نانوتوی، مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر کی، مولانا شیخ محمد محدث تھانوی اور مولانا غوث علی شاہ قلندر پانی پتی۔

مولانا مملوک العلی نے مولانا محمد قلندر سے کیا تعلیم حاصل کی اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، مولانا عاشق الہی میرٹھی کی ایک عبارت سے مجمل اطلاع ملتی ہے، مولانا لکھتے ہیں:

نیز سنا ہے کہ آپ (مولانا مملوک العلی) نے معقول کا کچھ حصہ مولوی قلندر بخش سے بھی پڑھا ہے۔ (۱)

راقم سطور کو مولانا احمد اللہ کیرانوی کی روایت پہنچی ہے، وہ اپنے استاذ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا مملوک العلی نے حدیث کی چند کتابیں مولانا محمد قلندر سے پڑھی تھیں۔

مولانا قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی نے چند اعلیٰ درسی کتابیں اور صحیح بخاری کا ایک تہائی حصہ مولانا محمد قلندر سے پڑھا تھا۔ مؤلف تذکرہ رحمانیہ لکھتے ہیں:

صاحب سوانح (مولانا قاری عبدالرحمن) کو تحصیل علوم کا شوق آپ کے پاس لے گیا۔ حضرت ممدوح سے آپ نے ثلاث صحیح بخاری اور بعض دیگر کتب دینیات پڑھیں۔ (۲)

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی نے مشکوٰۃ کا چوتھائی حصہ مولانا محمد قلندر سے پڑھا، حضرت حاجی صاحب نے ایک مجلس میں اس تلمذ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

بعد ازاں بالہام غیبی و بجذبہ لذت کلام نبوی مشکوٰۃ شریف کا ایک ربع قراءۃ عاشق زار رسول انور حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی پر گزرا۔ (۳)

(۱) تذکرہ الرشید مولانا عاشق الہی میرٹھی ص ۲۷ ج ۱ (طبع اول میرٹھ)

(۲) تذکرہ رحمانیہ ص ۳۶

(۳) شائم امداد المشتاق ص ۱۰

حضرت میا نجیو نور محمد صاحب کی خدمت میں حضرت حاجی امداد اللہ کے حاضر ہونے اور حضرت میا نجیو صاحب سے پہلی ملاقات کا ذریعہ بھی مولانا محمد قلندر صاحب ہی تھے، حضرت حاجی صاحب نے میا نجیو نور محمد صاحب کی خدمت میں پہلی حاضری (۱) کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”ایک دن حضرت استاذی مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے اضطراب کو دیکھ کر بکمال شفقت و عنایت فرمایا کہ تم کیوں پریشان ہوتے ہو، موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے وہاں جاؤ اور حضرت میا نجیو صاحب سے ملاقات کرو شاید مقصودِ دلی کو پہنچو اور اس حیث و بحث سے نجات پاؤ۔ جناب ایشان فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت مولانا سے میں نے یہ سنا متفکر ہوا اور دل میں سوچنے لگا کہ کیا کروں، آخر بلا لحاظ سواری وغیرہ میں نے فوراً راہ لوہاری کی لی۔“ (۲)

مولانا شیخ محمد تھانوی موصوف نے معقولات کی کتابیں مولانا محمد قلندر سے پڑھیں تھیں، مولانا شیخ محمد تحریر فرماتے ہیں:

”امادرفن معقول ہم ازیں خاندان عالیشان بذریعہ مولانا الحاج المدرس مولوی مملوک العلی نانوتوی مرحوم و مولانا الحاج محمد قلندر جلال آبادی مغفور۔“ (۳)

مولانا محمد عمر چر تھاؤلی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شیخ محمد نے نحو و صرف کی تمام کتابیں مولانا عبدالرحیم تھانوی اور مولانا محمد قلندر سے پڑھیں تھیں۔ (۴)

(۱) راقم سطور کا خیال ہے کہ حضرت میا نجیو نور محمد صاحب کی خدمت میں حضرت حاجی صاحب کی پہلی حاضری غالباً ۱۳۵۸ھ کے آخر میں ہوئی، اس کا قرینہ یہ ہے کہ ۱۲۵۶ھ تک حضرت حاجی صاحب کے پہلے شیخ حضرت مولانا نصیر الدین نقشبندی حیات تھے انکی زندگی میں کسی دوسرے شیخ سے رجوع ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ کئی سال حضرت میا نجیو صاحب کی تلاش و جستجو میں رہے (شائم امدادیہ ص ۱۳) اور رمضان ۱۲۵۹ھ میں حضرت میا نجیو صاحب کا وصال ہو جاتا ہے، میا نجیو کا وصال کے وقت یہ فرمانا کہ ”میرا ارادہ تھا کہ تم سے مجاہدہ و ریاضت لوڑگا مشیت باری سے چارہ نہیں ہے عمر نے وفانہ کی“ شائم ص ۱۶۰ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب میا نجیو صاحب کی خدمت میں چند ماہ رہے۔

(۲) شائم امدادیہ ص: ۱۱، امداد المشتاق ص: ۱۰

(۳) دلائل الاذکار فی اثبات الجہد والاسرار ص: ۳۷ (دہلی ۱۲۷۰ھ)

(۴) نثر حالات محمدیہ ص: ۵، عثمانی میرٹھ ۱۲۹۷ھ



مولانا غوث علی شاہ قلندر پانی پتی نے مثنوی مولانا روم کا دفتر اول مکمل اور دوسرے دفتر کا کچھ حصہ مولانا محمد قلندر سے پڑھا، اسکا مولانا غوث قلندر نے خود ذکر کیا ہے۔ (۱)

مولانا عبداللہ خاں علوی کے متعلق تفصیلی معلومات کیاب ہیں، مختلف تذکروں اور اطلاعات سے صرف

یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موضع شمس آباد، ضلع فرخ آباد، یوپی کے ایک پٹھان خاندان سے نسبت رکھتے تھے، والد کا نام قاسم علی خاں تھا، سنہ ولادت معلوم نہیں۔

حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کے علاوہ اور متعدد علماء سے تعلیم حاصل کی۔ مختلف علوم و فنون میں ماہر ہو گئے تھے، خصوصاً فارسی ادب و انشاء میں فخر روزگار، اردو کے اپنے

دور کے مرجع اور فارسی کے بڑے شاعر بھی تھے، کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔

قادر بخش صابر دہلوی نے (گلستانِ سخن میں) مولانا کے اردو کے چند شعر اور فارسی کلام کا مفصل انتخاب درج کیا ہے۔ (۲)

مولانا عبداللہ خاں علوی طب میں بھی خاص دستگاہ رکھتے تھے، متعدد طلباء نے طب مولانا سے پڑھی جن میں حکیم اصغر حسین فرخ آبادی اپنے عہد کے ممتاز طبیب تھے، امیر

شاہ خاں خورجوی کی ایک روایت کے مطابق مولانا مملوک العلی بھی مولانا کے شاگرد تھے۔

مولانا عبداللہ خاں کی زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں گزرا اور تعلیم و تدریس میں مشغول رہے، آخر عمر میں نواب محمد علی خاں کے اصرار پر شمس آباد چلے گئے تھے، نواب صاحب

نے مولانا کیلئے معقول وظیفہ جاری کر دیا تھا، آخر تک وہیں رہے، مولانا کی شمس آباد میں ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۸ء) میں وفات ہوئی، مولانا کے خاص شاگرد امام بخش صہبائی نے قطعہ تاریخ کہا ہے۔ (۳)

(۱) تذکرہ غوثیہ منسوب بہ مولانا گل حسن ص: ۲۳

(۲) گلستانِ سخن قادر بخش صابر ص ۲۲۲، ۲۲۱ تا ۲۲۲ جلد دوم مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی (لاہور: ۱۹۶۶ء)

(۳) مولانا عبداللہ خاں علوی کے متعلق مزید معلومات کیلئے ملاحظہ ہوں: گوہرین نامہ احسن اللہ خاں ثاقب

(لکھنؤ: ۱۳۳۱ھ)۔ نزہۃ الخواطر مولانا عبداللہ خاں ص ۳۱۲ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۳۹۹ھ)۔ ارواحِ ثلاثہ ص ۸۰

(مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون)۔

علوی کہ جو او نداد کس داد سخن      چوں او نہ رسیدہ کس بہ فریاد سخن  
ناگہ ز جہاں رخت اقامت بر بست      ہاتھ گفتہ فقاذ بنیاد سخن (۱)

مولانا رشید الدین خاں کشمیری | مغلوں کے آخری دور میں کئی معزز کشمیری خاندان یا افراد تعلیم و تربیت یا تجارت کے

خیال سے دہلی آئے تھے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ (۲) ایسے خانوادوں میں سے ایک معزز خاندان وہ تھا جس کا دو تین نسلوں تک دہلی کے علماء اور مشائخ خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ اور انکے صاحبزادگان سے تعلیم و تلمذ اور عقیدت و استفادہ کا خاص تعلق رہا۔ اس خاندان کے چند اصحاب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے تلمذ کا فخر رکھتے تھے۔ (۳) چند اصحاب نے حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں سے تعلیم حاصل کی اور ان کی صحبتوں سے مسلسل استفادہ کیا، ایسے ہی نامور علماء میں سے ایک بڑی شخصیت مولانا رشید الدین خاں کشمیری دہلوی کی تھی۔ اس خانوادہ کے لوگ کب دہلی آئے، یہاں انکے کیا کاروبار تھے اور اس خانوادہ کی عمومی خدمات کیا کیا ہیں، اسکا ذکر نہیں ملا، نسب کی تفصیلات بھی مفقود ہیں، تاہم مولانا عبدالحی حسنی نے مولانا رشید الدین کے والد، دادا، پردادا کے نام لکھے ہیں، جو اس طرح ہیں:

”مولانا رشید الدین، بن امین الدین، بن وحید الدین، بن عبدالسلام کشمیری“ (۴)  
مولانا کا سنہ ولادت محقق نہیں، لیکن سرسید احمد نے مولانا رشید الدین کی کل عمر ساٹھ سال (۵) لکھی ہے (وفات ۱۲۳۳ھ) اس اطلاع کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مولانا

(۱) گلستان سخن قادر بخش صابر ص ۲۲۶ جلد دوم مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی (لاہور: ۱۹۶۶ء)  
(۲) ایسے افراد کی لمبی فہرست ہے جن میں سے چند اصحاب کا مرزا محمد رستم بدخشی نے اپنی تالیف تاریخ محمدی میں ذکر کیا ہے۔ مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی رام پور ۱۹۶۰ء۔  
(۳) حضرت شاہ ولی اللہ کے کشمیری منتسبین کے نام شاہ صاحب کے متعدد مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ کے مکتوبات میں درج ہیں۔

(۴) نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحی حسنی ص ۱۸۰ جلد ۷ (حیدرآباد: ۱۳۹۹ھ)  
(۵) آثار الصنادید سرسید احمد ص ۵۱-۵۲ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۸ھ)

رشید الدین کی تقریباً ۱۱۸۳ھ (۷۰-۶۹-۷۱ء) میں ولادت ہوئی ہوگی۔

مولانا رشید الدین نے ابتدائی کتابیں اور درسیات مولانا مفتی علی کبیر بناری سے اور متوسطات سے فقیہانہ کتابوں تک حضرت شاہ رفیع الدین سے پڑھیں، نیز حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے بھی استفادہ کیا، مگر اصل تلمذ اور استفادہ شاہ رفیع الدین سے تھا۔ سرسید احمد نے لکھا ہے کہ شاہ رفیع الدین، مولانا رشید الدین کی تعلیم و تربیت میں ہمیشہ اس طرح مشغول رہتے تھے جس طرح باپ بیٹے کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتا ہے۔ (۱)

مولانا رشید الدین خاں نے ان بزرگوں کے علمی کمالات کو اپنے اندر سمو لینے کی بھر پور کوشش فرمائی یہاں تک کہ خود ایک بڑے عالم اور علماء کے مرکز نگاہ بن گئے، مولانا کا حضرت شاہ عبدالعزیز کی حیات میں دہلی کے بڑے علماء اور اہل درس اصحاب میں شمار کیا جاتا تھا اور جاننے دیکھنے والے مولانا کے کمالات علمی کے معتقد اور مداح تھے۔

مولوی عبدالقادر چیف رامپوری جو حضرت شاہ عبدالعزیز کی حیات میں دہلی آتے رہتے تھے اور دہلی کے اکابر علماء نیز مولانا رشید الدین خاں سے بھی خاصا تعارف اور ملاقات رکھتے تھے (اور ان کی غالباً مولانا سے بے تکلف گفتگو بھی رہتی تھی) مولوی عبدالقادر کی (آخر شوال ۱۲۳۸ھ جولائی ۱۸۲۳ء میں) دہلی میں مولانا سے جو ملاقات ہوئی تھی اس کا رام پوری نے اپنے روزنامچہ میں خاصا مفصل ذکر کیا ہے۔ یہاں مولوی عبدالقادر کی پوری عبارت اور اس کا اردو ترجمہ نقل کیا جاتا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا رشید الدین کے معاصر مولانا کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے۔ عبدالقادر چیف رامپوری نے لکھا ہے کہ:

”از تلامذہ رشید ایں بزرگواران رشید الدین خاں بودا گرچہ چنداں تیز نبود، مگر مشق افادہ و استفادہ خوب داشت، و قصد پیروی اساتذہ در ہر باب می کرد مگر در مناظرہ زودتر رنجیدہ می شد، و پابند نمود از اندازہ زیادہ بود۔ معلومات فراوان ہر فن می

(۱) آثار الصنادید سرسید احمد ص ۵۱-۵۲ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۸ھ)

داشت، و ہرچہ نوشتی بہ بسط و تفصیل نوشتی، علی الخصوص در مباحث دینیہ اختلافیہ، و گمان بردی کہ حالا جانب مقابل راجائے رد و قدح نماںدہ۔

بابندہ ربط شفیقانہ داشت، بملاقات اخیرش کہ ہنگام مراجعت اجمیر نصیب ایں بے ہیج شد، آنچہ در مسئلہ متعہ بجواب فضلائے امامیہ لکھنوی نوشت، مقدمہ آں را کہ چند اجزا بود و ہنوز بانجام نرسیدہ نمود و گفت کہ ہر گاہ ایں کتاب بہ شرح و بسط کہ میخوانم صورت اختتام پذیرفت و بہ لکھنور رسید، علمائے آں طرف در فکر جواب خواہند مرد، و سر از جیب نخواہد بر آورد۔ گفتم نامش جناب لوح محفوظ نہند تا اسم با سہمی باشد۔

اکنون در اں شہر ہچو او دیگرے نیست..... با مولوی محمد اسماعیل، و مولوی عبدالحی آنجمانی در مجلس وعظ بہ مسجد جامع شاہ جہاں آباد بطوری کہ پیش آمدنہ شایان وضع شریفش بود و نہ زیبا بعلاقہ و ربط کہ باں خاندان داشت۔ (۱)

ترجمہ: ان سب بزرگوں کے شاگرد رشید الدین خاں تھے جو اگرچہ اتنے تیز فہم نہ تھے مگر تعلیم و تعلم کی خوب مشق تھی، ہر بات میں اساتذہ کی پیروی کرتے تھے مگر مناظرے میں بہت جلد رنجیدہ ہو جاتے تھے، نمائش کے بہت زیادہ پابند تھے، ہر فن کی بہت کچھ معلومات رکھتے تھے، جو کچھ لکھتے بسط و تفصیل سے اور جو کچھ کہتے دراز و طویل، بالخصوص مباحثہ اختلافیہ دینیہ میں یہی طریقہ تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ اب مقابل میں رد و قدح کی گنجائش نہیں رہی۔

بندے (مولوی عبدالقادر) سے بہت شفقت فرماتے تھے، ان سے آخری ملاقات اس

(۱) عبدالقادر چیف کے فارسی روزنامے کا یہ اقتباس مولانا امتیاز علی عرشی نے (رضالا بیری رام پور کے قلمی نسخہ کے ص ۶۵ سے) فہرست مخطوطات اردو، رضالا بیری رام پور میں کتاب رشید المومنین کے تعارف میں نقل کیا ہے۔ فہرست ص ۱۶۶ (رام پور ۱۹۶۷ء)۔ مگر رشید المومنین مولانا رشید الدین خاں کی تالیف نہیں ہے، اس میں مولانا عرشی کو مغالطہ ہوا۔ رشید المومنین اور اس بحث میں ضمنانڈ کو ایک اور کتاب نور الایمان، دونوں مولانا سلطان حسن خاں شاہ جہاں پوری، مؤلف تذکیر الاخوان کی تالیف میں سے ہیں، اس پر مولانا رشید الدین کا نام کسی کاتب ناواقف کی غفلت سے درج ہو گیا ہے، مولانا کے تعارف کیلئے ملاحظہ فرمائیں راقم سطور کی نا تمام تالیف ”تقویۃ الایمان اور اس کے خلاف برپا شورش، تاریخ و حقیقت کے آئینہ میں“ کی پندرہویں قسط، مولانا سلطان حسن خاں شاہ جہاں پوری اور ان کی تالیفات۔ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ (اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۳ء)

وقت ہوئی جب کہ بندے کو اجیر سے واپسی نصیب ہوئی (۱) مسئلہ متعہ کے متعلق لکھنؤ کے شیعہ علماء کے جواب میں جو کتاب لکھ رہے تھے اس کا مقدمہ کئی جزو ہو گیا تھا اور ابھی پورا نہیں ہوا تھا، مجھے کتاب دکھا کر کہا کہ جب یہ کتاب اس شرح وسط کے ساتھ جو میں چاہتا ہوں، پوری ہو جائے گی اور لکھنؤ پہنچے گی تو وہاں کے علماء اس کے جواب کی فکر میں مر جائیں گے اور گریبان سے سر نہ اٹھا سکیں گے۔ میں (مولوی عبدالقادر) نے کہا کہ جناب اس کا نام ”لوح محفوظ“ رکھیں کہ اسم باسٹھی ہو جائے۔ اب اس شہر میں ان جیسا دوسرا نہیں ہے اور وہ بھی غالباً ۱۲۴۰ھ یا ۱۲۴۱ھ میں اس دار پر شور شغب سے اپنے باکمال اساتذہ کے پاس چلے گئے۔

مولوی رشید الدین خاں اور مولوی محمد اسماعیل نیز مولوی عبدالحی سے وعظ جامع مسجد شاہ جہاں آباد میں جو صورت پیش آئی، نہ ان کی شریف وضع کے شایاں تھی نہ اس خاندان سے علاقہ رکھنے والوں کے لئے زیبا تھی۔ (۲)

مولانا رشید الدین خاں علوم دینیہ، فقہ و حدیث اور درسیات کے علاوہ معقولات نیز مناظرہ و کلام کے بھی جید فاضل اور محقق تھے اور ان کے علاوہ اپنے استاذ خاص (مولانا شاہ رفیع الدین کے فیض صحبت سے ریاضی میں بھی بڑا دست قدرت رکھتے تھے۔ عربی تحریر و انشاء میں اپنے معاصرین اور اقران سے ممتاز اور اپنے دور کے نامور عربی انشاء پردازوں میں سے تھے، مولانا اپنی عربی تحریروں میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے طرز کی پیروی کرتے تھے اور مولانا کی عربی تحریرات شاہ صاحب کا عکس اور شنی سمجھی جاتی تھیں۔ مولانا کی اس خوبی اور کمال کا حضرت شاہ صاحب کو بھی اعتراف تھا، ایک موقع پر فرمایا:

”میری تقریر اسماعیل نے لے لی، تحریر رشید الدین نے اور تقویٰ محمد اسحاق نے“ (۳)

(۱) اس فقرہ پر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم نے یہ ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۵ء متعین کیا ہے جو صحیح نہیں، عبدالقادر چیف نے اسی کتاب میں چند صفحات پہلے وضاحت کی ہے کہ انکا دہلی کا سفر جس میں علماء دہلی سے یہ ملاقاتیں ہوئیں تھیں ۲۶ رشوال ۱۲۳۸ھ (۶ جولائی ۱۸۲۳ء) کو ہوا تھا، دیکھئے علم و عمل ترجمہ وقائع عبدالقادر خاں ص ۱۸۵ جلد اول (کراچی)۔

(۲) ترجمہ وقائع عبدالقادر خاں از مولوی معین الدین افضل گڑھی ص ۲۳۹-۵۰، جلد اول (کراچی ۱۹۷۰ء)

(۳) مقالات طریقت، عبدالرحیم ضیاء ص ۲۳۷۔ (حیدرآباد، ۱۲۹۲ھ)

دہلی کالج اپنی ابتداء اور آغاز کے پہلے  
مدرسہ دہلی یادہلی کالج کی ملازمت

ایک مدرسہ تھا، مولانا رشید الدین خاں مدرسہ کے مدرس اعلیٰ تھے۔ مگر افسوس کہ مدرسہ دہلی کی اس وقت کی خدمات، تعلیمی سفر اور مدرسہ کی سرگزشت کی تفصیل دریافت نہیں، اسلئے یہ بھی معلوم نہیں کہ مدرسہ دہلی میں مولانا رشید الدین کیا کیا خدمات انجام دے رہے تھے، مدرسہ میں مولانا کی تعلیمی تدریسی اور انتظامی مصروفیت کس قدر رہتی تھی، مدرسہ میں کس قدر جماعتوں اور طلبہ نے مولانا سے استفادہ کیا، اس کے کیا نتائج سامنے آئے، دہلی کالج میں مولانا کے طلبہ کی صلاحیت و استعداد کس درجہ کی تھی اور بعد میں ان طلبہ نے کیا خدمات انجام دیں، اس کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ لیکن معلومات و اطلاعات کی کمی کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مدرسہ دہلی یادہلی کالج کے یہی ابتدائی سال اس کے باقی رہنے، علمی ترقی کرنے اور روشن مستقبل کے ضامن بنے، اگر دہلی کالج کو شروع سے مولانا رشید الدین خاں جیسے نامور عالم (اور انکی وفات کے بعد انکے خاص شاگرد اور تربیت یافتہ مولانا مملوک العلی نانوتوی) کا بھرپور تعاون اور سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو شاید مدرسہ دہلی یادہلی کالج کبھی اس طرح ترقی نہ کر سکتا جو اس نے کی، اور وہ شمالی ہند کا سب سے اہم تعلیمی ادارہ سمجھا گیا، مدرسہ دہلی یادہلی کالج کی تاسیس، توسیع اور اس پر عوام خصوصاً مسلمانوں کے مختلف طبقوں کے بھروسہ اور اس میں اپنے بچوں کی تعلیم کیلئے داخل کرنے کی سب سے بڑی وجہ مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک العلی نانوتوی کی اس ادارہ سے وابستگی تھی اور کچھ نہیں۔

مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک العلی کی اس کالج سے وابستگی نے مدرسہ دہلی یادہلی کالج کو جو خاص وقار اور اعتبار بخشا اور اسکے ذریعہ سے ایک نئی طرح کی تعلیمی سلسلہ کی نمود ہوئی اور کالج طویل عرصہ تک علمی تدریسی ادبی تصنیفی خدمات انجام دے سکا۔ اگر اس کالج کو علماء کا بھرپور تعاون اور سرپرستی نصیب نہ ہوئی ہوتی تو مشکل تھا کہ کالج آگے بڑھتا اور دینی علمی دنیا میں کوئی قابل ذکر کام کر سکتا اور اس کو عام مسلمانوں اور

## شیعوں کی کتابوں کے جوابات اور اس موضوع پر مولانا کی تصانیف

مولانا رشید الدین خاں نے خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء کی صحبتوں سے علم اور کمال حاصل کیا تھا، ان بزرگوں نے برصغیر ہند میں ہر گوشہ پر دینی خدمات کے نقوش رقم کئے، جس میں سے ایک بڑی خدمت اور خاصا اہم عنوان برصغیر ہند میں شیعیت کے گہرے اور غیر معمولی اثرات کو ختم کرنے، نیز شیعیت کے صحیح چہرہ اور تعلیمات کو عوام کے سامنے پیش کرنے کا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز دونوں نے اس منصوبہ پر جس طرح مسلسل کام کیا اور شیعیت پر علمی استدلالی حیثیت سے جو ضرب لگائی اس کی اہمیت و معنویت اور ان کے دلائل کے وزن اور قوت سے صرف نظر کرنا آسان نہیں، بلاشبہ اس موضوع کی جملہ تصانیف میں ازالة الخفاء، قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین اور تحفہ اثنا عشریہ منفرد تصانیف ہیں۔

مولانا رشید الدین خاں ان کتابوں کے پس منظر، انکے منافع و فوائد، مقبولیت و پذیرائی اور برصغیر میں شیعیت کی ترقی پر ان کتابوں کے اثرات یا ضرب سے اچھی طرح واقف تھے بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، مولانا نے محسوس کر لیا تھا کہ مذکورہ بالا کتابوں کی تصانیف و اشاعت سے اگرچہ اس طوفان کے سامنے بند لگ گیا ہے مگر ابھی کئی سوراخ اور گوشے ایسے ہیں جہاں سے شیعیت کے فروغ، ترقی یا علمی اعتراضات کا موقع ہو سکتا ہے، مولانا نے ان راستوں کو بھی بند کرنے کی کوشش کی اور تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف کے بعد اس سلسلہ بحث میں جوئے مباحث پیدا ہو گئے تھے اور شیعہ علماء نے جس طرح تحفہ کے مندرجات اور اسکے دلائل کے جوابات لکھنے کی ایک بڑی اور مسلسل مہم کا آغاز کیا تھا (جس میں ضمناً اور پہلو بھی زیر بحث آجاتے تھے) مولانا رشید الدین نے ان جوابات کا ارادہ فرمایا اور شیعہ علماء کی طرف سے اہل سنت کی تردید میں جو کچھ لکھا جا رہا تھا خود کو اس کے جوابات کیلئے گویا وقف کر دیا تھا، مولانا رشید الدین خاں کی اکثر

تصانیف کا یہی موضوع ہے۔ اس وقت چونکہ عام علمی تصنیفی زبان فارسی تھی اسلئے مولانا کی اکثر تصانیف بھی فارسی میں ہیں، شیعیت کی تردید اور جواب میں مولانا کی معروف تصانیف کی فہرست درج ذیل ہے:

- ۱۔ ایضاح لطافة المقال
- ۲۔ صولت غنظریہ
- ۳۔ شوکت عمریہ
- ۴۔ عزة الراشدین
- ۵۔ جواب نزہة اثنا عشریہ
- ۶۔ حسام الاسلام
- ۷۔ رد صوارم الہیات
- ۸۔ حق المبین
- ۹۔ تفضیل الاصحاب
- ۱۰۔ مکتوبات بنام دلدار علی خاں مجتہد (۱)

رد شیعیت کے علاوہ اور موضوعات پر بھی مولانا کی متعدد تالیفات دیگر مؤلفات

تھیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) مولانا کی ایک بڑی علمی یادگار (جس کا مولانا کی مؤلفات و تصانیف میں اس وقت تک غالباً کہیں ذکر نہیں آیا) حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے عربی مکتوبات و تحریرات کے ایک مجموعہ کی ترتیب یا نقل ہے، یہ مجموعہ بڑے سائز کے ایک سو نوے (۱۹۰) صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) اعانة الموحدين و اهانة الملحدين (رسالہ رد راجہ رام موہن رائے) مولانا کے عہد کے غیر مسلم زعماء میں سے رام موہن رائے نے ہندوستان میں ایک نئے فرقہ یا تحریک کی بنیاد ڈالی تھی، جس میں بعض خیالات و نظریات اسلامی تعلیمات و عقائد سے بھی لئے گئے تھے اور اس تحریک کو برہمن سماج کے نام سے موسوم کیا تھا، راجہ رام موہن رائے نے اپنے نظریات کی اشاعت کیلئے فارسی میں دو تین رسالے لکھے تھے، جن کے علمائے اسلام نے جوابات لکھے، مولانا رشید الدین نے بھی اس کی تردید میں ایک رسالہ لکھا، جس کو خاصی شہرت ملی، یہ رسالہ شائع بھی ہوا ہے۔ (۲)

(۱) ایضاح لطافت المقال، شوکت عمریہ، صولت غنظریہ اور عزة الراشدین ۱۸۵۷ء سے پہلے چھپ گئی تھیں، ایضاح، شوکت، اور عزة کے مطبوعہ نسخے راقم سطور نے دیکھے ہیں اور ان سب کتابوں کا ایک ایک یا دو دو قلمی نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں، تفصیلات کے ملاحظہ ہو مرآة العلوم (فہرست مخطوطات فارسی) جلد دوم (پٹنہ: ۱۹۴۳ء)

..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....



(۳) معقولات منطق فلسفہ کی متعدد درسیات پر مولانا کے مفصل و مختصر حاشیے یادگار تھے، جن میں سے بعض کی موجودگی کا سراغ ملتا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی رسالہ تصریح کا حاشیہ ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ (۱)

(۴) ایک اور تالیف شرح تشریح الافلاک کی شرح ہے، یہ شرح مولوی کریم الدین پانی پتی نے دیکھی تھی، پانی پتی نے لکھا ہے کہ:

ایک شرح تشریح الافلاک کی علم ہیئت میں انہوں نے لکھی ہے، بندہ نے بھی اسکی خوب سیر کی، معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرح خلاصہ شرح مولوی عصمت (اللہ) سہارنپوری کی ہے جو بہت بڑی ایک شرح ہے، بعد تطبیق عبارت سے معلوم ہوا کہ یہ شرح عصمت سے اس فاضل نے مختصر کی ہے۔ (۲)

مولانا کی ایک اور علمی ادبی یادگار مولانا کے خطوط ہیں، مولانا کی اپنے دوستوں اور معاصر اہل علم سے خط و کتابت رہتی تھی جو اکثر عربی میں ہوتی تھی، یہ خطوط ادب و انشاء کا نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ ان مکتوبات میں سے شیخ احمد بن محمد یمانی (مؤلف تحفۃ الیمن) کے نام خطوط ایک مجموعہ کی صورت میں چھپے ہیں۔ (۳) مولانا فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزرہ کے نام چند خط دریافت ہیں۔ (۴) نیز آزرہ کے نام مولانا کا ایک ایک خط

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... نیز رد شیعیت میں مولانا کی ایک ضخیم تالیف کا قلمی نسخہ جو مصنف کے مسودہ سے مولانا نور الحسن کاندھلوی نے نقل کرایا تھا ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے، مگر اسکے ابتدائی صفحات موجود نہیں، اسلئے تحقیق نہیں کہ یہ کونسی کتاب ہے بظاہر صولت الضعیم ہے۔

(۲) اس رسالہ کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۲۲۷ھ (۱۸۳۱-۳۲ء) میں مولانا نور الحسن کاندھلوی وفات (۱۲۸۵ھ - ۱۸۶۸ء) نے نقل کیا تھا ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ اور خود راجہ رام موہن رائے کی تالیف رسالہ مناظرۃ الادیان کا بھی ایک نسخہ مولانا نور الحسن کاندھلوی کے قلم سے ۱۲۲۷ھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔

(۱) اس کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

(۲) تذکرہ فرائد الدھر مؤلفہ ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء ص ۴۰۰ (مطبع العلوم دہلی: ۱۸۴۷ء)

(۳) یہ مجموعہ "المکاتیب" کے نام سے مطبع مجبائی دہلی سے ۱۳۱۱ھ (جنوری ۱۸۹۴ء) میں چھپا تھا۔ اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے اور ہمارے ذخیرے میں موجود ہے۔

(۴) مفتی صدر الدین آزرہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے نام خطوط مولانا خیر آبادی کی بیاضوں میں درج ہیں۔

..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

مولوی کریم الدین نے فرائد الدھر میں اور سرسید احمد نے آثار الصنادید میں نقل کیا ہے۔  
مولانا کے چند فتاویٰ بھی ملے ہیں جن میں سے بیشتر فارسی میں ہیں، فقہی اختلافی  
موضوعات پر ایک دو تقریریں بھی موجود ہیں جو عربی میں ہیں۔ یہ مولانا کے معلوم علمی  
دینی ادبی آثار کا مختصر تعارف ہے، تلاش کیا جائے تو مولانا کی اور بھی متعدد تالیفات و  
تحریرات ملیں گی۔

حضرت مولانا تقریباً پینتیس چھتیس سال تک درس و تعلیم  
مولانا کے چند تلامذہ | میں مشغول رہے جس کے آخری تقریباً دو سال مدرسہ دہلی  
یا (دہلی کالج) کے عہدہ صدارت پر گزرے، مگر اس دور کے اکثر علماء کی طرح مولانا کے  
بھی بہت کم شاگردوں کے نام معلوم ہیں۔ راقم سطور کو مولانا کے صرف دس شاگردوں  
کے نام ملے ہیں، جو یہ ہیں۔

(۱) مولانا مملوک العلی نانوتوی (۱)

(۲) مولانا حیدر علی فیض آبادی (۲)

(۳) مولانا قاری عبدالرحمان پانی پتی (۳)

(۴) مولانا محمد مظہر نانوتوی (۴)

(۵) مولانا احمد سعید بن ابوسعید دہلوی (۵)

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ راقم نے مولانا کی دو بیاضوں سے استفادہ کیا ہے جن میں سے  
ایک معروف بیاض تو وہ ہے جو حکیم نصیر الدین صاحب (نصرتی دو خانہ کراچی) کے ذخیرہ میں ہے، اس نسخہ کا مکمل  
فوٹو اسٹیٹ (جو اصل سے لیا گیا ہے) راقم سطور کے ذخیرہ میں ہے، اس کا ایک اور عکس جو چھوٹا کر کے لیا گیا ہے اور  
صاف بھی نہیں ہے کئی جگہوں سے پڑھا نہیں جاتا ڈاکٹر مہر النساء کی کتاب العلامہ فضل حق خیر آبادی حیاتہ  
و مائثرہ مع تحقیق کتاب الثورة الہندیہ (لاہور: ۱۳۰۶ھ) میں شامل ہے۔

دوسری ایک بیاض اور ہے جو راقم سطور کی نظر سے گزری ہے اس کا بھی عمدہ فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

(۱) نزہۃ الخواطر ص ۵۰۱-۵۰۲ ج ۷۔ (۲) نزہۃ الخواطر ص ۱۵۶-۱۵۷ ج ۷۔

(۳) نزہۃ الخواطر ص ۲۲۵-۲۲۶ ج ۸۔ (۴) نزہۃ ص ۲۵۵ ج ۸

(۵) نزہۃ ص ۴۱ ج ۷

- (۶) مولانا کریم اللہ دہلوی (۶)  
 (۷) مولانا محمد شکور مچھلی شہری (۷)  
 (۸) سید محمد حکیم دہلوی (۸)  
 (۹) قاری یوسف بن مظہر علی دہلوی (۹)  
 (۱۰) مولانا کرامت علی موسوی دہلوی (۱۰)

مولانا کے صاحبزادگان | مولانا کی اولاد کی تفصیل مجھے نہیں ملی، تاہم چار بیٹوں کے نام ملتے ہیں، مگر ان کے بھی مفصل احوال بلکہ سنین وفات بھی دستیاب نہیں۔

مولانا سدید الدین خاں، مولانا مؤید الدین خاں، مولانا امین الدین خاں اور مولانا سلیم الدین خاں۔

مولانا سدید الدین خاں نے چند کتابیں اپنے والد ماجد سے اور اکثر درسیات مولانا مملوک العلی سے پڑھیں، جید عالم، نامور فاضل اور مشہور مدرس تھے، دہلی کالج میں مدرس تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مدرسہ عالیہ رامپور میں استاد مقرر ہو گئے تھے، مختصر تالیفات علمی یادگار ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز کی صحبتوں سے مستفید تھے اگرچہ مولانا کے شاہ صاحب سے تلمذ کی صراحت نہیں ملی لیکن عبدالرحیم ضیاء حیدر آبادی نے مولانا مؤید الدین کے حوالہ سے حضرت شاہ صاحب کے متعدد واقعات نقل کئے ہیں۔ مولانا حیدر آباد دکن میں جوڈیشیل (JUDICIAL) سیکریٹری تھے۔ تشخیص المقال کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی مولانا مؤید الدین کے بیٹے مولانا محی الدین بھی جید عالم تھے، جو حیدر آباد ہائی

(۶) نزہ ص ۲۰۷-۲۰۸ ج ۷

(۷) نزہ ص ۲۵۵ ج ۷

(۸) نزہ ص ۲۲۰ ج ۷

(۹) وصال الجلیل شاہ امان الرحمان دہلوی ص ۷ (دہلی ۱۳۳۳ھ)

(۱۰) مقالات طریقت عبدالرحیم ضیاء حیدر آبادی ص: ۵۴۰ (حیدر آباد دکن ۱۲۹۲ھ)

کورٹ میں حج کے عہدہ پر فائز رہے۔ مولانا محی الدین کی ایک بڑی دینی علمی خدمت ”تیسیر الوصول الی جامع الوصول“ (۱) کا اردو ترجمہ ہے، جو تلخیص الصحاح کے نام سے چھ جلدوں میں چھپا ہے، اور بھی تالیفات یادگار ہیں۔

مولانا مؤید الدین کا مولانا عبدالحی حسنی نے مولانا محی الدین کے مختصر تعارف میں ضمناً ذکر کیا ہے۔ (۲)

مولانا سلیم الدین خاں کی آخری عمر دہلی میں گزری اور جب مولانا عبدالحی حسنی رجب ۱۳۱۲ھ (جنوری ۱۸۹۵ء) میں دہلی پہنچے تو مولانا سلیم الدین کی وفات کو دو مہینے ہو چکے تھے۔ (۳) مولانا سلیم الدین کے ایک بیٹے مولوی رضی الدین خاں خطاطی کے بلند پایہ استاذ تھے، مولوی رضی الدین خاں کی غالباً رمضان المبارک ۱۳۰۷ھ (مئی ۱۸۹۰ء) میں وفات ہوئی، مولوی رضی الدین کی وفات پر سرسید احمد نے لکھا تھا کہ ان کی وفات سے دہلی ایک بے مثل صاحب کمال سے خالی ہو گئی۔ (۴)

مولانا تعلیمی تدریسی خدمات میں منہمک  
مولانا رشید الدین کا صحیح سنہ وفات

تھے کہ ۱۲۴۲ھ (جون ۱۸۲۷ء) میں حج کا شوق غالب ہوا، کالج سے رخصت بھی مل گئی تھی، سفر کی تیاری مکمل تھی کہ اچانک بیمار ہو گئے، علالت کا سلسلہ دراز ہوا، بیماری نے نازک صورت اختیار کر لی اور یہی مرضِ موت بن گیا، علاج کیلئے ہر ممکن تدبیر کی گئی، مگر وقت آچکا تھا اجل کے مصمم فیصلہ کے سامنے کسی کی کچھ نہ چلی اور مولانا اسی بیماری میں محرم الحرام ۱۲۴۳ھ (جولائی ۱۸۲۷ء) کو انتقال فرما گئے رحمۃ اللہ علیہ۔

(۱) یہ ترجمہ پہلی مرتبہ مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۱۹ھ سے ۱۳۲۲ھ تک شائع ہوا تھا۔ اس طباعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرے میں موجود ہے۔

(۲) نزہۃ الخواطر ص ۷۰ ج ۸ (حیدرآباد دکن، ۱۳۰۲ھ)

(۳) دلی اور اس کے اطراف، ص ۵۶ (دلی، ۱۹۵۸ء)

(۴) سرسید کی تعزیتی تحریریں، مرتبہ اصغر عباس ص ۹۱ (علی گڑھ، ۱۹۸۹ء)

اس تاریخ وفات کی ایک معاصر، معتبر اور قریب ترین ذریعہ سے تصدیق و تحقیق ہو رہی ہے، مولانا فضل حق خیر آبادی جو مولانا رشید الدین خاں سے روابط (بلکہ عقیدت و نیاز مندی) کا تعلق رکھتے تھے، اس وقت دہلی میں تھے، اس وقت مولانا خیر آبادی نے شیخ احمد بن محمد یمنی کو جو خطوط لکھے ان میں مولانا رشید الدین خاں صاحب کی علالت، مرض کی شدت اور وفات کا ذکر ہے۔

پہلا خط جس میں مولانا کی سخت بیماری کا ذکر آیا ہے ۷ رزی الحجہ ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رشید الدین نہایت کرب و بے چینی اور شدید مرض میں مبتلا ہیں، مرض کی صحیح تشخیص نہیں ہو سکی، اطباء اور معالجین کی الگ الگ رائے ہے اور دونوں علاج سے عاجز ہیں لکھا ہے کہ:

”ومما اقلق الادواء ابتلا مولانا المطاع، المولوی رشید الدین خان بمعضل الداء فی مداویہ فقد عجز الاطباء واضطرب بسوء حالاتہ الاحیاء، وتحیر فی تشخیص مرضہ حذاق الاساءة فمنہم من یقول ام العلة ما تولد فی الکلیة من الحصاة، ومنہم من یقول انها عسر البول لاجل الرماح البواسیرة، وذلك رائی اکثر اهل الحصاة و لكن علاج الفریقین لا یشفی من العاهة“ (۱)

ترجمہ: مولانا رشید الدین خاں بیماری میں مبتلا ہیں اور اسکے علاج کی تدبیر میں ناکام ہیں، انکے علاج سے اطباء عاجز ہو گئے ہیں۔ مولانا کی نازک کیفیت کی وجہ سے اکثر احباب اور اعزاء بھی پریشانی میں مبتلا ہیں، انکے مرض کی تشخیص میں حاذق طبیب بھی حیران ہیں، اطباء میں سے کچھ کہتے ہیں کہ بنیادی مرض گردوں میں پتھری کا پیدا ہو جانا ہے، کچھ یہ کہتے ہیں کہ یہ عسر بول کی شکایت ہے جو ریاحی بواسیر کی وجہ سے ہے اور یہی اکثر متعلقین کی رائے ہے، لیکن دونوں طبیبوں میں سے کسی کے علاج سے مرض کو شفا نہیں ہوئی۔

دوسرے خط میں مولانا کی وفات کی اطلاع اور مولانا خیر آبادی کے رنج و الم کا ذکر ہے، اس خط سے تاثر ملتا ہے کہ حادثہ بالکل تازہ ہے، غالباً یہ خط مولانا رشید الدین کی وفات

(۱) مکتوب مولانا خیر آبادی ۷ رزی الحجہ ۱۲۴۲ھ (۷ جون ۱۸۲۷ء) بیاض خیر آبادی، ورق ۱۱-الف

کے دن یا اسکے ایک دو دن کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس سے مولانا کی مولانا رشید الدین خاں کی وفات پر غم کی شدید کیفیت (اور مولانا خیر آبادی کے مولانا رشید الدین سے نہایت گہرے بلکہ ارادت مندانہ تعلقات) کا اظہار ہوتا ہے، مولانا خیر آبادی نے لکھا ہے:

”وقد صرع الاسماع حال التحریر خبر وفاة الرشید النحریر فاجرت عیون الاعیان عیون العبرات حزنا و اوجب اهل السنة لمصاب ذلك الامام ما..... الشیعة فی هذه الايام، من وفور الآلام بذكرهم الامامین حسنا حسینا، و کاد فوادى الکلیم ان یفطر بهذا البلاء العظیم والخطب الجسیم، کان واللہ مرشداً رشیداً و رء وفا بالطالبین رحیماً، تغمدہ اللہ برحمة رضوانه واسکنه بکرمه فسیح جنانه“ (۱)

یہ خط ۱۲ / محرم الحرام ۱۲۴۳ھ (۸ / اگست ۱۸۲۷ء) کا لکھا ہوا ہے اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا رشید الدین کی شاید اسی دن یا اس سے ایک دو دن پہلے وفات ہوئی ہوگی، تیسرا خط جو احمد بن محمد یمنی کے خط کے جواب میں ہے، اس میں مولانا خیر آبادی نے مولانا رشید الدین کی وفات کی خبر پر یمانی کی تعزیت کا یوں ذکر فرمایا ہے:

مکتوبہ ۱۲ / جمعہ محرم الحرام ۱۲۴۳ھ (۸ / اگست ۱۸۲۷ء)

”فاما ما اشار مولانا الیہ من التحسر لوفات مولانا المولوی رشید الدین خاں والتأسف علیہ، فانه من ادھی الارذاء والخطوت، واشجی الدواھی والکروب لایدع ان یلطم له الخدود وتشق له الخیوب، بل ان ینفطو له الاکباء ویتصدع له القلوب، فالنوح ان کان مفروض علی مثل ذاک السندب المندوب، فبا لله ای حنوذئب وفات وای خیر ذهب له الوفات“

(۱) بیاض مولانا خیر آبادی ورق ۱۲-الف

## باب (۵)

### دہلی کالج کاپس منظر اور قیام

مدرسہ غازی الدین حیدر سے دہلی کالج تک

پہلا نام مدرسہ دہلی، ابتدائی مدرسین، نظام تعلیم اس کے طریقہ تعلیم

پر مشرقی مدارس کا اثر، مغربی اثرات سے بڑی حد تک حفاظت

مشرقی شعبہ کا مغربی شعبہ سے امتیاز اور متعلقات

مولانا مملوک العلی دہلی کالج میں | تذکرہ آچکا ہے کہ مولانا مملوک العلی ۱۲۳۰ھ سے پہلے تعلیم حاصل کرنے کیلئے

دہلی آئے تھے، دہلی میں تعلیم حاصل کی مگر تعلیم سے کب فارغ ہوئے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد کیا مشغلہ رہا، یہ اوقات دہلی میں گزرے تھے یا وطن میں، کچھ معلوم نہیں، تعلیم کے زمانہ میں دہلی میں قیام کے بعد مولانا مملوک العلی کی دہلی میں موجودگی کی پہلی معتبر اطلاع دہلی کالج میں نائب مدرس اول کے عہدہ پر مولانا کے تقرر اور مولانا کے اس خدمت کو منظور کرنے سے ملتی ہے۔ دہلی کالج کی ملازمت کی منظوری سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا مملوک العلی دہلی کالج کے افتتاح سے کچھ دن پہلے سے دہلی میں موجود ہونگے اور شروع شوال ۱۲۳۰ھ (مئی ۱۸۲۵ء) میں یقیناً دہلی آگئے ہوں گے۔

دہلی کالج کاپس منظر اور تحریک | مگر خود دہلی کالج کیا تھا اس کے قیام کے محرکات، اس کی تاریخ اور اس کا علمی تعلیمی پس

منظر کیا ہے، اس کے نصاب تعلیم میں علوم شریعت (حدیث فقہ وغیرہ) کی تعلیم کا کس قدر حصہ تھا اور یہ کالج (شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے نظام تعلیم کا سنگ میل اور بنیادی پتھر ہونے کے باوجود) مغربی تعلیم کے دیگر اداروں اور کالجوں سے کس حد تک مختلف تھا، مولانا مملوک العلی کے مدرسہ دہلی یا دہلی کالج کے دورِ ملازمت کا ذکر کرنے سے پہلے ان عنوانات و محرکات کا کچھ تذکرہ ضروری ہے۔

لارڈ منٹو، وائسرائے ہند نے ۱۸۱۱ء تا ۱۸۲۶ء میں ایک طویل یادداشت لکھ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالکان کو بھیجی تھی جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہے، ہندو مسلمانوں میں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے جھوٹی گواہی دھوکہ بازی (اور جعل سازی) کے جرائم بڑھ رہے ہیں اس لئے سفارش کی گئی تھی کہ ہندوستان میں تعلیم پر زیادہ رقم خرچ کی جائے اور کئی کالج قائم کئے جائیں۔ لارڈ منٹو کی اس یادداشت کے بعد کمپنی نے ۱۸۱۳ء میں ایک کمیٹی بنائی اس کمیٹی کے سامنے بڑے بڑے انگریزوں کی شہادتیں ہوئیں اور کمیٹی کی سفارش پر پارلیمنٹ میں ایک قانون پیش کیا گیا جس میں کمپنی کے دورِ حکومت میں پہلی مرتبہ ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کی تجویز تھی، یہ قانون منظور ہوا اور اس کی روشنی میں ہندوستانیوں کی تعلیم کیلئے ایک لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی، اور طے کیا گیا کہ محروسہ ہند میں تعلیم کی ترقی، ادب کے احیاء و ترقی اور سائنسی تعلیم عام کرنے کیلئے کم سے کم ایک لاکھ روپے خرچ کئے جائیں (۱) مگر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں:

”یہ سالانہ رقم منظور تو ہو گئی لیکن دس برس تک ایک پیسہ بھی اس مد پر خرچ نہیں ہوا“۔ (۲)

(۱) تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو: الف: تاریخِ تعلیم میجر باسو (Major B. D. BASU) اردو ترجمہ:

وارث سرہندی ص: ۳۲ تا ۳۹ (کراچی: ۱۹۷۶ء)

ب: مسلمانوں کا روشن مستقبل، مولوی طفیل احمد منگلوری ص ۱۳۲-۱۳۳ (طبع اول بدایوں ۱۹۳۸ء) نیز ص ۱۴۱-۱۴۰ (طبع دوم، بدایوں ۱۹۳۹ء)

ج: مرحوم دہلی کالج، مولوی عبدالحق ص ۴-۶ (طبع دوم، دہلی: ۱۹۴۵ء)

(۲) ماسٹر رام چندر تالیف ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی مقدمہ از خواجہ احمد فاروقی ص ۱۱ (دہلی: ۱۹۶۱ء)



دہلی کا تعلیمی جائزہ اور دہلی میں ایک کالج قائم کرنے کا فیصلہ

بالآخر انگریز حکمرانوں کو اس اہم ضرورت کا خیال آیا اور ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء کو مجلس تعلیم عامہ (Genral Committee of Public instruction) کی تشکیل کی گئی، اور یہ ایک لاکھ کی رقم اسکے تصرف میں دیدی گئی، اس کمیٹی کا سکریٹری ولسن (Dr. Horace Hyman Wilson) کو مقرر کیا گیا، جو مشرقی علوم کا حامی تھا۔ اس کمیٹی نے برطانوی علاقوں کا تعلیمی جائزہ لینے کیلئے ایک گشتی مراسلہ دہلی آگرہ اور دوسرے مقامات کی مقامی مجلسوں کے نام جاری کیا، جس میں ان اضلاع کے تعلیمی حالات دریافت کئے گئے تھے اور یہ بھی معلوم کیا گیا تھا کہ ان اضلاع میں تعلیم کی ترقی اور توسیع کیلئے کیا وسائل و ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں، ان اضلاع کے قصبات و دیہات میں کون کون سے مکتب یا تعلیم گاہیں ہیں، ان میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور کون کون سی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور ان میں سے کون کون سے مدارس سرکاری امداد کے مستحق معلوم ہوتے ہیں اور اس امداد کی کونسی صورت زیادہ مناسب اور بہتر ہوگی۔

ان سب امور کے بیان کرنیکے بعد یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ گورنمنٹ کا منشاء دہلی میں ایک کالج قائم کرنا ہے، نیز کمپنی نے یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ اگر ان مقامات میں ایسے اوقاف موجود ہوں جو تعلیمی اغراض کیلئے کام آسکیں تو ان سے بھی مطلع کیا جائے۔

دہلی کی تعلیمی کمیٹی کے سکریٹری جوزف ہنری ٹیلر (۱) (J. H. Taylor) نے اپنا مفصل جواب جنوری ۱۸۲۴ء (جمادی الاول ۱۲۳۹ھ) میں کمیٹی کو بھیجا، جس میں اس نے دہلی کے حوالہ سے تعلیم کے مختلف امور پر بحث کی، مولوی عبدالحق نے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

اس میں اس کا ذکر تھا کہ کچھ ونوں پہلے متعدد درسگاہیں حکومت وقت کی طرف سے قائم تھیں لیکن اب وہ نہایت خراب و خستہ حالت میں ہیں۔ انکے مصارف کیلئے جو انتظام تھا وہ سیاسی

(۱) سکریٹری کا نام اکرام چغتائی صاحب نے فریڈرک ٹیلر لکھا ہے ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۲۰۲ جو صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

انقلاب کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا اور اب ان رقوم کا پھر سے حاصل کرنا امکان سے باہر ہے، دہلی میں سرکاری درسگاہ کے قیام کے متعلق مقامی مجلس نے لکھا ہے کہ اس امداد کیلئے ساڑھے تین ہزار روپے سالانہ کی گنجائش نکل سکتی ہے اور کچھ دنوں بعد اس میں اضافہ بھی ممکن ہے۔ اس مجلس نے یہ بھی لکھا کہ دہلی جیسے آباد شہر میں ایسے اشخاص کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے جو کسی زمانے میں بہت مرفہ حال تھے لیکن سیاسی تغیرات کی وجہ سے اب نان شبینہ کے محتاج ہیں، مگر اس پر بھی وہ کسی ادنیٰ پیشے کو اختیار کرنا باعث ننگ و عار سمجھتے ہیں، اسلئے اگر مجوزہ کالج قائم ہو گیا تو اس قبیل کے بعض لوگ اسکی طرف مائل ہونگے، تاکہ تعلیم پا کر عزت سے بسر کر سکیں (۱)

مسٹر ٹیلر نے اپنی رپورٹ میں مدرسہ غازی الدین خاں کا خاص طور سے ذکر کیا اور لکھا کہ اس کی عمارت بوسیدہ ہے اور تعلیم کا حال بھی اچھا نہیں ہے۔ (۲)

کمپنی کے حکام نے یہ رپورٹ اپنی سفارش کے ساتھ کمپنی کے مالکان کو بھیجی وہاں سے غازی الدین خاں کے مدرسہ کی مرمت کیلئے سات ہزار ایک سو پندرہ روپے کی منظوری اور یہ ہدایت آئی کہ اس عمارت میں ایک کالج کھولا جائے جہاں شرفاء کی اولاد کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جائے، اس حکم کی تعمیل میں ایک کالج کا افتتاح ہوا، جس کا نام مدرسہ دہلی یا دہلی کالج رکھا گیا۔

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۴-۵

(۲) اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مالک رام صاحب نے لکھا ہے:

”کمپنی نے غازی الدین خاں کے مدرسہ کا خاص طور پر ذکر کیا اور لکھا کہ اس مدرسہ کی حالت بہت خراب ہے، اس کی عمارت بوسیدہ اور مرمت طلب ہے اور تعلیم کا حال اس سے بھی بُرا، اس وقت اس میں صرف نو طالب علم ہیں جن کی تعلیم کے لئے ایک مدرس مقرر ہے“

اور اس عبارت کے لئے مرحوم دہلی کالج کا حوالہ دیا ہے۔ قدیم دہلی کالج ص ۲۴ (دہلی: ۱۹۷۶ء) مگر یہ الفاظ مرحوم دہلی کالج میں موجود نہیں ہیں۔ مولوی عبدالحق نے صرف یہ لکھا ہے کہ:

”البتہ مسٹر ایچ ٹیلر کی رپورٹ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۲۴ء میں مدرسہ غازی الدین میں صرف نو طالب علم تھے اور مولوی عبداللہ ان کو تعلیم دیتے تھے۔“

عبدالحق کے الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ اصل رپورٹ انکے سامنے ہے۔ اسلئے عبدالحق کی اطلاع پر اعتماد کیا جانا چاہئے۔

(مرحوم دہلی کالج ص ۳ دہلی: ۱۹۴۵ء)

## مدرسہ غازی الدین خاں کی تاریخ تعمیر اور اس کا جائے وقوع

مدرسہ غازی الدین خاں اس زمانہ میں ایک اہم اور مشہور تعلیمی مرکز تھا، یہ مدرسہ ۱۷۹۲ء (۱۲۰۶ھ) میں اجمیری دروازے کے باہر، عالم گیر ثانی کے وزیر غازی الدین خاں نے قائم کیا تھا (۱) جو ایک عرصہ تک اپنے بانی کے نام سے موسوم رہا۔ ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی نے مدرسہ غازی الدین خاں میں زیر تعلیم موضوعات، مدرسہ کی شہرت و اہمیت اور اس کے خاص محل وقوع کا مفصل ذکر کیا ہے، تحریر ہے:

یہاں عربی و فارسی، قرآن و تفسیر، حدیث و فقہ، ہیئت و نجوم اور دیگر رسمی علوم کا درس دیا جاتا تھا۔ دہلی کی علمی زندگی میں مدرسہ خاص اہمیت رکھتا تھا، تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں شہرت حاصل کر لی تھی اور دور دور سے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ اسے شہر کی ہنگامہ خیز فضا سے ہٹا کر شہر پناہ کے باہر اس خیال سے قائم کیا گیا تھا کہ عام زندگی کا شور و شغب تحصیل علم میں حارج نہ ہو اور دراصل اپنے علمی ماحول کی بنا پر ہی اس مدرسہ کو خاص قدر و منزلت حاصل ہوئی، آج بھی علمی اداروں کیلئے اس قسم کا ماحول سازگار سمجھا جاتا ہے، دہلی میں شاید پہلا ادارہ تھا جو اس خیال کے پیش نظر قائم کیا گیا تھا۔ (۲)

دہلی کالج کے افتتاح سے ایک سال پہلے تک مدرسہ غازی الدین حیدر میں تعلیم جاری تھی مگر اس تعلیم اور طلبہ کی تعداد کو اسکی پرانی عظمت و شان سے کچھ مناسبت نہیں تھی، جی ایچ ٹیلر کی اطلاع کے مطابق ۱۸۲۲ء (۱۲۳۹ھ) میں اس مدرسہ میں صرف نو طالب علم تھے جو ایک گننام عالم مولوی عبداللہ سے پڑھتے تھے۔ (۳)

سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں مدرسہ غازی الدین خاں کا تفصیلی تعارف کرایا ہے اور اس کی کشادگی، حسن و زیبائش اور پختگی کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ

(۱) سیرالسنائل مرزا سنگین بیگ، تحقیق و ترجمہ، ڈاکٹر شریف احمد قاسمی ص ۱۱۹ (دہلی: ۱۹۸۲ء)

(۲) رام چندر ص ۱۶ (دہلی: ۱۹۶۱ء) نیز ملاحظہ ہو: آثار الصنادید، سر سید احمد خاں باب سوم ص ۷۰ (مطبع سید الاخبار دہلی: ۱۸۴۷ء)

(۳) مرحوم دہلی کالج ص ۳

انگریزوں نے اسکو منہدم کرانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس فیصلے پر عمل بھی شروع ہو گیا تھا، مگر اس کی عمارت ایسی مضبوط نکلی کہ جب تک گزبھردیوار ٹوٹی، کئی کدالیں ٹوٹ گئیں اور مزید خرچ علیحدہ ہوا، اسلئے اسکے تڑوانے کا خیال بدل گیا اور بعد میں اس میں دہلی کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سرسید احمد کے الفاظ میں:

”اس کا انہدام موقوف کر کے ایک خندق اس کے گرد کھود کر اس کو شہر میں لے لیا اور سرکار انگریزی نے اسکو طالب علموں کی تعلیم کے واسطے پسند کیا، چند مدرس عربی اور فارسی اور شاستری کے اس میں مقرر کر دیئے“ (۱)

جب کالج کے مغربی اور مشرقی شعبے ایک جگہ ہو گئے تو شاید مدرسہ غازی الدین خاں کی عمارت نا کافی ہو گئی تھی یا کسی اور وجہ سے اس کام کیلئے ناموزوں خیال کی گئی، اس لئے مدرسہ دہلی (دہلی کالج) جمیری دروازے سے کشمیری دروازے پر کتب خانہ دارالاشکوہ میں منتقل کر دیا گیا جو ۱۸۵۷ء تک وہیں رہا۔ (۲)

ٹیلر کی دہلی میں ایک کالج مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کا افتتاح اور مولانا مملوک العلی کا نائب مدرس اعلیٰ کیلئے انتخاب قائم کرنے کی سفارش منظور کر لی گئی اور اس رپورٹ کے مطابق دہلی میں ایک

کالج قائم کرنے کا فیصلہ ہوا اور یہی مسٹر ٹیلر جنھوں نے رپورٹ پیش کی تھی، اس کالج کے عارضی پرنسپل اور سپرنٹنڈنٹ نامزد کئے گئے، مدرس اعلیٰ اور نائب مدرس کا بھی تقرر ہوا۔ مدرس اعلیٰ کے عہدہ پر (حضرت شاہ عبدالعزیز کے خاص شاگرد، ہندوستان کے نامور عالم اور مدرس) مولانا رشید الدین خاں مقرر کئے گئے، مولانا کی تجویز اور مشورہ کے مطابق نائب مدرس اول کیلئے مولانا مملوک العلی کا نام منظور ہوا، تین مدرس اور رکھے گئے۔

(۱) آثار الصنادید سرسید احمد باب سوم ص ۷۰-۷۱ طبع اول: (مطبع سیرت الاخبار دہلی: ۱۲۶۳ھ-۱۸۴۷ء) نیز باب سوم ص ۳۱

(مطبع نول کشور لکھنؤ: ۱۳۱۸ھ-۱۹۰۰ء) یہ دونوں اشاعتیں کم یاب بلکہ نادر ہیں۔

(۲) یہ عمارت کشمیری گیٹ کے بڑے ڈاکخانہ سے متصل گرو گو بند سنگھ اندر پرستھ یونیورسٹی کے احاطہ میں گیٹ کے بالکل

سامنے واقع ہے۔ اصلانیہ دارالاشکوہ کی لائبریری کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں اب محمد آثار قدیمہ کامیوزیم ہے۔

پرنسپل کی ابتدائی تنخواہ ایک سو چھتر روپے، مدرس اعلیٰ کی سو روپے، دو بڑے مدرسین کی تنخواہ پچاس پچاس روپے اور عام مدرس کی تنخواہ پچیس روپے تھی۔

اس ادارہ کا پہلا نام | اگرچہ سرکاری رپورٹوں اور کاغذات میں اس ادارہ کو دہلی کالج کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، مگر دہلی کے عوام و خواص اور علمی حلقوں میں اس کی شہرت مدرسہ دہلی کے نام سے تھی۔ مرزا سنگین بیگ، سر سید احمد، نیز مولوی کریم الدین پانی پتی نے جو دہلی میں مقیم تھے اور اس مدرسہ کے پس منظر سے ذاتی طور سے واقف اور اس کے آغاز کے وقت سے اس کے تقریباً تمام واقعات و حالات کے دیکھنے والے معتبر راوی ہیں۔ اس کا نام مدرسہ دہلی لکھا ہے، نیز انگریز افسران نے اس ادارہ کیلئے نواب اعتماد الدولہ (ضیاء الملک فضل علی خاں بہادر سہراب جنگ) کا ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا فیاضانہ اور گراں قدر عطیہ ملنے پر جو کتبہ مدرسہ غازی الدین میں ۱۸۲۹ء میں نصب کرایا تھا، اس میں بھی اس کا مدرسہ ہی نام لکھا ہے، نئے کالج کا آغاز بھی ایک بڑے دینی اسلامی مدرسہ کی طرح ہوا تھا، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے بھی اس نقطہ نظر سے اتفاق کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

”صاف ظاہر ہے کہ ابتداء میں دہلی کالج کا مقصد بھی اور مدارس کی طرح خصوصیت سے عربی زبان اور قانون سکھانا تھا۔ (۱)

اس کی تاریخ افتتاح بھی یہی بتا رہی ہے کہ شروع شروع میں اس کا تصور صرف ایک مدرسہ کا تھا جس نے بعد میں توسیعی صورت اور کالج کا روپ اختیار کیا۔ رمضان المبارک کے بعد شوال کے دوسرے ہفتہ میں مدارس اسلامیہ کی ترتیب پر اس کا افتتاح کرنے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت یہ خاص دینی، مذہبی مدرسہ تھا، اگرچہ اس کے نگران اعلیٰ انگریز تھے اور تنخواہ وغیرہ کا انتظام بھی انہی کے ہاتھوں میں رہا۔

نیز متعدد شواہد اس کی تائید کر رہے ہیں کہ ابتداء میں اس پر دینی اثرات خاصے گہرے تھے، مثلاً دلی کالج کے شروع ہونے کے تین سال بعد جب پہلی مرتبہ انگریزی کی

(۱) مقدمہ (تالیف ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی) از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۱۳

کلاسیں شروع کی گئیں تو ان کا آغاز بھی مدرسوں کے معمول کی طرح شوال ۱۲۲۳ھ (اپریل ۱۸۲۸ء) (۱) میں ہوا تھا اور مولانا رشید الدین خاں کے انتقال کے کئی سال بعد مولانا مملوک العلی کے صدر مدرس کے عہدہ پر ترقی کا بھی رمضان ہی میں فیصلہ ہوا تھا۔ غالباً یہ سب اسی خیال سے ہوتا تھا کہ نئے تعلیمی سال میں (جو اسلامی مدارس میں رمضان المبارک کے فوراً بعد شوال سے شروع ہوتا ہے) کلاسوں کا نظام درست ہو جائے اور تعلیمی و انتظامی سلسلہ بھی صحیح رہے۔

### مدرسہ کے نظام اور طریقہ تعلیم میں تبدیلی اور مغربی شعبہ کی ابتداء

مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کے افتتاح کے وقت ہی اس میں زبان، سائنس اور ضروری علوم و فنون کی تعلیم و ترقی کا بڑا منصوبہ شامل تھا مگر اس وقت تک کوئی واضح طریقہ عمل سامنے نہیں تھا۔ کالج کی ابتداء ایک مدرسہ کی طرح ہوئی تھی اور تین سال تک اس کی یہی ترتیب رہی، مدرسین کی تعداد میں اضافہ ہوا، نہ نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی گئی، مذہبی تفریق بھی نہیں تھی، شیعہ، سنی، مسلم، غیر مسلم ایک جماعت میں ایک استاد سے پڑھتے تھے۔ تین سال کے بعد اپریل ۱۸۲۸ء (شوال ۱۲۲۳ھ) میں پہلی مرتبہ انگریزی جماعت کا اضافہ ہوا، اور ایک اور قابل ذکر تبدیلی یہ ہوئی کہ ہیئت اور ریاضی کی مغربی اصولوں کے مطابق تعلیم دی جانے لگی (۲) مگر انگریزی کی تعلیم کا معیار معمولی تھا اور پہلے سال میں انگریزی جماعت کے امتحان کے نتیجے بھی اچھے نہیں تھے۔ خواجہ احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ:

”اس سال کے امتحانات کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کالج میں انگریزی کی تعلیم

ثانوی حیثیت سے ہوتی تھی، جس کا معیار بہت معمولی تھا“۔ (۳)

انگریزی تعلیم کی اس کیفیت کو دیکھ کر تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی نے سفارش کی کہ انگریزی کی جماعتیں (مدرسہ دہلی سے) علیحدہ قائم کی جائیں اور انگریزی زبان سائنس اور ادب کی تعلیم کے لئے آٹھ سو (۸۰۰) روپے ماہوار منظور کئے جائیں۔ حکومت نے بھی

(۱) رام چندر: تالیف صدیق الرحمن قدوائی، ص ۱۷ (دہلی: ۱۹۶۱ء)

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۱۱۸ (دہلی: ۱۹۳۵ء) (۳) مقدمہ خواجہ احمد فاروقی، ص ۱۴۔

اس خیال کی تائید کی اور دہلی کالج کا انگریزی شعبہ وجود میں آ گیا۔ اور مشرقی و مغربی دونوں حصے علیحدہ علیحدہ کام کرتے رہے، مگر کچھ دنوں کے بعد دونوں شعبے پھر ایک جگہ کر دیئے گئے تھے جو آخر تک اسی طرح رہے۔

دہلی کالج کی ایک بڑی خصوصیت | درجوں میں نصابِ تعلیم اور نظام کی تھوڑی بہت تبدیلیوں کے علاوہ جو ہر ایک تعلیمی ادارہ

اور انتظام میں ضروری ہوتی ہیں، دہلی کالج اور تغیرات سے بہت کم متاثر ہوا۔ دہلی کالج کے بعد جو سرکاری تعلیمی ادارے شروع ہوئے ان میں موجود کوئی امدادی ادارہ، مدرسہ، کالج ایسا نہیں ہے جو اس دور کے نئے نئے قوانین اور احکامات و قواعد سے متاثر نہ ہوا ہو، بیشتر مدرسوں کالجوں میں بڑے بڑے انقلاب آئے، ذریعہٴ تعلیم تبدیل ہوا، نصاب میں تبدیلی کی گئی، نئے نئے نصابِ تعلیم نافذ کئے گئے، اردو فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ دینی، شرعی علوم اور مشرقی طریقہٴ تعلیم و تربیت کو نکال دیا گیا اور بھی طرح طرح کی پابندیاں عائد کی گئیں، مگر دہلی کالج کچھ ایسا سخت جان تھا یا اس کے ذمہ دار اور سربراہ اور اس میں تعلیم دینے والے اپنے مقصد کیلئے ایسے مخلص تھے کہ اس میں چوتھائی صدی (یا مولانا مملوک العلی کی وفات ۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء) تک کوئی غیر معمولی تبدیلی عمل میں نہیں آئی تھی، یہاں تک کہ لارڈ میکالے (BABINGTON, LORD, THOMAS,) کی ہندوستان اور ہندوستانیوں کی تعلیم پر وہ بدنام زمانہ یادداشت بھی، جو ڈاکٹر سید عابد حسین کے بلغ الفاظ میں:

”جہالت، تنگ نظری و خطابت و وکالت کا بے مثال نمونہ ہے“ (۱)

اور جس نے ملک کے پورے تعلیمی نظام اور تہذیبی عمل کو تہ و بالا کر دیا تھا، اس کالج

(۱) قومی تہذیب کا مسئلہ، ڈاکٹر سید عابد حسین ص ۱۰۷ (دہلی: ۱۹۸۰ء) اس رپورٹ پر کمپنی کے ایک اور افسر ولن

(Dr. HORACE WILSON HAY MAN) نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

”مجھے اس کے مطالعہ کا موقع ملا ہے، یہ اس کی تمام تحریروں کی طرح بہت پُرکارانہ و صناعانہ یادداشت ہے۔ مگر اس ملک سے متعلق علم اور تجربہ کی کمی اس میں صاف جھلکتی ہے۔“

ترجمہ تاریخِ تعلیمِ ہندوستان۔ ترجمہ وارث سرہندی ص ۱۳۲ (کراچی)

کے نظام اور طریقہ کار پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔

دہلی کالج اس لحاظ سے اس وقت (۱۸۵۷ء سے پہلے) کے ہندوستان کا ایک غیر معمولی اور منفرد ادارہ تھا، جو اس طوفانِ بلاخیز اور تیز آندھیوں میں بھی ایک شان سے کھڑا اور اپنے راستہ پر چٹان کی طرح جمارہا، خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں:

”اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زلزلہ آتا ہے اور مکان و مکین سب دب جاتے ہیں، لیکن ایک بچہ حسن اتفاق سے بچ جاتا ہے، کچھ ایسا ہی دہلی کالج کے ساتھ ہوا، میکالے کی تعلیمی پالیسی نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا، مشرقی علوم (سرکاری) سرپرستی اور امداد سے محروم کر دیئے گئے، لیکن کالج کو باقی رہنے دیا گیا، واپس آفت ازینا گذشت“ (۱)

مولوی عبدالحق نے بھی دہلی کالج کے اس امتیاز اور اس کے اس دور کے تغیرات سے متاثر نہ ہونے کا خاص طور سے ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”ستم ظریفی یہ ہوئی کہ سنسکرت، عربی، فارسی کی تعلیم بھی انگریزی کے ذریعے ہونے لگی، دیسی زبانوں کی بد قسمتی کا کچھ ٹھکانا ہے۔ ۱۸۳۵ء سے قبل تقریباً تمام مدارس میں عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم ہوتی تھی اور گورنمنٹ بھی اس کی پوری تائید پر تھی اور ساری توجہ اور محنت اس پر صرف کی جاتی تھی اور دیسی زبانوں کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ جب لارڈ بنٹنک کاریز یولوشن عمل میں آیا تو انگریزی نے وہ زور پکڑا کہ اس نے عربی سنسکرت ہی کو نہیں بٹھا دیا بلکہ دیسی زبانیں بھی کس میرسی کی حالت میں آگئیں۔ ایک دہلی کالج ایسا تھا جہاں مغربی علوم یعنی ہیئت، ریاضت، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم بھی اردو کے ذریعے سے دی جاتی تھی اور باوجود ان تمام موانعات کے جو معترضین ذریعہ تعلیم کی بحث میں ہر موقع پر پیش کرتے تھے، وہ نہایت کامیاب رہا“ (۲)

## دہلی کالج کے مشرقی شعبہ کی مغربی شعبہ سے بہتر کارکردگی

دہلی کالج میں عربی، فارسی، علوم اسلامیہ، فقہ، دینیات، حدیث اور عربی اس اہتمام

(۱) مقدمہ خواجہ احمد فاروقی ص ۲۳-۲۴ (رام چندر، از صدیق الرحمان قدوائی)

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۲۵، ۲۴، ۲۳



اور توجہ سے پڑھائے جاتے رہے جس طرح کالج کے ابتدائی دنوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ کالج کی تعلیمی زبان اردو رہی، جس میں اسلامی، ادبی، مشرقی اور سائنسی علوم مناسب موضوعات کی تمام کتابیں اردو میں پڑھائی جاتی تھیں جس کا بہت اعلیٰ معیار تھا، اور مشرقی شعبہ مغربی شعبہ سے بہت ممتاز تھا، دہلی کالج کے نگران اور ممتحن مانتے تھے کہ:

”مشرق شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے بڑھا ہوا ہے“ (۱)

یہ تبصرہ دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر کارگل (Jhon, Kargill) کا ہے۔ کارگل صاحب کا تجزیہ یہ تھا کہ نصاب کی مناسب کتابیں نہیں ہیں ورنہ مشرقی حصہ کے طالب علموں کا علم اس سے بھی اچھا ہو جاتا، کارگل کے تبصرہ کے کچھ اور الفاظ بھی مولوی عبدالحق نے نقل کئے ہیں، وہ لکھتا ہے:

”حال ہی میں کالج کا معائنہ بعض نہایت قابل فوجی افسروں اور مشنریوں نے کیا جو معاملات تعلیم سے بخوبی واقف تھے، انہوں نے مشرقی شعبے کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان سے علم ہیئت، جنرل سائنس، اخلاقی اور مذہبی مسائل میں گفتگو کی، ان سب کا یہ بیان ہے کہ اس شعبے میں قطعی طور پر بڑی ترقی پائی جاتی ہے اور مختصر یہ کہ تمام ہندوستان میں کسی جگہ ترقی کے لئے ایسے آثار نظر نہیں آتے“۔ (۲)

ان اطلاعات اور تبصروں سے واضح ہے کہ دہلی کالج اور مدرسہ دہلی کے طلبہ کی مولانا مملوک العلی اور ان کے رفقاء نے اس طرح تربیت کی تھی اور ان کو علم کے جوہر سے اس قدر مالا مال کر دیا تھا کہ وہ اپنے ہم مرتبہ طلبہ سے ہمیشہ ممتاز رہے۔ مولانا کے طلباء کی لیاقت کا کچھ اور تذکرہ مولانا کے شاگردوں کے ذکر میں آئے گا۔

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۲۵

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۲۵

## باب (۶)

### مولانا مملوک العلی کا دہلی کالج میں تقرر

منصب، ترقی، کالج کے ذمہ داروں اور پرنسپل صاحبان سے روابط اور اختلاف، کالج سے ایک سال کی رخصت، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس اول اور امین مدرسہ کے عہدہ کیلئے انتخاب، کلکتہ کے سفر کا ارادہ، مولانا کے دوستوں کا کلکتہ نہ جانے کا مشورہ، دہلی کالج سے ملازمت کلکتہ کیلئے رخصت لینے کی کوشش اور اس میں ناکامی، کلکتہ کے سفر کے منصوبہ کا اختتام اور مدرسہ دارالبقاء میں ملازمت کی روایت پر ایک نظر

دہلی کالج کے ابتدائی منصوبہ اور سب سے پہلے ملازمین اور منصب اور ترقی | مدرسین کے تقرر کے وقت جو اصحاب مدرسہ دہلی (دہلی کالج) میں تعلیم و تدریس کی خدمت کیلئے منتخب کئے گئے تھے ان میں مدرس اول (مولانا رشید الدین) کے بعد دوسرا نام مولانا مملوک العلی کا تھا۔ مولانا رشید الدین خاں دہلی کالج کے قیام کے وقت (۱۰ شوال ۱۲۴۰ھ جون ۱۸۲۵ء) سے تین سال تک دہلی کالج کے مدرس اول رہے، مولانا رشید الدین کی وفات (۱) کی وجہ سے مدرس اول کا عہدہ خالی ہو گیا تھا، مولانا مملوک العلی مدرس اول کے نائب، کالج کے تمام استادوں میں سب سے پرانے اور علمی حیثیت اور تعلیمی و درسی خدمات میں سب سے فائق تھے، اس لئے مدرس اول کے عہدہ پر مولانا کا پورا حق تھا، اسلئے مولانا رشید الدین کی وفات کے بعد مولانا مملوک العلی کو مدرس اول کے عہدہ پر نامزد کیا جانا چاہئے تھا لیکن بوجہ اس میں بہت دیر ہوئی، اگرچہ مولانا

(۱) مولانا رشید الدین خاں کی وسط ماہ محرم الحرام ۱۲۴۳ھ میں دہلی میں وفات ہوئی تھی، صحیح تاریخ کی تحقیق گزر چکی ہے۔

مملوک العلی اس عہدہ پر عملاً فائز تھے اور اس کے متعلق تمام خدمات مولانا مملوک العلی انجام دے رہے تھے مگر مولانا کو عہدہ تفویض نہیں کیا گیا تھا، اس میں اور مشکلات کے علاوہ ایک رکاوٹ یہ آگئی تھی کہ نواب حامد علی خاں نے (جو دہلی کالج کے لئے وقف اعتماد الدولہ لکھنؤ کے متولی تھے) مولوی جعفر علی خاں چارجوی کو مدرس رکھ لیا تھا اور نواب صاحب چاہتے تھے کہ مولوی جعفر علی خاں کو صدر مدرس نامزد کر دیا جائے، مگر نواب صاحب کی اس ہدایت پر عمل کرنے سے ڈاکٹر ایوب قادری کے الفاظ میں:

”مولانا مملوک العلی (جو) پندرہ سولہ سال سے کالج میں ملازم تھے ان کی حق تلفی ہوتی تھی“ (۱)

اسلئے کالج کے ارباب انتظام نے یہ معاملہ مولانا مفتی صدر الدین آزرہ کے پاس مشورہ کیلئے بھیجا، مفتی صاحب نے مولانا مملوک العلی کے فضل و کمال کی تعریف کی اور مولانا کے حق میں رائے دی، مگر مشکل یہ تھی کہ کالج کی انتظامیہ، متولی، وقف کے رکھے ہوئے ملازم کو الگ بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اور کمیٹی کیلئے مولانا مملوک العلی کی کالج سے پرانی وابستگی کو نظر انداز کرنا بھی مشکل تھا، دہلی کالج کیلئے مولانا کی خدمات نیز دہلی کے علمی حلقوں میں مولانا کی عظمت و وقعت اور پذیرائی کے کسی پہلو کو بھی نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے اس معاملہ کو غالباً جوں کاتوں رکھنے کا فیصلہ ہوا اور یہ فیصلہ برسوں تک ٹلتا رہا، کئی سال کے بعد مولانا مملوک العلی کے حق میں اس عہدہ کا فیصلہ ہوا، اور ایوب قادری صاحب کی اطلاع کے مطابق، مولانا کو ۸ نومبر ۱۸۴۱ء (۲۳ رمضان ۱۲۵۷ھ) کو باضابطہ صدر مدرس مقرر کر دیا گیا (شاید اسی موقع پر) کالج کے وزیر مسٹر ٹامسن (THOMASON) نے مولانا مملوک العلی کے تعارف میں لکھا تھا:

”وہ عربی کے بہت بڑے فاضل ہیں اور شہر دہلی میں ان کا بہت احترام ہے“ (۲)

اگرچہ ایوب قادری صاحب نے مولانا مملوک العلی کے صدر مدرس کے عہدہ پر مقرر

(۱) تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی، مرتبہ محمد ایوب قادری ص ۱۷۴ (کراچی)

(۲) تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی، مرتبہ محمد ایوب قادری ص ۱۷۴ (کراچی)

ہونے کی تاریخ کی صراحت کی ہے مگر مجھے یہ اطلاع مشتبہ معلوم ہوتی ہے، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ دہلی کالج جیسے مقتدر علمی مرکز اور ادارہ میں دس سال مدرس اعلیٰ کا عہدہ پر نہ کیا جائے، سال دو سال کی تاخیر تو ممکن تھی مگر دس سال کی اطلاع محل نظر ہے۔

مولانا مملوک العلی صدر مدرس ہو گئے اور کالج کے مشرقی شعبہ کے نگران بھی رہے اگرچہ (وقف اعتماد الدولہ لکھنوی کی وجہ سے) کالج میں سنی اور شیعہ دینیات کیلئے الگ الگ استاد تھے، مولوی جعفر علی شیعہ دینیات پڑھاتے تھے مگر کالج کے علمی سربراہ مولانا ہی تھے جو اپنی زندگی کے آخر دنوں تک عزت و حرمت اور وضع داری کے ساتھ اس عہدہ پر فائز رہے اور یقیناً بناء مدرسہ ان کی ذات سے مستحکم رہی۔ (۱)

مولانا مملوک العلی اپنے علم و فضل، اعلیٰ منصب، بے نہایت فیض، نامور شاگردوں تاریخی ناقابل فراموش خدمات کے علاوہ دہلی کالج کی تاریخ میں اس وجہ سے بھی ممتاز ہیں کہ دہلی کالج کے سب عہدہ داروں اور مدرسین میں مولانا کا دورِ ملازمت سب سے زیادہ وسیع ہے، مولانا کالج کے افتتاح کے وقت ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) کالج میں مدرس ہوئے اور اپنی وفات کے دن ۱۱ رذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) تک تقریباً چھبیس سال دہلی کالج کی ملازمت میں گزارے، خود مولانا نے اسپرنگر کے نام اپنے ایک خط میں اپنی اس خدمت کا یوں ذکر کیا ہے:

”احقر نے چھبیس برس مدرسہ دہلی میں طلبہ کی خدمت کی ہے“ (۲)

تنخواہ | مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) میں ابتدائی تقرر کے وقت مولانا مملوک العلی کی تنخواہ پچاس روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی، جو اس زمانہ میں تعلیمی شعبوں میں ہندوستان کی تنخواہ کے اوسط کے لحاظ سے بہت مناسب تنخواہ تھی، مولانا کے ساتھ ایک اور مدرس (مولانا سید محمد صاحب) تھے، ان کی تنخواہ بھی پچاس روپے ماہانہ تھی۔ مدرس اول کی وفات کے بعد مولانا مملوک العلی اگرچہ مدرس اول کے قائم مقام تھے اور مولانا رشید

(۱) یہ الفاظ مولوی کریم الدین پانی پتی کے ہیں۔ طبقات شعرائے ہند ص ۴۶۳ (لکھنؤ ۱۹۸۱ء)

(۲) مکتوب مورخہ ۲۲ جولائی ۱۸۵۰ء (۱۲ رمضان ۱۲۶۶ء) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۷۰

الدین کی تنخواہ ایک سو (۱۰۰) روپے تھی لیکن مولانا مملوک العلی کی تنخواہ میں اضافہ نہیں ہوا، منصب میں ترقی کے باوجود وہی پرانی تنخواہ ملتی رہی۔

جنرل پبلک انسٹرکشن کمیٹی نے ۳۰ اکتوبر ۱۸۴۰ء (۴ رمضان ۱۲۵۶ھ) کو گورنر جنرل کو ایک مراسلہ بھیجا تھا جس میں دہلی کالج کے استادوں کی تنخواہ کا ذکر کیا تھا اور اس تنخواہ میں اضافہ کی سفارش کی گئی تھی اور مولانا مملوک العلی کی تنخواہ میں اضافہ کا (خاص طور سے) ذکر تھا، خواہش کی گئی تھی کہ مولانا کی تنخواہ بڑھا کر اسی (۸۰) روپے ماہوار کر دی جائے، مگر کمیٹی کی یہ تجاویز منظور نہیں ہوئیں۔ اس تجویز کے ایک سال بعد نومبر ۱۸۴۱ء (رمضان ۱۲۵۷ھ) جب مسٹر ٹامسن (THOMASON) وزیر دہلی کی ہدایت پر مولانا مملوک العلی کو دہلی کالج کے مدرس اول کا عہدہ سپرد کیا گیا، اس وقت ٹامسن نے بھی مولانا کی تنخواہ میں اضافہ کی سفارش کی، اس سفارش پر مولانا کی تنخواہ میں دس روپے کا معمولی اضافہ کیا گیا (۱) مگر یہ اضافہ اور تنخواہ مرحوم مدرس اول، مولانا رشید الدین خاں کی تنخواہ سے بہت کم تھا، اس امتیاز کو دہلی کالج کے ذمہ داروں نے غالباً محسوس کیا ہوگا، اس لئے مولانا کی تنخواہ میں اضافہ کی دوبارہ تحریک ہوئی ہوگی جس کی تفصیل راقم سطور کو نہیں ملی، لیکن اس کوشش کے نتیجے میں مولانا کی تنخواہ بڑھ کر سو روپے ماہوار ہو گئی تھی، اس اضافہ کی تاریخ معلوم نہیں، مگر ۱۸۴۷ء میں مولانا کی تنخواہ ایک سو روپے ماہوار تھی، کریم الدین پانی پتی کی اطلاع ہے:

”مدرس اول مدرسہ دہلی جناب مولوی مملوک العلی مدظلہ عالم بے بدل، متقی بے مثال اور فاضل کامل ہیں، عہدہ میر مولوی بہ مشاہرہ سو روپے ماہوار مدرسہ میں مقرر ہیں“ (۲)

یہ مولانا کی تنخواہ کا غالباً آخری اضافہ تھا، اسی ملازمت و تنخواہ پر چند سال بعد مولانا رحلت فرما گئے۔ سدا نام رہے اللہ کا!

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۳۱

(۲) طبقات شعرائے ہند ص ۴۶۳ (لکھنؤ ۱۹۸۱ء)

دہلی کالج سے طویل رخصت

مولانا مملوک العلی نے ملازمت کے زمانہ میں (کم سے کم) ایک مرتبہ کالج سے ایک سال کی

طویل رخصت بھی لی تھی، یہ چھٹی سفر حج کیلئے لی گئی تھی، جس کی ابتداء ۲۶ رجب ۱۲۵۸ھ (۲۳ اگست ۱۸۴۳ء) کو ہوئی اور اختتام ایک سال بعد رجب ۱۲۶۰ھ (جولائی، اگست ۱۸۴۴ء) میں ہوا تھا۔ اس سفر کا مورخین، تذکرہ نگاروں اور علماء نے عموماً جو سنہ لکھا ہے وہ صحیح نہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ سفر رجب ۱۲۵۸ھ میں ہوا تھا، مگر شہرت عام اور کثرت نقل کے باوجود ۱۲۵۸ھ میں سفر حج کی روایت و اطلاع صحیح نہیں (تفصیلات سفر حج کے ذکر میں آئیں گی)۔ بہر حال اس زمانہ میں شمالی ہند کے سرکاری اسکولوں (اور دہلی کالج میں بھی) چھٹی کا ضابطہ یہ تھا کہ چھ مہینہ تک کی چھٹی تنخواہ کے ساتھ دی جاتی تھی، اگر چھ مہینہ سے زیادہ کی رخصت کی ضرورت ہو تو اس کی تنخواہ نہیں ملتی تھی، اس عہدہ پر عارضی طور سے دوسرے شخص کو رکھ لیا جاتا تھا مگر رخصت لینے والے کی ملازمت اور عہدہ محفوظ رہتا تھا، جب وہ رخصت سے واپس آتا تھا پرانی تنخواہ پر اپنے عہدہ پر بحال کر دیا جاتا (۱) مولانا مملوک العلی صاحب کو کالج کی انتظامیہ نے ازراہ قدردانی و عزت افزائی پورے سال کی رخصت دی اور مولانا کیلئے تنخواہ کے ضابطہ میں بھی ترمیم کی گئی، تنخواہ بھی پورے سال کی عطا ہوئی۔

مولانا مملوک العلی کے چھبیس سالہ دورِ ملازمت میں دہلی کالج میں چار پرنسپل مقرر ہوئے، ٹیلر جو دہلی کالج قائم کرنے کا پہلا محرک تھا اسی کو کالج کا پہلا پرنسپل بھی مقرر کیا

دہلی کالج کے انگریز ذمہ داروں

سے روابط اور اختلافات

گیا تھا، اسکے بعد مولانا مملوک العلی کے عہد میں تین پرنسپل اور آئے، بتروس (۲) (FELIX, BOUTROS) اسپرنگر (SPRENGER) اور جے کارگل (JHON, KARGILL) دہلی کالج کے قدیم دور کی معلومات دستیاب نہیں، اسلئے ان

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب۔ مرتبہ محمد اکرام چغتائی ص ۳۳۰

(۲) بتروس پرنسپل دہلی کالج کی فرمائش پر مولانا شیخ امام بخش صہبائی نے ..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

صاحبان کے ساتھ مولانا کے روابط کی تفصیل بھی نہیں ملتی مگر اسپرنگر صاحب علم اور کتب و نوادرا کا نہایت شوقین تھا مولانا کے اس سے خاص مراسم تھے، خط و کتابت رہتی تھی، یہ خط و کتابت اور تعلقات ٹیلر کو ناپسند تھے، اس لئے ٹیلر مولانا سے ناراض رہتا تھا، ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی نے لکھا ہے:

”ٹیلر اسپرنگر کے قریبی احباب کو پسند نہیں کرتا تھا اور انہیں کسی نہ کسی طرح

نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا تھا“ (۱)

ٹیلر اور مولانا مملوک العلی کے اختلاف اور مولانا سے ٹیلر کی ناراضگی کا اس وقت سب کو پتہ چل گیا جب علی اکبر سونی پتی (جو دہلی کالج میں فارسی کا استاد اور مولانا مملوک العلی کا شاگرد تھا) کے کلکتہ جانے اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے عہدہ ایمنی کیلئے ملازم رکھے جانے کی خبر مشہور ہوئی اور دہلی کالج میں علی اکبر کے ماتحت استادوں کو یہ خیال ہوا کہ علی اکبر کے کلکتہ جانے کے بعد اس کی جگہ خالی ہو کر انہیں مل جائے گی، ادھر مولانا مملوک العلی نے یہ کوشش کی کہ علی اکبر کی جگہ پر مولانا مظہر نانوتوی (جو مولانا مملوک العلی کے بھتیجے اور شاگرد تھے) کا تقرر ہو جائے۔ قائم مقام پرنسپل ٹیلر تھا، وہ مولانا مملوک العلی کے اسپرنگر سے قریبی تعلقات کی وجہ سے مولانا محمد مظہر کو یہ ملازمت دینے پر تیار نہیں ہوا، اسلئے یہ جگہ مولوی احمد علی دہلوی کو مل گئی تھی، کچھ دنوں کے بعد جب علی اکبر کو کلکتہ کی ملازمت کی امید نہیں رہی اور احمد علی جو اس کی جگہ مقرر کئے گئے تھے چھٹی پر چلے گئے تو اس عہدہ پر دوبارہ علی اکبر کو رکھ لیا گیا، چغتائی صاحب نے اس واقعہ کا وضاحت سے اس طرح ذکر کیا ہے:

”اسپرنگر کو جب دہلی کالج کی پرنسپل سے ہٹا کر شاہان اودھ کے کتاب خانوں

کی فہرست سازی کیلئے لکھنؤ بھیجا گیا (۶ دسمبر ۱۸۴۷ء کو) تو اس کی جگہ ٹیلر کو قائم مقام پرنسپل مقرر کر دیا۔ ٹیلر سے مولانا کی بنتی نہیں تھی اور وہ چاہتے تھے کہ مدرسہ کی

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... شمس الدین فقیر کی کتاب حدائق البلاغہ کا اردو ترجمہ کیا تھا اور اس کے مباحث اور مثالوں کو اردو کا مزاج بخشتا تھا، یہ کتاب پہلی مرتبہ سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں کے لیتھوگرافک پریس میں ۱۲۵۹ھ (اپریل ۱۸۴۲ء) میں مصنف کی تصحیح سے چھپی تھی، اس طباعت کا ایک نہایت عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۴۴

ملازمت ترک کر دی جائے اور اپنی جگہ اپنے بیٹے یعقوب یا قریبی عزیز محمد مظہر (محمد احسن نانوتوی کے حقیقی بڑے بھائی) کا تقرر ہو جائے، لیکن پرنسپل ٹیلر کی مخالفت کی وجہ سے مولانا اپنی خواہش پوری نہ کر سکے۔

مولانا اور ٹیلر کے مابین یہ اختلاف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ دونوں میں قطع تعلق تک کی نوبت جا پہنچی۔ ٹیلر کی مخالفت کی شاید بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اسپرنگر کے قریبی احباب کو پسند نہیں کرتا تھا اور ہر وقت انہیں کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا تھا، اسی جھگڑے کے دوران میں مولانا کا انتقال ہو گیا اور ٹیلر نے فی الفور اُن کی جگہ سنی طلبہ کے استاد مولوی سید محمد کو مقرر کر دیا“ (۱)

علی اکبر نے (جو ان واقعات کے تمام پہلوؤں سے واقف، بلکہ خود بھی اس کا ایک حصہ ہے) اسپرنگر کے نام ایک خط میں یہ تمام روداد یوں بیان کی ہے:

”عرضی مولوی محمد مظہر کی ملفوف ہے، باعث ان کی عرضی لکھنے کا یہ ہے کہ علی اکبر چونکہ کلکتہ ضرور جائے گا، علاقہ مولوی احمد علی کا بعد اس کے ہم کو ملے گا، لیکن اب صورت اس کی دگرگوں ہوگئی، یعنی سرکار میں استحقاق روشن علی کا ثابت ہو گیا، میرے بعد وہ علاقہ اسی کو ملے گا، مجھ کو بھی وہ علاقہ ملنا مشکل تھا مگر صرف حضور کے اقبال سے حاصل ہوا، ورنہ مجھ کو کون پوچھتا۔ چنانچہ ٹیلر صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ تو ہی تھا جو یہ علاقہ تجھ کو مل گیا اور کسی کو ہرگز نہ ملتا، اسی سبب سے انہوں نے مضطر ہو کر حضور کو لکھا اور سوار تکاب سفر کے اور کچھ نہیں بن پڑتا۔

اگر مولوی مملوک العلی اور ٹیلر صاحب میں اتفاق ہوتا تو شاید علاقہ مذکور محمد مظہر کو مل جاتا، کیونکہ اختیار اور رائے بالکل ان دنوں میں ٹیلر صاحب کو حاصل ہے لیکن مولوی صاحب ایسے عقلمند ہیں کہ ٹیلر صاحب سے ناحق بگاڑ اور خلاف کر رکھا ہے، تمام مدرسہ کے باب میں جو مشورہ وغیرہ منظور ہوتا ہے ٹیلر صاحب مولوی سید محمد صاحب کو بلاتے ہیں، آمدورفت مولوی مملوک العلی کی ان کے پاس ترک ہوگئی ہے اور فی الواقع مولوی مملوک العلی ان کا ہر بات میں خلاف کرتے ہیں“ (۲)

(۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۲۹۸

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۲۴



مولانا مملوک العلی اور ٹیلر کے اختلافات کا اس وقت بھی صاف اظہار ہوا جب مولانا نے اسپرنگر کے اصرار پر مدرسہ عالیہ کلکتہ جانے کا ارادہ کیا، مولانا چاہتے تھے کہ میں کلکتہ کی ملازمت کیلئے ایک سال کی رخصت حاصل کر لوں، دہلی کالج کی ملازمت سے سبکدوش نہ ہوں، مگر مولانا اور ٹیلر کے اختلافات تھے، ٹیلر مولانا کے اسپرنگر سے تعلقات کی وجہ سے ناخوش تھا، اس نے مولانا کی رخصت منظور نہ ہونے دی (۱) چوں کہ اس وقت ٹیلر قائم مقام پرنسپل تھا مولانا کی دہلی کالج سے لمبی رخصت کی منظوری اس کی سفارش اور رائے کے بغیر متوقع نہیں تھی اور اسکو اسپرنگر کے پاس مولانا کا قیام کرنا پسند نہیں تھا، اس لئے نہ اس نے اجازت دی نہ مولانا کو رخصت ملی۔

اسپرنگر جو دہلی کالج کا پرنسپل رہ چکا تھا، مولانا مملوک العلی کو اچھی طرح جانتا تھا، دونوں میں قریب کے روابط

مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس اول یا امین کے منصب کیلئے مولانا مملوک العلی کا انتخاب

تھے، علمی معلومات، کتابوں اور اطلاعات کا تذکرہ و تبادلہ ہوتا رہتا تھا، دہلی کالج سے اسپرنگر کو نو ابان اودھ کے کتب خانہ کی فہرست بنانے کیلئے لکھنؤ بھیج دیا گیا تھا، اسپرنگر اودھ لائبریری کی فہرست بنا کر فارغ ہوا تو اس کا مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل کے عہدہ پر کلکتہ تقرر کر دیا گیا، اسپرنگر (غالباً) جون ۱۸۵۰ء میں لکھنؤ سے کلکتہ پہنچا اور نئی ذمہ داری کو سنبھال لیا۔ اس نے کلکتہ پہنچنے سے غالباً پہلے ہی مدرسہ کے انتظام اور نصابِ تعلیم میں چند بنیادی تبدیلیوں کا منصوبہ بنا لیا تھا اور جو اہم عہدے خالی تھے ان کے لئے مناسب افراد کا تقرر بھی اسکے منصوبہ کا اہم حصہ تھا، اسپرنگر کے آنے سے پہلے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے امین، مولوی احمد کبیر کا انتقال ہو چکا تھا اور عہدہ امینی کا خالی تھا، اسپرنگر چاہتا تھا کہ اس منصب پر کسی عالم فاضل شخص کو لایا جائے، اسپرنگر دہلی کالج میں قیام کے وقت مولانا کے کمالات و خصوصیات اور مولانا کے اعلیٰ علمی مراتب سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا لہذا اس عہدہ

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۳۳۰

کیلئے اس کی نگاہِ انتخاب مولانا مملوک العلی پر گئی، اسپرنگر نے مولانا سے گزارش کی کہ وہ اس منصب کو قبول فرمائیں، محمد اکرام صاحب چغتائی لکھتے ہیں کہ:

”اسپرنگر نے مولانا کو کلکتہ بلانے کا مصمم ارادہ کر لیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مولانا کے عالمانہ مرتبے اور مدرسانہ صلاحیتوں کا کس قدر معترف تھا، وہ کلکتہ پہنچتے ہی مدرسے کے نصاب وغیرہ میں بعض بنیادی تبدیلیاں کرنا چاہتا تھا، اور اس کیلئے اسے مولانا کے تعاون کی ضرورت تھی، چنانچہ اس نے مولانا سے پوچھے بغیر ارباب اختیار کو یہ درخواست بھیج دی کہ مولانا کو دہلی کالج سے مدرسہ عالیہ بھیج دیا جائے“ (۱)

مولانا مملوک العلی کے خطوط سے جھلکتا ہے کہ وہ ملازمتِ کلکتہ کی اس پیش کش کو قبول کرنا نہیں چاہتے تھے (۲) مگر اسپرنگر نے مولانا کو اس کی اطلاع دینے سے پہلے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے امین کے عہدہ کے لئے ایک درخواست اپنی سفارش کیلئے تعلیمی کونسل (EDUCATIONAL CONCIL) کے سکریٹری کو بھیج دی تھی، سکریٹری کیلئے اسپرنگر کی تجویز سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں تھی، لہذا اس نے اپنا تائیدی نوٹ لگا کر اسپرنگر کی یہ درخواست دہلی کالج کے پرنسپل کو بھیج دی اور جب یہ سب کارروائی مکمل ہو گئی اس وقت مولانا مملوک العلی کو اس کی خبر ملی، مگر تعجب ہے کہ اکرام چغتائی صاحب نے جو خود مذکورہ بالا وضاحت کر چکے تھے (اسی کتاب میں) چند صفحات کے بعد یہ بھی لکھ دیا کہ:

”مولانا مدرسہ عالیہ کے جس عہدہ کے خواہش مند تھے وہ امین کا عہدہ تھا“

چغتائی صاحب نے اپنے الفاظ کی اس طرح وضاحت کی ہے:

”مطلب یہ ہوا کہ مولانا اس ادارے کے جس عہدہ کے متمنی تھے وہ تدریسی نہیں بلکہ انتظامی نوعیت کا تھا، علاوہ ازیں اسپرنگر نے انہیں اس عہدہ کی پیش کش نہیں کی تھی بلکہ انہوں (مولانا) نے خود اس عہدہ کا انتخاب کیا تھا، ان دنوں کسی امین کے انتقال یا سبکدوشی کی وجہ سے یہ عہدہ خالی ہوا تھا، مولانا کی دہلی میں اسپرنگر سے

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۶۸

(۲) اکرام چغتائی صاحب نے لکھا ہے: وہ دہلی کالج کی ملازمت ترک کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی عمر کا

اہم ترین حصہ یہیں بسر کیا تھا۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۷۱

ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس خالی جگہ کے لئے اپنا نام پیش کر دیا، اسپرنگر نے موٹ کو مولانا کے تقرر کی سفارش کر دی اور ساتھ ہی مولانا کو لکھا کہ جلد وہ اپنی درخواست بھیج دیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ وہ مستقل طور پر دہلی کالج کو نہ چھوڑیں، بلکہ انہیں ایک سال کی رخصت مل جائے اور اس عرصہ میں اگر وہ کلکتہ سے واپس دہلی آنا چاہیں تو ان پر کوئی پابندی نہ ہو، ایک سال کی رخصت کی یہ درخواست دہلی کالج کی کمیٹی نے نامنظور کر دی۔ اس نامنظوری کے بعد مولانا نے بعض ملنے باختیار افراد سے رجوع کیا تا کہ کمیٹی کے اراکین اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں، لیکن غالباً وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے“ (۱)

مگر چغتائی صاحب کی یہ قیاس آرائی صحیح نہیں، اس خیال و اطلاع کی ان ہی کے اور مندرجات سے صاف تر دید ہو رہی ہے، نیز خود مولانا مملوک العلی اور ان کے ایک شاگرد اور اسپرنگر کے علمی رفیق علی اکبر سونی پتی کے خطوط سے بھی واضح ہے کہ مولانا مملوک العلی اس عہدہ کے خواستگار نہیں تھے اور ابتدائی طور پر انہوں نے اس کیلئے کوئی درخواست یا کاوش نہیں کی تھی، مگر جب اسپرنگر نے مولانا کی طرف سے خود ہی درخواست بھیج دی اور اوپر سے اس کی منظوری ہو کر کاغذات دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کے پاس پہنچ گئے اور اسپرنگر کا خط علی اکبر کے ذریعہ سے مولانا کو ملا، اس وقت مولانا کو اس قصہ اور ملازمت کلکتہ کی خبر ملی۔ لہذا مولانا نے دہلی کالج میں چھٹی کیلئے کاروائی شروع کی اور تھارنٹن (THRIENTON) کے یہاں مدرسہ عالیہ کی اس ملازمت کیلئے درخواست بھیج دی۔

مولانا مملوک العلی کو اس سلسلہ میں اسپرنگر کا پہلا خط اکبر علی سونی پتی کے ذریعہ سے ۱۶ جولائی ۱۸۵۰ء (۶ رمضان

ترتیب واقعات، مولانا کی رخصت کی درخواست اور کالج سے اس کی نامنظوری

المبارک ۱۲۶۶ھ) سے شاید ایک دو دن پہلے ملا ہوگا، اگر اسپرنگر مولانا کیلئے کلکتہ کی

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۷۸

ملازمت کی درخواست کا مولانا سے ابتدائی مشورہ کرنے کے بعد ارادہ کرتا اور پہلے سے مولانا سے اجازت لی جاتی تو ممکن تھا کہ مولانا اس پیش کش کو منظور نہ کرتے، لیکن اس صورت میں جب مولانا کو اطلاع دینے سے پہلے بڑے افسران سے اسپرنگر اس کی منظوری لے چکا تھا، اس پیش کش سے انکار کرنے کا موقع نہیں تھا، ادھر مولانا کو اسپرنگر سے اپنے مراسم کا بھی خیال ہوا ہوگا، ڈاکٹر اکرام چغتائی کے الفاظ میں مولانا مملوک العلی:

”اپنے دیرینہ تعلقات کی بناء پر اسپرنگر کی اس پیش کش کو منظور نہیں کر سکتے تھے“ (۱)

اسپرنگر کو مولانا سے ملاقات کا تقاضہ اور مولانا کے کلکتہ پہنچنے کی جلدی تھی، اسپرنگر چاہتا تھا کہ جب وہ اپنا سفر پورا کر کے کلکتہ پہنچے تو مولانا مملوک العلی وہاں موجود ہوں، مگر مولانا مملوک العلی کی رائے یہ تھی کہ وہ اسپرنگر کے پہنچنے کے بعد کلکتہ آئیں، مولانا نے اسپرنگر کے نام اپنے ایک خط میں اس کا یوں ذکر کیا ہے:

”عنایت نامہ حضور کا دستخطی مع چھٹی اسی موات (MOWAT) صاحب

بہادر سکریٹری کونسل مدارس کی معرفت ٹیلر صاحب بہادر کے، بیسویں جولائی کو احقر کے پاس پہنچا، معزز اور ممتاز کیا۔

حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ کی رائے میری رائے کے موافق ہو تو اپنی درخواست مع میری چھٹی جلد نہ بھیجیں، سو یہ تاخیر احقر کے نزدیک بہت مناسب ہے۔ بعد حصول جواب اس عرضی کے عشرہ اخیرا گت تلک، اگر خدا نے چاہا درخواست اپنی مع حضور کی چھٹی کے بھیجوں گا۔

اور وہ جونچ باب پہنچنے احقر کے اوخرا کتوبر اور بھیجنا اپنا اوسط نومبر میں ارقام ہوا احقر کے عند یہ میں بھیجنا احقر کا کلکتہ میں بعد پہنچنے حضور کے مناسب تر ہے۔ آئندہ جو حکم ہوگا عمل میں آوے گا“ (۲)

مگر دہلی کالج کے اعلیٰ حکام نے مولانا مملوک العلی کی چھٹی کی درخواست منظور نہیں کی، ایک سال کی رخصت کی درخواست بھی رد کر دی گئی، بلکہ علی اکبر سونی پتی کی اطلاع کے مطابق:

(۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، مکتوب نمبر ۵ ص ۶۹

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۳۰۹

”مولوی مملوک العلی کی رخصت ایک مہینے کی بھی نہ ہوئی“ (۱)

مولانا یہ بھی چاہتے تھے کہ دہلی کالج میں مولانا کی جگہ مولانا کے بھتیجے مولانا مظہر کو عارضی طور پر مدرس اول مقرر کر لیا جائے، مولانا کلکتہ کی ایک دو سال کی ملازمت کے بعد دہلی کالج میں اپنی ملازمت پر واپس آ جائیں گے نیز (مولانا مملوک العلی کے صاحبزادہ) مولانا یعقوب کو مدرس سوم نامزد کر دیا جائے، مگر یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی اور چھٹی بھی نہیں ملی، لیکن یہ ناکامی صرف ٹیلر کی مخالفت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس میں کچھ اور محرکات بھی کار فرما تھے۔

مولانا کو رخصت نہ دینے کی ایک اہم وجہ | کالج کے بڑے بڑے افسران بھی یہ بات جانتے اور سمجھتے

تھے کہ مولانا مملوک العلی کی وجہ سے دہلی کے مسلمانوں، علماء اور بڑے طبقہ میں دلی کالج کا خاص وقار اور احترام ہے، اگر مولانا دلی کالج سے کلکتہ یا کہیں اور چلے گئے تو دہلی کالج کا وقار اور تعلیمی نظام متاثر ہوگا، لیکن ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے موقعوں پر اداروں کے ذمہ دار متعلقہ شخصیت سے صاف نہیں کہتے کہ آپ کا تعاون اور رفاقت ہمارے ادارہ کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور آپ کے جانے سے ہمارا پورا ادارہ اور اس کا نظام تعلیم متاثر ہوگا، بلکہ عام طور پر ایسی ہی تدبیریں کی جاتی ہیں کہ بات بھی بنی رہے اور شخصیت بھی نہ جانے پائے۔ مولانا مملوک العلی کے ساتھ بھی شاید ایسا ہی ہوا ہوگا، اسی لئے اسپرنگر کی سفارش اور پرنسپل دہلی کالج کی منظوری کے باوجود بھی کامل رخصت اور کلکتہ جانے کی اجازت نہیں ملی۔

کلکتہ نہ جائیے! علماء اور دوستوں کا اصرار | مولانا مملوک العلی کے کلکتہ نہ جانے کی ایک وجہ اور بھی تھی،

مولانا کے دوست احباب بھی نہیں چاہتے تھے کہ مولانا دہلی سے کلکتہ چلے جائیں اور وہ مولانا کی صحبتوں سے محروم ہو جائیں، اس وقت دہلی کالج کے مدرس دوم مولانا سید محمد

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۳۳۶

دہلوی تھے جو دہلی کالج میں مولانا کے قائم مقام تھے، اگرچہ مولانا مملوک العلی کے جانے کے بعد ان کا مدرس اول ہو جانا یقینی تھا مگر وہ بھی مولانا کی کلکتہ کی ملازمت کے حق میں نہیں تھے، ایک اور بڑی شخصیت مولانا مفتی صدر الدین آزرہ کی تھی، آزرہ بھی کلکتہ جانے سے مانع ہوئے، مفتی صاحب نے مولانا کو اس ارادہ سے بارہا منع کیا (اور تفریحاً) یہ تک کہہ دیا کہ:

”تم کلکتہ گئے اور مرے، مرے اور جہنم میں گئے“ (۱)

اسلئے معاملہ جوں کا توں رہا، نہ مولانا کو رخصت و اجازت ملی، نہ مولانا کلکتہ گئے۔ کلکتہ کی ملازمت و سفر کا منصوبہ ختم کرنے کی مولانا نے اسپرنگر کو ان الفاظ میں خبر دی تھی:

”لہذا سب اہل رائے اور جمیع دوستوں کی عقل میں اس صورت میں کہ رخصت ایک سال بھی نہ ہو، چھوڑنا روزگار مدرسہ دہلی کا واسطے عہدہ کلکتہ کے مناسب نہیں“ (۲)

دوستوں کی سخت مخالفت اور کالج کے افسران کے اس رویہ کی وجہ سے کلکتہ کی ملازمت قبول کرنے کا وہ خیال جو پہلے ہی کمزور تھا بالکل ختم ہو گیا۔ مولانا نے

مولانا نے کلکتہ کے سفر اور

ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا

اسپرنگر کو معذرت کا خط لکھ دیا، اس خط کا ایک اقتباس اور پڑھ لیجئے:

”عرضی باب رخصت کے معرفت ٹیلر صاحب بہادر کے دی تھی اور صاحب بہادر نے بسبب عرض اور معروض احقر کے سفارش بھی کی اور کچھ دلیلیں بھی لکھیں، لیکن بہت افسوس ہے کہ وہ درخواست منظور نہ ہوئی، اور صاحب بہادر کو بھی اس امر کا افسوس ہوا۔ لہذا سب اہل رائے اور جمیع دوستوں کی عقل میں اس صورت میں کہ رخصت ایک سال کی بھی نہ ہو چھوڑنا روزگار مدرسہ دہلی کا واسطے درخواست عہدہ کلکتہ کے مناسب نہیں، اور اغلب ہے کہ آپ کی رائے بھی ان سب کی رائے کے موافق ہوگی اور احقر کو بسبب نہ بھیجئے درخواست کے معاف اور معذور تصور فرمائیں گے“ (۳)

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۳۰۰ (۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۷۴ (۳) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۷۴

مولانا مملوک العلی کے مدرسہ دارالبقاء  
دہلی میں ملازمت کی روایت پر ایک نظر

۱۸۵۷ء سے پہلے دہلی کے علمی  
افتخار پر جو تعلیمی ادارے روشن  
تھے، ان میں سے ایک مدرسہ  
دارالبقاء بھی تھا، یہ مدرسہ بہت پرانا تھا اور شاہ جہاں کی یادگار تھا، شاہ جہاں نے جامع مسجد  
کی تعمیر کے بعد (۱) اس کے ساتھ دو عمارتیں اور بنوائی تھیں، شمالی مغربی کونہ پر دارالشفاء،  
جس میں بیماروں اور دواؤں کا انتظام کیا گیا تھا، جنوب مغربی کونہ پر دارالبقاء جس میں  
طلبہ کے قیام و تعلیم کا نظم تھا، یہ دونوں عمارتیں مغلوں کے آخری دور میں خستہ و خراب ہو گئی  
تھیں دارالشفاء تو تقریباً ختم ہو گیا تھا اس پر لوگوں نے قبضے کر کے گھر بنائے تھے، سرسید  
احمد کا مشاہدہ ہے کہ:

”سابق حکیم بیٹھتے تھے اور دوائی خانہ رہتا تھا اب لوگ رہتے ہیں اور گھر بھی بن گئے ہیں“ (۲)  
دارالبقاء کی عمارت بھی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور بالکل ویران پڑی تھی، مولانا مفتی صدر  
الدین آزرہ نے اسکی مرمت اور تجدید کرائی، جو حجرے گر گئے تھے انکو دوبارہ بنوایا، تعلیم کیلئے  
علماء ملازم رکھے اور جو طالب علم یہاں پڑھتے اور رہتے تھے انکے خرچہ کی بھی پوری ذمہ داری  
لی۔ (۳) مگر اس میں درس دینے والے علماء اور طلبہ کی تفصیلات موجود نہیں، تاہم سرسید احمد  
نے اس مدرسہ کے دو استادوں مولانا حاجی محمد جو نیوری اور ملاسرافراز کا ذکر کیا ہے۔

مولانا محمد جو نیوری نے شاہ محمد اسحاق سے حدیث پڑھی تھی، ملاسرافراز مفتی صدر  
الدین کے شاگرد تھے اور دونوں صاحبان مدرسہ دارالبقاء میں تعلیم دیتے تھے۔ (۴) ان  
کے علاوہ دارالبقاء کے کسی اور مدرس کا سرسید اور کریم الدین پانی پتی وغیرہ نے ذکر نہیں کیا  
مگر مولانا محمد یعقوب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی

(۱) آثارالصنادید سرسید احمد (باب سوم ص ۴۷) مطبع سیدالاکبار، دہلی: ۱۸۴۷ء

(۲) آثارالصنادید باب سوم ص ۲۳ (منشی نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۸ھ، ۱۹۰۰ء)

(۳) آثارالصنادید باب سوم ص ۲۰-۲۱ (طبع اول ۱۸۴۷ء)

(۴) آثارالصنادید باب چہارم ص ۱۷۲-۱۷۳ (طبع اول ۱۸۴۷ء)

(مولانا مملوک العلی کی وفات کے ایک ڈیڑھ سال بعد) کچھ دنوں کیلئے مدرسہ دارالبقاء میں رہے تھے (۱) یہ قیام مفتی صدرالدین آزرہ کی ہدایت پر وہاں درس دینے کیلئے تھایا کسی اور صورت سے تھا اس کی صراحت نہیں ملی، لیکن اس سلسلہ میں یہ اطلاع صحیح نہیں کہ مدرسہ دارالبقاء میں مولانا مملوک العلی بھی مدرس رہے تھے، مولانا کے مدرسہ دارالبقاء میں مدرس، ملازم یا مقیم رہنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

بظاہر اس روایت کی اساس نزہۃ الخواطر کی ایک عبارت اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک ملفوظ پر ہے۔ مولانا عبدالحی حسنی نے مولانا مملوک العلی کے تعارف میں لکھا ہے کہ:

”وولنی التدریس بمدرسة دار البقاء فدرس و افاد مدة عمره“ (۲)  
ترجمہ: ان کو مدرسہ دارالبقاء میں پڑھانے کی ذمہ داری دی گئی اور انہوں نے اپنی تمام عمر درس و افادہ میں گزار دی۔

اور حضرت تھانوی کے ایک ملفوظ میں ہے:

”مولانا مملوک العلی صاحب جو کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کے والد اور حضرت مولانا رشید احمد و مولانا محمد قاسم صاحب کے استاذ ہیں، دہلی میں دارالبقاء سرکاری مدرسہ تھا اس میں ملازم تھے۔“ (۳)

متاخر تمام مآخذ کی اطلاعات ان ہی دو روایتوں سے لی گئی ہیں، لیکن ان دونوں ہی روایتوں میں ایسے اشارات موجود ہیں جن سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان میں مدرسہ دارالبقاء کا نام سہواً آ گیا ہے، دونوں کی اصل مراد دہلی کالج ہی تھا، وجوہات درج ذیل ہیں:

الف: مؤلف نزہۃ الخواطر نے اس اطلاع کیلئے حالات مولانا محمد قاسم مؤلف مولانا

(۱) حالات طیب یا تذکرہ مولانا محمد قاسم، مرتبہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ص: ۱۸۷

(۲) نزہۃ الخواطر، مولانا عبدالحی حسنی ص ۵۰۱ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۳۹۹ھ)

(۳) ملفوظات حسن العزیز مرتبہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب ص ۳۹۰ جلد اول۔ ملفوظ نمبر ۳۹۵ جلد اول (مکتبہ تالیفات

اشرفیہ تھانہ بھون: بلاسنہ) نیز قصص الاکابر ص ۳۲ طبع اول: ماہنامہ الہادی دہلی، شعبان ۱۳۵۱ھ



محمد یعقوب نانوتوی کا حوالہ دیا ہے، تحریر ہے:

”کما فی رسالۃ و لدہ یعقوب، فی ترجمۃ الشیخ قاسم النانوتوی“

مگر اس حوالہ میں کچھ سہو ہوا۔ مولانا محمد یعقوب کی تالیف ”حالات طیب مولانا محمد قاسم“ میں کہیں درج نہیں کہ مولانا مملوک العلی مدرسہ دار البقاء میں استاذ یا ملازم تھے، اس لئے ”و ولی التدریس بمدرسۃ دار البقاء“ کی نسبت، حالات طیب مولانا محمد قاسم، کی جانب درست نہیں۔ حالات طیب مولانا محمد قاسم میں مدرسہ دار البقاء کا صرف ایک جگہ ضمیمہ ذکر آیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

ایک برس دن کے قریب بعد انتقال والد مرحوم احقر دہلی رہا، پھر نوکری اجیر کے سبب دہلی چھوٹی اور مولوی صاحب سے جدائی پیش آئی، مولوی صاحب چند روز اس مکان میں تنہا رہے پھر چھاپہ خانہ میں جا رہے، پھر دار البقاء میں چند روز رہے“ (۱)

مولانا محمد یعقوب کی مذکورہ تالیف میں اس اندارج کے علاوہ مدرسہ دار البقاء کا کہیں حوالہ یا تذکرہ نہیں اور اس عبارت میں مولانا مملوک العلی کے مدرسہ دار البقاء میں مقیم ہونے یا وہاں مدرس یا طالب علم ہونے کا کچھ ذکر و اشارہ تک نہیں، اس لئے نزہۃ الخواطر کی اس عبارت کے حوالہ سے مدرسہ دار البقاء میں مولانا مملوک العلی کی ملازمت کا تذکرہ محل نظر ہے۔

ب: مولانا تھانوی کے ملفوظ میں مدرسہ دار البقاء سرکاری مدرسہ تھا، کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ حضرت تھانوی کی مراد سرکاری مدرسہ ہے، جو دہلی کالج تھا۔ دار البقاء سرکاری مدرسہ نہیں تھا، اس کی توسیع و تجدید کا تمام خرچہ مفتی صدر الدین آزرہ نے دیا تھا، وہی اس مدرسہ میں مقیم طلبہ اور ان کے مدرسین کے اخراجات اٹھاتے تھے، اور وہی اس کا انتظام رکھتے تھے اس لئے اس کو سرکاری مدرسہ کہنا درست نہ ہوگا، اس وقت دہلی میں سرکاری انتظام میں ایک ہی بڑا ادارہ تھا، جہاں علوم دینیہ فقہ و حدیث وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی اور وہ دہلی کالج تھا۔ اس لئے یہ اطلاع بھی صاف اور فیصلہ کن نہیں، تاہم ممکن ہے کہ مولانا مملوک العلی نے مدرسہ دہلی (دہلی کالج) میں ملازمت سے پہلے، کچھ وقت مفتی

(۱) تذکرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مرتبہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص ۹ (مطبع صادق الانوار بھاول پور ۱۲۹۷ھ)

صدرالدین آزرودہ کے مدرسہ دارالبقاء میں گزارا ہو، یا درس دیا ہو لیکن یہ زمانہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کیلئے دہلی آنے (۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء سے بیس بائیس سال پہلے کا ہوگا) مگر اس کی بھی کوئی معتبر شہادت موجود نہیں۔

## باب (۷)

مولانا مملوک العلی کے عہد میں دہلی کالج کا نصابِ تعلیم  
درجوں کی کیفیت، امتحانات کے بہترین نتائج  
مولانا کے شاگردوں کی اعلیٰ ترین استعداد  
اور مولانا کی تربیت کے اثرات

مدرسہ دہلی میں مولانا کے درجوں کا نصابِ تعلیم | شروع میں دہلی کالج  
ایک خالص مشرقی اند

از کا مدرسہ تھا اسلئے خیال ہے کہ اس میں شروع شروع میں وہی کتابیں پڑھائی گئی ہوں گی  
جن کی تعلیم کا علمائے دہلی کے یہاں عام معمول تھا، حدیث تفسیر فقہ اور عربی ادب اسکے  
خاص مضامین ہوتے تھے، بعد میں تاریخ وغیرہ کچھ اور مضامین کا آہستہ آہستہ اضافہ ہوا۔  
کالج کے نصابِ تعلیم کا مرحوم دہلی کالج میں کچھ ذکر آیا ہے، مگر اس میں عربی کے نصابِ تعلیم  
کی زیادہ تفصیل نہیں۔ جو معلومات ہیں وہ بھی نا تمام ہیں، مثلاً مولوی عبدالحق نے نصابِ  
تعلیم میں حدیث شریف کی کتابوں اور اسباق کا قطعاً ذکر نہیں کیا، حالانکہ اس کا معتبر ثبوت  
ہے کہ اس وقت مدرسہ دہلی کے نصاب میں حدیث کے سبق بھی شامل تھے۔ کریم الدین  
پانی پتی نے (جو دہلی کالج کا مشہور طالب علم، مؤلف، مترجم، اور تذکرہ نگار ہے) اسپرنگر  
کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

”(علی اکبر) نے صرف ایک ہدایہ، حماسہ اور حدیث اس کالج میں پڑھی ہے“ (۱)

(۱) مکتوب ۳ جولائی ۱۸۵۲ء، ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۱۷۹۔

اس خط کے الفاظ ”حدیث پڑھی ہے“ سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی ایک نہیں بلکہ کئی کتابیں (فن حدیث) دہلی کالج کے نصابِ تعلیم میں داخل تھیں۔

کریم الدین کے اس قول کی دوسرے معتبر ذرائع بھی تصدیق کر رہے ہیں، خود مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ کالج کی لوکل کمیٹی نے (۱۸۴۷ء میں) کالج کے نصاب میں ترمیم کرتے ہوئے یہ تجویز منظور کی تھی کہ:

”عربی صرف و نحو منطق فقہ اور حدیث وغیرہ کی اعلیٰ کتابیں نصاب میں شامل

نہ کی جائیں، بلکہ ان کی تعلیم عام لکچروں کے ذریعہ دی جائے“ (۱)

مذکورہ اقتباسات سے یہ واضح ہو گیا کہ مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کے نصاب میں حدیث کی تعلیم شامل تھی اور اسکے باقاعدہ سبق ہوتے تھے اور یہ بھی کہ خصوصاً عربی درجوں کے نصابِ تعلیم کے حوالہ سے مولوی عبدالحق کی اطلاعات مکمل نہیں ہیں۔

۱۸۴۳ء میں عربی جماعت کی کتابیں | مدرسہ دہلی ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) میں قائم ہوا تھا اس وقت سے ۱۸۴۲ء

(۱۲۵۶ھ) تک تقریباً پندرہ سال کے طویل عرصہ میں کالج کے نصابِ تعلیم میں کیا کیا ترقی اور ترمیمات ہوئیں، طلبہ کی کیا کیفیت تھی، مولانا رشید الدین خاں اور مولانا مملوک العلی کے حلقہ درس میں کون کون اصحابِ تعلیم و استفادہ کیلئے آئے اور دہلی کالج سے کس طرح فیض حاصل کیا، اسکا کچھ تذکرہ نہیں ملا۔ کالج کے عربی درجوں کے نصابِ تعلیم کی، مولوی عبدالحق کی پہلی اطلاع سنہ ۱۸۳۹-۴۰ء کی ہے، اس سال کی اعلیٰ جماعت کے طلبہ جو مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے شمس بازغہ ختم کر چکے تھے، میرزا ہدیم حاشیہ عبد العلی اور مقامات حریری پڑھ رہے تھے، انکی تعلیمی کیفیت پچھلے سالوں سے بہتر تھی، کتابیں بھی معمول (کے نصاب) سے زائد ہو گئی تھیں اور طلبہ کی علمی استعداد بھی تعریف کے لائق تھی۔ (۲)

کئی برس تک یہ نصابِ تعلیم جاری رہا ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) میں اسپرنگر دہلی کالج کا پرنسپل مقرر ہو کر آیا اور اس نے کالج کے نصاب میں ترمیم کا فیصلہ کیا، اسپرنگر کی تجویز اور

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۷۴، ۳۰

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۶۵، ۳۳، ۳۰ (دہلی ۱۹۳۵ء)

ہدایت کے مطابق نیا نصابِ تعلیم تجویز ہوا اور کالج میں نافذ کر دیا گیا۔ ترمیم کے بعد نصابِ تعلیم درج ذیل تھا۔

(۱) دیوانِ منتہی بعض حصے، درمختار، بعض حصے، اصولِ حکمت

(۲) وضع قوانین۔

### THE PRINCIPLES OF GOVERNMENT AND LEGISLATION

(۳) رہنمائے ضابطہ دیوانی۔ مصنفہ مارش مین۔

(4) MARSHMAN'S GUIDE TO THE CIVIL REGULATIONS CHAPTERS

(۴) الجبرا۔ علم مثلث تحلیلی مستوی۔

### ALGEBRA-ANALYTICAL PLANE TRIGONOMETRY

(۵) ہرشل کی کتاب ہیئت (ایک حصہ)

### HERSHOL'S ASTRONOMY (A PORTION)

نصاب کی یہ کتابیں سنی اور شیعہ دونوں جماعتوں کیلئے تھیں، فقہ کا نصاب دونوں کیلئے علاحدہ تھا۔ سنی طلبہ درمختار، ہدایہ، شرح و قایہ وغیرہ پڑھتے تھے اور شیعہ طلبہ کیلئے ان کے مسلک کے مطابق فقہ جعفریہ کی کتابیں شامل درس تھیں۔ تین سال کے بعد ۱۸۴۸ء (۱۲۶۴ھ) میں اس مذکورہ نصاب میں کچھ اور ترمیم کی گئی اب نصاب کی ترتیب اس طرح ہو گئی تھی:

”فقہ میں درمختار، ادب میں تاریخِ یمینی (اگر مکمل چھپ جائے) حماسہ پہلا

باب۔ جامع التواریخ، سائنس، علم مناظر فلپ۔ علم ہیئت مصنفہ ہرشل احصائے تفرقات“

### DIFFERENTIAL-CALCULUS (۱) رام چندر

ان کے علاوہ طلبہ نے سائنس کی وہ کتابیں پڑھیں جو اردو میں ترجمہ ہو گئی تھیں، جیسے انٹروڈکشن ٹو اینول، فلاسفی طبیعیات مؤلفہ ارٹاٹ وغیرہ مارل سائنس پیلی (PALEY) کی کتاب جہاں تک چھپ گئی ہو، نقشے بنانا (DRAWING) اور پیمائش

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۷۸

(SURVEYING) اختیاری مضامین میں شامل تھی (۱) اور ہفتہ میں دو مرتبہ مضمون نویسی کی مشق کرائی جاتی تھی۔ (۲)

۱۸۴۹ء (۱۲۶۵ھ) میں اس نصاب میں پھر ترمیم ہوئی:

توضیح حرکیات (DYNAMICS)، علم ہندسہ تحلیلی (ANALYTICAL-GEOMETRY) نیز تاریخ انگلستان کا اضافہ ہوا، ہرشل کی کتاب ہیئت، علم المناظرہ اور جامع التواریخ نصاب سے خارج کر دی گئیں (۳) ۱۸۵۰ء (۱۲۶۶ھ) کے نصاب تعلیم میں تاریخ ابوالفداء بھی شامل تھی، اگرچہ دہلی کالج کے نصاب میں اسکے بعد بھی کچھ ترمیم ہوئی مگر ۱۸۵۱ء (۱۲۶۷ھ) میں مولانا مملوک العلی کی وفات ہو گئی تھی، اسلئے یہ گفتگو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

مولانا کے درجوں میں جماعت کی جماعتوں کی درجہ بندی اور ترتیب

ترتیب یہ تھی کہ ابتدائے سال میں بڑی جماعت ہوتی تھی، ان کی کتابیں بیک وقت شروع ہوتی تھیں، اسباق آگے بڑھتے رہتے اور طلبہ کی صلاحیتوں کا زیادہ سے زیادہ اندازہ ہوتا رہتا تھا اور دو تین مہینوں کے بعد اس جماعت کے دو یا تین حصے ہو جاتے تھے۔ جو طلبہ غیر معمولی ذہین اور محنتی ہوتے تھے وہ اور طلباء سے آگے نکل جاتے تھے، انکی جماعت الگ ہو جاتی، وہ تیزی سے آگے بڑھتے رہتے تھے، مدرسین بھی قدرتی طور پر ایسے ہی طلبہ کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے، متوسط طلبہ کی ایک اور جماعت بن جاتی اور معمولی لیاقت کے طلبہ کی اپنی روش اور کچھوا چال علیحدہ ہوتی تھی، جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ ایک جماعت کا نصاب پورا ہو جاتا دوسرے طلباء کی کم ترقی ہوتی تھی۔ اکثر طالب علم ایسے ہی ہوتے تھے جو دوسری تیسری جماعت میں شریک رہتے تھے، اس سے کالج کی کارگزاری پر حرف آتا تھا اسلئے کالج کی کمیٹی نے اس طریقہ کو بدلنے کی کوشش کی اور یہ طے کر دیا کہ سال کے شروع میں پوری جماعت کا کام (نصاب اور تعلیم کی مقدار) متعین کر دی جائے اور اس کو بارہ مہینوں پر تقسیم کر کے

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۷۹ (۲) مرحوم دہلی کالج ص ۸۰ (۳) مرحوم دہلی کالج ص ۸۱

اسی تناسب سے نصابِ تعلیم پڑھایا جائے۔ اور ماہانہ امتحان میں دیکھ لیا جائے کہ طلبہ نے سبق اچھی طرح سمجھ لئے یا نہیں، جس استاد کے زیادہ سے زیادہ طلبہ کامیاب ہوتے، وہی کار گزار اور اچھا استاذ سمجھا جاتا تھا۔

**طلبہ کی (عموماً) تعداد** | مدرسہ دہلی یا دہلی کالج بلکہ پورے شمالی ہندوستان میں اپنے طرز کی پہلی درسگاہ تھی جس سے امیدیں اور اندیشے برابر

کے تھے، چونکہ اس کی تاسیس اور پورا نظام انگریزوں کی ماتحتی میں تھا اس لئے اول اول اس سے وابستگی میں اکثر لوگوں کو تکلف اور اندیشہ رہتا تھا، مگر جب کچھ دنوں کے بعد اندازہ ہو گیا کہ اس سے تعلیمی ترقی کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہے اور اسکے نظامِ تعلیم کی اور استادوں کی عیسائیت کی تعلیم و تلقین سے مطلق وابستگی نہیں تو یہ بدگمانی دور ہونی شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ طلباء کی تعداد بڑھتی گئی، نیچے کے درجوں کے بچوں کی تعداد بڑھی تو اسکا اثر اعلیٰ جماعتوں پر بھی ہوا، اس میں بھی ترقی کے آثار نظر آئے، مگر ترقی کے باوجود خاص طور سے اونچے درجوں میں طلباء کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ ایک موقع پر عربی کی جماعت میں انیس طلباء تھے وہ سب مسلمان تھے، مگر طلباء کی بڑی جماعتیں اور یہ تناسب ہمیشہ نہیں رہا، مختلف دور آئے، طلباء کبھی کم ہوئے، کبھی بڑھ گئے۔ اسکے اسباب بھی مختلف اوقات میں مختلف رہے، ایک مرتبہ کالج میں طلبہ کیلئے وظیفے ختم کئے جانے پر طلبہ اچانک کم ہو گئے تھے ایک سال جب وظیفہ کی تعداد فی طالب علم پچاس روپے ماہانہ جا پہنچی تھی، طلبہ خاصی تعداد میں ہو گئے تھے۔ غرض اسی طرح اتار چڑھاؤ آتے رہے مگر ۱۸۴۰ء - ۱۸۵۶ء (۱۲۵۵ھ) کے علاوہ مایوس کن تعداد کبھی نہیں ہوئی۔ مولانا مملوک العلی کے زمانہ ملازمت تک دہلی کالج میں عربی کے طلبہ کی کل تعداد نقشہ ذیل سے معلوم ہوگی۔

(نقشہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

نمبر شمار	سنہ	طلبائے فارسی	طلبائے عربی	نمبر شمار	سنہ	طلبائے فارسی	طلبائے عربی
۱	۱۸۳۵-۳۶ء	۸۱	۶۱	۹	۱۸۳۳-۳۴ء	۵۳	۵۸
۲	۱۸۳۶-۳۷ء	اعدادو شمار درج نہیں	اعدادو شمار درج نہیں	۱۰	۱۸۳۴-۳۵ء	۱۰۹	۷۵
۳	۱۸۳۷-۳۸ء	۵۶	۳۵	۱۱	۱۸۳۵-۳۶ء	۱۱۵	۶۶
۴	۱۸۳۸-۳۹ء	۳۹	۳۵	۱۲	۱۸۳۶-۳۷ء	۵۸	۶۵
۵	۱۸۳۹-۴۰ء	۳۹	۴۱	۱۳	۱۸۳۷-۳۸ء	۴۳	۷۲
۶	۱۸۴۰-۴۱ء	۳۴	۲۸	۱۴	۱۸۳۸-۳۹ء	۴۷	۵۶
۷	۱۸۴۱-۴۲ء	۱۴۶	۱۶	۱۵	۱۸۳۹-۴۰ء	۶۱	۴۳
۸	۱۸۴۲-۴۳ء	۷۵	۴۰	۱۶	۱۸۵۰-۵۱ء	۵۶	۳۹

ایک وقت میں جب کالج کے پرنسپل ٹیلر کی اطلاع (۱) کے مطابق:  
”شہر میں متعدد فارسی اور عربی درسگاہیں کھل گئی تھیں اور عربی فارسی پڑھنے

والے طلباء ان قومی درسگاہوں میں بٹ گئے تھے“ (۲)

طلبہ کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی مگر یہ کیفیت اور تنزل بھی عارضی تھا، اس کے بعد ایک مرتبہ پھر ترقی کے آثار ظاہر ہوئے مولانا مملوک العلی کی جماعت میں ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) میں گیارہ طلبہ ہو گئے تھے، اور بعد میں بھی کم زیادہ ہوتے رہے۔

۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں دہلی کالج کے طلبہ کے رجسٹر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال مولانا مملوک العلی کی جماعت میں تین طالب علم تھے، علی اکبر سونی پتی، عبدالرحمن اور شمس الدین دہلوی، مولانا نے ان کو درج ذیل کتابیں پڑھائیں تھیں:

درمختار، تاریخ یمنی، جامع التواریخ، دیوان حماسہ، جزئیات رسالہ ہیئت اور علم مثلث (۳)

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۱۰۹ (۲) مرحوم دہلی کالج ص ۵۴ (۳) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۲۵۵



مگر اس سے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اس سال میں مولانا نے صرف انہی تین طالب علموں کو پڑھایا، بلکہ ایک خاص جماعت میں صرف تین طلبہ تھے، مولانا مملوک العلی اور عربی کے دوسرے استادوں کے پاس ایک سے زیادہ جماعتوں کے سبق ہوتے تھے اور ہر ایک جماعت میں کم زیادہ طلبہ رہتے تھے۔

**وظیفوں کا نظام** | گزشتہ سطور میں اجمالاً ذکر آچکا ہے کہ دہلی کالج میں طلبہ کیلئے وظیفہ کا بھی انتظام تھا، ہمت افزائی کیلئے وظیفہ دیئے جاتے تھے اور معاش کے لحاظ سے کمزور طلبہ کی مدد کیلئے بھی وظیفے جاری ہوتے تھے۔ اس کا سلسلہ کالج کے تقریباً ابتدائی وقت سے شروع ہو گیا تھا، جو کمی یا اضافہ کے ساتھ برابر جاری رہا، درمیان میں جب ۱۸۳۵ء میں وظیفہ دیئے جانے کا معمول ختم کر دیا گیا تو کالج کو اس کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی وجہ سے طلبہ کی ایک خاصی تعداد کالج سے علیحدہ ہو گئی تھی جس میں بعض بہت اچھے اور لائق طالب علم بھی تھے (۱) اسلئے ۱۸۴۱ء (۱۲۵۷ھ) میں دوبارہ وظیفہ رائج کیا گیا اس میں مختلف درجے اور مراتب تھے مگر فرق مراتب کے باوجود عربی کی اعلیٰ جماعتیں قسم اول کے وظیفے حاصل کرنے میں سرفہرست رہیں۔ کالج کے شروع کے چند سال تک وظیفہ کی تعداد تین روپے ماہانہ یا کم زیادہ ہو گئی تھی، اس وقت وظیفوں کا خاصا حصہ عربی جماعتوں کو ملتا تھا، یہی صورت وظیفوں میں اضافہ اور کالج کی ترقیات کے دور میں رہی۔

۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) میں دہلی کالج میں دو طرح کے وظیفے دیئے جاتے تھے، سینئر (اعلیٰ) جو نیر (ادنیٰ)، اعلیٰ درجہ کا وظیفہ تیس یا چالیس روپے ماہوار تھا اور ادنیٰ پچیس روپے سے چار روپے ماہانہ تک، ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) میں عربی شعبہ کے جن طلبہ کو وظیفہ ملتا تھا ان میں دس کو اعلیٰ (سینئر) وظیفہ ملتا تھا اور چار کو ادنیٰ (جونیر) (۲)

دو سال بعد سنہ ۲۸-۱۸۴۷ء (۶۳-۱۲۶۲ھ) میں عربی شعبہ کے نو طلبہ کو اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ کے اٹھارہ طلباء کو وظیفہ ملتا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں (پچھلے سال جن طلباء کا وظیفہ جاری

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۹۶ (۲) مرحوم دہلی کالج ص ۱۰۱

ہوا تھا، انکے علاوہ) مزید چار طلبہ کو اعلیٰ اور آٹھ کو ادنیٰ درجہ کا وظیفہ ملتا تھا، ۱۸۴۹ء (۱۲۶۵ھ) میں عربی کی جماعت کی مندرجہ ذیل کتابوں کیلئے اعلیٰ وظیفہ تجویز کیا گیا تھا۔

”مقامات حریری۔ نصف اول، شرح وقایہ نصف، فتحہ الیمن، ترجمہ اردو سے

(عربی) اقلیدس چھ مقالے، الجبر اتا مساوات درجہ چہارم، جغرافیہ، تاریخ ہند“ (۱)

وظیفہ میں یہ اضافہ غالباً مولانا مملوک العلی کے زمانہ ملازمت (بلکہ زندگی کے آخری

سال ۱۸۵۱ء، ۱۲۶۷ھ) کا آخری اضافہ ہوگا۔

مولانا مملوک العلی کے تقرر کے پانچ سال بعد  
سنہ ۱۸۳۰ء کا اہم ترین امتحان

۱۸۳۰ء (۱۲۴۵-۴۶ھ) میں کالج کے طلبہ کا امتحان ہوا۔ جس میں طلبہ کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، طلبہ کی لیاقت اور سوالات کے جوابات توقع سے بہت عمدہ نکلے، کالج کی کمیٹی نے امتحان میں اول آنے والوں کیلئے جس قدر انعامات دینے کا ارادہ کیا تھا اس سے زیادہ انعام دیئے گئے، اس امتحان کے نتیجوں کی بہت شہرت ہوئی، کالج کے سکریٹری نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

”جس قدر انعام ہم نے رکھے تھے اس سے زیادہ دہینے پڑے، اس لئے کہ

طلبہ کی استعداد ایسی عمدہ اور ان کے جوابات ایسے کامل تھے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح

دینی مشکل تھی۔ بہت سے دیسی شرفاء جو امتحان کے وقت موجود تھے اپنے شہر کے

ہونہار بچوں کی لیاقت دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ ساتے تھے“ (۲)

کالج کا تعلیمی سلسلہ  
سنہ ۱۸۳۷-۳۸ء (۱۲۵۲-۵۳ھ) کے امتحانات

بڑھتا رہا، اگرچہ درمیان میں ایک دو سال عربی کی جماعت میں طلبہ بھی کم رہے تھے وہ

امتحان میں اچھے نمبر نہیں لاسکے تھے، مگر یہ کیفیت جلد ہی ختم ہوگئی تھی، ۱۸۳۷ء (۵۳-

۱۲۵۲ھ) کے امتحانات پھر اسی روایتی شان سے ہوئے، اکثر طلبہ امتحان میں کامیاب

ہوئے، امتحان لینے والوں نے طلبہ کی صلاحیت کی تعریف کی۔ (۳)

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۱۰۳

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۱۱

(۳) مرحوم دہلی کالج ص ۲۹

۱۸۳۸ء کے آخر میں کالج کے سالانہ امتحانات منعقد ہوئے، امتحان کے وقت دہلی کے معزز ترین اصحاب اور اہل فضل و کمال امتحان گاہ میں موجود تھے، انہوں نے اپنی آنکھوں اور کانوں سے امتحان کا حال دیکھا سنا اور:

”وہ طلبہ کی لیاقت اور جوابات سے بہت خوش ہوئے۔ (۱)

عربی جماعت کے عربی ترجمے اور فارسی انشاء پر دازی کے نمونے گورنمنٹ کو بھیجے گئے، گورنمنٹ نے انہیں بہت پسند کیا۔

سنہ ۱۸۳۹-۴۰ء میں اگرچہ نصابِ تعلیم گزشتہ سالوں سے زیادہ تھا مگر پھر بھی طلبہ کی علمی استعداد اچھی تھی، عربی کی اعلیٰ جماعت شمس بازغہ ختم کر چکی تھی، میرزا ہدیح حاشیہ عبدالعلی اور مقامات حریری پڑھ رہی تھی۔

سالانہ امتحان عیسوی سنہ کے آخر میں ہوتا تھا، اور اس زمانہ میں بڑی سالانہ تعطیلات دسمبر کے آخر میں ہوا کرتی تھی، اسی معمول کے مطابق ۱۸۴۸ء کا

سنہ ۱۸۴۸ء (۱۲۶۴ھ) کا سالانہ امتحان اور اس میں کامیابی

امتحان ہوا، یہ امتحان ۲۴ نومبر سے ۲۱ دسمبر ۱۸۴۸ء (ذی الحجہ محرم ۱۲۶۴-۶۵ھ) تک جاری رہا۔ عربی کی متوسط اور اعلیٰ کتابوں، تاریخ مسعودی، تاریخ یمنی، قدوری، میر قبطی، حماسہ، متنبتی (۲) کا تحریری امتحان ہوتا تھا، سوالات کے پرچے گورنمنٹ نے بنا کر بھیجے، جوابات مولانا مفتی صدر الدین آزرہ نے ملاحظہ کئے، مفتی صاحب کی رائے میں ان جماعتوں کی قابلیت نہایت عمدہ تھی۔

سنہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۱ء تک ۱۸۴۸ء کا سالانہ امتحان مولانا مملوک العلی کے زمانہ ملازمت و تعلیم کا آخری امتحان ہے جس کا

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۳۰

(۲) مرحوم دہلی کالج میں ”میاں حسینی“ چھپا ہوا ہے ص ۴۴ (دہلی ۱۹۴۵ء جو صحیح معلوم نہیں ہوتا غالباً ”متنبتی“ صحیح ہوگا۔

مولوی عبدالحق نے کسی قدر مفصل ذکر کیا ہے۔ اس سال کالج کے کئی فارغین مختلف مدرسوں میں مدرسہ کیلئے نامزد کئے گئے اور انہوں نے اپنے اپنے علاقہ میں علمی ترقی کیلئے کام کیا، دہلی کالج کا اخبار قرآن السعدین بھی اس کا معترف تھا، قرآن السعدین نے ایک شمارہ میں لکھا ہے:

”سالہائے گزشتہ میں اکثر لوگ متعلق مدرسہ کے علاقہ ہائے مدرسہ پر مدارس گرد و نواح کے مقرر ہوئے ہیں اور طالب علموں وغیرہ میں واسطے تربیت کرنے اپنے ہم وطنوں کے اتنا میل اور خواہش دلی ہے کہ انہوں نے اپنی جیب خاص سے روپیہ خرچ کر کے ایک مکتب واسطہ تعلیم بے کس یتیموں کے شہر دہلی میں مقرر کیا ہے، ان جمیع باتوں سے ظاہر ہے کہ مدرسہ دہلی راہ راست میں طے منازل کرتا جاتا ہے اور اس کے وسیلہ سے علم کو ترقی ہے“ (۱)

اس کے بعد مولانا مملوک العلی نے دہلی کالج میں دو سال اور گزارے مگر ان کی تعلیمی کیفیت اور امتحان کا تذکرہ راقم سطور کو نہیں ملا، اور ۱۸۵۱ء میں مولانا رحلت فرما گئے تھے، اس لئے یہاں بعد کی رپورٹوں کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

مولانا مملوک العلی کی علمی صلاحیت کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ جو طالب علم مولانا کی خدمت میں پہنچا جو ہر آب دار بن کر چکا، مولانا کی صلاحیت اس درجہ کی تھی اور درسیات کی نئی

مولانا مملوک العلی کے  
شاگردوں کی اعلیٰ استعداد

پرانی تمام کتابیں اس طرح مولانا کے حافظہ میں تھیں کہ خطا مشکل تھی، مولوی کریم الدین پانی پتی لکھتے ہیں:

”کیوں کہ وہ فاضل ایسا ہی ہے کوئی کتاب کسی فن کی مشکل اس کے پاس لیجاؤ حفظ پڑھا دیں گے، گویا اس کو حفظ کر رکھی ہے“ (۲)

(۱) صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات، و مطبوعات، محمد عتیق صدیقی ص ۲۷۲ (علی گڑھ۔ ۱۹۶۲)

(۲) طبقات شعرائے ہند ص ۲۶۳ عکس طبع اول مطبوعہ لکھنؤ: ۱۹۸۲ء

کریم الدین کی یہ اطلاع مبالغہ سے پاک ہے، اور ذرائع کے علاوہ سرسید احمد کے الفاظ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ سرسید احمد نے جو مولانا کے شاگرد تو نہیں مگر مولانا سے اچھی طرح واقف اور دہلی کے اونچے علمی حلقوں اور ممتاز علماء کی مجلسوں کے صحبت نشیں تھے، مولانا کی یادداشت اور قوتِ حافظہ کا یوں ذکر کیا ہے:

”علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتبِ درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینہ عالم خالی ہو جاوے تو ان کی لوحِ حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے“ (۱)

جب مولانا مملوک العلی دہلی کالج کے مدرس مقرر ہوئے اس وقت دہلی علماء کی کثرت اور بے نظیر علمی حلقوں اور مجالسِ تعلیم و تربیت کی وجہ سے برصغیر میں ممتاز تھی، ہر طرف سے اعلیٰ سے اعلیٰ استعداد کے طلبہ اور فاضل اصحاب دہلی آتے تھے اور یہاں کے علماء کی مجلسوں میں نیاز مندانہ حاضری اور ان سے تعلیمی استفادہ کو ایک نعمت، اعزاز اور بڑی دولت سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ محمد اسحاق، شاہ محمد یعقوب، خاندان ولی اللہی کے دوسرے علماء نیز مولانا مفتی صدر الدین آزرده، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا محمد حیات پنجابی دہلوی، حضرت مولانا شاہ غلام علی، شاہ احمد سعید مجددی، مولانا نوازش علی اور بہت سے فخر روزگار علماء دہلی میں جلوہ فرما تھے اور علماء و طلباء کو فیضیاب کر رہے تھے۔ ایسے بھرپور علمی ماحول میں کسی نو آموز طالب علم کا مدرس مقرر ہونا اور اسکے حلقہٴ درس کی طرف طلباء اور اہل ذوق کی توجہ اور اس سے استفادہ کا شوق ایک بڑی بلکہ بہت غیر معمولی بات تھی، مولانا مملوک العلی کی اعلیٰ صلاحیت کا کمال، درسی کتابوں پر عبور، فنی اصطلاحات و رموز سے گہری واقفیت اور ان کا بروقت گہرا ادراک، انکے سمجھانے اور ذہن پر نقش کرنے کی اعلیٰ صلاحیت، عمدہ قوتِ تفہیم، زیر تدریس کتابوں اور طلبہ پر مضبوط گرفت، طلبہ کی ذہنی تربیت و ترقی پر قابو یافتہ ہونے کی دلیل ہے، اگرچہ یہ تمام کمالات بیک وقت بہت کم علماء کے حصہ میں آئے ہیں، لیکن یقیناً مولانا مملوک العلی کو ان سب صلاحیتوں سے بھرپور حصہ

(۱) آثار الصنادید، باب چہارم ص ۷۰ (نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۸ھ)

ملا تھا اور مولانا نے ان سے ہر طرح سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس صلاحیت سے ایسے ایسے لعل و گہر تراشے جن کی تابانی نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے۔ مولانا مملوک العلی کے اسی کمال کا ذکر کرتے ہوئے مولانا رشید احمد گنگوہی فرمایا کرتے تھے کہ:

”اس زمانہ میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں ایک ہمارے استاد مولانا مملوک العلی صاحب اور دوسرے ہمارے استاد مفتی صدرالدین صاحب تھے رحمۃ اللہ علیہما“ (۱)

مولانا اپنے ایک ایک شاگرد کی اس طرح نگرانی و تربیت فرماتے اور اس کی تعلیمی ترقی کا ایسا لحاظ رکھتے اور اس کو یوں قدم بہ قدم آگے بڑھاتے کہ اس کی فطری صلاحیتیں چمک جاتی تھیں اور وہ علمی استعداد میں اپنے ہم عمر طالب علموں اور دوسرے طلبہ سے بھی عموماً ممتاز رہتا تھا اور ان کا علمی جوہر ایسا صیقل ہو جاتا تھا اور ان کی علمی استعداد اس قدر نمایاں ہو جاتی تھی کہ طلبہ کے امتحان (جن میں مغربی یورپین فاضل بھی ہوتے تھے اور مولانا مفتی صدرالدین آزرہ جیسے نادر روزگار علماء بھی) مولانا کے شاگردوں کی پختہ صلاحیت، ذکاوت، حاضر جوابی اور زیر تعلیم موضوعات پر فنی گرفت سے حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے تھے اور یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ مولانا:

یہ جماعت طالب علموں کی ہے یا فاضلوں کی؟“ (۲)

اس زمانے میں (اور بعد میں بھی) اچھے اساتذہ ابتدائی کتابوں کی تعلیم کو اصل اور تعمیر کی بنیاد کا پتھر سمجھتے تھے اسلئے ابتدائی کتابوں پر طلبہ سے اس قدر محنت کراتے تھے اور ان کو اس طرح تیار کر دیتے تھے کہ طلباء کا آئندہ کا تعلیمی سفر بہت آسان ہو جاتا تھا اور اس کی وجہ سے اکثر طلباء متوسط اور اعلیٰ کتابیں خود ہی نکال لیتے تھے، طریقہ تعلیم یہ تھا کہ

(۱) تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۳۰-۳۱ سہارنپور: ۱۹۷۷ء

(۲) تذکرہ رحمانیہ (سوانح قاری عبدالرحمان پانی پتی) تالیف مولانا عبدالحلیم انصاری ص ۳۸ عکس طبع اول ۱۳۵۷ھ

(لاہور: ۱۴۰۰ھ)

طالب علم خود کتاب حل کرتا اور پوری تیاری کے بعد استاذ کے سامنے اپنا سبق پڑھتا تھا، استاذ صرف اس کی عبارت سنتا اور کتاب فہمی کی لیاقت پر نظر رکھتا تھا کہ یہ طالب علم کہاں کیا پڑھ رہا ہے کیوں پڑھ رہا ہے، وہ غلط ہے یا صحیح، اور کہیں کہیں استاذ شاگرد سے کچھ معلوم بھی کر لیتا تھا، طالب علم پڑھتا رہتا استاذ سنتا رہتا اور اسی پر سبق ختم ہو جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ شاگرد میں اس کتاب کے سمجھنے کی ابتدائی صلاحیت پیدا ہوگئی، جب استاذ کو اس بات کا اطمینان ہو جاتا تو اس کتاب کا پورا کرنا ضروری نہیں تھا اس کو کسی باب یا فصل پر ختم کر کے اس کے بعد کی کتاب شروع کرادی جاتی تھی۔

اس طریقہ تعلیم کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ تھا کہ جب طالب علم درسیات مکمل کر کے نکلتا تھا بلکہ بعض صورتوں میں درسیات مکمل کرنے سے پہلے نئے طالب علم اس کے پاس استفادہ اور تعلیم کیلئے آنا شروع ہو جاتے تھے، اس سے بڑے طالب علموں کو دوہرا فائدہ ہوتا تھا جو کتابیں اب تک انہوں نے پڑھی تھیں وہ منجھ جاتی تھیں اور تعلیم کے ساتھ ہی پڑھانے کی بھی ایسی مشق ہو جاتی کہ جب وہ پڑھنے سے فارغ ہوتے تو اچھے مشاق مدرس ہوتے تھے اور بڑی سے بڑی جگہوں پر ذہین سے ذہین طالب علموں کو بلا تکلف پڑھا سکتے تھے۔ اس طرح تعلیمی تجربہ کی وہ کٹھن منزل جو آجکل برسوں کی تدریسی مشغولیات کے بعد بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے تعلیم سے فراغت پر طالب علم کا زور راہ ہوتی تھی اور وہ نوعمری سے اپنے لئے تدریس کے ضوابط اور راہ عمل متعین کر لیتا تھا۔ اس کے مستقبل کا تعلیمی تدریسی سفر بہت خوش اسلوبی سے طے ہو جاتا تھا۔ مولانا مملوک العلی کا نظام تعلیم بھی اسی ترتیب پر مرتب تھا۔

اگرچہ مولانا کے دہلی کالج میں پڑھے ہوئے شاگرد بھی ایک سے بڑھ کر ایک اور لائق فائق تھے مگر جن طالب علموں نے مولانا کے کالج سے فارغ اوقات میں گھر پر پڑھا انکارنگ ہی کچھ اور ہے، غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ مولانا کالج میں کالج کے نصاب تعلیم کو مقررہ اوقات اور کالج کے ضابطوں کے مطابق پڑھاتے تھے مگر گھر پر تعلیم کا طریقہ مختلف تھا،

کتابیں بھی مختلف ہوتیں اور اکثر طالب علم بھی وہ ہوتے تھے جو کالج میں داخل نہیں تھے۔ مولانا نے اپنے بلکہ علماء کے قدیم طریقہ تعلیم کا انہی طلبہ پر تجربہ کیا اور اس میں نہایت کامیاب رہے متوسطات کی کتابوں سے عموماً آخری کتابوں تک زیادہ زور اسی پر ہوتا تھا کہ طالب علم سبق خود حل کر کے لائے، اسکو کتاب کے صرفی نحوی مباحث اور کتاب کے موضوع و مندرجات پر فی الجملہ عبور حاصل ہو اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے الفاظ میں:

”استاذ جو چاہے پوچھ لے اور شاگرد کچھ نہ پوچھے، وہ کتاب گویا پڑھ لی، اس کے بعد (کتاب) ختم کرنا ضروری نہ تھا، اگر شاگرد کاجی چاہتا تو دورہ (حدیث کی کتابوں) کی طرح سے فر فر سنا کے ختم کر دیتا“۔ (۱)

مولانا مملوک العلی کے یہاں بھی یہی طرزِ تعلیم رائج تھا خصوصاً چند ذی شعور استعداد کے طلبہ کیلئے تو گویا اسی کا قانون تھا کہ وہ سبق کی عبارت پڑھتے رہیں، مولانا توجہ سے سنتے رہیں۔ بعض مرتبہ بڑی کتابوں کے تیز رفتار سے سبق پڑھنے والوں پر انکے بعض ساتھیوں کو بھی شبہ ہو جاتا کہ یہ بغیر سمجھے یوں ہی پڑھے جا رہے ہیں، ایک مرتبہ ایسا ہی اتفاق حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ساتھ ہوا تھا، مولانا محمد قاسم کسی اونچی دقیق کتاب کا سبق لے رہے تھے، کتاب کی عبارت اس طرح پڑھتے جا رہے تھے جس طرح حافظ منزل سناتا ہے، کہیں کہیں کوئی لفظ کہتے اور باقی عبارت کا ترجمہ تک نہ کرتے تھے، مولانا مملوک العلی کے اور شاگردوں کو خیال ہوا کہ یہ طالب علم ان کتابوں کو سمجھتے نہیں یوں ہی پڑھتے آگے بڑھے جا رہے ہیں اور نام کیلئے کتاب ختم کرنا چاہتے ہیں، شاگردوں میں سے کسی نے یہ بات مولانا مملوک العلی سے بھی کہہ دی: حضرت! یہ تو کچھ سمجھتے معلوم نہیں ہوتے، مولانا نے فرمایا:

”میاں! میرے سامنے طالب علم بے سمجھے نہیں چل سکتا“ (۲)

مولانا مملوک العلی کے خلف الرشید مولانا محمد یعقوب فرماتے ہیں:

(۱) آپ بیتی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، ص: ۲۴ حصہ دوم طبع اول (سہارنپور بلاسنہ)

(۲) حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص: ۱۸۰



”واقعی ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا، وہ طرزِ عبارت سے سمجھ لیتے

تھے کہ یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں“ (۱)

مولانا مملوک العلی طالب علم کے پڑھنے کے انداز سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ اس کتاب کی عبارت کو کس قدر سمجھ کر پڑھ رہا ہے اور اس کے ذہن میں اس کا مطلب کہاں تک حاضر ہے، جب استاذ ایسا فہیم اور صاحب نظر ہو تو ظاہر ہے اس تربیت گاہ سے نکلنے والے طلبہ بھی علم و صلاحیت میں ممتاز ہی ہوں گے۔

حضرت مولانا کے شاگردوں کا ایک اور غیر معمولی کمال

جو کتابیں پڑھیں ہی نہیں ان کا امتحان اور اس میں اعلیٰ کامیابی

حضرت مولانا مملوک العلی کی تدریس و تربیت کا ایک غیر معمولی کمال یہ تھا کہ مولانا طلبہ کو اس طرح تیار اور کامل بنا دیتے تھے کہ ان کو بڑے سے بڑے امتحان میں بیٹھنے میں تکلف نہیں ہوتا تھا، یہی نہیں کہ وہ حضرت مولانا سے پڑھی ہوئی کتابوں میں طاق ہوتے تھے، ان کو فر فر پڑھتے چلے جاتے تھے اور کڑے سے کڑے امتحان میں کامیاب رہتے تھے، بلکہ حضرت مولانا مملوک العلی کے خاص شاگردوں نے جن کتابوں کو حضرت مولانا یا کسی اور استاذ سے پڑھا بھی نہیں تھا حضرت مولانا ان کا امتحان دلواتے اور مولانا کے فیضان علمی کا اثر کہتے یا کرامت کہ وہ طلبہ اپنے ایسے امتحانات میں بھی اعلیٰ درجہ سے کامیاب رہتے تھے۔ غالباً اس وقت دہلی کالج کے نظام میں اس کی گنجائش تھی کہ جو طلبہ کالج کے استادوں سے پڑھتے تھے وہ کالج میں داخلہ کے بغیر بھی کالج کے امتحانات میں شرکت کر سکتے تھے، مولانا مملوک العلی نے ایسے کئی موقعوں پر اپنے شاگردوں کو امتحانات میں بٹھایا اور ممتحن نے مولانا کی محنت اور شاگردوں کی لیاقت کا اعتراف کیا، اس قسم کے دو واقعات قابل ذکر بلکہ ناقابل فراموش ہیں، دونوں نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص: ۱۸۰

## مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی کا معقولات کی کتابوں کا

### پڑھے بغیر امتحان دینا

مولانا مفتی صدرالدین آزرده کی مولانا سے دوستانہ چشمک اور چھیڑ چھاڑ چلتی رہتی تھی، ایک مرتبہ افسر اعلیٰ نے مولانا مملوک العلی کو لکھا کہ مدرسہ کا امتحان مفتی صدرالدین آزرده میرے سامنے لیں گے، مولانا سمجھ گئے کہ اس میں مفتی صاحب کا دخل ہے، وہ میرے طلبہ کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں، اسوقت منجملہ اور طلبہ کے مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی مولانا محمد مظہر نانوتوی وغیرہ مدرسہ کے علاوہ اوقات میں مولانا سے مختصر المعانی وغیرہ پڑھتے تھے، مولانا مملوک العلی نے ان کو طلب کیا اور مولانا قاری عبدالرحمن سے فرمایا کہ:

”حافظ جیو امتحان دینا پڑے گا“

مولانا قاری عبدالرحمن صاحب نے معذرت کی اور عرض کیا کہ میری تعلیم خارج از مدرسہ ہوئی ہے۔ مولانا نے فرمایا ہم نے پڑھایا ہے تم اس پڑھائی میں امتحان دو۔ پھر عرض کیا: کون سی کتاب میں سے امتحان لیا جائے گا، ارشاد ہوا مجھے کیا پتہ کون سی کتاب ہوگی۔ (۱)

بعد میں مولانا مظہر نانوتوی نے قاری عبدالرحمن سے کہا (جو غالباً قاری صاحب کے رفیق سبق تھے) کہ یہ تو مفتی صاحب مولانا سے چھیڑ کر رہے ہیں، امتحان ہونے دو، دیکھا جائے گا۔ ایک ساتھی اور تھے تینوں نے مشورہ کر کے ایک منصوبہ طے کر لیا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ امتحان کے مقررہ وقت پر مفتی صدرالدین آزرده تشریف لائے اور معقول کی ایک کتاب میں سے ایک عبارت پڑھوائی، ان ساتھیوں میں سے ایک نے جان بوجھ کر وہ عبارت غلط پڑھی، دوسرے سے پڑھوائی اس نے بھی یہی کیا، تیسرے نے بھی اسی طرح غلط پڑھی، مفتی صاحب نے اس کا مطلب بتانے کیلئے کہا تو جس ترتیب سے عبارت پڑھی تھی اسی پس منظر میں مطلب بتا دیا۔ مفتی صاحب نے پھر کہا کیا یہ مطلب صحیح

(۱) تذکرہ رحمانیہ (سوانح حضرت مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی) تالیف مولانا عبدالحلیم انصاری پانی پتی ص ۳۷-۳۹

ہے، تو تینوں بیک زبان بولے، اگر یہ مطلب غلط ہے تو آنجناب اس پر اعتراض کریں یا اس کی تردید فرمائیں، یعنی ہم اس کا جواب دیں گے اور اپنے اس مطلب اور عبارت کو صحیح ثابت کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسی اونچی بات وہی فاضل کہہ سکتا ہے جس نے کتاب پر ہر پہلو سے غور فکر کیا ہو اور اس کو ہر طرح سے پڑھا اور سمجھا ہو، مفتی صدر الدین صاحب بھی جلیل القدر عالم تھے سمجھ گئے کہ یہ معمولی طالب علم نہیں بلکہ فن کے ماہر ہیں، اس لئے اسی پر امتحان ختم کر دیا اور مولانا مملوک العلی سے فرمایا:

”مولانا! یہ جماعت طالب علموں کی ہے یا فاضلوں کی“ (۱)

قاری عبدالرحمن صاحب فرماتے تھے کہ اس وقت میں نے مولانا مملوک العلی کی طرف نظر اٹھائی تو وہ مسکرارہے تھے، مولانا نے مفتی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا:

”مفتی صاحب! میرے طالب علم تو ایسے ہی ہوا کرتے ہیں، آپ اعتراض کریں یہ جواب دیں گے“

اسی سوال و جواب پر امتحان ختم ہو گیا اور مفتی صدر الدین آزرده نے جو ممتحن تھے افسر اعلیٰ سے کہہ دیا کہ:

”جب ان طالب علموں کا یہ حال آپ نے دیکھا تو اب مزید امتحان کی ضرورت نہیں رہی، نہایت عمدہ تعلیم ہے، یقین ہے کہ تمام طالب علم ایسے ہی نکلیں گے۔“ (۲)

ایک اور خاص واقعہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ساتھ پیش آیا تھا، اگرچہ اس وقت حضرت مولانا محمد قاسم کالج کے سالانہ امتحان میں شریک نہیں ہوئے تھے مگر عملاً

مولانا محمد قاسم نانوتوی کا

بغیر پڑھے اقلیدس کا امتحان دینا

ایسا امتحان ہو گیا تھا کہ جس کی کالج کے اندر اور باہر خاص شہرت ہوئی تھی۔

مولانا، حضرت مولانا مملوک العلی سے پڑھتے تھے اور دہلی کالج میں بھی داخل تھے،

(۱) تذکرہ رحمانیہ (سوانح حضرت مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی) تالیف مولانا عبدالعلیم انصاری پانی پتی ص ۳۷-۳۹

(۲) تذکرہ رحمانیہ ص ۳۹

مولانا مملوک العلی نے ریاضی کے استاذ سے کہہ دیا تھا کہ (مولانا) محمد قاسم کو میں خود پڑھا لوں گا، تم ان کی فکر مت کرنا، اور مولانا محمد قاسم سے فرمایا کہ اقلیدس تم خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کر لو۔

مولانا محمد قاسم نے چند دنوں میں اقلیدس کے مقالات دیکھ لئے اور حساب بھی پورا کر لیا، چونکہ بغیر استاذ سے پڑھے خود اقلیدس کو حل کر لینا اور حساب میں ماہر ہونا بہت ہی انوکھا اور ناقابل یقین واقعہ تھا، اسلئے اس کا بہت چرچا ہوا۔ دہلی کالج کے طالب علموں نے مولانا سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور کئی سوالات کئے، مولانا نے ان کو آسانی سے حل کر دیا تو اور چرچا ہوا، آخر میں منشی ذکاء اللہ چند نئے سوالات لے کر آئے جن میں سے دو سوال بہت مشکل تھے، مولانا نے ان کو بھی حل کر دیا تو اس کا غیر معمولی تذکرہ ہوا، مگر مولانا محمد قاسم غالباً مولانا مملوک العلی کی ہدایت پر امتحان میں شریک نہیں ہوئے تھے جس کا دہلی کالج کے ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل ٹیلر (J.H. Tylor) صاحب کو بہت رنج ہوا، کیوں کہ اس قدر ذہین اور غیر معمولی صلاحیت کا طالب علم اگر کالج سے امتحان دیتا تو اس سے کالج کی شہرت اور ناموری میں کس قدر اضافہ ہوتا۔

مولانا کی شاگردوں پر محنت، توجہ اور شاگردوں کی اعلیٰ قابلیت کا اس سے بھی اچھی طرح علم ہو جاتا ہے کہ مولانا کے اکثر شاگرد، دہلی

مولانا کے شاگردوں کا دوسرے مدارس میں، اور بڑے عہدوں پر تقرر

کالج سے فارغ ہوتے ہی سرکاری مدرسوں کے مدرس اعلیٰ یا دوسرے ممتاز سرکاری عہدوں کیلئے منتخب کر لئے جاتے تھے، جس میں چند تو ایسے تھے کہ ان کی تعلیم بھی پوری نہیں ہوئی تھی مگر جس قدر تعلیم اور لیاقت تھی اس میں وہ اپنے ہم عمروں اور ان کتابوں کے پڑھنے والوں سے فائق نظر آتے تھے، اس لئے کسی خاص کوشش کے بغیر ان کا سرکاری ملازمتوں یا دوسری اچھی جگہوں پر تقرر ہو جاتا تھا۔ مولانا کے فرزند مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی کے علاوہ

مولانا مہتاب علی دیوبندی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولوی سمیع اللہ دہلوی، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، ڈپٹی نذیر احمد بجنوری دہلوی، کریم الدین پانی پتی کے علاوہ مولانا کے اور بھی کئی شاگردوں (بلکہ اکثر شاگردوں) کے نام لئے جاسکتے ہیں (ان چند مخلصین اور نمونہ سلف اصحاب کے علاوہ جو سرکاری ملازمتوں اور عہدوں سے ہمیشہ علیحدہ رہے اور بلا کسی معاوضہ اور اجرت کے دینی خدمات انجام دیتے رہے) جو دہلی کالج کی تعلیم اور مولانا کے حلقہ درس سے فارغ ہوتے ہی برسر روزگار ہو گئے اور اپنی اعلیٰ علمی صلاحیت کی وجہ سے بڑے بڑے کارنامے اور علمی، دینی، درسی، تحریری، تصنیفی خدمات انجام دیں، جس کی وجہ سے مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کی نیک نامی میں بہت اضافہ ہوا اور کالج کے طالب علموں کی محنتوں سے علمی کارواں تیزی سے آگے بڑھا، جس کی دہلی کالج کے کارکنان کو بے حد خوشی تھی اور وہ بہت مسرت کے ساتھ اسکا ذکر کیا کرتے تھے۔

ان سب طلباء کی تربیت اور گوہر تراشی کا عمل حضرت مولانا مملوک العلی کے ہاتھوں سرانجام پایا تھا، اس لئے حضرت مولانا کے ان شاگردوں میں حضرت مولانا کے کمالات و علم کی کرنیں اثر انداز ہو گئی تھیں اور بلاشبہ یہ سعادت مند شاگرد اس سعادت و نعمت کے اظہار میں کہتے ہوں گے کہ:

جمالِ ہم نشین در من اثر کرد  
و گر نہ من ہاں خاتم کہ ہستم

اور اس حقیقت کے سبب ہی اہل علم و کمال صاف معترف ہیں کہ حضرت مولانا کے شاگردوں کی یہ جماعت برصغیر میں احیائے علم و دانش کی علم بردار، آئندہ نسلوں کی رہنما اور ہماری دینی علمی تاریخ کی ایک سنہری کڑی اور اہم عنوان ہے۔

## باب (۸)

دہلی کالج کے مختلف علمی تعلیمی شعبوں کی نگرانی  
دہلی کالج سے چھپنے والے تمام کتابوں رسالوں  
اور اخبارات کی تصحیح، دہلی کالج کے مطبع کی سرپرستی  
اس میں حصہ داری اور دیگر علمی مصروفیات

دہلی کالج کی دوسری مصروفیات اور نگرانی | دہلی کالج میں مولانا کی مصروفیات  
ہمہ گیر تھیں، تمام اوقات تعلیم اور

اسباق میں گزرتے تھے، لیکن مولانا کی کالج سے متعلق یہی ایک مصروفیت نہیں تھی بلکہ کالج  
کے اور بھی کئی کام مولانا کی ہدایت و مشورہ کے پابند تھے۔ کالج کے جملہ علمی تعلیمی امور کی  
نگرانی مولانا کے سپرد تھی، مشرقی شعبہ کا انتظام اور تعلیم مولانا ہی دیکھتے تھے، کالج کے مطبع  
سے جو کتابیں چھپتی تھیں اور جو علمی کام ہوتے تھے ان میں مولانا کا مشورہ شامل رہتا تھا۔

دہلی کالج کے علمی تعلیمی نوعیت کے کئی شعبے تھے، ادارہ تصنیف و تالیف تھا یا دہلی سوسائٹی  
(Verancular Translation Society) تھی، مطبع تھا اور ہفت روزہ اخبار  
قران السعدین تھا، حضرت مولانا مملوک العلی ادارہ تصنیف و تالیف کے رکن تھے، دہلی  
سوسائٹی کی سرپرستی فرماتے تھے، مطبع کے حصہ دار تھے اور اخبار قران السعدین کے شریک  
مشورہ اور نگران تھے، اگرچہ اس کی تفصیلات کم معلوم ہیں جو کچھ ملا وہ درج ذیل ہے۔

شعبہ تصنیف و تالیف جس کو سنہ ۱۲۵۸ھ میں دہلی سوسائٹی کے  
شعبہ تصنیف نام سے موسوم کیا گیا تھا، دہلی کالج کا ایک اہم شعبہ اور اس زمانہ کا

بڑا کارنامہ تھا۔ دہلی سوسائٹی نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے اردو میں ترجمہ کرانے اور ان کو چھپوانے کا ایک بڑا منصوبہ بنایا تھا جس میں عربی، فارسی، ہندی، انگریزی کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں شامل تھیں۔ یہ کتابیں کالج کی درسی ضروریات اور عوام کیلئے متوسط درجہ کے علمی مطالعہ کے خیال سے لکھوائی جاتی تھیں، رسالے بھی چھپتے تھے، ان دونوں کے بنیادی رکن اور اصل نگران مولانا مملوک العلی نیز دہلی کالج کے ایک اور نامور مدرس اور عالم مولانا سبحان بخش شکار پوری معلوم ہوتے ہیں۔

دہلی سوسائٹی کے متعلق معلومات کم ملتی ہیں، اسی وجہ سے مولوی عبدالحق، مالک رام اور صدیق الرحمن قدوائی نے دہلی سوسائٹی کے قیام اور اس کے مقاصد کا تو خاصا مفصل ذکر کیا ہے مگر سوسائٹی کے بنیادی ارکان، ان کتابوں اور اصلاحی تحریری خدمات کا ایسا ذکر نہیں کیا جیسا کیا جانا چاہئے تھا۔ سوسائٹی کے جن اصحاب کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب انگریز تھے، منصوبہ یقیناً ان کے مشورہ سے بنایا گیا ہوگا، لیکن تصنیف و اشاعت کا اکثر کام کالج کے ذمہ داروں نے انجام دیا، جس کی متعدد ذرائع سے مجمل تصدیق ہوتی ہے، اور یہ ہر پہلو سے قرین قیاس بھی ہے کیوں کہ یہ منصوبہ بنانے والوں میں سے دہلی کالج کے پرنسپل بتروس (F. BOUTROS) کے علاوہ کوئی اور ایسا نہیں تھا جو کالج کے علمی تحریری کام اور تصنیف و تالیف کے لئے اپنا وقت فارغ کر سکتا اور یہ لوگ انگریزی کے علاوہ اور مضامین و موضوعات پر ایسی دسترس بھی نہیں رکھتے تھے کہ ان کی مسلسل نگرانی اور اصلاح کرتے، اسلئے سوسائٹی کے کام کی منصوبہ بندی، نگرانی اور سوسائٹی کیلئے عربی فارسی کتابوں کے ترجموں نیز تینوں زبانوں کی تصانیف کا جائزہ لینے کا کام عملاً مولانا مملوک العلی کے سپرد تھا۔ بتروس نے (جو کالج کا پرنسپل تھا) سوسائٹی کی خدمات کے متعلق اپنی ۱۸۲۳ء کی رپورٹ میں لکھا ہے:

”مدارس کی درسی کتابیں جو اب تک دہلی کالج یا دوسری درسگاہوں کے استعمال کے لئے طبع ہوئی تھیں ان کے صرف ایک ایک سو نئے طبع کئے گئے تھے، ان میں سے بہت سی کتابیں ختم ہو چکی ہیں اور بعض مدرسہ (یعنی دہلی کالج کے مشرقی شعبے) میں

جاری ہیں۔ ان کتابوں کے متعلق یہ قرار دیا گیا تھا کہ مدرسین پڑھاتے وقت تمام غلطیوں اور مبہم جملوں وغیرہ پر، جو ان کی رائے میں قابل اصلاح ہیں، نظر رکھیں اور قلمبند کر لیں، بعد ازاں یہ مجوزہ اصلاحیں صدر مدرس یا پرنسپل کو دکھائیں اور ان کی پسندیدگی اور مشورے کے بعد دوسرے ایڈیشن میں درج کر دی جائیں۔ چونکہ ہر بعد کے ایڈیشن میں یہی طریقہ عمل میں لایا جاتا ہے اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ ترجمہ گو شروع میں کیسا ہی ناقص ہو، آخر میں تمام غلطیوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے“ (۱)

اس رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب مشرقی شعبہ کے استادوں کو (اور ایسے ذمہ دار استادوں کے سربراہ مولانا مملوک العلی تھے) ایسے نصاب تعلیم کی نگرانی کرنی پڑتی تھی جس میں ایسی کتابیں بھی شامل تھیں جو انگریزی کتابوں کا ترجمہ تھیں، یا وہ فن اور موضوع ایسا تھا جس سے مشرقی شعبہ کے استادوں (علماء) کو کم واقفیت ہوتی تھی، اس صورت میں یہ استاد، ان ترجموں کو زیادہ توجہ سے پڑھتے تھے اور اپنے شاگردوں کو اہتمام سے پڑھاتے تھے، اس کمال میں بھی مولانا مملوک العلی دوسرے استادوں سے فائق تھے۔ مغربی علوم و فنون کی جو کتاب بھی ترجمہ ہو کر آتی، مولانا اس کا مطالعہ فرماتے اور اس کے اصول کو اس طرح سمجھ لیتے تھے، جیسا قدیم زمانہ اور طالب علمی سے اس فن کو جانتے ہوں، کریم الدین پانی پتی کا اپنا مشاہدہ ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

”فارسی اور اردو عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں، ہر ایک علم و فن سے جو ان زبانوں میں مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہیں ان کو اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے، گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے“ (۲)

شعبہ تصنیف کیلئے تحریری خدمات | کالج کے علمی شعبہ نے تصنیف اور ترجموں کا جو بڑا منصوبہ بنایا تھا اسکی ابتداء بھی

مولانا مملوک العلی کے ذریعہ سے ہوئی تھی، سوسائٹی کے ترجموں اور تالیفات کی فہرست میں

(۱) مرحوم دہلی کالج ص ۱۳۴ (دلی: ۱۹۳۵ء)

(۲) طبقات شعرائے ہند ص ۲۶۳ (عکس طبع اول لکھنؤ)



سب سے پہلانا نام تحریر اقلیدس کا ہے، جسکے چار مقالوں کا مولانا مملوک العلی نے ترجمہ کیا تھا (یہ ترجمہ اسی وقت چھپ گیا تھا) اسکے علاوہ سوسائٹی کیلئے حضرت مولانا نے سنن ترمذی کا اردو ترجمہ کیا تھا (جو چھپا نہیں) تاریخ یمنی مرتب کی اور مسعودی کا خلاصہ تیار کیا۔ (۱)

بہر حال مذکورہ اشارات سے دہلی کالج کی علمی سوسائٹی میں مولانا مملوک العلی کی اہمیت اور خدمات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، تفصیلات اس لئے نہیں ملتیں کہ جن لوگوں نے دہلی کالج پر لکھا انہوں نے کالج سے وابستہ علماء خصوصاً مولانا مملوک العلی اور مولانا سبحان بخش کو عموماً نظر انداز کیا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے وہ بھی ان کی حیثیت کو کم کرتے ہوئے سرسری طریقہ سے لکھا ہے، اس لئے مولانا مملوک العلی کی خدمات کی تفصیل سامنے نہیں آتی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ جب بھی شمالی ہند کی تعلیمی ترقیوں اور اردو ادب کی ان ابتدائی کوششوں کا ذکر ہوگا جن کے ذریعہ سے ہمیں علم و دانش میں ترقی کی ایک بڑی راہ ملی تو مولانا مملوک العلی کی خدمات کا ذکر ضرور کیا جائے گا۔ چنانچہ مالک رام نے دہلی کالج اور مولانا مملوک العلی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”دلی کالج نے نہ صرف اردو کی یہ امتیازی حیثیت ثابت کر دی کہ یہ ہر طرح کے موضوع کے اظہار کا ذریعہ بننے کے قابل ہے بلکہ اس نے ایک اور پہلو سے بھی اردو علم و ادب کی لازوال خدمت کی۔ یہیں کے اساتذہ اور طلبہ میں سے وہ اصحاب نکلے جنکے نام آج اردو جاننے والے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ اردو ادب کا کونسا طالب علم ہے جو امام بخش صہبائی، مولوی مملوک العلی نانوتوی، ماسٹر رام چندر، منشی حکیم چند، رائے بہادر ماسٹر پیارے لال، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلماء منشی ذکاء اللہ، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین، میر ناصر علی ایڈیٹر صلوائے عام، مولوی کریم الدین سے واقف نہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنکی تحریریں ہماری زبان کا قابل فخر اور رہتی دینا تک باقی رہنے والا سرمایہ ہیں اور جن کے احسانات سے اردو علم و ادب اور اسکے پڑھنے والے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے“ (۲)

(۲) قدیم دہلی کالج ص: ۶۳

(۱) تفصیلات مولانا کی تصانیف کے باب میں آرہی ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مالک رام صاحب نے اس اقتباس میں جن صاحبان کے نام ذکر کئے ہیں ان میں سے اکثر مولانا مملوک العلی کے شاگرد یا ان کے تربیت یافتہ ہیں۔

دہلی کالج (یا مدرسہ دہلی) صرف ایک مدرسہ، کالج یا تعلیمی ادارہ ہی نہیں تھا

## کالج کے اخبارات کی اصلاح و نگرانی

بلکہ متنوع پہلوؤں پر مشتمل بڑی علمی تحریک تھی، جس نے مشرقی علوم کو مغربی فنون کے معیار پر زندہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اسکے کارکنوں میں ہر شعبہ اور ہر فن کے اعلیٰ درجہ کے ماہرین شامل تھے۔ کالج کا تعلیمی شعبہ شروع سے خوب سرگرم تھا اور علمی دنیا میں اس کی ترقیات کا چرچا عام تھا، دوسرے شعبہ بھی آہستہ آہستہ سرگرم ہو رہے تھے، خصوصاً ڈاکٹر اسپرنگر کے پرنسپل مقرر ہونے کے بعد اس میں بہت تیزی آئی، نئے نئے کام شروع ہوئے اور تیزی سے آگے بڑھے، ان شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ صحافت کا تھا، دہلی کالج سے کئی اخبار نکلنے شروع ہوئے جن میں سب سے اہم اور مقبول ترین اخبار قرآن السعدین تھا، اس کے علاوہ مختلف تاریخوں میں فوائد الناظرین، محبت ہند، تحفۃ الحدائق، مفید ہند جاری ہوئے، اگرچہ ان اخبارات کی اشاعت بہت زیادہ نہیں تھی مگر انکے سنجیدہ، علمی تاریخی فکر انگیز مضامین نے علمی طبقہ کو بہت متاثر کیا، بعد میں اور کئی اخبارات اسی انداز پر نکلے اور ان کی وجہ سے صحافت کے مزاج و مذاق میں واضح تبدیلی آئی۔

اگرچہ ان اخبارات کا تعارف اور ان کی اہمیت کا ذکر تاریخ صحافت کا اہم اور خاص موضوع ہے مگر اس تعارف میں بھی ان اخبارات کے مدیران، مضامین اور ان کی تاریخی، علمی افادیت و اثرات کا ذکر تو کیا جاتا ہے لیکن اس کا تذکرہ نہیں آتا کہ ان اخبارات کی نوک پلک سنوارنے، ان کے مضامین کی تراش و خراش اور ان کو عام قارئین کے لئے پسندیدہ بنانے اور ان کی معنویت کو چار چاند لگانے میں دہلی کالج کے علماء کا کس قدر موقع اور ناقابل فراموش حصہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر دہلی کالج کو حضرت مولانا مملوک العلی جیسا فخر روزگار عالم و مدرس نہ ملتا اور مولانا سبجان بخش شکار پوری اور مولانا سید محمد دہلوی جیسے جید علماء دہلی کالج اور ان

اخبارات کے مدیروں کا تعاون نہ فرماتے اور یہ علمائے کرام کالج کی علمی تصنیفی خدمات کی آبیاری کرنے والے نہ ہوتے تو اس کام کا آگے بڑھنا اور عام ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں اور اہل دہلی کا اس ادارہ اور اس کی خدمات کو تعاون اور اعتماد حاصل ہونا سخت مشکل تھا، مگر ان حضرات کی اس بڑی خدمت، کارنامہ اور قربانی کو تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے، دہلی کالج کا جب ذکر ہوتا ہے تو ان حضرات کا تذکرہ ضمناً آتا ہے، حالاں کہ اس جسم کی روح یہی اصحاب تھے اور ان علماء پر عوام کے اعتماد کی وجہ سے ہی مسلمان اپنے بچے کالج میں بھیجنے کیلئے تیار ہوئے تھے، اور کالج کے علمی تعلیمی شعبہ کے علاوہ کالج کے سلسلہ میں تصنیف و تالیف اور کالج سے شائع اخبارات کی مقبولیت و پذیرائی میں بھی مولانا مملوک العلی کی ذاتی وجاہت، علمی مقام اور اس اعتماد کا بڑا حصہ تھا جو مولانا کو عام مسلمانوں میں خصوصاً دہلی میں حاصل تھا، مگر یہاں بھی مولانا کا نام کہیں ضمناً آجائے تو آجائے، یہ کسی نے بھی نہیں لکھا کہ اس کام میں بھی مولانا کی بھرپور شرکت تھی اور یہ کہ حضرت مولانا کی علمی رہنمائی اور مدد دہلی کالج کے اخبارات و رسائل کے مدیروں کو ہمیشہ حاصل رہی۔

قران السعدین دہلی کالج کا ایک معیاری اور معتبر نمائندہ تھا جو اسپرنگر کی کوشش سے ۱۸۲۸ء (۱۲۶۳ھ) میں جاری ہوا تھا، اس کے بعد اور اخبارات نکلے۔ یہ سب دہلی کالج کے استادوں کی کوشش سے نکل رہے تھے، مگر ایک دو بڑے علماء اور ٹیلر و اسپرنگر جیسے اصحاب کے علاوہ کالج کے مدرسین کا تعارف کالج کی وجہ سے تھا اور اسی وجہ سے ان اخباروں کو کالج کا نمائندہ و ترجمان سمجھا جاتا تھا، اور گورنمنٹ کی ہدایت کی وجہ سے کالج کے انگریز ذمہ دار یہ چاہتے تھے کہ کالج کے حوالہ سے جو بھی کام ہو اس پر علماء کی گہری نظر رہے، تاکہ کالج کا نام بے محل استعمال نہ ہو اور کالج کے علمی مقام کو نقصان نہ پہنچے۔ چونکہ کالج کے مطبع سے چھپنے والی ایک ایک چیز کی نگرانی اور اس کی ذمہ داری یعنی مشکل تھی، اس لئے کالج کی منتظمہ نے یہ طے کیا کہ پریس کو کالج سے منتقل کر دیا جائے، پریس کالج سے علیحدہ ہو کر آزادانہ کام کر سکتا ہے اور کالج کے اخبارات کی نگرانی آسان ہے، اسلئے چند اخبارات کی کالج سے وابستگی میں کوئی اعتراض نہیں تھا مگر کالج کی کمیٹی نے اسکے لئے

بھی کچھ شرطیں طے کی تھیں، جن کے ذریعہ اخبارات کی مکمل نگرانی کی جاسکتی تھی، اور اخبارات میں چھپنے والے ایک ایک مضمون اور تحریر کا جائزہ لے کر اس کی ذمہ داری لی جاسکتی تھی۔ تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے عتیق احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ:

”یہ تمام اخبار و رسائل مطبع العلوم میں چھپتے ہیں، یہ مطبع پہلے کالج ہی سے متعلق تھا مگر اب کالج سے اس کا واسطہ نہیں۔ وجہ یہ ہوئی کہ کالج کی کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ مطبع چوں کہ کالج کی خالص ملک نہیں ہے اس لئے کمیٹی کو اس پر سولہ آنے اختیار نہیں ہو سکتا اور گورنمنٹ کی خواہش کے مطابق اس مطبع میں چھپنے والی کتابوں کی پوری نگرانی بھی کمیٹی نہیں کر سکتی، چنانچہ یہی مناسب سمجھا گیا کہ مطبع کو کالج کے حدود سے منتقل کئے جانے کے احکام جاری کئے جائیں، لیکن جہاں تک اخبارات کا تعلق ہے کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ ان کی نگرانی کرنا ممکن ہے، اسی کے پیش نظر کمیٹی نے تین مہینوں کے لئے حسب ذیل شرائط پر ان کی نگرانی قبول کر لی“ (۱)

عتیق احمد صاحب نے سرکاری رپورٹ کے حوالہ سے ان شرائط کا بھی ذکر کیا ہے جو اخبارات کے مالکان سے کالج کے ذمہ داروں نے طے کی تھیں، یہاں ان شرائط کا مطالعہ مفید ہوگا۔ شرطیں یہ تھیں:

”اشاعت سے پہلے تمام چھپنے والے مضامین کالج کے شعبہ عربی کے اول اور دویم مولویوں کو دکھلائے جائیں، ان مضامین کے جو حصے ان لوگوں کو قابل اعتراض معلوم ہوں، ان کو حذف کرنے کا ان کو اختیار ہوگا“ (۲)

اخباروں کے مالکان اور مدیروں نے یہ شرطیں منظور کر لیں اور ان کے مطابق کام شروع ہو گیا۔ قرآن السعدین کے پہلے ایڈیٹر دھرم نرائن تھے، دھرم نرائن کا جب (اندور) تبادلہ ہو گیا تو موتی لال ایڈیٹر مقرر ہوئے، اس کے بعد سید اشرف علی، پھر اصغر علی اور کریم بخش ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ قرآن السعدین سنہ ۱۸۴۸ء میں جاری ہوا تھا اور ۱۸۵۲ء تک چھپتا رہا۔ قرآن السعدین کا اس دور کے اہم اور ممتاز ترین اخبارات میں شمار ہے، اخبارات و

(۱) صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۰۸ (علی گڑھ: ۱۹۶۲ء)

(۲) صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۰۹

مطبوعات کی سرکاری رپورٹ میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ:

”دہلی کالج سے جو اخبارات شائع کئے جا رہے ہیں ان میں قرآن السعدین بلند ترین معیار کا حامل ہے، اس صوبہ کا کوئی اخبار بھی اس سے زیادہ متنوع اور قابل قدر معلومات پیش نہیں کر سکتا۔ اگرچہ فوائد الناظرین کا پلہ اس میدان میں بہت بھاری ہے جس کا ایڈیٹر ایک ماہوار رسالہ (محب ہند) بھی نکالتا ہے اور ان دونوں کی وساطت سے دیسیوں میں تاریخ و ادب اور یورپ کے دیگر علوم کی بے حد اشاعت ہو رہی ہے“ (۱)

ان اخبارات کی ترتیب و مضامین پر حضرت مولانا کے مفصل اثرات کا اخبارات کے تفصیلی مطالعہ کے بعد جائزہ متوقع ہے، مگر افسوس ہے کہ ان میں سے ایک اخبار بھی راقم سطور کی دسترس میں نہیں ہے۔

سید اشرف علی کے پریس مطبع العلوم میں شرکت | مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) نے اپنے تعلیمی کام کی

ابتداء کے وقت سے ہی طباعت و اشاعت کا کام بھی شروع کر دیا تھا، کالج کی انتظامیہ کا کالج کے علمی تصنیفی شعبہ کو بہت اونچائی تک لیجانے کا منصوبہ تھا، اسلئے جلد ہی کالج کیلئے ایک پریس کا انتظام کیا گیا، یہ مطبع کالج کے احاطہ میں تھا اور مطبع مدرسہ دہلی کے نام سے موسوم تھا۔ شروع شروع میں اس پریس سے صرف کالج کے مصنفین کی تالیفات، ترجمے اور کالج کے رجسٹر وغیرہ چھپتے تھے، باہر کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا، مگر جب اسپرنگر پرنسپل مقرر ہو کر آئے انہوں نے کالج کے نصاب و نظام میں اور بہت سی تبدیلیوں کے علاوہ مطبع کے انتظام میں بھی ترمیم کی، اس کا نام بدل کر مطبع العلوم کر دیا اور کالج کے دفتر کے نگراں منشی سید اشرف علی کو پریس کا ناظم بنا دیا، پریس کے اشاعتی کام کو وسعت دینے کی کوشش کی اور چاہا کہ یہ مطبع ایک لمیٹڈ کمپنی کی حیثیت سے آگے بڑھے اور کالج کی مطبوعات کے علاوہ بھی اشاعت کا کام کرے، اس منصوبہ کے مطابق اسپرنگر کی کوشش سے کالج کے کئی مدرسین مطبع کے حصہ دار بن گئے تھے جن میں حضرت مولانا مملوک العلی بھی شامل تھے۔

(۱) صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۰۸

مطبع العلوم ایک بڑا اور قابل قدر اشاعتی ادارہ تھا جس نے سنہ ۱۸۴۹ء سے سنہ ۱۸۵۱ء (۶۷-۱۲۶۵ھ) تک صرف تین سال میں متعدد اہم اور ضخیم علمی کتابیں چھاپی تھیں، غالباً یہی اس مطبع کی ترقی کا سنہرا دور تھا۔ مطبع العلوم کی مطبوعات کی جو فہرست عتیق صدیقی صاحب نے درج کی ہے اس سے مطبع کی عمدہ کارکردگی اور اعلیٰ معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ مطبع العلوم کی چھپی ہوئی کتابوں میں شاندار، ضخیم اور علمی کتابوں کی خاصی تعداد ہے، حضرت مولانا مملوک العلی کی تصحیح سے حضرت مولانا احمد علی محدث نے ترمذی کا جو نسخہ شائع کرنا شروع کیا تھا اسکی طباعت بھی اس مطبع میں ہوئی تھی، شاہ عبدالعزیز کی تفسیر عزیزی اور ٹیک چند بہار کی مشہور تصنیف بہارِ عجم (جو دو بڑی جلدوں میں ہے) اور تالیفات شریفی (۱) جیسی اہم علمی اور خاصی ضخیم کتابیں مطبع العلوم نے شائع کیں، اس کے علاوہ مطبع العلوم کی اکثر مطبوعات مفید اور سنجیدہ موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں، تین سال تک مطبع العلوم کی مطبوعات کی فروخت بہت زیادہ نہیں ہوئی، کچھ کتابیں تو ایسی تھیں جو قابل لحاظ تعداد میں فروخت ہو گئی تھیں، لیکن جو رپورٹ چھپی ہے اس کے مطابق اکثر مطبوعات کی نکاسی کم ہوئی مگر یہ مقدار بھی ایسی معمولی نہیں تھی کہ اس سے مطبع کی معاشی حالت خراب ہو گئی ہو، جب تک کتابیں چھپتی رہیں مطبع العلوم کی مشترکہ حیثیت باقی رہی، پریس ترقی کرتا رہا، مگر جب اسپرنگر کا دہلی سے لکھنؤ (پھر کلکتہ) تبادلہ ہو گیا تو مطبع کی کارکردگی یکجہت متاثر ہوئی، مطبع کے حصہ داروں نے اپنے حصے فروخت کر دیئے، جس کی وجہ سے مطبع کی ساکھ پر برا اثر پڑا اور اس کا منافع خسارہ میں بدل گیا۔ مطبع کے مہتمم سید اشرف علی نے اس کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے، بالآخر مطبع بند ہو گیا۔ سید اشرف علی نے مطبع کے حصہ داروں کے مطبع سے علیحدہ ہونے اور اپنی مشکلات کا اسپرنگر کے نام ایک خط میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، یہاں اس کا مطالعہ مفید ہوگا:

(۱) تالیفات شریفی یا علاج الامراض، شیخ احمد علی سوداگر کی فرمائش پر سید اشرف علی نے مطبع العلوم، دہلی سے سنہ ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۲ء میں شائع کی تھی یہ کتاب چھوٹے سائز کے نو سو چونتیس (۹۳۴) صفحات پر مشتمل ہے اور اس کتاب کی اس طباعت کا ایک عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

”جس روز سے حضور یہاں سے تشریف لے گئے تو شرکاء مطبع نے مثل مولوی مملوک العلی مرحوم اور مولوی سبحان بخش اور مولوی امام بخش اور میر سید محمد خوشنویس اور اکثر طلبہ وغیرہ نے قریب پچاس حصوں کے بعض نے پورے پر اور بعض نے کچھ کم پر بیچ دیئے، در صورت لا چاری واسطے جاری رکھنے چھاپہ خانہ کے اس نیاز مند نے قریب تیس حصوں کے اور قریب بیس حصوں کے لالہ رادھا کشن خزانچی نے خرید لئے..... (کاغذ کا دایاں کونا الگ ہو کر گر گیا ہے)..... حصہ داروں کو ادا کر دیا، اب جناب عالی! اس شہر میں بیس چھاپہ خانہ..... (دایاں کونا موجود نہیں)..... اس چھاپہ خانہ اور پرانے چھاپہ خانوں کی رونق گھٹ گئی اور باہر کی چھپائی اور سوسائٹی کی چھپائی کہ جس کے سبب سے بڑی آبادی تھی وہ بسبب نہ تشریف رکھنے حضور کے مطلق نہیں ہوتی، ناچار قرض دام کر کے چھاپہ خانہ ہی کی کتابیں چھاپنی شروع کیں تو اب یہ چھاپہ خانہ دو ہزار روپے کا قرض دار ہو گیا ہے اور آئندہ کو امید نفع کی بسبب کثرت چھاپہ خانوں کے نہیں معلوم ہوتی“ (۱)

اشرف علی کے اس خط سے مولانا مملوک العلی کی اس پریس میں حصہ داری کا اور اس سے علیحدگی کا تو علم ہوتا ہے، مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت مولانا کی اس مطبع سے کس قدر آمدنی تھی اور مولانا پریس کی حصہ داری سے کب سبکدوش ہو گئے تھے۔

## مولانا مملوک العلی کی دہلی کالج سے وابستگی کا ایک بڑا فائدہ

حضرت مولانا مملوک العلی دہلی کالج سے وابستگی اور اس کی علمی تعلیمی خدمت کی یہ مجمل روداد تھی جو یہاں درج ہوئی۔ مذکورہ تفصیلات سے یہ بھی صاف اور بے غبار ہو گیا کہ مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) کے پروان چڑھانے اور اس کی علمی تعلیمی، تصنیفی اور صحافتی خدمات اور بلند معیار تک پہنچانے اور ان کی ترقی میں مرکزی اور بنیادی شخصیت حضرت مولانا مملوک العلی کی تھی اور دہلی کالج کی شہرت و مقبولیت میں بھی حضرت مولانا کی ذاتی عظمت، بلند و بالا شخصیت اور وجاہت و احترام کا خاص حصہ تھا، مگر یہ بات بہت اہم اور

(۱) خط سید اشرف علی بنام اسپرنگر، ایک نادر مجموعہ مکاتیب، مرتبہ ڈاکٹر محمد اکرم چغتائی ص ۲۳۰

قابل توجہ ہے کہ حضرت مولانا نے دہلی کالج کے تعلیمی مقاصد کو پھیلانے میں تو پوری جدوجہد کی اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور محنت سے کالج کے علمی تعلیمی معیار کو اس بلندی تک پہنچا دیا تھا کہ شمالی ہندوستان میں انگریزوں کا کوئی اور ادارہ ایسا با وقعت اور محترم نہیں تھا، مگر حضرت مولانا کا اس ادارہ کے ساتھ یہ تعاون صرف علمی کارواں کے آگے بڑھانے کیلئے تھا اور حضرت مولانا کی دہلی کالج سے وابستگی کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہ ادارہ انگریزی معاشرت کی تربیت گاہ اور نصرانیت میں ڈھالنے کا مرکز نہیں بنا۔

یہ ادارہ صرف علمی تصنیفی تعلیم و تربیت کرتا تھا، اور بہ ظاہر یہ مولانا کی نگرانی فرمانے اور نگاہ رکھنے کا اثر تھا کہ حضرت مولانا کی زندگی تک کالج کے استادوں اور طلبہ میں سے (غالباً) کسی ایک شخص نے بھی اپنا مذہب ترک کر کے عیسائیت قبول نہیں کی، کالج کے عملہ میں ماسٹر رام چندر پہلا شخص تھا، جو ہندو سے عیسائی ہوا تھا مگر یہ واقعہ بھی مولانا کی وفات (۱۲۶۷ھ ۱۸۵۱ء) کے بعد کا ہے۔ جس سے یہ بھی تاثر ملتا ہے کہ حضرت مولانا کے رہتے ہوئے کالج پر عیسائی اثرات بہت کم تھے اور مولانا کی موجودگی میں دہلی میں سرگرم عیسائی مبلغین کو بھی اس کی جرأت کم ہوتی تھی کہ وہ دہلی کالج کے استادوں یا طالب علموں کو درغلا کر عیسائیت میں داخل کر لیں، اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اگر حضرت مولانا دہلی کالج میں اور کوئی خدمت انجام نہ دیتے تب بھی مولانا کو ہمیشہ اس وجہ سے یاد کیا جاتا کہ مولانا نے اس بڑے اور اہم تعلیمی ادارہ کو مشنری کا تختہ مشق اور عیسائیت کی پناہ گاہ بننے سے محفوظ رکھا۔ اس بڑی خدمت کے علاوہ دہلی کے مسلمانوں اور علمی حلقہ میں دہلی کالج کی قدر و منزلت میں مولانا کے کالج سے تعلق کا بہت زیادہ حصہ تھا، جس کا سبب ہی نے اعتراف کیا ہے، اسلئے اگر یہ کہا جائے کہ کالج کے پہلے پچیس سال کی ترقیات اور تعلیم و تربیت کی تاریخ دراصل مولانا مملوک العلی کے ذاتی فضل و کمال کی تاریخ ہے، تو یہ ایک بڑی حقیقت کا اعتراف اور انصاف و دیانت کے عین تقاضوں کے مطابق ہوگا، مگر خود دلی کالج پر بھی بہت زیادہ نہیں لکھا گیا اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں اگرچہ مولانا مملوک العلی کا پورا احترام جھلکتا ہے مگر کالج کی تعلیمی، تصنیفی، ترقی اور معیار و قاری بلندی میں حضرت مولانا کا جو



بنیادی حصہ اور مقام ہے افسوس ہے کہ اس کا شایانِ شان تذکرہ نہیں ملتا۔

## مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) کے علاوہ مولانا کی علمی مصروفیات

حضرت مولانا کی زندگی علم و عمل، تعلیم و تدریس اور تربیت طلباء سے عبارت تھی، مولانا کیلئے تعلیم کی مصروفیت دہلی کالج سے وابستگی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ کالج سے رابطہ اس ذوق کی وجہ سے ہوا تھا، لیکن حضرت مولانا نے اس رابطہ کو ملازمت کے اصولوں سے آگے بڑھ کر خدمت دین و علم کے خیال سے قبول فرمایا تھا اور اس میں ایسے انہماک سے لگے کہ کالج کے اوقات کا ایک ایک لمحہ کالج سے وابستہ علماء اور طلبہ کیلئے مفید اور قیمتی بن گیا کالج میں درس و تعلیم کے علاوہ بھی جو مصروفیات تھیں ان میں بھی بھرپور حصہ لیتے تھے بلکہ انکے عملاً ذمہ دار تھے جسکی تفصیلات و اشارات گزر گئے ہیں، مگر کالج کی طویل اور تھکا دینے والی مصروفیت بھی مولانا کے بلند خیالات اور عالی حوصلہ کے مطابق نہیں تھی، مولانا چاہتے تھے کہ میرے پاس جو بھی لیاقت و صلاحیت، وقت، صحت اور علم ہے اسکو دین اور علم کی راہ میں لٹا دوں، اسلئے حضرت مولانا نے مدرسہ سے فارغ اپنے تمام اوقات بھی درس و تعلیم کیلئے وقف کر دیئے تھے۔

مولانا کا کوئی لمحہ بھی تدریس و تعلیم سے فارغ نہیں تھا، تہجد کے وقت سے مدرسہ جانے تک اور مدرسہ سے واپسی کے بعد رات دیر گئے تک، تعلیم و اسباق جاری رہتے تھے، مولانا سے تعلیم حاصل کرنے والوں کا اس قدر ہجوم تھا اور مولانا کی تعلیم اور اسباق میں ایسی گہری دلچسپی تھی کہ وہ اوقات بھی جو درس و سبق کے نہیں ہوتے اسی میں مشغول گزرتے تھے، گھر سے مدرسہ (کالج) آنے اور واپسی میں جو وقت راستہ میں گزرتا تھا وہ بھی اسباق کی مصروفیت سے گھرا ہوا تھا، آتے جاتے دونوں وقت سبق ہوتا، طلبہ مولانا کی سواری کے ساتھ دوڑتے اور سبق ہوتا رہتا تھا، تفصیلات گزر چکی ہیں۔

## باب (۹)

تحریک سید احمد شہید سے وابستگی اور حضرت سید احمد شہید کا  
مولانا مملوک العلی کے نام ایک اہم اور مفصل گرامی نامہ

مولانا مملوک العلی کی تحریک سید احمد شہید کی عملی تائید

اور اس کا تحریری اصلاحی تعاون

حضرت مولانا مملوک العلی نے جس علاقہ اور ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور تعلیم و تربیت حاصل کی تھی وہ پرانے زمانے سے علمائے کرام اور مشائخ و مصلحین کا علاقہ تھا، جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (جو اس علاقہ سے مادری تعلق رکھتے تھے اور اسی خطہ کی ایک بستی پھلت میں ان کی پیدائش ہوئی تھی) کی ذات گرامی، خدمات اور تعلیمات سے اک نیا جذبہ، نیا ولولہ اور علمی ذوق حاصل ہوا تھا، مولانا مملوک العلی اپنے خاندان کے افراد اور استادوں کی زبان سے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان عالی مرتبت کے مراتب و کمالات اور امت پران کے دینی علمی احسانات کا تذکرہ ہمیشہ سنتے رہتے ہوں گے، کیوں کہ مولانا مملوک العلی کو جو استاذ ملے تھے وہ سب بلا واسطہ یا بالواسطہ حضرت شاہ ولی اللہ کے فیض علم و کمال کے جرعہ نوش اور خاندان ولی اللہی کے علماء کے فیض یافتہ اور خادم و ترجمان تھے، ان نسبتوں اور روابط کی وجہ سے مولانا مملوک العلی بھی نسبت ولی اللہی کے حامل اور فکر ولی اللہی کے نمائندہ و ترجمان بن گئے تھے، جب مولانا مملوک العلی تعلیم مکمل کرنے کیلئے دہلی آئے اس وقت ان علماء اور بزرگوں کو دیکھنے کا اور ان کے فیض

صحبت سے براہ راست مستفید ہونے کا موقع ملا جو علم و عمل کے آفتاب، برصغیر کی دینی علمی زندگی کے روح رواں اور ملت اسلامیہ کے محسن و رہنما تھے۔ مولانا مملوک العلی نے شاہ عبدالقادر کو غالباً دیکھا بھی نہیں، لیکن مولانا کو حضرت شاہ رفیع الدین کی زیارت و صحبت نصیب ہوئی ہوگی اور حضرت شاہ عبدالعزیز سے ایک سبق پڑھنے کی سعادت میسر آئی، ان بزرگوں کی ایک ہی صحبت بلکہ ایک نگاہ مس خام کو کندن بنانے کے لئے کافی تھی، مولانا مملوک العلی کو حضرت شاہ عبدالعزیز کی صحبت اور مجلسوں میں حاضری کے اور حضرت شاہ صاحب سے استفادہ کے مواقع کثرت سے ملے ہوں گے اور یقیناً مولانا نے ان سراپا علم و افادہ صحبتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہوگا۔

**تحریک سید احمد شہید کا آغاز اور حضرت مولانا پر اس کے اثرات**  
 جس زمانہ (تقریباً ۱۲۳۰ھ) میں حضرت مولانا مملوک العلی دہلی میں تھے اور حضرت شاہ عبدالعزیز کی زیارت اور فیضان علمی سے دامن مراد پر کر رہے تھے اس دور میں حضرت شاہ عبدالعزیز کی مجلسوں کے فیض یافتہ اصحاب ایک نئے انقلاب، نئی تحریک اور ایک نئی مگر بہت بڑی اور غیر معمولی شخصیت کے فیضان و کمالات کا مشاہدہ کر رہے تھے اور ایک نئی دعوت اور جدوجہد کی آمد کا چرچا سن رہے تھے، اور خود کو اس کا ایک رکن، خادم اور سپاہی بنانے کیلئے بے تاب و بے چین تھے، یہ تحریک وہ تھی جس کا منبع حضرت سید احمد شہید کی غیر معمولی شخصیت اور سراپا اخلاص و عمل ذات تھی۔ تحریک سید احمد شہید کا مولانا مملوک العلی کے دہلی قیام کے زمانہ میں آغاز ہوا، یہ تحریک اور جدوجہد تیز رفتاری سے آگے بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے مہینوں برسوں میں پورے ملک (جس کو آج برصغیر کہنا چاہئے) میں پھیل گئی اور اس کے اس قدر غیر متوقع اور حیرت ناک نتائج ظاہر ہوئے کہ آج تک مورخین اور اہل نظر حیران ہیں۔

حضرت سید صاحب کی ذات بابرکت سے جو دینی انقلاب برپا ہو رہا تھا، شرک و بدعات کے اثرات جس تیزی سے ختم ہو رہے تھے اور اصلاح معاشرہ نیز صحیح اسلامی زندگی

کے احیاء اور سنت و شریعت پر حرف بہ حرف عمل کی خدمت جس برق رفتاری سے انجام پارہی تھی، اور پورے ملک پر اسکے جو گہرے اثرات نظر آ رہے تھے اور جس طرح صبح و شام معاشرہ قرونِ اولیٰ کے دینی معاشرہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگی کی طرف رجوع ہو رہا تھا، وہ ایسی چیز نہیں تھی جس سے کوئی مسلمان اور صاحب نظر شخص (جس نے براہِ راست سیرتِ طیبہ اور احادیث شریفہ کا مطالعہ کیا ہو) غافل اور بے پرواہ رہ سکتا اور مولانا مملوک العلی تو خود حضرت شاہ عبدالعزیز کے گھرانے کے ایک ایک عالم سے ذاتی طور سے واقف تھے، مولانا نے بہت قریب رہ کر ان کے احوال و کمالات اور سراپا عمل زندگی کا مشاہدہ و تجربہ کیا تھا، اسلئے مولانا مملوک العلی کی حضرت سید احمد رائے بریلوی اور اس تحریک سے وابستگی قدرتی طبعی مطالبہ اور اپنی متاعِ گم شدہ کی بازیافت تھی۔

مولانا مملوک العلی کی حضرت شاہ صاحب کے خاندان بلکہ گھر کے افراد خصوصاً حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید مولانا عبدالحی بڈھانوی وغیرہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے ممتاز ترین شاگردوں نیز ملک کے نامور علماء کی حضرت سید احمد رائے بریلوی سے ارادت و عقیدت مندی اور حضرت سید صاحب کے دامن تربیت سے وابستگی کیلئے بہت تھی، لیکن یہی نہیں بلکہ خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ کے اکابر علماء کے علاوہ جو اصحاب حضرت سید صاحب اور انکی تحریک اور فکر و عمل کے ترجمان اور دست و بازو بنے ہوئے تھے اور تحریک میں سید صاحب کے نائب و ترجمان سمجھے جاتے تھے، ان میں سے اکثر جو مولانا مملوک العلی کے وطن اور علاقہ کے رہنے والے تھے اور اپنے اپنے علاقہ میں شہرت و امتیاز کے علاوہ اخلاص و ایثار اور دیانت و عمل کا نمونہ اور مثال تھے، وہ حضرت سید صاحب کے کفش بردار اور خادم بن گئے تھے اور سید صاحب کی خدمت و ہم رکابی کی سعادت کو فخر اور سرمایہٴ نجات سمجھتے تھے۔

مولانا، حضرت سید صاحب سے بیعت ہوئے یا نہیں اس کی صراحت نہیں ملی، مگر جب مولانا کے اکثر استاد، اہل خاندان اور علاقہ کے تقریباً تمام مشائخ اور علماء سید صاحب کے سلسلہ سے وابستہ ہو گئے تھے اور علاقہ و نواح کے عوام ہی نہیں بلکہ ملک بھر کے علماء اور مشائخ جوق در جوق حضرت سید صاحب کے حلقہٴ بیعت میں داخل ہو رہے تھے

اور اس کو بڑی دولت اور نعمت سمجھ رہے تھے، اس وقت مولانا مملوک العلی اس سے علیحدہ اور یکسو رہے ہوں، ناممکن اور تمام قرآن و اشارات کے خلاف ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ مولانا مملوک العلی حضرت سید صاحب کے دورہ دوآبہ گنگ و جمن (ضلع سہارنپور اور موجودہ مظفرنگر) خصوصاً نانوتہ وغیرہ کے سفر میں سید صاحب کے قافلہ کے ساتھ ہوں اور اسی وقت سید صاحب کے دامن اصلاح و تربیت سے وابستہ ہو گئے ہوں؟ غالباً یہی وجہ ہے کہ مولانا مملوک العلی کی کسی اور بزرگ سے بیعت و ارادت اور وابستگی کا ذکر نہیں ملتا۔

مکتوب حضرت سید احمد شہیدؒ

اگرچہ حضرت سید صاحب سے بیعت و ارادت کی کوئی تحریری شہادت راقم سطور کے علم میں نہیں ہے، مگر مولانا مملوک العلی کے نام حضرت سید صاحب کے ایک ہم گرامی نامہ اور تحریک سید احمد شہید کے اصول اور ترتیب کے مطابق مولانا مملوک العلی کی اصلاحی تربیتی خدمات خصوصاً نکاح بیوگان کی تجدید اور رسوم و بدعات کی تردید اور اکابر علمائے سلسلہ ولی اللہی کے اصلاحی فتاویٰ اور تحریرات کی توثیق، اسی سلسلہ کی کڑی اور اسی نسبت و تعلق کا ثمرہ ہے جو مولانا کو حضرت سید احمد شہید اور تحریک سید احمد شہید سے حاصل تھا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے جس خط کا ذکر ہوا ہے، یہ خط میرٹھ اور سہارنپور و مظفرنگر کے نامور علماء، مشائخ اہل درس و افادہ اور مرجع عام شخصیات کے نام صادر ہوا تھا۔

یہ گرامی نامہ جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے حضرت سید صاحب کے لئے امیر المؤمنین کے خطاب و منصب کے اعلان کے بعد لکھے گئے سید صاحب کے ابتدائی اور اہم مکتوبات میں سے ہے۔ اگرچہ یہ گرامی نامہ اعلان عام کیلئے اور گشتی چٹھی (CIRCULAR) کی حیثیت سے لکھا گیا تھا مگر اس کے پہلے اور اہم ترین مخاطب دہلی اور ضلع سہارنپور و مظفرنگر اور ان کے قصبات کے ممتاز و منتخب علمائے کرام تھے۔ خصوصاً وہ حضرات جو علمی تربیتی سلسلہ سے خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ سے وابستہ تھے اور تحریک حضرت سید احمد شہید کے مقاصد و نظریات اور اس کی دینی اصلاحی جدوجہد کے معاون و قدر داں تھے۔

حضرت سید صاحب کا یہ گرامی نامہ نسبتاً غیر متعارف اور کم یاب ہے، راقم سطور نے

اس کے تین نسخوں سے استفادہ کیا ہے، جن میں سے ایک مطبوعہ ہے دوقلمی ہیں (۱) مولانا شیخ محمد تھانوی (مولانا شیخ محمد کے والد حضرت سید صاحب کے معاون تھے، مولانا نے بھی سید صاحب کی زیارت کی ہے) کی تصریحات کے مطابق یہ گرامی نامہ حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کا لکھا ہوا ہے، مولانا شیخ محمد نے لکھا ہے کہ:

”منشی آں اعلام نامہ جلیل، مولانا شاہ محمد اسماعیل موصوف اندقدس اللہ

اسرار ہم۔ درس نہ یک ہزار و دو صد و چہل و دو ہجری مطابق ۱۸۲۵ء ہنگامہ عزیمت جہاد

بر کفرہ فجرہ قوم سکھان لاہور صورت تحریر یافت“ (۲)

اگرچہ مولانا شیخ محمد صاحب نے تاریخ تحریر کی صراحت نہیں فرمائی مگر قرآن سے

اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۲۲۲ھ کے آخری تین چار مہینوں (مارچ جون، ۱۸۲۷ء) میں لکھا

گیا ہوگا (۳) قلمی نسخوں میں تاریخ تحریر ذکر نہیں مگر خط کے اصل بنیادی مضمون پر تینوں

نسخے متفق ہیں، مگر تینوں میں کسی قدر اختلاف یا کمی زیادتی بھی ہے (جس کا آئندہ سطور میں

ذکر آ رہا ہے) تینوں ہی نسخوں میں اس گرامی نامہ کا آغاز ان کلمات سے ہوا ہے:

”از امیر المومنین سید احمد بر الواح خاطر شرفا و سادات کرام و مشاہیر علمائے

عظام و جماہیر مشائخ ذوالاحترام، و اراکین امراء عالی مقام، و کافہ مومنین مخلصین،

و جماعۃ مسلمین راسخین و سائر خواص و عوام از اہل ایمان و اسلام خصوصاً“ (۴)

انوار محمدی اور نسخہ لاہور میں مکتوب کے آخری فقرہ والسلام علی من اتبع الهدی

(۱) مطبوعہ مولانا شیخ محمد تھانوی کی تالیف انوار محمدی میں شامل ہے جو صرف ایک مرتبہ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴-۷۵ء) میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے چھپی تھی، قلمی تحریر حضرت سید صاحب کے مجموعہ مکتوبات میں شامل ہے۔

(۲) انوار محمدی ص: ۳۶

(۳) چودھری غلام رسول مہر نے صراحت کی ہے کہ سید صاحب سے ۱۲/ جمادی الثانی ۱۲۲۲ھ (۱۱/ جنوری ۱۸۲۷ء) بحیثیت امیر المومنین پہلی بیعت کی گئی اور اس بیعت کے تیسرے دن بدھ سنگھ کے نام اپنے خط میں سید صاحب نے

اپنے لئے امیر المومنین کا خطاب استعمال فرمایا۔ سید احمد شہید ص ۲۸۳ ج اول طبع اول لاہور: ۱۹۵۸ء

(۴) (الف) مجموعہ مکتوبات حضرت سید احمد شہید مکتوبہ بلاسنہ مخزونہ کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

(ب) انوار محمدی ص ۴۰ (ج) مکاتیب سید احمد شہید خطی نسخہ کا عکسی ایڈیشن لاہور ص: ۳۵، ۱۳۹۵ھ

تک مسلسل مضمون ہے، مگر نسخہ کا ہور میں مذکورہ بالا ابتدائی عبارت کے بعد مکتوب الیہم کے نام ذکر کئے گئے ہیں، اگرچہ مولانا شیخ محمد صاحب نے اس موقع پر مکتوب الیہم کے نام تحریر نہیں فرمائے لیکن انوار محمدی میں والسلام علی من اتبع الهدی کے بعد چند سطروں کا اضافہ ہے، جو یہ ہیں:

”ہر چند کہ ایسے اعلام عام است بخدمت کا فہ اہل اسلام اسامے چندیں از مومنین

مخلصین دریں مقام نگارش می رود، تا در اشاعت آں تحریر و تقریر سعی بلیغ فرمائید“ (۱)

ترجمہ: اگرچہ یہ تمام اہل اسلام کے نام اعلان عام ہے مگر یہاں مومنین

مخلصین میں سے چند اصحاب کے نام درج کئے جاتے ہیں تاکہ یہ سب (اس خط کو)

تقریر اور تحریر کے ذریعہ سے عام کرنے میں پوری پوری کوشش فرمائیں۔

مولانا شیخ محمد صاحب نے درج بالا اقتباس کے بعد حضرت سید صاحب کی چند

سطریں اور نقل کی ہیں، جو یہ ہیں:

”مکرر آنکہ مولوی محمد یعقوب صاحب و عبد اللہ خاں و مومن خاں و سید امان

علی و مولوی عبد الحلق و مولوی مملوک علی صاحب، بقبول اس دعوت نامہ طویلہ و صغیرہ

را گرفتہ در اشاعت آں تحریر و تقریر سعی بلیغ فرمائید، و چند قطعات دیگر کہ ملفوف اس اعلام

میرسد، آںرا بمکتوب الیہم بر سبیل ڈاک بہ محافظت تمام ارسال نمائید“

دونوں خطوط کے سرنامہ اور خاص مکتوب الیہم میں مولانا مملوک العلی کے ذکر اور

مؤخر الذکر خاص ہدایت میں بھی مولانا مملوک العلی کے نام کی شمولیت سے مولانا مملوک

العلی کی حضرت سید صاحب سے خاص قربت، سید صاحب کے مولانا پر اعتماد اور مولانا کے

توسط سے تحریک جہاد کے عام تعارف اور اشاعت کی توقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا

حضرت سید صاحب کے خاص اراکین میں سے تھے اور تحریک سید احمد شہید کے مقاصد کی

تلقین و اشاعت سے گہری وابستگی اور دلچسپی رکھتے تھے۔ (۲)

(۱) انوار محمدی مولانا شیخ محمد تھانوی ص: ۴۰ (مطبع ضیائی میرٹھ: ۱۲۹۱ھ)

(۲) انوار محمدی ص: ۴۰

دونوں خطوط کی منزل اور مکتوب الیہم صاحبان مختلف ہونے کے باوجود یہ بات بہت قابل توجہ اور اہم ہے کہ درج ذیل چار علمائے کرام کا حضرت سید صاحب کے گرامی نامہ کے دونوں نسخوں میں ذکر آیا ہے جن میں حضرت مولانا مملوک العلی بھی شامل ہیں، اور دونوں خطوں میں مولانا کا نام اہمیت سے درج ہے، ترتیب یہ ہے:

مولانا رشید الدین خان (۱) مولانا مملوک العلی مولانا سید محبوب علی جعفری (۲)  
مولانا عبداللہ خاں صاحب (دہلوی) (۳)

### مکتوب الیہم اصحاب کی وہ فہرست جو قلمی نسخہ میں درج ہے

(مولانا) حکیم محمد اشرف (کاندھلوی) (۴) حکیم قاضی محی الدین (کاندھلوی) (۵)  
(مولانا) حکیم رحیم اللہ (کاندھلوی) (۶) (مولانا) احمد اللہ (تھانوی) (۷) شیخ فضل علی

(۱) مولانا رشید الدین خاں دہلوی: (شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی) وفات محرم ۱۲۴۳ھ  
(جولائی اگست ۱۸۲۷ء)۔

(۲) مولانا سید محبوب علی: بن مصاحب علی جعفری دہلوی۔ ولادت ۲۷ محرم ۱۲۰۱ھ وفات ۱۰ ارزی الحجہ ۱۲۸۰ھ  
(۱۷ مئی ۱۸۶۴ء) نامور عالم، مصنف حضرت شاہ عبدالعزیز کے ممتاز شاگرد اور شاہ محمد اسماعیل کے ہم سبق تھے۔  
(۳) مولانا عبداللہ: بن قاسم علی خاں افغانی، شمس آبادی، دہلوی۔ اپنے زمانے کے ممتاز علماء میں سے تھے، شاہ محمد اسماعیل سے تعلیم حاصل کی، سید احمد شہید سے بیعت ہوئے، ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں وفات ہوئی۔ نزہۃ الخواطر ص ۳۰۶ ج ۷۔

(۴) مولانا حکیم محمد اشرف: خلف مولانا امام الدین (برادرزادہ حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی) مؤلف تفسیر سورہ یوسف وغیرہ ۳ ربیع الثانی ۱۲۴۷ھ کو (اکتوبر ۱۸۳۱ء) میں خان پور ضلع بلند شہر میں وفات ہوئی۔  
(۵) حکیم قاضی محی الدین: خلف قاضی نجیب الدین کاندھلوی تقریباً ۱۸۴۰ء میں وفات ہوئی، حضرت سید احمد شہید کے متوسل تھے۔

(۶) حکیم رحیم اللہ: خلف عزیر اللہ کاندھلوی۔ حضرت مفتی الہی بخش سے تعلیم حاصل کی، حافظ محمد ضامن سے بھی استفادہ کیا عالم اور جید طبیب تھے۔ ۱۸۷۲ء (۸۹-۱۲۸۸ھ) میں وفات ہوئی۔

(۷) مولانا احمد اللہ: خلف محمد بخش فاروقی تھانوی۔ مولانا شیخ محمد تھانوی کے والد ماجد۔ تاریخ تھانہ بھون میں مولانا حمد اللہ کا سنہ وفات ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۲ء) لکھا ہے..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....



(تھانوی) (حکیم) غلام سبجانی (جھنجھانوی) (۱) (حضرت میانجیو) نور محمد (جھنجھانوی) (۲) پیر جی عظیم الدین (غالباً جھنجھانوی)؟ شیخ محمد احسن؟ خلیفہ رسول بخش؟ (مولانا) محمد قلندر (جلال آبادی) (۳) (مولانا) محمد حسن (رام پوری) (۴) (مولانا) حکیم مغیث الدین (سہارنپوری) (۵) (مولانا) عبداللہ (خان صاحب سہارنپوری) (۶) (مولانا) عبدالرحمن (غالباً سہارنپوری)؟

مکتوب الیہم اصحاب کی وہ فہرست  
جو مولانا شیخ محمد صاحب نے انوار محمدی میں نقل کی ہے

(مولانا شاہ) محمد یعقوب (دہلوی) (۷) (مولانا مفتی) صدر الدین آزرده

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... (تاریخ تھانہ بھون مولانا شیخ محمد تھانوی بحواشی ثناء الحق صدیقی صاحب ماہنامہ البلاغ کراچی ص ۴۴ وغیرہ) مگر سید صاحب کے اس خط کی روشنی میں یہ سنہ وفات صحیح معلوم نہیں ہوتا۔  
(۱) حکیم غلام سبجانی: خلف حکیم شمس الدین بن حکیم صدر الدین جھنجھانوی خلیفہ درفتی جہاد سید احمد شہید، فاضل طبیب عالم اور مصنف تھے۔

(۲) حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی: پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی، خلیفہ حضرت سید احمد شہید اور مرشد کامل۔ وفات ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳-۴۴ء)

(۳) مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی: عالم محدث اور مدرس، تعارف گذر چکا ہے۔

(۴) مولانا محمد حسن: بن غلام علی مصطفیٰ رام پوری (شاگرد حضرت مفتی الہی بخش) جید عالم نامور مدرس، مصنف، سید صاحب کے خلیفہ معتمد علیہ اور قاضی لشکر تھے، ذی قعدہ ۱۲۴۵ھ (اپریل مئی ۱۸۳۰ء) میں پھولڑہ کی جنگ میں شہید ہوئے۔

(۵) مولانا حکیم مغیث الدین: خلف حکیم محمد بخش بن غلام شرف صدیقی سہارنپوری۔ نامور عالم، طبیب، مفتی الہی بخش کے شاگرد حضرت سید احمد شہید کے خلیفہ اور درفتی جہاد تھے۔ وفات ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء)

(۶) مولوی عبداللہ (خان سہارنپوری): مفتی الہی بخش کے شاگرد، بڑے عالم، مفتی، محقق، مناظر اور صحیح بخاری کی طباعت بمبئی ۱۲۸۲ھ کے مصنف تھے۔

(۷) مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب: خلف محمد افضل سونی پتی، حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسہ اور شیخ محمد افضل فاروقی کے فرزند تھے۔ عالم، عارف اور نامور شیخ طریقت ولادت ذی الحجہ ۱۲۰۰ھ وفات ۲۸/۲۸ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ درمکہ معظمہ، نزہۃ الخواطر میں تاریخ وفات ۲۷/۲۷ ذی قعدہ لکھی ہے۔ نزہۃ الخواطر ص ۵۵۰ ج ۷، جو صحیح نہیں۔

(دہلوی) (۱) (حکیم) سید امان علی (دہلوی) (۲) مؤمن خاں مؤمن (دہلوی) (۳) مولوی نور الحق صاحب؟ (مولانا سید) نصیر الدین (مجاہد منگلوری) (۴) (مولانا) عبد الخالق (دہلوی) (۵) قاسم علی خاں؟ محمد علی خاں؟ حافظ عبد الوہاب عرف میاں معبود؟ خلیفہ عبد الرحمان؟ افادت مآب شاہ اکبر؟ صاحبزادہ صاحب؟ میاں محمد حسن پیر جی؟ میر یوسف؟ میاں شاہ علی؟ حکیم خواجہ حسن (دہلوی) (۶) (شہزادہ) مرزا غلام حیدر گورگان (دہلوی) (۷)

مکتوب الیہم اصحاب کی دو علیحدہ فہرستوں کی وجہ سے خیال ہے کہ قلمی نسخہ میں درج مکتوب اور انوار محمدی کا گرامی نامہ دونوں ایسے مکتوبات کی نقل ہیں جو علیحدہ علیحدہ مختلف

(۱) مولانا مفتی صدر الدین آزرده: خلف لطف اللہ کشمیری دہلوی تیرہویں صدی ہجری کے برصغیر ہندوپاک کے مایہ ناز اور نامور ترین علماء میں سے تھے، عالم ببحر، مفتی، مصنف، شاعر، اور ہر علم و فن میں فخرزماں تھے۔ ولادت ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹-۹۰ء) وفات ۱۲۵۸ھ نزہۃ الخواطر ص ۲۲۶ ج ۷۔

(۲) اپنے عہد کے مشہور علماء میں سے تھے، شاہ عبد القادر سے تعلیم حاصل کی پھر طب پڑھی، نہایت قانع اور باخدا شخص تھے۔ نزہۃ الخواطر ص ۸۰-۷۹ ج ۷۔

(۳) مؤمن خاں مؤمن: اردو کے مایہ ناز شاعر، شاہ عبدالعزیز کے شاگرد اور تحریک سید احمد شہید کے پر جوش معاون، ولادت ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۸ء) وفات ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) مؤمن شخصیت اور فن ص ۱۵۸-۱۵۹، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی: ۱۹۷۲ء)

(۴) مولانا نصیر الدین: بن نجم الدین چشتی سونی پتی دہلوی شاہ محمد اسحاق کے داماد اور شاگرد، ۱۲۵۰ھ میں دہلی سے مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہجرت کی اور حضرت سید احمد شہید کے قائم مقام سمجھے جاتے تھے، تقریباً ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰-۴۱ء) میں وفات ہوئی۔ نزہۃ الخواطر ص ۵۱۷ ج ۷۔

(۵) مولانا عبد الخالق دہلوی: شاہ عبد القادر کے شاگرد تھے، شاہ محمد اسحاق سے بھی حدیث پڑھی۔ دہلی میں بے عرصہ تک حدیث شریف کا درس دیا، مولانا سید نذیر حسین محدث اور ڈپٹی نذیر احمد کے بھی استاد تھے۔ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں وفات ہوئی۔ نزہۃ الخواطر ص ۲۵۷ ج ۷۔

(۶) حکیم خواجہ حسن: نامور فاضل اور بلند مرتبہ کے طبیب تھے آثار الصنادید کی تالیف (۱۸۴۷ء) سے تقریباً تیس سال پہلے وفات ہو گئی تھی۔ آثار الصنادید ص ۳۹ باب چہارم (لکھنؤ ۱۳۰۰ھ)

(۷) مرزا غلام حیدر: دہلی کے ممتاز افراد میں سے تھے اور اکبر شاہ ثانی کے مشیر تھے۔ علم و عمل (وقائع عبد القادر خاں) اردو ترجمہ ص ۲۹۰ ج ۱، ترجمہ معین الدین افضل گڑھی، محمد ایوب قادری (کراچی): مرزا غلام حیدر سید صاحب اور شاہ محمد اسماعیل کے غالباً خاص معتمد اور مکتوب الیہ تھے۔ مرزا صاحب کے نام دونوں کے متعدد گرامی نامے ملتے ہیں۔

اصحاب کو روانہ کئے گئے، اسی وجہ سے دونوں میں مکتوب الیہم کی ترتیب و تفصیل اور ان کے اندراج کے مواقع میں اختلاف ہے۔

اور جیسا کہ ذکر ہوا، قلمی نسخہ میں درج مکتوب میں تمہیدی کلمات کے بعد مکتوب الیہم کے نام آگئے ہیں، یہ انیس (۱۹) حضرات ہیں۔ مگر نسخہ مکتوبہ مولانا عبید اللہ غلام حسین میں مکتوب الیہم اصحاب کے نام شامل نہیں کئے گئے، یہ جگہ خالی ہے، کاتب نسخہ نے غالباً اختصار کے خیال سے نام نہیں لکھے۔ (۱)

مولانا شیخ محمد صاحب نے مکتوب الیہم کی جو فہرست نقل فرمائی ہے وہ بھی انیس (۱۹) ناموں پر مشتمل ہے، دونوں فہرستوں کے جائزہ سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ جو گرامی نامہ مولانا شیخ محمد صاحب نے نقل کیا ہے وہ دہلی کے علماء اور خواص کے نام تحریر صادر ہوا تھا، اور جو خط مجموعہ مکتوبات میں نقل ہوا ہے اس کے اصل مخاطب اضلاع سہارنپور مظفرنگر کے (دو آہ جمنائو گنگا) قصبات کے علماء اور تحریک سید احمد شہید کے خاص اراکین ہیں۔ دونوں نسخوں میں درج مکتوب الیہم اصحاب کی فہرست جو اوپر درج کی گئی ہے جس سے اس خط کے مکتوب الیہم متعدد گم نام علماء کے نام سامنے آئیں گے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا اس خط میں حضرت سید صاحب کے اثرات اور مکتوب الیہم اصحاب کا دائرہ کس قدر وسیع تھا۔ مذکورہ بالا تفصیلات اور مکتوب الیہم اصحاب کے کسی قدر تعارف کے بعد یہ گرامی نامہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

### اعلام نامہ سید صاحب

بسم اللہ الرحمن الرحیم از فقیر سید احمد بر الوارح خواطر شرفا و وسادات کرام  
و مشاہیر علماء عظام و جماہیر مشائخ ذوی الاحترام و اراکین امراء عالی مقام، و کافہ  
مومنین مخلصین و جماعۃ مسلمین را سخین سائر خواص و عام از اہل ایمان و اسلام، منقش و  
مبرہن آنکہ اصل جمیع طاعات و اساس ہمہ عبادات و مدار سعادت جاودانی و سرمایہ  
راحت و دو جہانی تکمیل علاقہ عبودیتہ و انقیاد و تحصیل مقام اطمینان و اعتماد و ترجیح جانب

(۱) مجموعہ مکاتیب سید احمد شہید (عکس نسخہ خطی ص ۳۵ ب (لاہور: ۱۳۹۵ھ))

حضرت حق بر جانب عباد است، واقوی علامات و اعظم آثار آن ایثار محبت حضرت رب الارباب بر محبتہ سائر اخوان و احباب ہست چنانچہ نص و من الناس من يتخذ من دون الله اندادا يحبونهم كحب الله والذين امنوا اشد حبا لله.

و حدیث من كان لله ورسوله واحب اليه مما سواهما بدین دعوی فرمان منجبل و شاہد معدل است و ہر چند این محبت مذکورہ سری است مخفی و امریست مبطن لیکن آثار و علامات آن در ضمن افعال و اعمال ظاہر و ہویدا میگردد۔ واقوی مظنہ آثار ظہور این محبت و انقیاد معرکہ جہاد با اہل کفر و عناد است۔ چہ مقابلہ مشرکین و اقامت این رکن رکین مستلزم صرف جان و مال و ترک اہل و عیال و مہاجرت اخوان و اوطان است، پس اقدام در اقامہ این ذرہ سنام اسلام اقوی علامات غلبہ محبتہ حضرت خالق است بر محبتہ جمیع مخلوقات و لہذا در آیت کریمہ قُلْ اِنْ كَانَ اَبَاءُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَاَمْوَالٌ اِقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَاَسَاكِنَ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِهِ فَتَرْبِّضُوا حَتّٰی يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرٍ وَّاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔

جہاد را با محبت خدا و رسول در یک سلک منسلک گردانیدہ اند، ہر چند کہ قال اہل کفر و طغیان در ہر زمان و ہر مکان لازم است۔

اما دریں جزو زمان کہ شورش اہل کفر و طغیان از حد گزشتہ کہ فریاد و فغان مظلومان از دست تعظلم ایشان سر بفلک کشیدہ و تخریب شعائر اسلام از دست تعدی ایشان ہویدا گردیدہ۔ پس بریں تقدیر اقامتہ این رکن رکین یعنی مقابلہ مشرکین بر ذمہ جمہور مسلمین دریں ایام او کد و او جب گردیدہ۔

بناء علیہ فقیر از وطن مالوف خود در دیار ہندوستان و خراسان دور و سیر نمودہ، و مومنین آن اقطار و مسلمین آن دیار را بہ سوائے ادائی و این عبادت عظمی و ادراک این سعادت علیا ترغیب کرد، الحمد للہ کہ اکثر مومنین مخلصین و صادقین را سخین این دعوت حق را قبول کردند، و بہ کمال و فور رغبت و عالیہ علوہمہ کمر عزیمتہ در ادراک این سعادت

چست بستند، کہ عند الطلب بقلب و قالب حاضر خواهند گردید و در صرف جان و مال در رضا ایزد متعال در بیخ نخواهند کرد۔

والحال ہم بر طبق منطق لازم الوثوق و قَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا نُكَلِّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرَضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ بخدمت کافہ اہل دین و جماعت ارباب صدق و یقین بطریق دعوت عام نگارش کرده میشود کہ ای مومنان پاک، وای مسلمانان چست و چالاک، شکر منعم علی الاطلاق بجا آرید، و حقوق مالک بالاستحقاق یاد آرید، و بہ حمیہ اسلامی کار فرمائید، و غیرت ایمانی بر روی کار آرید، و این جان ناتواں و نہاد دست بنیاد خداوند حقیقی و خداوند تحقیقی بہ سپارید، و متاع زندگانی فانی بعوض راحت جاودانی بہ فروشید، و در تحصیل رضا جوئی حضرت رب العزت بکمال علو ہمتی و تاکید عزیمت بکشید، و لباس صبر و تقوی و استقامت در میاں دین شجاعت و شہامت بہ پوشید، و آب شمشیر بر آن مثل آب زلال باران بنوشید، با جملہ محبتہ اہل و عیال و انسیت اخوان و اوطان پس پشت انداختہ، و جان و مال و رضا جوئی ایزد متعال در باختہ، و اطاعت ذوالجلال قبلہ ہمت ساختہ، و علم نصرت دین متین بر فروختہ، و کوس تائید شرع متین نواختہ، مردانہ وارد در معرکہ جہاد کفار گونہ ساز در آئید، و گوئی سعادت جاودانی و راحت دو جہانی بہ قوت ایمان از میدان شجاعت و جلادہ بر بائید، و در مصافقت و قتال و معرکہ جنگ و جدال مثل کوه متین در مقابلہ اعداء دین ثابت القلب و راسخ القدم بائید، و شکستن رونق اہل کفر و عناد و بر باد دادن ارباب شرک و فساد و بمشاہد راندن گس ناپاک یا بر تافتن خس و خاشاک شمارید و نص قرآنی: **إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ** در ادل جلادہ منزل ملاحظہ کنانید و آیہ فرقانی: **وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ، وَ كُمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ. بِلِسَانِ صَدَقِ تَرْجَمَانِ بَخَوَانِيدِ مَضْمُونِ: إِذْ هَبْ أَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ وَ لَا طَاقَةَ لَنَا بِجَالُوتَ جُنُودِهِ.**

مثل قاعدین سابقین بر زبان حرب نشان مرابند، و گلگونہ خون شہادت بر چہرہ عبودیتہ و اطاعت مالیدہ سرخروئی دنیا و آخرت حاصل کنید، و انگشت و فاء و انقیاد خون

اہل کفر و فساد و مخضب کردہ عروس وار، در محضر حضرت داور دادار جلوہ گر شوند، ہمیں سو فبار و گفتار و این نیست درست و عزیمت چست مثل شیر زغران و پیل مست دماں مقابلہ اہل شرک و طغیان خواہند رسید، ضرور بضرور بر طبق منطوق لازم الوثوق: فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ مظفر و منصور خواہید شد، و از الواث آٹام مطہر گردیدہ از عذاب الیم حجیم نجات یافتہ بہ ارج عالیہ و مراتب شامخہ در ریاض جنان و روح و ریحان در جوار رحمتہ منان خواہید رسید، و در سلک عباد مقررین و جماعتہ سابقین از بندگان خاص و مقبولان ذوی الاختصاص منسلک خواہید گردید۔

و علاوہ بریں آنکہ در میان اخوان و اقران بشجاعت و جلادۃ موصوف و غیرت معروف خواہید شد، انشاء اللہ تعالیٰ او بر بلاد کفار و خزاہن بیشتر فایض خواہید گردید، و بہ تسلط و حکومتہ بر اہل غرور و نخوت فائز شدہ بمناصب ریاست سلطانی و خلافتہ رحمانی خواہید رسید، و این مواعید را مثل نمایش باغ سبز بنا بر تسلی اطفال تصور نفرمائید بلکہ مواعید مذکورہ مطابق منطوق کلام ربانی و موافق منصوص آیات قرآنی است، قال اللہ تبارک و تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ، تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ، وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ، وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا نَصْرَمِنَ اللَّهِ وَقَدْ قَرَّبْتُمْ، بِبَشْرِ الْمُؤْمِنِينَ.

و علاوہ بر این آنکہ این فقیر ہم در منابات بے شمار و معاملات خارج از حد و حصار در باب سرانجام دادن این امر عظیم و مهم حجیم از پردہ غیب باشارت ربانی و از ممکن لاریب بشارت رحمانی مبشرہ، و چونکہ الہام غیبی بکلام لاریبی منضم گرد و پس در نظر مومنین راسخ الاعتقاد و مخلصین کامل الانقیاد بمشابہ نور علی نور جلوہ گر شود، و اگر تقاعد و تساہل دریں باب بعمل خواہید آورد۔ و پس چنانکہ در دار دنیا مخذول و منکوب شدہ اند ہم چنین در دار آخرتہ و عذاب الیم و در درکات حجیم گرفتار خواہید گردید، و در عوض ایشان دیگر سعادت منداں ازلی و مقبلان لم یزلی در سلک جنود ربانی منسلک خواہند گردید،

وقال الله تبارک تعالیٰ: ان لا تنفروا يعذبکم عذابا الیما ویستبدل  
 قوما غیرکم و لا تضروه شیئا واللہ علی کل شیء قذیر.  
 بالجملہ این زندگانی فانی رالا بدروزی گزشتنی و گزاشتنی است و در محکمہ حساب و  
 کتاب و سوال و جواب در حضرت رب الارباب حاضر شدنی است، پس اہل تقاعد و  
 تساہل در معرکہ حساب و کتاب بکدام زبان جواب خواہند داد، و در حضور ملک علی  
 الاطلاق و مالک بالاستحقاق بکدام روح حاضر خواہند شد و از گرفت گیریاں رب قدیر  
 بکدام حیلہ و تزویر خلاص خواہند یافت و ما علینا الا البلاغ المبین والسلام  
 علی من اتبع الهدی۔

**تحریک سید احمد شہید کے اثرات** | مولانا مملوک العلی کی سید صاحب سے  
 وابستگی اور سید صاحب کی تحریک سے عملی  
 دلچسپی کی اگرچہ کوئی شہادت نہیں ملی لیکن محولہ بالا خط اور مولانا نے حضرت سید صاحب کی  
 اصلاح رسوم و بدعات کی تحریک کی حوصلہ افزائی فرمائی، اسکو آگے بڑھانے اور بذات خود  
 اس سے دلچسپی رکھنے کی علامت ہے۔ اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا مملوک العلی اگرچہ بہت  
 کھل کر (غالباً دہلی کالج کی ملازمت کی وجہ سے) حضرت سید صاحب اور اس تحریک کے  
 ہم قدم نہیں رہے لیکن مولانا کی دلی وابستگی اور تائید حضرت سید صاحب کی خدمات اور  
 انکے کام کے ساتھ تھیں۔

**تحریک سید احمد شہید اور شاہ محمد اسماعیل**  
**کی دعوت توحید و سنت کی ترویج** | مولانا مملوک العلی کے جو خاص تربیت  
 یافتہ شاگرد اور وہ علماء ہیں جو مولانا  
 کے عزیز و قریب تھے اور بعد میں  
 ہندوستان میں تعلیمات دین اور  
 احیائے اسلام کے نقیب ثابت ہوئے۔ وہ سب فکر و لی اللہی کے نمائندہ و ترجمان،  
 تحریک سید احمد شہید کے دامن گرفتہ اور اس کے داعی و مبلغ تھے۔ اور ان اصحاب کے ذریعہ  
 سے ملت کو علم و دین کا جو بیش بہا سرمایہ حاصل ہوا اور جو دینی تعلیمی ادارے (دارالعلوم

دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور وغیرہ اور ان کے اثر سے قائم اور فیض سے آراستہ ہزاروں لاکھوں دینی ادارے (برصغیر اور عالم سلام میں قائم اور آباد ہوئے وہ سب تحریک سید احمد شہید کے نمائندہ و ترجمان ہیں اور یہ سب ادارے اور علمائے کرام اسی آواز کو، ان ہی مقاصد کو، اسی پیام کو لے کر چل رہے ہیں، آگے بڑھ رہے ہیں جس کی علمائے خاندان ولی اللہی حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ محمد اسماعیل نے آواز لگائی تھی، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ علمائے دیوبند و سہارنپور میں ان اثرات کا ایک حصہ حضرت مولانا مملوک العلی کی تربیت و صحبت سے بھی آیا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ:

بہار رنگ و بو میں خون دیوانوں کا شامل ہے

حضرت سید صاحب نے جن برائیوں کے دور کرنے

**نکاح بیوگان کی جدوجہد** اور انکی اصلاح کی پر زور و پر جوش کوشش فرمائی تھی ان میں یہ ایک بڑا کام بیواؤں کے نکاح کرانے کی جدوجہد بھی تھی جس کی برکت سے ہزاروں بیواؤں کے نکاح ہوئے اور ہندوؤں کے اثر کی وجہ سے بیواؤں کے دوسرے نکاح کو سخت عیب سمجھنے کا جو رواج سو سال بلکہ اس سے زائد عرصہ سے مسلمانوں میں عام ہو گیا تھا، اس میں بہت کمی آئی۔

حضرت سید احمد صاحب نے اس مبارک کام کا اپنے خاندان بلکہ گھرانہ کی بیواؤں کے نکاح کرنا آغاز کیا، خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء نے اسکی تقلید کی اور پھر علاقہ کے اکابر علماء کی بھی ادھر خاص توجہ ہوئی، مختلف علاقوں کے ممتاز علماء نے دعوت و پیام کو آگے بڑھایا اور اس کا رواج عام کرنے کی کوشش فرماتے رہے، مولانا کی توجہ کی وجہ سے اور بھی کئی بڑے علماء نے اس میں خاص دلچسپی لی جس میں ایک بہت ممتاز اور نمایاں نام مولانا مملوک العلی کا ہے۔

مولانا مملوک العلی نے اس ہندوانہ رسم کو ختم کرنے اور مسلم معاشرہ کو اس سے پاک کرنے اور نکاح بیوگان کا رواج ڈالنے کے لئے قلمی اور عملی دونوں طرح موثر جدوجہد کی، نکاح بیوگان کیلئے جو فتوے لکھے گئے مولانا نے انکی تائید و تصدیق کی، ان پر دستخط کئے اور



نکاح بیوگان کی نانوتہ اور اسکے آس پاس کوشش فرمائی۔ مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے:

”بیواؤں کے نکاح کی بنا ان اطراف میں اول ان (مولانا مظفر حسین کاندھلوی) سے ہوئی اور والد مرحوم نے اسکو نہایت خوبصورتی سے اجراء فرمایا اور ان دونوں بزرگوں کے قدم بہ قدم حضرت مولانا (محمد قاسم) نے اسکو پورا شائع کیا“ (۱)

بیواؤں کے نکاح کے ثواب اور اس مردہ طریقہ کو زندہ کرنے کیلئے ایک مفصل فتویٰ حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری نے لکھا تھا، حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کے اسی موضوع پر دو فتوؤں کے ساتھ (مطبع مطبع الرحمن دہلی سے ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱-۵۲ء میں) پہلی مرتبہ چھپا تھا (۲) اس پر مولانا مملوک العلی کے تائید اور مہر درج ہے۔

شفاعت کی تحقیق میں شاہ محمد اسماعیل کی تائید | حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید کے سفر ہجرت بلکہ

شہادت کے بعد بعض علماء نے شاہ صاحب کی معرکتہ الآراء تصنیف تقویۃ الایمان کے خلاف شورش برپا کی اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات کئے، جن میں ایک بڑا اعتراض شفاعت کے متعلق شاہ شہید کے بعض کلمات پر تھا۔ جو علماء علوم قرآن و سنت میں گہری نظر رکھتے تھے اور خاندان حضرت شاہ ولی اللہ سے تلمذ و تربیت کی نسبت رکھتے تھے ان میں سے اکثر نے اس اعتراض کے مختلف حیثیتوں سے جواب دیئے، کئی رسالے اور فتوے مرتب کئے گئے جن میں واضح دلائل سے حضرت شاہ محمد اسماعیل کے الفاظ کے صحیح معنی اور شفاعت کی بحث میں علمائے سلف کا مسلک واضح کیا گیا تھا، اس سلسلہ کی تالیفات و تحریرات کا سلسلہ دیر تک جاری رہا، بعد کے دور میں اس موضوع پر جو تالیفات مرتب ہوئیں ان میں سے ایک مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کا ایک مفصل فتویٰ بھی تھا۔ مولانا محمد حسین فقیر دہلوی نے اس فتوے پر ایک تمہید کا اضافہ کر کے اس کو ”البضاعة فی حقیقة الشفاعت“ کے نام سے شائع کیا تھا، یہ فتویٰ ۱۲۶۶ھ میں مرتب ہوا تھا۔

(۱) حالات مولانا محمد قاسم، تالیف مولانا محمد یعقوب ص ۱۲ (بھاول پور ۱۲۹۷ھ)

(۲) اس اشاعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔ اس فتویٰ کا اردو ترجمہ مولانا نواب قطب الدین دہلوی کی کتاب عروس المؤمنین (طبع اول، مطبع دارالسلام دہلی، ۱۲۶۳ھ) میں درج ہے۔

اس بحث کے متعلق ایک مشہور غلطی کی تصحیح اس میں مولانا نذیر حسین نے شاہ محمد اسماعیل پر کئے گئے اعتراضات کا مفصل علمی جواب لکھا تھا، اس فتویٰ پر مولانا مملوک العلی کے تائیدی دستخط ہیں، جس سے اس بحث میں مولانا مملوک العلی کے نظریہ کا علم ہو جاتا ہے۔

سب سے پہلے مولانا فضل حق خیر آبادی نے اعتراض کیا تھا مگر اس اعتراض اور اس کے بعد کے مباحث اور واقعات کے

نظریہ شفاعت کی وجہ سے شاہ شہید پر اعتراضات، کچھ پس منظر اور حقائق

حوالہ سے سخت مغالطہ پایا جاتا ہے، اسلئے یہاں اس بڑی اور بہت مشہور تاریخی غلطی بلکہ غلط بیانی کی کچھ تحقیق و تصحیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت شاہ محمد اسماعیل کے سب سے بڑے مخالف مولانا فضل حق خیر آبادی تھے۔ مولانا خیر آبادی نے شاہ شہید کی برملا مخالفت کی، خیر آبادی کے شاہ شہید سے مناظرے یا مناظرہ بھی ہوا اور دونوں میں ہمیشہ رد و کدر ہی، مگر یہ بات فرط شہرت (اور تقریباً پچاس کتابوں میں نقل ہونے) کے باوجود قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔

حضرت شاہ محمد اسماعیل (ولادت ۱۲/ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ) نے اپنی معرکہ آراء تالیف

ایک اہم تاریخی حقیقت کا تذکرہ

رد الاشراک سنہ ۱۲۱۳ھ میں تالیف کی اور تقویۃ الایمان رمضان المبارک ۱۲۳۳ھ (جولائی ۱۸۱۸ء) میں لکھی گئی، اس کے بعد تحریک سید احمد شہید کا آغاز ہوا، اسی کے حوالہ سے تقویۃ الایمان کا پیام اور دعوت عام ہوئی اور پورے ملک میں پھیل گئی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات تک حضرت شاہ شہید اور ان کے نظریات کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھی تھی، شاہ عبد العزیز کی وفات (۷/شوال ۱۲۳۹ھ ۶/جون ۱۸۲۲ء) کے سات مہینے کے بعد ۲۹/ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو پہلی مرتبہ جامع مسجد دہلی میں دہلی کے چند علماء نے ایک اجتماع کیا تھا، جس میں شاہ محمد اسماعیل کے بعض نظریات پر بحث و گفتگو ہوئی تھی، اس موقع پر شاہ محمد اسماعیل اور مولانا فضل حق بھی موجود تھے، شاہ محمد اسماعیل نے اسی جلسہ میں اعلان کر دیا تھا کہ جس

کو بھی تقویۃ الایمان پر کوئی اعتراض یا شبہ ہو وہ یہاں میرے سامنے لائے اور پیش ہوتا کہ اس کا جواب دیا جاسکے، مگر مولانا خیر آبادی بالکل خاموش رہے، مولانا خیر آبادی نے نہ اس اختلاف کی تائید کی، نہ تقویۃ الایمان پر کوئی شبہ یا اعتراض کیا۔

مباحثہ جامع مسجد دہلی کے چھ مہینے کے بعد (آخر شوال ۱۲۳۰ھ جون ۱۸۲۵ء میں) شاہ محمد اسماعیل دہلی سے سفر جہاد کیلئے روانہ ہو گئے، جو دہلی بلکہ ہندوستان سے شاہ شہید کا آخری سفر تھا، اس سفر سے واپسی نہیں ہوئی، مگر اس وقت تک شاہ شہید یا تقویۃ الایمان کی تردید یا اعتراض میں کوئی تحریر مرتب نہیں ہوئی تھی، شاہ محمد اسماعیل کی دہلی سے آخری رخصت کے تقریباً آٹھ مہینے کے بعد جمادی الاخری ۱۲۳۱ھ (جنوری فروری ۱۸۲۶ء) میں مولانا فضل حق نے تقویۃ الایمان پر اعتراض کرتے ہوئے اپنی پہلی تحریر یا مختصر رسالہ ”تقریر اعتراض بر تقویۃ الایمان“ لکھا، جس میں تقویۃ الایمان کی ایک سیدھی سی عبارت پر اعتراض کرتے ہوئے شفاعت اور امکان و امتناع نظیر پر دقیق علمی اور فلسفیانہ بحث کی ابتدا کی۔

شاہ محمد اسماعیل قافلہ مجاہدین کی رفاقت میں شروع ذی الحجہ ۱۲۳۱ھ (جولائی ۱۸۲۶ء) سے سندھ میں قیام پذیر تھے کہ دس ذی الحجہ کو شاہ شہید کو مولانا خیر آبادی کا یہ رسالہ ملا، شاہ اسماعیل نے اسی وقت اسی مجلس میں اس کا قلم برداشتہ جواب لکھ دیا تھا۔ اسی لئے شاہ محمد اسماعیل کی تالیف اور جواب کو ”رسالہ یک روزی“ کہا جاتا ہے۔

ادھر مولانا شہید کے رد میں مولانا خیر آبادی کے رسالہ کا چرچا ہوا، ادھر رسالہ یک روزی کی نقلیں عام ہو گئیں۔

نیز تحریک سید احمد شہید کے ذریعہ سے بدعات و رسوم کے خلاف جس طویل جدوجہد اور مہم کا آغاز ہوا تھا اس کی تائید میں خانوادہ ولی اللہی کے علماء اور شاگردوں نے ایک مفصل فتویٰ یا رسالہ مرتب کر دیا، اس رسالہ یا فتوے کو بھی کثرت سے پڑھا گیا اور اس کی بہت شہرت ہوئی، مولانا خیر آبادی کو رسالہ یک روزی کے جواب کی تو جرأت نہ ہوئی مگر مولانا خیر آبادی نے اس فتوے کے جواب میں (بظاہر جمادی الثانی ۱۲۳۲ھ جنوری ۱۸۲۷ء میں) ”ابطال الطغوی فی تحقیق الفتوی“ لکھی تھی۔

حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ محمد اسماعیل ۲۲/ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۸/ مئی ۱۸۳۱ء) کو بالاکوٹ میں شہید ہو گئے تھے مگر اس وقت تک مولانا خیر آبادی نے شاہ اسماعیل کے رد میں کوئی اور فتویٰ یا کسی قسم کی تحریر نہیں لکھی تھی۔ شاہ اسماعیل کی شہادت کے بعد بھی خاموش رہے، اس حادثہ کے چوبیس پچیس سال بعد ۱۲۷۰-۷۳ھ (۵۷-۱۸۵۵ء) میں مولانا فضل حق کے شاگرد مولانا ہدایت علی جوینوری نے مولانا حیدر علی ٹونگی کی ایک اور تالیف کے جواب میں "امتناع النظیر" مرتب کی تھی جس کو مولانا فضل حق سے منسوب کیا جاتا ہے، حالانکہ امتناع النظیر کا مولانا خیر آبادی سے انتساب درست نہیں، امتناع النظیر مولانا جوینوری کی تالیف ہے۔

اس فتنہ اور تفریق کا ذمہ دار کون تھا؟ | واقعہ یہ ہے کہ شاہ محمد اسماعیل شہید اور تقویۃ الایمان کے خلاف برپا شورش

میں بنیادی کردار مولوی رجب علی شیعہ کا ہے، رجب علی جگراؤں کا رہنے والا تھا۔ دہلی میں انگریزوں کے جاسوس اور ایجنٹ کی حیثیت سے متعین تھا اور یہ بات اب پوری طرح محقق اور ثابت ہو چکی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں دہلی کے مجاہدین اور تحریک جہاد کو سب سے زیادہ نقصان اسی شخص نے پہنچایا، یہ اس زمانے کا سب سے بڑا غدار اور دلی میں انگریزوں کا سب سے بڑا منجر اور ایجنٹ تھا، اسی نے دلی کے اسلحہ خانہ کو اڑایا تھا اور اسی بد نصیب نے بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کیلئے جال بچھایا اور مرزا الہی بخش کو استعمال کیا تھا، اور حضرت شاہ محمد اسماعیل اور تقویۃ الایمان کے خلاف شورش بھڑکانے اور دہلی اور اطراف کے علماء سے مناظرے کر نیکا اور اس قضیہ کو آگے بڑھانے کا کام بھی اسی کا تھا۔ اگرچہ مولانا فضل حق خیر آبادی کو شاہ محمد اسماعیل شہید کے نظریات سے اختلاف تھا مگر وہ اس جھگڑے میں میدان میں کبھی نہیں آئے۔ (۱)

(۱) درج بالا تمام واقعات کی تاریخی، تحقیق اور علمی دلائل کیلئے راقم سطور کی تالیف "تقویۃ الایمان اور شاہ محمد اسماعیل کے خلاف برپا شورش تاریخ و حقیقت کے آئینہ میں" کا انتظار فرمائیے جس کا نصف سے کچھ کم حصہ (پندرہ قسطیں) ماہ نامہ الفرقان لکھنؤ میں چھپا ہے۔ (جولائی ۱۹۹۱ء سے اکتوبر دسمبر ۱۹۹۳ء تک) پوری کتاب انشاء اللہ جلد ہی سامنے آئے گی۔

## باب (۱۰)

حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کی ہندوستان سے ہجرت کے بعد  
شاہ محمد اسحاقؒ کی نمائندگی کے لئے علمائے ہند کے  
ایک مشاورتی بورڈ کی مشتبہ روایت

حضرت مولانا مملوک العلی جو خاندان ولی اللہی کے اکابر کی صحبتوں کے پروردہ، ان کے علوم کے جامع و امین اور ان کے فکر و مزاج اور تعلیمات و اصول کے علم بردار تھے، انگریزوں کی ملازمت کے معاملہ میں بھی خانوادہ ولی اللہی کے علماء کے تابع فرمان تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز اور اس خانوادہ کے علماء نے انگریزوں کی ملازمت جائز ہونے کا فتویٰ دیا تھا (۱) مگر ان کے طور و طریق سے مکمل احتیاط کی بھی تلقین (۲) فرمائی تھی، مولانا مملوک العلی نے زندگی بھر اسی کو اسوہ بنائے رکھا، مولانا مملوک العلی کی زندگی خصوصاً علمی تدریسی زندگی کا بڑا اور کامیاب حصہ انگریزوں کی ملازمت یعنی دہلی کالج کی مدرسے و سرپرستی میں گزرا مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مملوک العلی جن کی ذہانت اور عالی دماغی کے اس وقت بھی غیر معمولی چرچے رہتے تھے، انگریزوں کی عیاری، سازشوں، اور ان کی ہندوستانی نظام حکومت پر بڑھتی ہوئی گرفت اور اس کے متوقع اثرات سے بے خبر نہ ہوں گے، نیز حضرت مولانا جو مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) کے قائم ہونے کے پہلے دن سے اس ادارہ کے ذمہ دار رکن تھے، اس ادارہ کے مقاصد، کالج کے بانیوں کے نظریات و خیالات،

(۱) حضرت شاہ صاحب کا یہ فتویٰ ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم تاریخ ساز اور معرکہ آرا فتویٰ ہے، جس کے اثرات آج تک موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ اصل فتویٰ کیلئے ملاحظہ ہو فتاویٰ عزیزی فارسی ص ۳۲ ج ۱ (مجتبائی دہلی ۱۳۲۲ھ)  
(۲) فتاویٰ عزیزی ص ۱۱۸ ج دوم (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۵ھ)

ان کے طریقہ کار اور کالج کے دور رس اثرات، فائدوں اور نقصانات کو اس قدر ضرور جانتے تھے جس قدر کالج کے بانی جانتے ہوں گے۔

اس لئے حضرت مولانا نے کالج کے تعلیمی مقاصد سے اتفاق کرتے ہوئے کالج کے تعلیمی نظام کو ایسی ترتیب پر قائم رکھا جس سے یہ کالج سے زیادہ مدرسہ معلوم ہوتا تھا اور مولانا کی زندگی تک اس کالج سے صرف تعلیم و تربیت اور علمی نظریات کی ترجمانی و اشاعت کا کام ہوا۔ حضرت مولانا کا اس کالج کے ساتھ یہ تعاون ایک محدود دائرہ میں تعاون تھا اور حضرت مولانا نے اس کالج کو اپنی متعین کی ہوئی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کرنے دیا۔ نیز حضرت مولانا نے نہ کبھی کالج کے کسی کام اور خدمت میں تساہل برتا، نہ کالج کے علاوہ انگریزوں کی کسی خدمت اور کام میں شریک ہوئے، حیرت ہوتی ہے کہ کالج کی ملازمت اور ہمہ وقت انگریز افسران سے روابط کے باوجود حضرت مولانا کا انگریز دشمنی کا طبعی فطری مزاج کس طرح قائم رہا اور مولانا نے کس طرح دہلی کالج کی سرپرستی و ملازمت اور انگریزوں کی ذاتی پذیرائی میں فاصلہ برقرار رکھا۔

حضرت مولانا کی انگریز دشمنی | حضرت مولانا انگریزوں سے کس قدر بے زار تھے اور اگر کبھی ان سے ملاقات ہوتی تو وہ کس

کیفیت اور مجبوری میں ملاقات کرتے تھے، اس کا ایک واقعہ سے خوب اندازہ ہو جائیگا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہندوستان کا لیفٹنٹ گورنر دہلی دورہ پر آیا تھا (۱) اس کو دہلی کالج دیکھنے کی بھی دعوت دی گئی، گورنر نے مولانا کو دہلی کالج کا مدرس اعلیٰ (اور دہلی کا ممتاز عالم) سمجھ کر (مولانا کی عزت افزائی کیلئے) مولانا سے ہاتھ ملایا، مولانا نے ہاتھ تو ملایا، مگر اسکے بعد کیا ہوا یہ پورا واقعہ ڈپٹی نذیر احمد کے الفاظ میں پڑھئے۔ لکھتے ہیں:

”ملکی لاٹ آئے اور تمام درس گاہوں کو دیکھتے بھالتے پھرے، قدر دانی ہو تو ایسی ہو کہ جس جماعت میں جاتے مدرس سے ہاتھ ملاتے۔ بڑے مولوی صاحب

(۱) یہ لیفٹنٹ گورنر ولیم میور (SIR WILLAM MUIR) تھا، مولوی نذیر احمد نے لکھا ہے کہ جب حضور (ولیم میور) نے غدر سے پہلے کالج کا ملاحظہ فرمایا تھا میں عربی کی اول جماعت میں تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے لکچروں کا مجموعہ، لکچر نمبر ۴۰ ص ۲۳۰ ج ۲ (آگرہ: ۱۳۳۶ھ)

نے طوعاً و کرہاً بادلِ ناخواستہ آدھا مصافحہ کیا تو سہی، تو اس ہاتھ کو عضوِ نجس کی طرح الگ تھلگ لئے رہے، لاٹ صاحب کا منہ موڑنا تھا کہ بہت مبالغہ کے ساتھ انگریزی صابون نہیں بلکہ مٹی سے رگڑ رگڑ کر اس ہاتھ کو دھو ڈالا“ (۱)

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مرزا فرحت اللہ بیگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

”بچارے (مولانا مملوک العلی) پابندیِ شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکر میں

آگئے تھے، ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے، ان کے علم اور رتبے

کے خیال سے ہاتھ ملایا، جب تک صاحب بہادر وہاں رہے انہوں نے ہاتھ کو جسم

سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے، جاتے ہی صاحب کے

بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا“ (۲)

اسی ایک واقعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت مولانا کی نظر میں اس ملک پر مسلط

عیسائیوں اور انکے اربابِ اقتدار کی کیا حقیقت تھی اور وہ ان سے کس قدر دور رہنا چاہتے

تھے۔ ان کی مجلسوں محفلوں میں جانا اور ان کا اعزاز و اکرام حضرت مولانا کو کس قدر ناگوار

تھا، یہ ملاقات جو کسی اور ہندوستانی کے لئے ایک تاریخی لمحہ اور ایسی یادگار ملاقات ہوتی جس

پر وہ اور شاید بہت زمانہ تک اس کی نسلیں بھی فخر کرتیں، اور اس کے حوالہ سے اپنے مفادات

اور مقاصد پورے کر نیکی ہر ممکن کوشش کر سکتی تھیں، حضرت مولانا کی نگاہ میں ایسا بے وقعت

اور غیر ضروری کام تھا کہ مولانا نے اس میں خفت محسوس کی اور اسکی تلافی کی کوشش فرمائی۔

عیسائیوں کے سلسلہ میں حضرت مولانا کا یہ رویہ اور مزاج خاندانِ حضرت شاہ ولی

اللہی سے وابستگی کا اثر اور اس زمانہ کے اکثر علماء اور غیرت مند ہندیوں کے خیالات کا

عکس اور ترجمان تھا۔

لیکن اس وقت کے حالات ایسے نہیں تھے کہ انگریز اقتدار کے خلاف کوئی بڑی

منصوبہ بندی کی جاسکتی، یا اس کو اقتدار سے باہر کرنے کی تدبیر پر عمل کیا جاتا، یہی وجہ ہے

کہ اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ اور خاندانِ حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء کی طرح حضرت شاہ

(۱) ابن الوقت، ڈپٹی نذیر احمد صفحہ اول (ناشر شیخ نذیر حسین دہلی۔ بلاسنہ)

(۲) دہلی کی آخری شمع، مرتبہ رشید حسن خاں ص ۵۵ (دلی: ۱۹۹۲ء)

محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب (رحمہم اللہ) بھی انگریزوں کے تسلط اور غیر اسلامی نظام حکومت کی وجہ سے ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے مگر (تحریک سید احمد شہید کے بعد) حضرت شاہ محمد اسحاق یا اس خاندان کے کسی اور فرد نے انگریز کے خلاف مسلح جدوجہد کی کوشش نہیں کی، لیکن اگر کسی نے اس میدان میں قدم بڑھائے تو اس کو منع بھی نہیں کیا، یہی نظریہ مولانا مملوک العلی کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ بہ ظاہر مولانا مملوک العلی بھی انگریزوں کے اقتدار اور ان کی بڑھتی سیاسی طاقت سے بے زار تھے، لیکن مولانا نے اس کے خلاف کسی عملی جدوجہد میں حصہ لیا ہو، اس کی منصوبہ بندی کی ہو، یا اس میں حضرت مولانا کا کچھ حصہ ہو اس کی کوئی شہادت اور اطلاع نہیں۔

برصغیر ہندو پاکستان کی گزشتہ دو سو سالہ سیاست اور انگریزوں کے خلاف اقدامات اور عملی جدوجہد میں حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ صاحب کے فکر و خیالات اور علوم و خدمات کے نام لیواؤں کے کام اور قربانیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں، اور بلا تردید کہا جاسکتا ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں انگریزوں کو برصغیر سے نکالنے کی کوئی جدوجہد ایسی نہیں تھی جس کا سراخانوادہ ولی اللہی کے علماء یا ان کے وابستگان سے نہ ملتا ہو۔ تحریک سید احمد شہید ہو، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سوراؤں جیالوں کی روداد ہو، تحریک خلافت ہو، تحریک شیخ الہند مولانا محمود حسن ہو، یا تحریک خلافت کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک کی دینی، اسلامی، سیاسی، ملی تحریکات، ہراک میں اس جماعت کے نمائندے صف اول میں شامل اور ہر طرح کی قربانیاں دینے اور ہر پہلو سے جدوجہد کرنے میں دیگر جماعتوں سے نمایاں اور ہر محاذ پر اوروں سے آگے نظر آتے ہیں۔

مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ سے آج تک اس سلسلہ سے جس قدر بھی علماء، اہل کمال، مصنفین و مؤلفین، مدرسین اور داعیان اسلام وابستہ و منسلک رہے، سب ہی سیاسی تحریکی میدان کے رہ نور اور عملی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے عہد سے ہی سلسلہ ولی اللہی کے علماء میں دونوں طبقہ و خیال کے نمائندے موجود تھے، جن میں سے کچھ سیاسی جدوجہد اور تحریک



کے علمبردار تھے کچھ جہاد اور اعلائے کلمۃ الحق کیلئے جانی و مالی قربانی دیکر: وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعدوا ان اللہ لایحب المعتدین پر بہر صورت عمل کرنا چاہتے تھے، اور کچھ اس جدوجہد سے الگ اور سیاسی تحریکات کے خلاف تھے، کچھ اس کو دین، ملت اور ملک کیلئے ضروری سمجھتے تھے اور نامساعد حالات میں بھی اعلائے کلمۃ الحق کو فرض منصبی سمجھتے تھے اور بعض اس کی ضرورت کے قائل و معترف تو تھے لیکن یہ سمجھتے اور کہتے تھے کہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم معرکہ آرا ہو کر کوئی نتیجہ حاصل کر سکیں، حالات ہمارے حق میں نہیں، مسلح جدوجہد سے مسلمانوں کو سخت نقصان ہوگا، اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

یہ دوسری جماعت بھی پہلی جماعت کے علماء کی طرح مخلصین علماء صلحاء و اتقیاء کا گروہ تھا، اس کے بھی ارادے نیک تھے، اس کی نیتوں میں بھی کوئی خرابی اور مقاصد میں کوئی فریب یا دنیاوی منافع و مفادات کا خیال نہیں تھا، لیکن وہ مسلح جدوجہد کے خلاف تھے، اور اس کو مسلمانوں کیلئے مہلک سمجھتے تھے اور یہ ترتیب اور تقسیم ۱۹۴۷ء تک اسی طرح قائم رہی، اسلئے حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک یا انکے سلسلہ سے منسلک ہر اک عالم و صاحب کمال کیلئے سیاسی خدمات کو ضروری سمجھنا، یا ان کی سیاسی جدوجہد کا تذکرہ تلاش کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ یہ جاننا اور ماننا چاہئے کہ جو اصحاب اس طرح کی تحریکات سے دور یا اس کے مخالف رہے یا اس میں حصہ نہیں لیا وہ بھی اپنی رائے میں مخلص تھے اور ان کا بھی ایسا ہی احترام کیا جانا چاہئے جس قدر ان لوگوں کا احترام کیا جاتا ہے جو سیاسی تحریکات میں شامل تھے۔

اور اس بحث و گفتگو کے وقت یہ بھی صاف اعتراف کیا جانا چاہئے کہ علماء یا بڑی دینی ملی شخصیتوں کی سیاسی جدوجہد اور ان کی عالی قدر خدمات اور ان کی زندگی کا صرف ایک معمولی اور کئی پہلوؤں سے صرف جزوی اور چھوٹا سا حصہ تھا، صرف سیاسی جدوجہد یا ۱۸۵۷ء یا بعد کی سیاسی تحریکات میں شامل ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے انکے اور کمالات و خدمات، اخلاص، تقویٰ، للہیت وغیرہ محاسن پر پردہ ڈالنا غلط ہی نہیں بلکہ سخت ناانصافی اور بددیانتی ہے۔ اسی طرح ان علمائے کرام کو جنہوں نے سیاسی تحریکات سے علیحدہ ہو کر دینی

علمی خدمات کو اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا اور خاموشی سے افراد سازی اور ملت کے معمار تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے، سیاسی جدوجہد کا قائد بنا کر دکھانا اور نا کردہ گناہ ان کے سر تھوپنا بڑی جسارت اور سخت غلطی ہے، حق یہ ہے کہ:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کچھ پھول چمن کے لئے ہوتے ہیں، کچھ عیش و نشاط کی محفلوں کیلئے اور کچھ صرف غم و الم کی مجلسوں میں نثار کرنے کیلئے، ہر ایک سے ایک ہی خوشبو ایک ہی کیف کی امید رکھنا، یا ہر شخص سے ایک ہی بٹیا اور راستہ پر چلنے کی توقع کرنا درست نہیں۔ یہ نہ انصاف ہے اور نہ دین و شریعت کا مطالبہ۔

اس پس منظر | مولانا عبید اللہ سندھی کا ایک بے ثبوت نظریہ یا اطلاع

مناسب ہے کہ متاخر دور کے چند تذکرہ نگاروں اور علماء نے مولانا مملوک العلی کو تحریک ۱۸۵۷ء کے مؤسسین میں شمار کیا ہے جو صحیح نہیں ہے، اور غالباً اس غلط فہمی کی اساس مولانا عبید اللہ سندھی کی اس اطلاع پر ہے کہ:

”مولانا محمد اسحاق مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے

ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک العلی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کر کے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے اور یہی جماعت ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام کو چلاتی ہے۔ (۱)

مولانا عبید اللہ سندھی نے اسی سلسلہ گفتگو میں چند صفحات کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:

”چونکہ مولانا محمد اسحاق نے حزب ولی اللہ کے کام کو چلانے کیلئے دہلی میں جو انتظام کیا تھا اسے آپ کمپنی کے کارندوں سے مخفی رکھنا ضروری سمجھتے تھے اور اسی غرض کے پیش نظر انہوں نے اپنا مرکز مولانا مملوک العلی کے حوالہ کیا تھا، جو ایک سرکاری ملازم تھے اور آپ نے اپنے خاص اصحاب کی جماعت کو انکے تابع کر دیا تھا“ (۲)

(۲) ایضاً ص ۱۳۰

(۱) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۲۲ (لاہور: ۱۹۴۵ء)

مولانا سندھی کے حوالہ سے یہ بات بار بار دہرائی اور کہی گئی ہے، مولانا محمد میاں دیوبندی، رتن لال بنسل اور متعدد اہل قلم نے یہ رائے نقل کی ہے، اس کے علاوہ اس موضوع کا جس جگہ ذکر کیا گیا ہے وہ مولانا سندھی کی تحریروں کی بازگشت یا اس سے استفادہ ہے، جس کو بعض حضرات صحیح بھی سمجھتے ہیں مگر اس اطلاع کی صداقت مشتبہ ہے، راقم سطور کو ممکنہ تلاش و جستجو کے باوجود اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

خاندان حضرت شاہ ولی اللہ اور سلسلہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ میں اس قسم کے کسی بورڈ یا مشاورتی کمیٹی کا کہیں کوئی وجود نہیں تھا، شاہ عبدالعزیزؒ نے کوئی بورڈ بنایا نہ شاہ محمد اسحاقؒ نے مشاورتی کمیٹی تشکیل دی، نہ ہی حضرت شاہ صاحب کے سفر ہجرت ۱۲۵۸ھ کے بعد کوئی مشاورتی نمائندہ کمیٹی موجود تھی، جس کے صدر مولانا مملوک العلی ہوں اور مولانا مظفر حسین وغیرہ علماء اسکے رکن مقرر کئے گئے ہوں، ان بزرگوں کے حالات و سوانح کے جو قدیم مستند مآخذ اور جو مکتوبات و تحریرات اب تک شائع ہوئے ہیں یا ہماری دسترس میں ہیں ان سے اسکا کچھ ثبوت بلکہ اشارہ تک نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا سندھی نے یہ خیال یا نظریہ امیر الروایات (مجموعہ مرویات قصص علماء سلسلہ ولی اللہی و علماء دیوبند بزبان امیر شاہ خان مینڈھو) کی ایک روایت سے اخذ کیا ہے (۱) اور اسی کو ایک تاریخ اور فلسفہ سمجھ لیا ہے حالانکہ اصل روایت سے ظاہر ہے کہ اسکا وہ مطلب نہیں ہے جو مولانا سندھی کی فکر کی بنیاد ہے۔

اگرچہ حضرت شاہ محمد اسحاق اپنے بزرگوں و حضرت شاہ عبدالعزیز وغیرہ کی طرح ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے اور اسی لئے ہندوستان سے ہجرت فرما گئے تھے اور حضرت شاہ محمد اسحاق کے چند ممتاز شاگرد مثلاً حضرت شاہ عبدالغنی مجددی بھی اسی کے قائل تھے، قرین قیاس ہے کہ مولانا مظفر حسین بھی اس کے ہم نوا ہوں (مگر مجھے اس کی کوئی تحریری شہادت نہیں ملی) لیکن ان حضرات نے مسلح جدوجہد کیلئے ماحول سازگار نہیں سمجھا تھا اس لئے میدان میں نہیں آئے، تاہم وہ یہ بھی جانتے تھے کہ احیائے دین کا یہی ایک طریقہ

(۱) مولانا نور الحق نے شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک میں الصدر الحمید شاہ محمد اسحاق کے حاشیہ میں اس کی تصریح کی ہے کہ مولانا سندھی کے اس نظریہ کی بنیاد امیر الروایات ص ۸۸ طبع اول دہلی ۱۳۴۵ھ کی ایک روایت ہے۔

نہیں ہے، ہندوستان میں خدمت دین کے بہت مواقع اور بے شمار صورتیں ہیں، اس لئے ان حضرات میں سے جس نے جس کام کو اپنے لئے موزوں سمجھا اس میں پورے انہماک سے آخر وقت تک مصروف رہے، ان حضرات کی یہ خدمات ہندوستان میں دین کے قدم جمانے کے مترادف تھیں اور یقیناً ان سے بہت فائدہ ہوا، ایسا فائدہ کہ آج تک ہم سب ان کی برکات سے بہرہ ور ہیں۔

حضرت شاہ عبدالغنی حضرت شاہ محمد اسحاق کی ہجرت (۱۲۵۸ھ) کے پندرہ سال بعد تک ہندوستان میں رہے، شاہ عبدالغنی نے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) میں ہجرت فرمائی۔ مولانا مظفر حسین ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے فوراً بعد مکہ معظمہ چلے گئے تھے، پھر واپس آ گئے تھے، اسکے بعد آتے جاتے رہے، آخر میں ہجرت کی نیت سے گئے اور مدینہ منورہ میں ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں وفات ہوئی، یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد مولانا مظفر حسین نے بھی ہندوستان میں رہنا پسند نہیں کیا۔ نواب قطب الدین بھی ۱۸۵۷ء کے بعد تک دہلی میں مقیم تھے بعد میں سفر ہجرت کیا، یعنی یہ تینوں علماء (جن کو مولانا سندھی نے ایک مشاورتی بورڈ کا رکن بنایا ہے) ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اسکے بعد بھی ہندوستان میں یروں قیام فرما رہے (مگر اس وقت تک) ان بزرگوں کے جو حالات، مکتوبات، تصانیف اور متعلقہ تحریرات دریافت ہیں ان میں سے کسی ایک تحریر سے بھی یہ اشارہ نہیں ملتا کہ یہ حضرات کسی بورڈ یا مشاورتی کمیٹی کے رکن تھے اور خاص (خفیہ) منصوبہ بندی کے ساتھ کوئی کام کر رہے تھے۔

اگرچہ ان حضرات کے برصغیر کے مسلمانوں سے وسیع روابط تھے اور یہ سب ہی حضرات اپنی دینی خدمات میں تعلیم و تربیت، اصلاح و ارشاد، تصنیف و تالیف اور وعظ و تذکیر کے ذریعہ سے ہمیشہ سرگرم رہے، مگر یہ تمام مصروفیات سیاسی تذکروں سے پاک اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے تھیں اور ہر شخص جانتا ہے کہ ہمیشہ ہر موقع پر سیاسی جدوجہد کا تذکرہ یا جہاد بالسیف کی تیاری ضروری نہیں۔

یہی بات پوری قوت سے مولانا مملوک العلی کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کی زندگی کا ایک ایک دن بلکہ ایک ایک لمحہ علم و فضل کے گلدستے تیار کرنے اور انسانیت کے

نمونے بنانے میں صرف ہو رہا تھا، مولانا کی علمی مصروفیات جو دن رات کے انہماک میں تبدیل ہو گئی تھیں، ایسی تھیں کہ ان میں کسی اور کام کے لئے وقت فارغ کر لینا سخت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن تھا، اور مولانا جس اہم منصب پر فائز تھے وہاں رہ کر جو بڑی دینی خدمت انجام دے رہے تھے اور مولانا کی بھاری بھر کم شخصیت نے جس طرح دہلی کالج کو انگریزیت کی آلودگی اور عیسائیت کے مذہبی اثرات سے اور اسکوتبلیغ عیسائیت کا بڑا اڈہ یا مرکز بننے سے محفوظ رکھا وہ معمولی بات نہیں تھی، یہ بھی ایک بڑی خدمت اور کارنامہ ہے۔

شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کے بعد ملک کی آزادی کے لئے جو جدوجہد ہوئی اس میں حضرت شاہ محمد اسحاق کے دامن تربیت سے وابستہ علماء اور مولانا مملوک العلی کے متعدد شاگرد بے شک شریک ہوئے، بلکہ وہ اس مسلح جدوجہد کے قائدین اور رہنماؤں کی صف اول میں شامل تھے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ مولانا سندھی نے اس کمیٹی کے تحت جن علماء کے نام درج کئے ہیں ان میں سے کچھ ۱۸۵۷ء کی تحریک کے ہم نوا تھے، شاہ عبدالغنی نے جہاد کے فتویٰ پر دستخط بھی فرمائے تھے (۱) نیز ان علماء کے بہت سے وابستگان اس معرکہ میں شریک تھے، بعض شہید ہوئے، کسی نے سزا پائی، کوئی ہجرت کر گیا، مگر یہ ان حضرات کا ذاتی فعل تھا اور اگرچہ اس قسم کے اکثر اصحاب نے جذبہ حریت کی یہ فراوانی، قربانی کا یہ جذبہ اور دین کیلئے مر مٹنے کی یہ کیفیت خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے مختلف سرچشموں سے حاصل کی تھی مگر اس مقصد کے لئے تحریک حضرت سید احمد شہید کے بعد بھی کوئی منظم تحریک چلی ہو، یا خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء کی جانب سے اس قسم کی کوئی مجلس یا کمیٹی قائم کی گئی ہو اور اس نے اس مقصد کیلئے متواتر کام کیا ہو اور اس مجلس کی ذمہ داری اور سرپرستی کچھ اصحاب کے سپرد ہو اور ان سے یہ روایت اور خدمات بعد کے اراکین یا ممبران مجلس کو منتقل ہوئی ہوں، بالکل غلط اور ایک ایسا مفروضہ ہے جس کا ہمارے علمی تاریخی سرمایہ میں کچھ ثبوت بلکہ

(۱) انگریز کے خلاف جہاد کیلئے علمائے دہلی نے جو تاریخی فتویٰ مرتب فرمایا تھا، اس پر حضرت شاہ عبدالغنی کے دستخط ہیں،  
العبد مولوی عبدالغنی

یہ فتویٰ اسی وقت اخبار الظفر میں چھپا تھا، اس کا عکس عبدالرزاق صاحب کی کتاب نوائے آزادی میں شامل ہے۔ ص ۹  
(بہمنی: ۱۹۵۷ء) اور ملاحظہ ہو: اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) اخبارات و دستاویزات محمد عتیق صدیقی

اشارہ تک نہیں ملتا، لہذا یہ بات صحیح نہیں ہے، اس کی بلاتامل تردید کی جاسکتی ہے۔  
حضرت شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت (۱۲۵۸ھ) کے بعد مولانا مملوک العلی نو سال  
حیات رہے اور مولانا کا اس عرصہ میں (وطن کے سفر کے علاوہ غالباً) کہیں آنا جانا نہیں  
ہوا، مولانا سندھی کا یہ نظریہ اگر درست ہے تو اس کا تقاضہ تھا کہ حضرت مولانا مملوک العلی  
انگریزوں کے خلاف تیاری کرتے، اس سلسلہ میں کچھ جدوجہد فرماتے اور اس کے کچھ نہ  
کچھ اشارات مولانا کے شاگردوں اور متعلقہ اصحاب کی تحریروں سے جھلکتے، مگر مولانا کے  
دور کے جو اخبارات وغیرہ اب تک دستیاب ہوئے اور ان کے مندرجات کا جو حصہ شائع  
ہو چکا ہے، اس میں مولانا مملوک العلی کی اس نمائندگی یا مزاج کا کوئی تاثر نظر نہیں آتا،  
یہی وجہ سے کہ چند ممتاز مورخین نے بھی مولانا عبید اللہ سندھی کے اس نظریہ کی صاف  
تردید کی ہے، مثلاً ڈاکٹر محمد اکرام لکھتے ہیں:

”مولانا عبید اللہ سندھی کی بعض باتوں سے اختلاف کرنا دشوار نہیں، وہ صرف  
مذہبی معاملات ہی میں نہیں بلکہ سیاسی امور میں بھی ولی اللہی طریقے کو اپنا اساس کار  
بتاتے ہیں اور مجاہدین بالاکوٹ کے اختلاف کو ٹراٹسکی اور سٹالین کے اختلاف کی روشنی  
میں دیکھتے ہیں (۱)، نتیجہ یہ ہے کہ ان کے خیالات و افکار میں بسا اوقات تکلف نظر آتا  
ہے اور ان کی تصانیف میں ایسی چیزیں بھی مل جاتی ہیں جنہیں آپ بوڑھوں کی بہکی  
بہکی باتیں کہہ سکتے ہیں۔ مولانا کے کئی نظریے محل نظر ہیں اور ان کے چند ایک  
بیانات کی صحت بھی شبہ سے بالا نہیں، اس کے علاوہ صادق پوری پارٹی کے متعلق  
انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں بھی وہ کسی حد تک جاہل اعتدال سے  
منحرف ہو گئے“ (۲)

دوسرے لوگوں نے یہ بات اور وضاحت سے لکھی ہے اس لئے مولانا سندھی کی اس  
روایت پر اعتماد درست نہیں۔

(۱) مثلاً دیکھئے شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، مولانا سندھی ص ۱۰۷ (لاہور ۱۹۳۵ء)

(۲) موج کوثر، شیخ محمد اکرام ص ۳۳۹ (لاہور: ۱۹۷۵ء)

اس میں شک نہیں کہ مولانا عبید اللہ سندھی مدیر، مفکر، علوم ولی اللہی کے ماہر اور ملی سیاست کے رہنماؤں میں سے ایک ہیں، لیکن مولانا نے حضرت شاہ ولی اللہ سے تحریک شیخ الہند تک واقعات کی جو ترتیب بنائی ہے اور جس طرح خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے سیاسی نظام کا تسلسل ثابت کیا ہے اس کی صداقت مشتبہ ہے۔ مولانا سندھی نے جس نظام اور ترتیب کی نشاندہی فرمائی ہے مولانا سندھی کی تحریرات کے علاوہ اس کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا، خانوادہ علمائے ولی اللہی کی تحریرات و تصانیف، مکتوبات اور علمی آثار اور سوانحات کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے وہ اس ترتیب کی تائید سے قاصر ہے۔ ان بزرگوں نے جو دینی علمی یا ملی خدمات انجام دیں ہیں وہ سب اپنی اپنی جگہ یقیناً بے نظیر اور ملت کی تاریخ کا غازہ ہیں، لیکن علماء و اکابر میں سے ہر ایک کو سیاسی تحریکات سے وابستہ دکھانا ضروری نہیں، میرا خیال ہے کہ ہم ان میں سے بعض حضرات کو خواہ مخواہ سیاسی تحریکات سے وابستہ کر کے ان بزرگوں کی رفعت و عظمت میں اضافہ نہیں کرتے، بلکہ ایک ایسی موہوم حقیقت کا دعویٰ کرتے ہیں جس کو ثابت نہیں کر سکتے۔

مولانا سندھی کی ذہانت نے اس قسم کے کئی پیکر تراشے ہیں اور ان کا خاص ترتیب اور وسیع پس منظر کے ساتھ ذکر کیا ہے، مگر تاریخی حقائق مولانا کی روایات کا ساتھ نہیں دیتے، ان اطلاعات کا جب واقعات کی روشنی میں تجزیہ کیا جاتا ہے تو مولانا کی روایات کی صداقت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

مولانا سندھی کے بعض دینی علمی نظریات و خیالات اور ان کے ذریعہ خاندان حضرت شاہ ولی اللہ اور علمائے دیوبند کی ترجمانی مطابق واقعہ نہیں، اس کا اوروں کے علاوہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے بھی ذکر فرمایا ہے، مناسب ہوگا کہ یہاں حضرت مولانا مدنی کی ایک تحریر کا اقتباس بھی نقل کر دیا جائے۔ حضرت مولانا نے لکھا ہے:

”تمام اہل قلم اور ارباب قلم و علم سے پر زور درخواست ہے کہ مولانا مرحوم کی کسی تحریر کو دیکھ کر اس وقت تک اس پر کوئی حتمی رائے قائم نہ فرمائیں جب تک کہ اس کو اصول اور مسلمات اسلامیہ اور ضروریات دین و اعمال اہل سنت و الجماعت کے

زریں قواعد و تالیفات پر پرکھ نہ لیں۔ اور علیٰ ہذا القیاس مولانا کے کسی کلام کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اسلاف و اکابر دیوبند کا مسلک بھی نہ سمجھیں جب تک کہ اسی کسوٹی پر اس کو کس نہ لیں۔ یہ حضرات اکابر جملہ عقائد و اعمال میں خواہ وہ فروع سے تعلق رکھتے ہوں یا اصول سے سلف صالحین اور ان کے اصول و قوانین مسلمہ اہل سنت و الجماعت ہی کے تابع ہیں اور اسکی تعلیم و تلقین کرتے رہے ہیں۔ (۱)

جب مولانا کے مذہبی، دینی، فقہی خیالات میں اس قدر بے ترتیبی درآئی تھی تو تاریخی روایات و واقعات میں اس کا اثر آجانا غیر متوقع نہیں تھا، اور اسی کا ایک اثر وہ روایت بھی ہے جو مولانا شاہ محمد اسحاق کے مشاورتی بورڈ کے متعلق ہے۔

(۱) حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا یہ مضمون اولاً ماہنامہ برہان دہلی (جلد ۱۳ کے شمارہ نمبر ۴) میں چھپا تھا اور ذاتی ڈائری مولانا عبید اللہ سندھی مع رسائل، مرتبہ مولانا محمد عبدالقدوس قاسمی (مطبوعہ لاہور: ۱۹۴۶ء) میں بھی شامل ہے۔



## باب (۱۱)

### اخلاق و مزاج کی ایک سرسری جھلک

حسن کردار، اپنے سے چھوٹے باخدا اصحاب سے محبت اور نیاز مندی و احترام کا معاملہ نیز سادگی، بے تکلفی، خوش طبعی اور دل جوئی کے چند واقعات۔

حضرت مولانا مملوک العلی اگرچہ دہلی کے بڑے نامور عالم، مشہور مدرس اور دہلی کے ایک بڑے علمی تصنیفی مرکز، دہلی کالج کے مدرس اوّل اور عملاً سربراہ بھی تھے، مولانا کے تمام اوقات تعلیم اور پڑھانے میں صرف ہوتے تھے اور کیونکہ کالج سے معقول تنخواہ ملتی تھی اسلئے خرچ بھی اعلیٰ درجہ کا تھا، رئیسوں کی طرح رہتے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا کے علم و فضیلت، دہلی کالج کی صدر مدرس اور ذاتی کمالات کی وجہ سے دہلی کی دینی علمی مجلسوں اور اصحابِ دولت و اقتدار میں بھی مولانا کا نہایت احترام تھا، ہر ایک مجلس میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے اور اعزاز و مرتبہ سے نوازے جاتے تھے، مگر اس احترام اور دن رات کی بے پناہ غیر معمولی تعلیمی مصروفیت کے باوجود مولانا نہایت کشادہ پیشانی، شگفتہ مزاج اور سادہ طبیعت شخص تھے، طالب علموں کا بہت احترام کرتے تھے، ان پر شفقت و کرم کی نگاہ رکھتے کبھی کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اسکی قیام گاہ پر جا کر اسکی مزاج پرسی کرتے، کوئی ضرورت مند ہوتا اسکا تعاون فرماتے اور جو بھی علم کا شائق مولانا کے دروازے پر آ جاتا کوشش کرتے کہ اس کا ہر ممکن تعاون فرمائیں، وقت میں کسی طرح بھی گنجائش نکل سکتی تو اس کو مایوس نہ فرماتے اور جیسے بھی ممکن ہوتا زیادہ سے زیادہ طلباء کو زیادہ سے زیادہ کتابیں

پڑھاتے، طالب علموں کیلئے وقت کی پابندی تو تھی مگر اپنے لئے آرام اور فراغت کے لمحات کی پابندی نہیں تھی، طالب علم فجر کی اذان سے مولانا کے کالج جانے تک بلکہ کالج کے راستے میں اور واپسی کے وقت بھی اور پھر اس وقت سے رات دیر گئے تک مولانا سے پڑھتے رہتے تھے، مولانا ہمیشہ بہت محبت اور خوش طبعی کے ساتھ پڑھاتے اور چاہتے تھے کہ کوئی طالب علم آزرده خاطر نہ ہو، کسی کو مجھ سے شکایت نہ ہو اور کسی کا علمی نقصان اور اسکے تعلیمی سفر میں خلل نہ ہو، اس کے لئے خود ہر طرح کی پریشانی اٹھاتے مگر طالب علموں کا پریشان ہونا گوارہ نہیں تھا۔ کریم الدین پانی پتی جو مولانا کا شاگرد اور کالج سے گھر تک مولانا کی مصروفیات اور معمولات کا چشم دید گواہ ہے، لکھتا ہے:

”انکے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں“ (۱)

ایک مرتبہ حضرت مولانا کے شاگرد مولانا رشید احمد گنگوہی خارش میں مبتلا ہوئے، مرض بڑھتا رہا مگر مولانا گنگوہی نے حضرت مولانا کے درس میں جانا نہیں چھوڑا، ایک روز مرض کی بہت شدت تھی مگر اس دن بھی سبق میں حاضر ہو گئے، حضرت مولانا نے فرمایا:

”میاں رشید احمد تمہارا تو وہ حال ہو گیا کہ بقول شخصے:

یک تن وخیل آرزو بہ چہ مدعا دہم  
تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم“ (۲)

طلباء کی تعلیم پر بھرپور توجہ اور ان کیلئے ہر وقت حاضر رہنے کے علاوہ حضرت مولانا کے کردار اور مزاج کا ایک اور پہلو بھی نہایت دلکش اور قابل عمل ہے۔ جو معلومات دستیاب ہیں ان سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مولانا کے اپنے دور کے ممتاز مشائخ اور اصحاب سلوک و طریقت سے کیا روابط تھے، کہاں حاضری کا معمول تھا، مولانا کس سلسلہ کے کون سے شیخ سے وابستہ تھے اور راہ سلوک کا کس قدر سفر کس راستہ اور ترتیب سے طے فرمایا تھا، مگر قرین قیاس ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز یا حضرت سید احمد

(۱) تذکرہ فرائد الدہر ص ۴۰۳ (دہلی ۱۹۹۲ء)

(۲) تذکرۃ الرشید ص ۶۶ ج ۲

شہید کے گرفتہ دامن ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دہلی یا اپنے نواح کے علماء اور مشائخ میں سے کسی سے استفادہ کیا ہو، لیکن ان تفصیلات سے قطع نظر مولانا اپنے بعض خدادوست نیاز مندوں اور شاگردوں سے قدر و منزلت اور احترام پذیرائی کا جو معاملہ فرماتے تھے اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کے دل میں اللہ والوں اور دین کے مخلص سچے خادموں کی بے پناہ وقعت تھی، اگرچہ ان میں سے بعض عمر میں، صلاحیت میں، علم و مرتبہ میں حضرت مولانا سے بہت چھوٹے اور چند ایک مولانا کے حلقہٴ درس کے حاضر اور طالب علم تھے اس کے باوجود مولانا ان کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور ان کی بے نفسی پر کیسے فریفتہ تھے، ان چھوٹوں کی انہیں صفات اور کمالات کی وجہ سے ان سے وہ معاملہ کرتے تھے جو اپنے بڑوں اور بزرگوں سے کیا جاتا ہے، ان کو یوں نوازتے جیسے وہ مولانا کے بڑے اور مرشد و مخدوم ہوں۔ اس جلالت شان، عظمت و احترام خصوصاً علمی مرتبہ و وقار کے باوجود اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کو احترام سے نوازنا اپنے آپ میں خود ایک غیر معمولی بات، خود شکنی و بے نفسی کا اعلیٰ ترین نمونہ اور دل میں دین و شریعت کے بے پناہ احترام کا مظہر ہے۔

یہاں مولانا کے تین صاحبان سے روابط و معاملہ کا ذکر کیا جاتا ہے جو تینوں ہی علم و عمر اور مرتبہ کمال میں مولانا سے بہت چھوٹے تھے لیکن مولانا ان سے غیر معمولی بلکہ ایسا رابطہ رکھتے تھے جیسا اپنے ہم عمروں بلکہ اپنے سے ممتاز اصحاب سے کیا جاتا ہے۔ اس مختصر فہرست میں حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر کی اور مولانا کے ایک شاگرد مولانا محمد حسن رامپوری سے روابط کی خاص شان تھی، ملاحظہ ہو۔

حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی طالب علم کی حیثیت سے دہلی گئے تھے، جب مولانا دہلی پہنچے ہونگے اس وقت حضرت مولانا مملوک العلی دہلی کے بڑے علماء اور اہل درس میں گئے جاتے ہونگے، یہی وہ دور ہے جس میں دہلی کالج قائم ہوا اور مولانا مملوک العلی اس کے مدرس دوم مقرر کئے گئے، مولانا مملوک العلی کے سامنے ہی مولانا مظفر حسین کی طالب علمی کا اختتام ہوا ہوگا اور چونکہ مولانا مملوک العلی حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی

کے شاگرد تھے اس لئے مولانا مظفر حسین کے والد ماجد اور دوسرے اعزاء نیز خانوادہ کے تمام ہی افراد سے قریبی مراسم رکھتے ہوئے اور مولانا مملوک العلی مولانا مظفر حسین سے بھی ان کی نوعمری سے واقف ہوئے، لیکن اس سب کے باوجود مولانا مملوک العلی، مولانا مظفر حسین کا اس طرح احترام کرتے تھے جیسے اپنے بزرگوں کا کیا جاتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے (حالات طیب مولانا محمد قاسم میں) مولانا مظفر حسین صاحب کا بلند الفاظ میں تذکرہ کیا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب کا یہ تاثر دراصل حضرت مولانا مملوک العلی کے خیالات کا پرتو ہے، مولانا مملوک العلی مولانا کاندھلوی کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ:

”مولانا مظفر حسین نے کہہ رکھا تھا کہ دہلی سے آتے اور جاتے ہوئے

کاندھلہ میں مل کر جایا کرو“ (۱)

مولانا مملوک العلی نے ہمیشہ اس کی پاسداری کی، جب کاندھلہ سے گذرتے یہاں ٹھہر کر ملاقات کر کے جاتے، واپسی کے لئے بھی یہی ضابطہ تھا۔

مولانا مظفر حسین صاحب نے اتباع سنت اور نکاح بیوگان وغیرہ کی جو تحریک شروع کی تھی حضرت مولانا مملوک العلی نے اس کی بھی تائید فرمائی اور مولانا مظفر حسین کے طریقہ پر کام کرتے رہے، مولانا محمد یعقوب صاحب نے لکھا ہے کہ:

”بیواؤں کے نکاح کی بناء ان اطراف میں اول ان (مولانا مظفر حسین)

سے ہوئی اور والد مرحوم نے اس کو نہایت خوبصورتی سے اجراء فرمایا، ان دونوں

بزرگوں کے قدم بہ قدم حضرت مولانا (محمد قاسم) نے اس کو پورا شائع کیا“ (۲)

حضرت حاجی صاحب حضرت مولانا مملوک العلی سے عمر میں بہت (تقریباً تیس

سال) چھوٹے تھے مگر مولانا مملوک العلی کا ان سے بھی یہی رابطہ تھا، یہاں تک کہ جب

حاجی صاحب (جو اس وقت نوعمر تھے) دہلی آجاتے تو مولانا مملوک العلی کی درسی

(۱) حسن العزیز، ص: ۴۹۰ جلد اول (تھانہ بھون)

(۲) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۱۹۱ (کاندھلہ ۱۳۲۱ھ)

مصروفیات بھی کم ہو جاتیں اور مولانا شاگردوں سے فرما دیتے کہ اب حاجی صاحب آگئے، سبق پھر ہوگا اور وطن سے آتے جاتے وقت مولانا مظفر حسین صاحب سے ملاقات کا جو معمول تھا اس کا تھانہ بھون میں بھی اعادہ ہوتا تھا۔

تیسرے شخص جو مولانا کے شاگرد اور مولانا کے ہر طرح سے نیاز مند تھے، مولانا ان سے بھی بزرگوں جیسا معاملہ کرتے اور ان کا بے حد احترام فرماتے تھے، یہ مولانا محمد حسن انصاری راپوری تھے۔ وطن میں ابتدائی تعلیم کے بعد دہلی گئے تھے، دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے، مولانا سے پڑھتے تھے کہ مولانا کو ان کے کمالات کا اندازہ ہو گیا اور مولف تذکرۃ العابدین کے الفاظ میں:

”مولانا مملوک العلی صاحب کمال معتقد مولوی محمد حسن کے ہو گئے اور بہت

ادب کرنے لگے“ (۱)

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب حضرت مولانا کا اپنے شاگردوں، نیاز مندوں کے ساتھ احترام اور پزیرائی کا یہ معاملہ تھا تو اپنے بڑوں اور بزرگوں پر کس قدر نثار ہوتے ہوئے اور ان کے انفاس عالیہ اور صحبت کو کس طرح کس درجہ عزیز رکھتے ہوئے اور ان کے لئے کس درجہ کے احترام کے جذبات مولانا کے دل میں موجزن رہتے ہوئے۔

مولانا کی مصروفیات اگرچہ بہت زیادہ تھیں مگر ان مصروفیات میں اور مشاغل کے لئے بھی وقت نکال لیا کرتے تھے، دوست احباب سے ملاقاتیں، دہلی کی دینی علمی ادبی محفلوں میں شرکت، عوام کی پزیرائی اور ان کے مزاج اور صلاحیت کے مطابق معاملہ بھی مولانا کے مصروف نظام کا ایک حصہ تھا۔

جو عام لوگ مولانا کے پاس آتے مولانا ان کی پزیرائی فرماتے، ان کیلئے کچھ وقت فارغ کرتے اور ان کی خوش دلی کے لئے ان کی فرمائش بھی قبول کرتے، ان کے ہدیہ کو قبول کرتے اور ان کے لائے ہوئے تحفہ کو وہ کیسا ہی کم قیمت اور سادہ کیوں نہ ہو بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ حضرت مولانا تھانوی نے مولانا کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے

(۱) تذکرۃ العابدین، حاجی محمد زبیر احمد، ص: ۵۴ (دہلی ۱۳۳۳ھ)

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اگرچہ عمدہ لباس پہنتے تھے اور آسودہ حال میں رہتے تھے لیکن معمولی لباس اور کم قیمت کپڑا پہننے میں بھی کوئی تکلف اور عار نہیں تھا، نہ قیمتی لباس سے فخر اور اپنی بڑائی کا خیال ہوتا نہ معمولی لباس میں پریشانی محسوس کرتے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عام لوگوں اور غریب غرباء کی دل جوئی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس خیال سے کہ اس غریب کی دل شکنی نہ ہو ان کے لائے ہوئے معمولی ہدیہ، کپڑا لباس وغیرہ کی بہت قدر کرتے اور اہتمام سے اس کو استعمال کرتے تھے، اور اس کو پہنے ہوئے بلا تامل عوامی مجموعوں میں چلے جاتے، نہ کبھی اس کا خیال فرماتے کہ لباس عمدہ اور بیش قیمت نہیں اور نہ یہ سوچتے کہ دیکھنے والے کیا کہیں گے، یہ کیفیت ظاہر اور باطن کی یکسانیت، تام جھام اور ظاہری رکھ رکھاؤ سے بے تعلق اور دل میں ان کی وقعت نہ ہونے کی بڑی دلیل ہے۔ حضرت مولانا کا ذکر کرتے ہوئے ایک مرتبہ مولانا تھانوی نے فرمایا:

” (مولانا مملوک العلی صاحب) خوش لباس تھے، انہیں حکام سے ملنا ہوتا تھا، ایک شخص نے ان کو دھوتر کا کرتہ دیا، اس کو آپ جمعہ کے دن پہن کر نماز پڑھیں، چنانچہ انہوں نے جمعہ کے دن اس کو پہنا، سارے کپڑے تو قیمتی تھے، پانچامہ سرکا، دوپٹہ تو بڑھیا اور کرتہ دھوتر کا، اسی طرح جامع مسجد تشریف لے جا کر نماز پڑھی، لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ وہ خوش ہوگا۔ ہمارے حضرت ہدیہ یہ سمجھ کر کھاتے تھے کہ اس کی دلجوئی ہوگی“ (۱)

اگرچہ مولانا کی عام زندگی اور اخلاق و معاملات کے تفصیلی اشارے مفقود ہیں مگر انہیں چند واقعات سے اس کا خاصا اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا اخلاق و اخلاص کے کس درجہ پر فائز تھے۔

نیز مولانا ایک خشک مزاج مدرس نہیں تھے بلکہ شعر و ادب کے ذوق میں منفرد، شگفتہ بیان اور با ذوق عالم تھے۔ اس ذوق کی وجہ سے کبھی کبھی منتخب ادبی نشستوں اور مشاعرہ کی محفلوں میں بھی شرکت کر لیا کرتے تھے، اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے مگر فرحت اللہ بیگ کے

(۱) قصص الاکابر ماہ نامہ الہادی، ص: ۳۲ (شعبان سنہ ۱۳۵۶ھ)

الفاظ میں:

”مگر سمجھتے ایسا تھے کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا، گویا اس کو دوام کی سند دینا ہے۔“ (۱)  
 اگرچہ مولانا نہایت باوقار، کم گو اور حلیم و بردبار شخص تھے لیکن ایسی محفلوں میں جہاں  
 مجمع احباب اور خوش ذوق اصحاب کا جمگھٹا ہو کھل جاتے اور رعنائی محفل کے لئے چٹکوں  
 لطیفوں میں حصہ لیتے، بعض خاص شاعروں کے ساتھ فقرہ بازی کرتے اور دلچسپ سوالات  
 و جوابات سے رنگ محفل کو نکھار دیتے تھے، فرحت اللہ بیگ نے دہلی کے ایک مشاعرہ کی  
 مجلس سجائی ہے اس میں کئی جگہ مولانا مملوک العلی کا بھی ذکر آیا ہے۔

وہ مشاعرہ اس عہد کی ادبی زندگی کی ایک دلکش تصویر ہے، جس کے شرکاء میں ایک اہم  
 شخصیت حضرت مولانا مملوک العلی کی بھی تھی، اس مشاعرہ میں مولانا مملوک العلی سے جو  
 کلمات اور فقرے منسوب کئے گئے ہیں اگرچہ ان کو عین حقیقت سمجھنا درست نہ ہوگا مگر اس  
 سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا کیسے خوش فکر، سادہ مزاج اور باذوق تھے، اپنے دوستوں  
 اور ساتھیوں کی محفل میں کس طرح بے تکلف رہتے اور کیسے لطف اور خوش مزاجی کا معاملہ  
 فرماتے تھے اور مولانا کے واقف اور اس دور کے اہل علم و باذوق اصحاب مولانا کے کیسے  
 واقعات و احوال سنایا کرتے تھے۔

فرحت اللہ بیگ نے ایک موقع پر مولانا کی چھیڑ چھاڑ کا ایک دلچسپ قصہ نقل کیا  
 ہے۔ کہتے ہیں کہ دہلی کے ایک پرانے شاعر تھے جن کو میر صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا  
 تھا، یہ میر صاحب دماغ کے ڈھیلے سے تھے شاید اسی وجہ سے دلی کی محفلوں کی رونق سمجھے  
 جاتے تھے، دلی کا ہر ایک چھوٹا بڑا، عالم فاضل ہو یا عامی جاہل ان سے مذاق کرتا، یہ بھی ہر  
 ایک کا بلا فرق مراتب تڑ سے جواب دیتے، یہ جوابات اگرچہ ہمیشہ بے تکے اور معقولیت  
 سے خارج ہوتے مگر ان کے فقروں اور جوابات کی وجہ سے ہر ایک ان سے خواہ مخواہ الجھتا  
 تھا، یہاں تک کہ بادشاہ وقت بہادر شاہ ظفر اور مفتی صدر الدین آزرودہ نیز مولانا مملوک العلی  
 جیسے باوقار، شائستہ اور عالی مرتبت علماء بھی ان کو چھیڑتے اور ان کے فقروں اور بے تکی حاضر

(۱) دہلی کی آخری شمع، مرتبہ رشید حسن خاں ص: ۵۵ (دہلی ۱۹۹۲ء)

جوابی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ فرحت اللہ بیگ نے لکھا ہے کہ:

”چھوٹا ہو یا بڑا کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا اور یہ بھی تڑ سے وہ جواب دیتے کہ منہ پھر جاتے، ان کو اس سے غرض نہیں تھی کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں! مشاعرہ میں میاں تمکین سے بادشاہ سلامت تک ان کو چھیڑتے، انہوں نے نہ ان کا برا مانا نہ ان کا، جواب دینے میں نہ ان سے رکے نہ ان سے“ (۱)

میر صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ غزل کے نام سے فی البدیہہ نثر میں بولنا شروع کرتے تھے، بیچ بیچ میں دوسروں کے اعتراضات کا جواب بھی دیتے رہتے، جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف کہہ کر قافیہ لا کر شعر کو ختم کر دیا، اس معمول کے مطابق میر صاحب نے مشاعرہ میں بھی شعر پڑھے۔ جیسے ہی انہوں نے پڑھنا شروع کیا چاروں طرف سے ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہو گئی، بھلا یہ کب دبنے والے تھے، چونکھا لڑتے، جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آ کر کھڑے ہو جاتے، یہ کھڑے ہوئے اور کسی نے انکو بٹھا دیا، معترض کو ڈانٹا، ان کا دل بڑھایا، پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ فرحت اللہ بیگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

”اور تو اور مولانا مملوک العلی کو ان سے الجھنے میں مزا آتا تھا، یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سن لیتا، تو مدرسہ سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا“ (۲)

خیر اس محفل میں میر صاحب نے اپنے معمول کے مطابق ایک ’غزل‘ شروع کی، مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ انہوں نے کیا پڑھا، اس کا مضمون کیا تھا۔ انہوں نے ایک مصرع شروع کیا جو کسی طرح ختم ہونے میں نہ آ رہا تھا تو مولانا مملوک العلی صاحب نے کہہ دیا:

”اجی میر صاحب:..... یہ مصرع بحر طویل میں جا پڑا“

اسکے بعد کیا ہوا بات کہاں پہنچی اور اہل محفل نے جن میں غالب اور مولانا امام بخش صہبائی جیسے اساطین علم و فن بھی تھے، اس سے کس طرح لطف لیا اور اس میں کس کس طرح

(۱) و (۲) دہلی کی آخری شمع، مرتبہ رشید حسن خاں ص: ۸۵ (دہلی ۱۹۹۲ء)



شیرہ لگایا، اس کی تفصیل مرزا فرحت اللہ کے بہار آفریں کے قلم سے پڑھے:

”اب میر صاحب نے غزل شروع کی، کیا پڑھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بس اتنا تو معلوم ہوا کہ تیر، پیر، کھیر، قافیہ ہے اور ردیف ہے۔ اس کے علاوہ میں تو کیا خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ انہوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا اور تعریفیں شروع ہوئیں، کسی نے ایک آدھا اعتراض بھی جڑ دیا، اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے، ان کے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا، اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجئے۔

غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعے کو کھینچنا شروع کیا تو اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا، مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا:

”اجی میر صاحب یہ مصرع بحر طویل میں جا پڑا“

میر صاحب نے کہا: ”مولوی صاحب کبھی بحر طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سنی سنائی باتوں پر اعتراض ٹھوک دیا۔ پہلے مطوّل پڑھے مطوّل، جب معلوم ہوگا کہ بحر طویل کس کو کہتے ہیں۔“

مولوی صاحب بڑے چکرائے اور کہنے لگے: ”میر صاحب! بھلا مطوّل کو بحر طویل سے کیا واسطہ؟ مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ! آپکا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں۔“

میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی، مولانا صہبائی کی طرف دیکھا، انہوں نے کہا کہ مولوی صاحب!

”مطوّل میں بحر طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے؟ آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔“

”بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے، کہنے لگے: جی ہاں مولوی صاحب! آپ سمجھتے ہو گئے کہ آپکے سوا کسی نے مطوّل پڑھی ہی نہیں۔ اجی حضرت! میں تو روزانہ اس کے دو دور کرتا ہوں۔ کل ہی اس کی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا، لکھتے لکھتے تھک گیا ایک مصرع کوئی پونے دو سو صفحہ میں لکھا، وہ تو کہو بیاض کے صفحے ہی ختم ہو گئے جو مصرع ختم ہوا، ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔“

مرزا نوشہ نے کہا: میر صاحب آپ سچ فرماتے ہیں ہمارے مولوی صاحب نے بحر طویل کہاں دیکھی، مجھ سے پوچھو میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو؟ اس نے ایک کتاب بوستان خیال لکھی ہے، یہ بڑی اور یہ موٹی بارہ جلدیں ہیں، بحر طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحر طویل میں نہیں رباعی کی بحر میں ہے۔ میر صاحب نے بڑے زور سے ”ہیں“ کی اور بگڑ کر کہا: واہ مرزا صاحب! سیدھے چلتے چلتے آپ بھی بھٹک گئے۔ رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں؟ بھلا بتائیے تو سہی کون سی کتاب میں ہیں؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! از بعین پڑھئے جب معلوم ہوگا کہ رباعی کی بحریں کون کون سی ہیں۔

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گذر گیا، ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے، آنکھوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آ کر بیٹھے ہیں۔ (۱) اس روداد سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا مملوک العلی اور ان کے عہد کے اکابر کے باہمی تعلقات کیسے شگفتہ تھے اور وہ آپس میں کس قدر بے تکلف گھلے ملے اور دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اس ذوق، صفت انکسار اور محبت کی چاشنی سے محروم ہیں۔

(۱) دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، مرتبہ رشید حسن خاں، ص: ۸۶-۸۷ (دہلی ۱۹۹۲ء)

## باب (۱۲)

سفر حج، اس کا صحیح سنہ اور ضمناً حضرت شاہ محمد اسحاق کے  
سفر ہجرت کے سنہ کی تعیین

حضرت مولانا دہلی کالج کی ملازمت کے زمانہ میں شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کے بعد حج کے لئے حاضر ہوئے تھے، مولانا مملوک العلی کے اس سفر کی تفصیل دریافت نہیں، جو معلومات ملیں، وہ درج ذیل ہیں:

حضرت شاہ محمد اسحاق حضرت شاہ عبدالعزیز کے جانشین اور صدر بزم علماء تھے اور ایک خاص شانِ محبوبیت رکھتے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز سے نسبت اور اپنے علمی عملی کمالات اور بے نظیر اخلاق و معاملات کی وجہ سے پورے ہندوستان خصوصاً دہلی اور اطراف کے بڑے چھوٹے سب علماء کا مرجع اور ان کی تمناؤں کا مرکز تھے۔

حضرت شاہ محمد اسحاق، حضرت شاہ عبدالعزیز اور خانوادہ ولی اللہی کے اکثر علماء کے نقطہ نظر کے مطابق ہندوستان کو انگریزوں اور مرہٹوں وغیرہ کے تسلط کی وجہ سے دارالہرب سمجھتے تھے، اسی وجہ سے شاہ محمد اسحاق اور ان کے بھائی حضرت شاہ محمد یعقوب نے ہندوستان سے ہجرت کا ارادہ کر لیا، اور ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ (دسمبر ۱۸۴۲ء) میں دہلی سے سفر ہجرت پر روانہ ہو گئے تھے۔ شاہ صاحب کے سفر کے بعد مولانا مملوک العلی نے بھی حج و زیارت کا ارادہ کیا اور اس سفر سے ایک سال کے بعد رجب میں واپس ہوئے۔ مولانا محمد یعقوب نے حالات مولانا محمد قاسم کے حاشیہ پر شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت اور مولانا مملوک العلی کے سفر کا مختصر ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”۱۲۵۷ھ بارہ سو ستاون ہجری میں حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب اور جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی دونوں نواسے اور جانشین مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے تھے اچانک ارادہ ہجرت کیا، ذی قعدہ میں شاید روانہ ہو گئے، دہلی میں اندھیرا ہو گیا“ (۱)

لیکن اس اطلاع کی اہمیت کے باوجود مذکورہ اقتباس میں مذکور سنین صحیح نہیں۔

شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کا صحیح سنہ | واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کے سنہ کی تعیین میں

مورخین اور تذکرہ نگاروں کو سخت مغالطہ ہوا ہے، جن میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی بھی شامل ہیں، سرسید احمد کی تحریر سے شاہ محمد اسحاق کا سن ہجرت ۱۲۵۶ھ (۱۸۳۹ء) معلوم ہوتا ہے (۲) اکثر مورخین اور تذکرہ نگاروں نے یہی نقل کر دیا ہے، حالاں کہ یہ بھی غلط ہے، اکثر علمائے دیوبند کے تذکروں میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تحریر پر اعتماد کرتے ہوئے ۱۲۵۹ھ لکھا گیا (۳) مگر یہ بھی صحیح نہیں۔

درست یہ ہے کہ حضرت شاہ محمد اسحاق ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ میں دہلی سے روانہ ہوئے تھے، مولانا نواب قطب الدین دہلوی نے جو (حضرت شاہ صاحب کے خاص شاگرد تھے اور دہلی میں ہر وقت شاہ صاحب کی خدمت میں حانمہ رہتے تھے اور اس سفر کے وقت شاہ صاحب کو رخصت کرنے والوں میں شامل تھے) احکام العیدین کی تمہید میں شاہ صاحب کے سفر ہجرت کا ذکر کیا ہے اور اس موقع پر شعراء نے جو قطعات تاریخ لکھے تھے ان میں سے دو قطعات بھی نقل کئے ہیں، جس سے شاہ محمد اسحاق کے سفر ہجرت کا صحیح سنہ صاف معلوم ہو رہا ہے۔

میر ظہور علی دہلوی نے (جو مولانا مفتی صدر الدین آزر دہ کے شاگرد تھے) تاریخ کہی جس میں سنہ ہجرت صاف الفاظ میں نظم ہوا ہے اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ جو یہ ہے:

(۱) حالات طیب مولانا محمد قاسم ص: ۶، ۷ (طبع اول بھاو پور: ۱۲۹۷ھ)

(۲) آثار الصنادید سرسید احمد باب چہارم ص: ۵۹ (لکھنؤ: ۱۳۱۸)

(۳) مثلاً تذکرۃ الرشید ج: ۱ ص: ۲۷ و سوانح قاسمی ص: ۲۱۲ ج: ۱، وغیرہ

مولوی اسحاق صاحب باکمال  
سال تاریخش چنیں گفتہ ظہور  
ترک خانہ کردہ سوئے کعبہ رفت  
یک ہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت (۱)

خواجہ احسن اللہ کا قطعہ تاریخ پانچ شعروں پر مشتمل ہے، جو اس طرح ہے:

مولوی اسحاق صاحب فخر دین  
درس فرماتے ہفتے میں دو بار  
عالم و جاہل سبھی چھوٹے بڑے  
کر گئے ہجرت مع اہل و عیال  
سچ تو یوں ہے جو کہ احسن نے کہا  
تھا منور شہر جن کے نام سے  
فہم سے، ادراک سے، الہام سے  
بہرہ ور تھے ان کے فیض عام سے  
سوئے کعبہ شوق کے احرام سے  
شہر خالی ہو گیا اسلام سے (۲)

تیسرا قطعہ فارسی میں ہے جو تاریخ مومن خاں مومن کا ہے، مومن اس خاندان کے  
دامن گرفتہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق کی خدمت کے حاضر باش تھے، مومن نے کہا ہے:

### تاریخ مولوی اسحاق

آں مبنی دین و جان اسلام  
از کشور ہند رخت بر بست  
اندیشہ سال ہجرت او  
ہم چشم مقرر بان حق ہیں  
فرمود وحید عصر اسحاق  
بگذاشتہ دارِ حرب امسال  
عرفان مصور و مجسم  
بیزار از کافرانِ ظلم  
بر چرخ مہاجر و مکرم  
ہمراز فرشتگان محرم  
بر حکم شہنشاہ دو عالم  
جا کردہ بمکہ معظم (۳)

لیکن اس فقرہ تاریخ کے اعداد کی صحیح ترتیب معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس کے صحیح اعداد کی  
تعیین میں مغالطہ ہوا ہے، مولوی بشیر الدین احمد دہلوی نے جو اعداد شمار کرائے ہیں وہ صحیح

(۱) و (۲) احکام العیدین مولانا نواب قطب الدین دہلوی ص: ۲ (مطبع نول کشور لکھنؤ: ۱۲۹۰ھ)

(۳) دیوان فارسی۔ مومن، ص: ۱۳۱ (مطبع اول دہلی ۱۲۷۱ھ)

نہیں۔ (۱) صحیح استخراج یہ ہے کہ وحید عصر اسحاق کے اعداد (۵۵۸) ہوتے ہیں اور مکہ معظمہ کے ۱۱۱۵، دونوں کا مجموعہ ۱۶۷۳ ہے، اس مجموعہ کے اعداد میں دارحرب کے ۴۱۵ عدد نکال دیں تو صرف بارہ سواٹھاون ۱۲۵۸ عدد باقی رہتے ہیں (۲) یہی شاہ صاحب کا سنہ ہجرت ہے جیسا کہ میر ظہور علی اور خواجہ احسن اللہ کے قطعات تاریخ سے بھی معلوم ہو رہا ہے۔ بہر حال حضرت شاہ محمد اسحاق ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ (دسمبر ۱۸۴۲ء) میں دہلی سے رخصت ہوئے تھے اسی وقت سے مولانا مملوک العلی حجاز حاضری کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ آہستہ آہستہ سامان سفر اور زادراہ کا انتظام کرتے رہے، جب اس طرف سے کچھ اطمینان ہو گیا تو کالج میں رخصت کی درخواست دی، رخصت منظور ہو گئی اور کالج کی انتظامیہ نے پورے سال کی تنخواہ دینے کا فیصلہ کیا جس میں چھ مہینہ کی تنخواہ کالج کے ضابطہ کے مطابق تھی، مزید چھ مہینے کی تنخواہ مولانا کی قدردانی، خدمات کے اعتراف اور عزت افزائی کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ حضرت مولانا سب کاموں سے فارغ ہو کر رجب ۱۲۵۹ھ میں دہلی سے چلے، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (جو حضرت شاہ محمد اسحاق کے خاص شاگرد تھے اور شاہ صاحب سے حدیث شریف کی تکمیل کیلئے شاہ صاحب کی خدمت میں مکہ معظمہ میں حاضر ہونا چاہتے تھے) اس سفر میں مولانا مملوک العلی کے ساتھ تھے۔ مولانا احمد علی نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے:

”یادداشت سفر حج واقعہ بتاریخ بست و ششم رجب ۱۲۵۹ھ از مقام دہلی“ (۳)

یعنی مولانا مملوک العلی اور مولانا احمد علی ۲۶ رجب ۱۲۵۹ھ (۲۲ دسمبر ۱۸۴۳ء) کو دہلی سے چلے تھے، مولانا مملوک العلی کی ایک سال کے بعد رجب ۱۲۶۰ھ (جولائی، اگست ۱۸۴۴ء) میں دہلی واپسی ہوئی، اس وقت کالج سے ایک سال کی رخصت کا وقت ختم ہو رہا تھا اسلئے مولانا دہلی آ کر کالج کی ملازمت پر حاضر ہو گئے تھے گھر نہیں گئے، جب کالج

(۱) ملاحظہ ہو واقعات دارالحکومت دہلی ص: ۲۲۸ جلد دوم (آگرہ: ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء)

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے حیات شاہ محمد اسحاق حکیم محمود احمد برکاتی ص: ۷۴ (دہلی: ۱۳۱۲ھ ۱۹۹۲ء)

(۳) یہ بیاض حضرت مولانا احمد علی کے سفر حج اور شاہ محمد اسحاق سے مکہ مکرمہ میں درس حدیث کے زمانے میں مولانا کے ساتھ تھی۔

کی سالانہ چھٹی ہوئی اس وقت گھر گئے، یہی مولانا محمد یعقوب نے بھی لکھا ہے، تحریر ہے:

”۱۲۵۷ھ بارہ سو ستاون ہجری میں حضرت جناب مولانا محمد اسحاق صاحب اور

جناب مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی دونوں نواسے اور جانشین مولانا شاہ عبدالعزیز

رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، اچانک ارادہ ہجرت کا کیا، ذی قعدہ میں شاید روانہ ہو گئے، دہلی

میں اندھیرا ہو گیا اور آپ صاحبوں کے ساتھ ایک بہت بڑا قافلہ عرب کو روانہ ہوا تھا۔

یہ دیکھ کر حضرت والد مرحوم کو بھی دھیان حج ہوا، خفیہ تدبیر رخصت اور سامان سفر کی

کرتے رہے، آخر جب رخصت ایک سال کی مل گئی اور سرکار نے براہِ قدردانی آدھی

تنخواہ بھی دی، رجب ۱۲۵۸ھ میں وطن سے روانہ ہوئے اور اول ذی الحجہ مکہ پہنچے،

زیارت حرمین سے فارغ ہو کر برس دن میں پھر دہلی پہنچے۔ اس وقت یہ سفر جلد طے

ہونے میں عجیب سمجھا، رخصت کے دن پورے ہو چکے تھے وطن نہ آسکے، ذی الحجہ میں

جب چھٹی سالانہ ہوئی وطن تشریف لائے اور مولوی صاحب کو دہلی ساتھ لے گئے۔ (۱)

حضرت مولانا کا یہی پہلا اور آخری سفر حج تھا اس کے علاوہ حضرت مولانا کے کسی

اور سفر حج کا تذکرہ نہیں ملتا۔

(۱) حالات طیب مولانا محمد قاسم (نانوتوی) (طبع اول بھادپور: ۱۲۹۷ھ) حاشیہ نمبر ۶ نیز مشمولہ قاسم العلوم حضرت

مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۲۳۳-۲۳۵

## باب (۱۳)

### مولانا مملوک العلی کی تصانیف، مؤلفات حاشیے اور ترجمے

حضرت مولانا مملوک العلی کے علمی تحریری آثار خصوصاً تصانیف و مؤلفات بہت ہی کم ہیں، شب و روز کی درسی مصروفیات اور طلبہ سے ہر وقت گھرے رہنے کی وجہ سے حضرت مولانا کو اس کا وقت اور فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ تصنیف و تالیف پر توجہ فرمائیں۔ مولانا کی درسی مصروفیات کا کیا حال تھا اور ایک نئے سبق کیلئے بھی وقت نکال لینا کس قدر مشکل تھا اس کا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی ایک روایت اور مولانا گنگوہی کے زمانہ طالب علمی کے ایک واقعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ مولانا نے فرمایا:

جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحب دہلی میں استاد رحمہ اللہ سے پڑھتے تھے ہمارا ارادہ سلم شروع کرنے کا ہوا، لیکن مولانا کو فرصت نہ تھی اس لئے انکار فرماتے تھے، بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت ہفتہ میں دو بار صرف پیر اور جمعرات (یا جمعہ) کو پڑھا دیا کیجئے، خیر یہ منظور ہو گیا اور ہفتہ میں دو سبق ہونے لگے، تو اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی“ (۱)

تصنیف و تالیف پر توجہ نہ کرنے کی وجہ | ایسی بے پناہ مصروفیات میں جب ہفتہ میں صرف ایک سبق کیلئے بھی

وقت نکالنا مشکل ہو، تصنیف و تالیف کیلئے گنجائش نکال لینا نہایت دشوار تھا اور یہ بھی معلوم ہے کہ مولانا مملوک العلی کی تدریسی مصروفیات کا زندگی کے آخری دنوں تک یہی حال رہا۔ دہلی کالج کے معمولات و مصروفیات اور گھر پر درس و تعلیم کے شبانہ روز حلقوں کی بھی ویسی ہی

(۱) تذکرۃ الرشید مولانا عاشق الہی میرٹھی ص: ۳۱ ج: ۱ (سہارنپور: ۱۹۷۷ء)



کیفیت رہی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا ہوگا، کیوں کہ مولانا کسی طالب علم کو مایوس کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ کریم الدین پانی پتی کا قول ہے: ”تمام عمر میں باوجود اس کثرت علم اور فضل کے وعظ عام نہیں کیا اور تصانیف کتب پر مائل نہیں ہوئے۔ باعث اس کا یہی ہے کہ چوں کہ ان کی خدمت میں صدہا طالب علم اطراف و جوانب سے واسطے تعلیم پانے علوم کی حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں، پھر اس صورت میں فرصت واسطے تصانیف کے ہونی معلوم۔ لہذا اپنا ہرج گوارا کیا، دل شکنی کسی کی منظور نہ کی، مگر ہاں ایک کتاب تحریر اقلیدس کا جو عربی زبان میں تھی بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی کے ۱۸۴۴ء میں ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے ہر ایک شکل کو حل کیا ہے“ (۱)

### حضرت مولانا کی تحریری تصنیفی خدمات، مؤلفات اور ترجمے

درج بالا اقتباسات سے واضح ہے کہ مولانا مملوک العلی کو تصنیف و تالیف پر توجہ کا بہت کم موقع ملا، مگر کریم الدین کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ مولانا نے صرف ایک کتاب ترجمہ تحریر اقلیدس لکھی تھی، بلکہ مولانا نے اس کے علاوہ بھی چند کتابوں کی تحقیق، تصحیح، ترجمہ یا تدوین و انتخاب کی خدمت انجام دی ہے، اس وقت تک مولانا کی چھ تالیفات و تراجم کا علم ہوا ہے، جو تین موضوعات پر مشتمل ہیں:

- |                              |                                     |
|------------------------------|-------------------------------------|
| (۱) تصحیح سنن ترمذی          | (۲) اردو ترجمہ سنن ترمذی            |
| (۳) تصحیح و حواشی تاریخ یمنی | (۴) کتاب المختار فی الاخبار والآثار |
| (۵) ترجمہ اردو تحریر اقلیدس  | (۶) نتیجہ تحریر                     |

اس میں پہلی دوسری کتاب خدمت حدیث شریف کی ہے، تیسری چوتھی ادب اور تاریخ کی، پانچویں چھٹی ریاضی کی، مذکورہ کتابوں کا آئندہ صفحات میں اسی ترتیب سے تعارف درج ہے، ان کے علاوہ عربی اور اردو کے چند خطوط بھی معلوم ہیں، ان کا ذکر علیحدہ کیا جائیگا۔

(۱) تذکرہ، فرائد الدھر ص: ۴۰۲، ۴۰۳ (مطبع العلوم دہلی: ۱۸۴۷ء)

## سنن ترمذی کی تصحیح اور مقابلہ میں مولانا احمد علی کی رفاقت

ہندوستان میں حضرت شیخ عبدالحق محدث اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی محنت، حسن توجہ اور برکت سے درس حدیث کا بفضلہ تعالیٰ بہت بلند پیمانہ پر احیاء ہو گیا تھا اور خدمت حدیث کی ہوائیں چل رہی تھیں، مگر وہ دور کتابوں کی طباعت و اشاعت کا نہیں تھا، اس وقت کتابوں کی نقل کا رواج تھا طلبہ اور شاگردوں نے اساتذہ کرام کی خدمت میں جو کتاب پڑھی اس کی پڑھنے کے ساتھ ساتھ تصحیح ہو گئی، اور دوسرے علمائے کرام کے افادات اور حاشیے اپنی کتاب پر یا علیحدہ نقل کئے جاتے تھے، وہ نقلیں عام کتابوں اور کتابوں کی خرید و فروخت کا کام کرنے والوں کے پاس جاتی تھیں اور ان میں سے کچھ ہاتھوں ہاتھ پھیل جاتی تھیں اور بعض کی مانگ محدود ہوتی تھی، جس کی وجہ سے وہ افادات حواشی اور محنت عموماً کم یاب اور کبھی کبھی ضائع بھی ہو جاتی تھی۔ اسلئے دوبارہ پھر انہیں کتابوں پر اسی قدر محنت کی ضرورت ہوتی تھی اور یہ سلسلہ مدت سے جاری تھا۔

جب ہندوستان میں پریس آیا اور کتابوں کی طباعت کے کام کا آغاز ہوا اس وقت (راقم سطور کی معلومات میں) سب سے پہلے حضرت شاہ محمد اسحاق نے حدیث کی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام و انصرام فرمایا۔ سب سے پہلے جو کتاب حضرت شاہ صاحب کے افادات سے چھپی، وہ سنن نسائی تھی جو ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں مطبع سلطانی قلعہ معلیٰ دہلی سے چھپ کر آئی تھی۔ (۱) اسی سال ۱۲۵۸ھ میں حضرت شاہ صاحب نے ہندوستان سے ہجرت فرمائی، حضرت شاہ صاحب کی ہجرت کے بعد شاہ صاحب کے ایک مستعد اور خاص شاگرد مولانا احمد علی سہارنپوری بھی شاہ صاحب کی خدمت میں مکہ معظمہ حاضر ہو گئے، مولانا نے تقریباً ڈیڑھ سال حضرت کی خدمت میں حاضر رہ کر حدیث شریف کی کتابیں پڑھیں اور وہاں سے خدمت حدیث کا وہی جذبہ لے کر ہندوستان واپس آئے جو خاندان حضرت

(۱) اس نادر ترین اشاعت کا ایک عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرہ کتب میں موجود ہے، جس کی ایک خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ یہ نسخہ حضرت شاہ محمد اسحاق اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے درس میں پڑھا گیا ہے اور اس پر دونوں حضرات کی چند تصحیحات اور افادات بھی درج ہیں۔ فللہ الحمد

شاہ ولی اللہ کا طغرائے امتیاز تھا۔

مولانا احمد علی نے ہندوستان پہنچ کر سب سے پہلے حضرت شاہ محمد اسحاق کے شروع کئے ہوئے کام کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا اور حدیث پاک کی اہم ترین بنیادی کتابوں کو دقت نظر کے ساتھ صحیح و درست کر کے ان پر ضروری اور جامع حاشیہ لکھ کر، ان کی طباعت و اشاعت کا سرو سامان کیا۔

حضرت مولانا احمد علی نے سب سے پہلے جن کتابوں پر توجہ فرمائی وہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن ترمذی تھیں، مولانا احمد علی نے ان کی تصحیح اور حاشیے لکھنے میں کئی کئی سال محنت کی اور بار بار مقابلہ اور نظر ثانی کے بعد ان کو اشاعت کیلئے تیار کیا، ان کتابوں میں سے سب سے پہلے سنن ترمذی شائع ہوئی۔ حدیث کی بنیادی کتابوں کی تصحیح و حواشی لکھنے کا کام نہایت نازک، بہت بڑا اور سخت محنت طلب تھا، جس کو مولانا احمد علی نے بدرجہ کمال پورا کیا، اور حضرت مولانا نے ان کتابوں کے متون، حواشی کی تصحیح اور نظر ثانی کو مزید بہتر اور پوری طرح قابل اطمینان بنانے کیلئے چند ممتاز ترین علماء اور ایسے جید فاضلوں کا انتخاب کیا جن کی علمی نظر اور قابلیت سے مولانا پوری طرح مطمئن تھے، پھر ان میں سے علیحدہ علیحدہ اصحاب سے الگ الگ کتابوں کی تصحیح مکرر اور نظر ثانی کا کام لیا۔

مولانا احمد علی کا اعتراف | اس نظام اور ترتیب کے مطابق سنن ترمذی کے مقابلہ اور تصحیح میں مولانا مملوک العلی مولانا احمد علی کے معاون اور رفیق رہے، مولانا مملوک العلی کے تعاون کا مولانا احمد علی نے اپنی شائع کی ہوئی سنن ترمذی کی سب سے پہلی اشاعت میں صاف اعتراف کیا، اور مولانا مملوک العلی کا اونچے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

”وانی مع قلة الدراية والبضاعة قد اجتهدت في تصحيحه وحل مطالبه بحسب الوسع والطاقة، ثم لاحظت ثانياً بالملاحظة التامة والمراجعة العامة الفاضل الاجل والحبر الا بجل العالم بالخفي والجلی مولانا محمد مملوک العلی“

ترجمہ: اور میں نے اپنی کم فہمی اور معمولی لیاقت کے باوجود اس کتاب (سنن ترمذی) کے درست کرنے اور اس کے مفہوم کو حل کرنے کی صلاحیت و طاقت کے مطابق پوری کوشش کی، پھر دوبارہ اس کو گہری نظر سے دیکھا، جو اعلیٰ درجہ کی نظر ثانی تھی (جس میں) اسکے حاشیوں اور مراجع کا بھرپور مقابلہ کیا گیا تھا، یہ خدمت فاضل اجل بحر علوم، ظاہر اور خفی (مشہور اور غیر مشہور) علوم کے جاننے والے مولانا مملوک العلی نے انجام دی ہے۔“

اس نسخہ کی پہلی طباعت | مولانا احمد علی نے اس نسخہ کی طباعت کا اہتمام کیا، اسکی طباعت صفر ۱۲۶۵ھ (جنوری ۱۸۴۹ء) میں مطبع العلوم میں شروع ہوئی تھی، اس اشاعت کے صفحہ اول (ٹائٹل) پر طباعت شروع ہونے کی تاریخ درج ہے، لکھا ہے:

”الحمد لله الذی وفقنا بشروع طبع کتاب الترمذی، فی مطبع

العلوم الدہلوی (کذا؟) فی شهر صفر ۱۲۶۵ھ من ہجرة خیر البشر

صلی اللہ علیہ وسلم، باہتمام السید اشرف علی الواسطی“

مگر مطبع العلوم میں ترمذی کی طباعت کی رفتار بہت سست تھی، روزانہ صرف دو ورق چھپتے تھے، مولانا مملوک العلی نے اسپرنگر کے نام ایک خط میں اس رفتار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”ترمذی انشاء اللہ تین مہینے یا کچھ زیادہ میں تمام ہوگی، دو، دو ورق روز چھپتے ہیں۔“ (۱)

مگر شاید بعد میں طباعت کے کام کی رفتار اور سست ہوگئی ہوگی، جس کی وجہ سے کام پورا ہونے میں دیر لگی، فقط ایک سو چالیس صفحات اس مطبع میں چھپے تھے، اس سے بعد کے صفحات مطبع احمدی میں چھپنا شروع ہوئے، ابواب الحج کی ابتدا (ص: ۱۴۱) سے آخر تک پوری کتاب اسی پرپیس میں چھپی، اس صفحہ پر یادداشت کے طور پر یہ سطور چھپی ہوئی ہیں:

”وقد شرع طبع هذا الكتاب الترمذی من هذا المقام فی مطبع

الاحمدی الواقع فی الدہلی، باہتمام الشیخ ظفر علی فی شهر

(۱) مکتوب محررہ ۹ اکتوبر ۱۸۴۸ء (۱۲ رزی الحجہ ۱۲۶۳ھ) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۵۹

جمادی الاول ۱۲۶۵ ھ واللہ الموفق والہادی“

ترجمہ: اس مقام سے اس کتاب ترمذی کی طباعت مطبع احمدی واقع دہلی میں شیخ ظفر علی کے اہتمام سے، جمادی الاولیٰ ۱۲۶۵ھ میں شروع ہوئی۔

جلد اول ص: ۳۰۲ پر ختم ہو کر صفحہ: ۳۰۳ کے آغاز سے دوسری جلد شروع ہو گئی، جو صفحہ: ۶۵۴ پر مکمل ہوئی، آخری صفحہ پر خاتمۃ الطبع درج ہے جو مولانا احمد علی کا لکھا ہوا ہے، اس کی چند سطریں گذر گئیں ہیں، مکمل عبارت درج ذیل ہے:

يقول العبد الضعيف الراجي الى رحمة الولي احمد علي  
السهارنفوري، قد وقع الفراغ من طبع هذا الكتاب الشريف في  
المطبع (اي الواقع في الدهلي) الاحمدى، ثانی عشر من الصفر،  
سنة ست وستين بعد الالف والمنتين من هجرة خير البشر عليه  
افضل الصلوات وازكى التحية. واني مع قلة الدراية والبضاعة قد  
اجتهدت في تصحيحه وحل مطالبه بحسب الوسع والطاقة، ثم  
لاحظ ثانياً بالملاحظة التامة والمراجعة العامة الفاضل الاجل والحبر  
الابجل، العالم بالخفي والجليل مولانا محمد مملوک العلی،  
فالمامل ممن ينظر فيه وينتفع به ان لا ينسانا من دعاء الخير.

ولو اطلع على شئ من الخطاء والزلل فينبغي ان يصلحه ويسد  
الخلل ان تجد عيباً فسد الخلا، جل من لا عيب فيه وعلا. واللہ  
المستعان وعليه التكلان. و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين  
والصلوة والسلام على رسوله محمد وآله اصحابه اجمعين.  
یہ سنن ترمذی کا وہی مشہور و مقبول حاشیہ ہے جو اُس وقت (۱۲۶۶ھ) سے آج تک  
مسلل چھپ رہا ہے (۱) پچاسوں مرتبہ پہلے شائع ہوا اور اب بھی ہندو پاكستان میں  
دسیوں ناشرین کی مطبوعات میں شامل ہے۔

(۱) مولانا احمد علی کے حاشیہ والا یہ نسخہ بہت مقبول ہوا۔ اسکی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کا دوسرا  
ایڈیشن صرف چار سال بعد ۱۲۷۰ھ (ستمبر ۱۸۵۴ء) میں مطبع فخر المطابع (قلعہ دہلی) دہلی سے نیاز احمد کیرانوی کے  
اہتمام سے چھپا۔ اس نسخہ کی اصلاح کی خدمت حضرت شاہ محمد اسحاق کے ..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ حضرت مولانا کی اس بڑی اور اہم ترین اور علمی یادگار کا اس وقت تک کسی تذکرہ نگار نے بھی ذکر نہیں کیا، محمد اکرام صاحب چغتائی کو بھی غالباً اس کا سراغ نہیں ملا۔

مولانا مملوک العلی نے سنن ترمذی کی دوسری خدمت

ترجمہ اردو سنن ترمذی | ترمذی شریف کے اردو ترجمہ کی صورت میں انجام دی، یہ ترجمہ کب ہوا، پورا ہو گیا تھا یا نامکمل تھا، تفصیلات راقم سطور کو نہیں ملیں، قیاس کیا جاسکتا ہے کہ تصحیح ترمذی شریف کے بعد یا شاید اسی زمانہ (تقریباً ۶۶-۱۲۶۵ھ) میں یہ خدمت انجام پائی ہوگی، اس ترجمہ کا سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے ذکر کیا ہے، مولوی عبدالحق کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کالج کے ماتحت ادارہ ورنہ کلسوسائٹی

(Vernacular Translation Society) (۱) نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے اردو ترجموں کا ایک بڑا منصوبہ بنایا تھا، اس کے تحت جن کتابوں کا ترجمہ ہوا ان کی فہرست مرحوم دہلی کالج میں دی ہے، اس فہرست میں ایک سواٹھائیس (۱۲۸) کتابوں کے نام ہیں، جن میں ایک سو چودہ (۱۱۴) نمبر پر ”سنن ترمذی اردو ترجمہ“ کا نام آیا ہے (۲) غالباً یہ ترجمہ چھپا نہیں، اور نہایت افسوس ہے کہ اسکے کسی نسخہ کا حال سراغ نہیں ملا، بہر صورت یہ ترجمہ برصغیر میں حدیث کی بنیادی کتابوں کے ابتدائی ترجموں میں ایک اہم اور یادگار ترجمہ ہوگا۔

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... ایک اور ممتاز شاگرد مولانا سبحان بخش شکار پوری نے انجام دی تھی، اس نسخہ کا حاشیہ اور تمام ترتیب وہی ہے صرف جزوی تصحیح کی گئی ہے۔ یہ دونوں نادر اشاعتیں کتب خانہ مظاہر علوم (قدیم) میں محفوظ ہیں۔ اس طباعت کے چند سال کے بعد سنن ترمذی کے اسی نسخہ کا ایک ایڈیشن غالباً اور چھپا تھا، تیسری یا چوتھی اشاعت مولانا احمد علی کے دوسرے مطبع احمدی کی تھی جو ۱۸۵۷ء کے بعد میرٹھ میں قائم کیا گیا تھا۔ (دہلی کا مطبع احمدی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ختم ہو گیا تھا) اس نسخہ کی طباعت رمضان ۱۲۸۲ھ (جنوری فروری ۱۸۶۶ء) اسی مطبع (احمدی، میرٹھ) سے ہوئی تھی، اس چوتھی اشاعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ کتب میں ہے۔

(۱) اس کو دلی ورنہ کیولرسوسائٹی بھی کہتے ہیں۔ قدیم دہلی کالج، مالک رام ص: ۴۳

(۲) مرحوم دہلی کالج ص: ۱۴۵ دہلی (۱۹۴۵ء) مالک رام صاحب مولوی عبدالحق کی اس کی فہرست میں درج اکثر کتابوں کے مترجمین، سنہ ترجمہ یا طباعت اور مطبع کی معلومات کا اپنی تالیف..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

**تصحیح و حواشی تاریخ یمینی** | سلطان محمود غزنوی (۴۲۱ھ) کے حالات پر تاریخ یمینی ایک معاصر ماخذ اور معروف مستند کتاب ہے، جو ابو نصر

محمد بن عبد الجبار العتیبی (وفات سنہ ۴۲۷ھ ۱۰۳۶ء) (۱) کی تالیف ہے، یہ کتاب دہلی کے دینی علمی حلقوں میں اپنی زبان کی وجہ سے مقبول تھی، خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے یہاں بھی اس کے درس کی اطلاعات ملتی ہیں، مولانا رشید الدین خاں بھی اس کو بے حد پسند کرتے تھے اور اس کے نہایت مداح تھے، ان کے کتب خانہ میں اس کا ایک عمدہ اور صحیح نسخہ تھا، مولانا رشید الدین سے اس نسخہ کی ایک نقل مولف فقہ الیمین احمد بن محمد یمانی نے بھی منگوائی تھی (۲) بعد میں جب دہلی کالج کا نصاب طے ہوا تو اس میں بھی یہ کتاب شامل درس کی گئی (۳) اسکی نصاب میں شمولیت میں غالباً مولانا رشید الدین خاں کا مشورہ شامل رہا ہوگا اور مولانا کی وجہ سے مولانا مملوک العلی کا اس سے دلچسپی رکھنا اور اس کی تصحیح اور حواشی لکھنے پر توجہ فرمانا فطری بات ہے۔

مولانا نے اس کتاب کی تصحیح میں بہت محنت فرمائی ہے، عربی متن کے ساتھ سطور کے درمیان میں اور حاشیے پر وضاحتی عبارتیں لکھی ہیں، مشکل الفاظ کے معانی فارسی میں درج

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... ”قدیم دلی کالج“ میں مختصر ذکر کیا ہے اور عبدالحق کی فہرست کوفنون کی ترتیب پر مرتب کر دیا ہے۔ اس فہرست میں بھی مذہبیات کے تحت مولانا مملوک العلی کے ترجمہ سنن ترمذی کا ذکر ہے، لیکن اس کی کوئی وضاحت صفحات، سنہ، ترجمہ یا مطبع وغیرہ کا ذکر نہیں۔ (ص: ۱۱۸ اندراج ۱۲۴) بظاہر یہ ترجمہ چھپا نہیں۔

محمد ایوب قادری صاحب نے تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی میں مولانا مملوک العلی کے ترجمہ سنن ترمذی کیلئے حالات مولانا قاسم تالیف مولانا محمد یعقوب کا حوالہ دیا ہے ص: ۱۸۸ (کراچی: ۱۹۶۶ء) مگر یہ غالباً سہو کتابت ہے، تذکرہ مولانا محمد قاسم میں اس ترجمہ کا بالکل ذکر نہیں ہے۔

(۱) الاعلام، زرکلی ص: ۱۸۵ ج: ۶ (بیروت ۱۹۷۹ء)

(۲) المکاتیب (مراسلت مولانا رشید الدین خاں و شیخ احمد بن محمد یمانی شروانی) مکتوب مولانا رشید الدین خاں محررہ ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) ص: ۱۳-۱۴ (مجتہائی دہلی: ۱۳۱۱ھ)

(۳) یہاں یہ اطلاع مفید ہوگی کہ جب ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) کا افتتاح ہوا تو مدرسہ کے عربی دینیات کے متوسط اعلیٰ نصاب میں سنن ترمذی مشکوٰۃ اور تفسیر جلالین کے ساتھ تاریخ یمینی بھی شامل درس تھی اور اس کا درس ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو، روداد سال اول مدرسہ (دارالعلوم) دیوبند۔

کئے ہیں، نیز اس میں مذکورہ شخصیتوں، مقامات اور تاریخی واقعات کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ وضاحت حاشیہ میں عربی میں ہے، آخر میں چھ صفحات کی مفصل فہرست مضامین ”فہرس مطالب التاريخ الیمینی“ شامل ہے۔

کتاب پر دیباچہ یا اس کی وجہ اشاعت وغیرہ موجود نہیں، تاہم آخر میں تاریخ تکمیل ان الفاظ میں درج ہے:

” فرغت من تحریر هذا الكتاب يوم السبت في ۲۲ شهر رمضان

۱۲۶۳ھ (جمعہ ۳ ستمبر ۱۸۴۷ء)

اس نسخہ کے حواشی کی کتابت کے متعلق جناب محمد اکرام صاحب چغتائی کا خیال ہے (موصوف نے اس کتاب کا نسخہ جرمنی میں اسپرنگر کے ذاتی ذخیرہ میں دیکھا ہے) کہ یہ: ”تمام حواشی اور عبارت مولانا کے ہاتھ کی تحریر کردہ معلوم ہوتی ہیں“ (۱)

اس طباعت کے دیکھنے سے یہ خیال تو ضرور ہوتا ہے کہ اس نسخہ کے حواشی کی کتابت خوش نویس یا کاتب کے قلم سے نہیں ہے مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ حواشی مولانا مملوک العلی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس طباعت کا ایک بہت عمدہ اور صاف نسخہ راقم سطور کے سامنے ہے۔ یہ کتاب سید اشرف علی کے پریس میں چھپی تھی، ٹائٹل پر یہ عبارت درج ہے:

”باہتمام سید اشرف علی، در مطبع العلوم، مدرسہ دہلی طبع شد“

طباعت کے فوراً بعد اس کتاب کے پچیس نسخے اسپرنگر کی ہدایت پر یورپ بھیجے گئے تھے (۲) اور ۱۸۴۸ء میں یہ کتاب دہلی کالج کی اعلیٰ عربی جماعت کے نصاب میں داخل ہو گئی تھی (۳) اس طباعت کا بروکلیمان (Carl Brockelman) نے بھی ذکر کیا ہے (۴)

ایوب قادری صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا مملوک العلی نے تاریخ الیمینی کا اردو ترجمہ

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۳۹ (سہ ماہی اردو، کراچی: اکتوبر دسمبر ۱۹۸۵ء)

(۲) مکتوب سید اشرف علی بنام اسپرنگر، ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۲۱۱

(۳) مرحوم دہلی کالج ص: ۷۹ (دہلی: ۱۹۴۵ء)

(۴) تاریخ الادب العربی، کارل بروکلیمان، عربی۔ ترجمہ سید یعقوب بکر۔ ص: ۲۰ ج: ۶ (قاہرہ: ۱۹۷۷ء)



بھی کیا تھا (۱) مگر اس اطلاع کی کسی اور ذریعہ سے تصدیق نہیں ہوئی اور اس ترجمہ کے مطبوعہ یا قلمی نسخہ کا بھی سراغ نہیں ملا اس لئے یہ اطلاع مشتبہ ہے، لہذا راقم سطور نے اس ترجمہ کا مولانا کے علمی باقیات میں ذکر نہیں کیا۔

مولانا کی مؤلفات میں اس کتاب کا اضافہ  
**کتاب المختار فی الاخبار والآثار**  
 جناب اکرام چغتائی صاحب کی دریافت ہے

اس کا کوئی نسخہ راقم سطور کی نظر سے نہیں گذرا، اس کا تعارف چغتائی صاحب کے شکر یہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

مروج الذهب و معادن الجوہر ابوالحسن (علی بن الحسین) مسعودی کی مشہور مایہ ناز تالیف ہے (۲) دہلی کالج کے فاضل پرنسپل، اسپرنگر کو اس سے شروع سے دلچسپی تھی اور وہ ہندوستان آنے سے پہلے جرمنی قیام کے زمانہ میں اس کا انگریزی میں ترجمہ شروع کر چکا تھا، اس ترجمہ کی پہلی جلد ۱۸۴۰ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔ جب اسپرنگر دہلی کالج کا پرنسپل مقرر ہو کر دہلی آیا تو اس کو اپنی محبوب کتاب دوبارہ یاد آئی، اس وقت اس نے مولانا مملوک العلی کو اس کی تلخیص پر توجہ دلائی، مولانا نے اسپرنگر کے تعاون سے اس کا انتخاب تیار کیا، جو ”المختار فی الاخبار والآثار“ کے نام سے چھپا۔

المختار فی الاخبار والآثار چھوٹے سائز کے پونے تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، اس کی طباعت ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں عمل میں آئی تھی، سرورق پر مطبع یا ناشر کا نام موجود نہیں، صرف ”طبع فی المدرسة الدہلویة“ لکھا ہوا ہے۔ محمد اکرام چغتائی صاحب کا قول ہے کہ یہ وہی مطبع ہے جو بعد میں مطبع العلوم کے نام سے موسوم و مشہور ہوا، اس کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ درج ہیں:

کتاب المختار فی الاخبار والآثار

(۱) تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی ص: ۱۸۸ (کراچی: ۱۹۶۶ء)

(۲) مروج الذهب کئی مرتبہ چھپی ہے۔ ایک عمدہ طباعت دار الهجرة، قم، ایران کی ہے، جو چار جلدوں میں ۱۳۰۳ھ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی، یہ دار المعارف مصر کی ۱۹۷۷ء کی طباعت کا عکس ہے۔

الجلد الاول

وفيه تاريخ الدولة الاموية من مروج الذهب

للأبي الحسن علي المسعودي المتوفى ۳۲۶ھ

خلصه و صححه مولوی مملوک العلی نانوتوی

والوائس اسپرینگر التیرولی

المختار فی الاخبار والآثار کی یہ اشاعت تین حصوں پر منقسم ہے، جو ایک جگہ مجلد و مرتب

ہیں، ہر حصے کے صفحات کا شمار علیحدہ ہے:

حصہ اول : ذکر خلافت علی بن ابی طالب (ص: ۱-۶۹)

حصہ دوم : ذکر ایام معاویة بن ابی سفیان (ص: ۱-۵۰)

حصہ سوم : ذکر یزید بن معاویة بن ابی سفیان (ص: ۱-۱۶۰) (۱)

بروکلمان نے مولانا مملوک العلی اور اسپرینگر کی اس مشترک کاوش کا ان الفاظ میں ذکر

کیا ہے:

History of the Mmayyades from Masudy's Golden Meadows by a. Sprenger and Mauloe Mamluk Aly in Hist. Select from arabic authorst, 1846 (۲)

مگر تعجب ہے کہ کریم الدین پانی پتی نے (جو مولانا کا شاگرد ہے اس کتاب سے واقف ہے بلکہ اس سے استفادہ بھی کرتا ہے) مولانا مملوک العلی کے حالات میں اس کا بالکل ذکر نہیں کیا، بلکہ وہ اس کو اسپرینگر کی تالیف کہتا ہے، کریم الدین نے لکھا ہے کہ:

”پوشیدہ نہ رہے کہ کتاب المختار فی الاخبار والآثار میں جو کہ ڈاکٹر اسپرینگر

صاحب بہادر، پرنسپل مدرسہ دہلی نے کتاب سعودی اور آغانی سے منتخب کر کے عربی

زبان میں چھپوائی ہے“ (۳)

مگر مذکورہ اطلاعات کی روشنی میں کریم الدین کا یہ قول صحیح نہیں۔

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتب ص: ۳۱ اسی اطلاع پر چغتائی صاحب کا تعارف ختم ہوا۔ بعد کی سطور راقم سطور کا اضافہ ہیں۔

(۲) تاریخ الادب العربی، عربی ترجمہ دکتور عبدالعلیم النجار ص: ۵۹ ج: ۳ (دار المعارف قاہرہ: ۱۹۷۷ء)

(۳) کریم الدین نے شعرائے عرب کے تذکرہ فرائد الدہر میں ایک موقع پر ضمناً لکھا ہے: فرائد الدہر ص: ۷۵ (دہلی: ۱۸۴۷ء)

مولانا مملوک العلی کی تحریری باقیات میں سے جس کتاب کی سب سے زیادہ شہرت ہے وہ ترجمہ تحریر اقلیدس ہے، اقلیدس کی کتاب اصول، دہلی کالج کے نصاب تعلیم میں داخل تھی، جب دلی کالج کے

اردو ترجمہ تحریر اقلیدس  
(اور اس کی پہلی طباعت)

پرنسپل فیلکس بوترو کے زیر انتظام مجلس ترجمہ کتب قائم ہوئی تو اقلیدس کے ترجمہ کا بھی فیصلہ ہوا اور یہ کام مولانا مملوک العلی کے سپرد کیا گیا، مولانا نے اس کے چار مقالوں کا اردو ترجمہ کیا۔

حیرت ہے کہ کریم الدین پانی پتی نے لکھا ہے کہ مولانا نے چھ مقالوں کا اردو ترجمہ کیا، اور چغتائی صاحب نے آٹھ مقالوں کے ترجمہ کا ذکر کیا ہے، حالانکہ یہ دونوں ہی اطلاعی غلط ہیں، مولانا نے اس کتاب میں تحریر اقلیدس کے صرف چار مقالوں کا ترجمہ کیا ہے، جیسا کہ اس کتاب کی پہلی طباعت کے سرورق پر لکھا ہوا ہے، نیز اس کتاب کی اور طباعتوں میں بھی اسی قدر مضمون ہے۔

ترجمہ تحریر اقلیدس کی سادگی اور جامعیت کی کریم الدین نے اپنی دونوں کتابوں میں تعریف کی ہے، طبقات شعرائے ہند میں لکھا ہے:

”حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے“ (۱)

اور تذکرہ فراندالد ہر میں رقم طراز ہے:

”ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے اس کی

مشکلات کو حل کیا ہے“ (۲)

تحریر اقلیدس مختصر سی کتاب ہے، جس کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

” الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على خير خلقه

محمد وآله واصحابه اجمعين .

(۱) طبقات شعرائے ہند ص: ۴۶۴ (لکھنؤ: ۱۹۸۷ء)

(۲) فراندالد ص: ۴۰۳۔

حدود بیان ہے ان لفظوں کے معنی کا جو اس علم میں مستعمل ہیں۔  
نقطہ اسے کہتے ہیں جسکے جز نہ ہوئے اور اس کی طرف انگلی سے اشارہ ہو سکے۔  
خط ایک طول ہے بدون عرض کے، یعنی لمبا ہے چوڑا نہیں اور تمام ہوتا ہے نقطہ پر۔  
خط مستقیم یعنی خط سیدھا وہ چھوٹا ہے سب خطوں میں جو ملیں درمیانی دو نقطوں کے۔  
سطح اور بسیط وہ ہے جسکو فقط طول عرض یعنی لمبائی چوڑائی ہو اور تمام ہوتی ہے خط پر۔  
سطح مستوی اس سطح کو کہتے ہیں کہ جتنی خط مستقیم اس پر کسی جہت میں نکالیں اسے  
چھوٹے اور لگتے گذاریں“

اور اس کے سرورق پر یہ الفاظ چھپے ہوئے ہیں:  
”تحریر اقلیدس کے چار مقالہ اول کا ترجمہ مولوی مملوک العلی مدرس اول،  
مدرسہ عربی نے زبان اردو میں ۱۸۴۳ء میں کیا“  
اس کے بعد انگریزی میں تحریر ہے:

met  
of  
Geometry  
Books I, II, III and IV  
by  
Mowlvee Mamlook Ally  
of the Delhi College  
1844

آخر میں دو سطریں ان الفاظ پر مشتمل ہیں:  
”مطبع رفاه عام کے لیتھوگرافک پریس، واقعہ خاص دارالخلافہ شاہ جہاں آباد،  
گذرترکمان دروازہ کے میں اہتمام مولوی کریم الدین سے چھاپا ہوا۔ فقط“ (۱)  
ترجمہ اقلیدس کی اسی سال دوبارہ اشاعت ہوئی، کریم الدین پانی پتی نے جو اس  
رسالہ کا ناشر بھی تھا، لکھا ہے:

(۱) یہ اشاعت نہایت کم یاب بلکہ مفقود ہے، اس کا ایک نسخہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے کتب خانہ کی بیچی کچی کتابوں  
میں راقم سطور کی نظر سے گذرا ہے۔ اس نسخہ کے شروع آخر کے صفحات کا فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے، اس  
اشاعت اور نسخہ کے متعلق اکرام چغتائی صاحب کی اطلاع میں کئی فروگذاشتیں ہیں۔

”ایک کتاب تحریر اقلیدس کا جو عربی زبان تھی بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی کے ۱۸۴۳ء میں ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے ہر ایک شکل کو حل کیا ہے یہ ترجمہ ۱۸۴۳ء میں دو دفعہ چھپ چکا ہے“ (۱)

گار سین دتاسی کا قول ہے کہ یہ ترجمہ فارسی سے ہوا تھا مگر راقم کا خیال ہے کہ مولانا مملوک العلی نے انگریزی نسخہ سے بھی فائدہ اٹھایا ہوگا، مولانا کی ذاتی کتابوں میں اسکا انگریزی نسخہ موجود تھا۔

چند طباعتیں اور | ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء میں سید اشرف علی کے پریس مطبع العلوم سے یہ کتاب دو مرتبہ چھپی، ۱۸۴۹ء میں ڈیڑھ سو نسخے اور ۱۸۵۰ء میں تین سو نسخے (۲) جو اس زمانہ کے لحاظ سے خاصی تعداد اور مقبولیت کی بڑی علامت ہے، مگر یہ اس کتاب کی آخری طباعت نہیں تھی، وقفہ وقفہ سے اور طباعتیں بھی سامنے آئیں، ایک اور طباعت جو راقم سطور کی نظر سے گذری ہے، مطبع احمدی شاہ پیر دروازہ میرٹھ کی ہے جو محرم الحرام ۱۲۷۷ھ (جنوری ۱۸۶۰ء) میں شائع ہوئی تھی، اسکا خاتمۃ الطبع درج ذیل ہے:

”بعد حمد و سپاس خالق بے چوں و داور بے چگوں اور صلوة بے قیاس او پر خاتم رسل، برگزیدہ قادر بے نموں کے۔

ظاہر ہووے کہ چار مقالہ نسخہ جیدہ ترجمہ تحریر اقلیدس مؤلفہ مولوی مملوک العلی صاحب مرحوم کی ہے، بباعت کثرت خواہش طالبین کے بکوشش تمام وسعی وافر، بیچ مطبع احمدی حافظ غلام احمد صاحب کے واقع میرٹھ متصل شاہ پیر دروازہ، اہتمام سے مرزا اموں جاں کے، بتاریخ دوم شہر محرم الحرام ۱۲۷۷ھ میں مطبوع ہوئی“

یہ نسخہ چھوٹے سائز کے ایک سواٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱) تذکرہ فراندالد ہر ۳۰۳ (مطبع العلوم مدرسہ دہلی: ۱۸۴۷ء)

(۲) صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات۔ محمد عتیق صدیقی ص: ۱۸۸، ۱۹۰ (علیگزہ)

## ترجمہ تحریر اقلیدس پر مولانا عبدالحق خیر آبادی کے اعتراضات

## اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے جوابات

مولانا مملوک العلی کے ترجمہ تحریر اقلیدس کی بعض تعبیرات اور ترجمہ کی صحت پر مولانا عبدالحق خیر آبادی نے شبہ کیا تھا اور مولانا حبیب الرحمان (مہتمم دارالعلوم دیوبند) کے الفاظ میں ”رکیک الفاظ میں اعتراضات کئے تھے“ (۱) جب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رام پور گئے اس زمانہ میں جب مولانا عبدالحق خیر آبادی بھی رام پور میں ملازم تھے، اس سفر کے موقع پر حضرت مولانا نانوتوی نے اہل شہر کی درخواست پر وعظ کہا، یہ وعظ اذا وقعت الواقعة لیس لوقعتها کاذبہ پر کہا گیا تھا اور اس کے تحت فلسفہ کے ان تمام مسائل کا جن پر معقولین کو ناز تھا رد فرمایا اور مولانا خیر آبادی نے مولانا مملوک العلی کے ترجمہ تحریر اقلیدس پر جو اعتراضات کئے تھے ان سب کے جوابات دیئے اور نہایت جوش میں فرمایا:

”کہ یہ کیا بات ہے کہ لوگ گھر میں بیٹھ کر اعتراض کرتے ہیں، اگر کچھ حوصلہ ہے تو میدان میں آجائیں مگر ہرگز یہ توقع لیکر نہ آئیں کہ وہ قاسم سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ پھر فرمایا کہ میں کچھ نہیں ہوں مگر میں نے جن کی جوتیاں سیدھی کی ہیں وہ سب کچھ تھے، غرض کہ مسائل، مناطقہ و فلاسفہ کا نہایت زبردست رد اس وعظ میں فرمایا۔ شہر کے تمام مشاہیر علماء سوائے مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی کے اس وعظ میں موجود تھے، مگر بولنے کی جرأت کسی کو نہ ہوئی“ (۲)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تحریر اقلیدس کے نام سے عربی اور اردو میں اور بھی متعدد تالیفات ہیں مگر ان کا مولانا مملوک العلی سے کچھ تعلق نہیں۔

(۱) ارواحِ ثلاثہ: ص: ۲۶۲

(۲) ارواحِ ثلاثہ: ص: ۲۶۳ مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون

**نتیجہ فکر** | مولانا کی اس تالیف کا جناب اکرام چغتائی صاحب نے ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ: ”گار سین دتاسی نے اپنی ”تاریخ“ میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے (۲۷۲،۲) اور یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب مختلف اجزاء میں طبع کی گئی ہے، یہ علم ہندسہ سے متعلق ہے اور شمالی مشرقی صوبوں کے مدارس میں اسے پڑھایا جاتا ہے۔ ”آگرہ گورنمنٹ گزٹ“ (بابت یکم جون ۱۸۵۵ء) میں بھی اس کا حوالہ دیا گیا ہے، ممکن ہے یہ مولانا کی تحریر اقلیدس ”ہی کا کوئی حصہ ہو“ (۱)

گار سین (Garcin De Tassy) کی تاریخ ادب اردو کا ترجمہ راقم سطور کو نہیں ملا، اس لئے گار سین کی اس اطلاع پر کچھ کہنا صحیح نہیں۔

مگر اس کو ”ترجمہ تحریر اقلیدس کا کوئی حصہ“ قرار دینا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے نام سے یہ ضرور معلوم ہو رہا ہے کہ یہ کتاب ریاضی کی ہے اور یہ بھی تحریر اقلیدس کی طرح اس نام کی واحد تالیف نہیں ہے، بلکہ مولانا مملوک العلی کے قریب العہد اصحاب اور مولانا کے بعض شاگردوں نے بھی اس نام سے کتابیں لکھی ہیں (۲) راقم سطور کو چغتائی صاحب کی مذکورہ اطلاع کے علاوہ اس کتاب کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے۔

**مولانا کا ایک نا تمام کام، حاشیہ حماسہ** | حماسہ دہلی کالج اور ہندوستان کے اکثر دینی علمی حلقوں کے نصابِ تعلیم میں

شامل تھا، مولانا مملوک العلی نے حماسہ کے انتخاب کا اور اس کی شرح لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اور غالباً یہ کام شروع بھی کر دیا تھا اور اس میں تعاون کیلئے اپنے شاگرد، علی اکبر سونی پتی سے رابطہ کیا تھا، مگر وہ مولانا کے اس منصوبہ سے متفق نہیں تھا بلکہ چاہتا تھا کہ مولانا یہ کام نہ کریں۔ علی اکبر اسپرنگر کے نام ایک خط میں لکھتا ہے:

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۲۱

(۲) منشی ذکاء اللہ نے اقلیدس کے پہلے دوسرے مقالہ کا اردو ترجمہ کیا ہے اس کا نام بھی نتائج ہے (مطبوعہ مطبع مرتضوی دہلی: ۱۸۷۳ء) منشی ذکاء اللہ کی اس موضوع پر اس نام کی ایک تالیف اور بھی ہے اور عربی میں بھی ریاضی پر نتائج تحریر نام کی کئی کتابیں ہیں۔

”مولوی صاحب کا ارادہ ہے کہ ”باب الحماسہ“ چھپوادیں، اس طرح کہ ضروریات شرح حاشیہ پر ہو اور مجھے اس کے انتخاب کو کہتے ہیں، لیکن میرے نزدیک اس کا چھاپنا اس طرح بُرا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شرح اشعار و جز شعر و قصہ و صخر و شاعر مختصراً کتاب کے اندر ہو اور بعضے شعر و شاعر کا حال حماسہ میں کچھ نہیں اور اغانی میں اس کا حال موجود ہے۔ یہ بھی بہتر ہے کہ ”اغانی“ میں سے کچھ کچھ حال لکھوں، سو یہ بدون حاضر ہونے دہلی کے غیر ممکن ہے“ (۱)

علی اکبر سونی پتی کی اس علمی خدمت کی مخالفت کی وجہ بہ ظاہر یہ تھی (جس کا مولانا کو علم نہ ہوگا) کہ وہ خود حماسہ کی شرح لکھنا چاہتا تھا اور صاف بات یہ تھی کہ مولانا کی شرح کی موجودگی میں اس کے کام کی کچھ وقعت نہ ہوتی، اس لئے اس نے مولانا کے حماسہ پر کام کرنے کی بر ملا مخالفت کی مگر وہ خود بھی حماسہ پر کچھ کام نہ کر سکا، تاہم اسکے چھوٹے بھائی علی اصغر نے حماسہ کی ایک شرح لکھی تھی، جس کا اس کی ایک تحریر میں ذکر ہے۔

یہ حضرت مولانا مملوک العلی کی اس وقت تک معلوم تصانیف، تراجم اور علمی تحریری خدمات کا تعارف ہے، مذکورہ تحریری آثار کے علاوہ مولانا مملوک العلی کی کسی اور تصنیف، تالیف، ترجمہ یا تصحیح کی ہوئی کتاب کا راقم سطور کو علم نہیں ہے۔

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۲۹۹



## باب (۱۴)

حضرت مولانا کا عربی کا ایک خط بھی دستیاب ہے یہ خط جو صنعت مہملہ (بے نقط الفاظ) میں ہے، مولانا کے شاگرد کریم الدین پانی پتی نے اپنی تالیف تذکرہ فراند الدھر (تاریخ شعرائے عرب) میں نقل کیا ہے اور یہ اس وقت تک معلوم مولانا کا واحد عربی مکتوب ہے۔

کریم الدین کی تحریر کے مطابق حضرت مولانا نے یہ خط شہزادہ فیروز کو لکھا تھا، کریم الدین کہتا ہے کہ:

”ایک مسودہ عربی خط کا جو سخی فیروز بادشاہ زادے کو انہوں نے ایام طالب

علمی میں بے نقط لکھا تھا ڈھونڈ لایا ہوں، تیمناؤ تبر کا اپنی کتاب میں لکھتا ہوں“ (۱)  
مگر کریم الدین کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ یہ خط حضرت مولانا کے زمانہ طالب علمی کا لکھا ہوا ہے، کیونکہ اس خط کی آخری سطور سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ خط حضرت مولانا رشید الدین خاں کے مرض وفات میں لکھا گیا ہے، مولانا نے تحریر فرمایا ہے:

والمدرس الاول ماحلہ مسہ کسر مؤلم، ودھمہ ہم مدلہم  
رحم لسوء حالہ الاسود والاحمر، واکدہ الدھر کدا وھوادھی وامر  
والحال مسدد واوددہ ومعدھمہ وکمدہ واطرد امرہ وحلا مرہ  
وسودہ۔ (۲)

مولانا رشید الدین خاں ۱۲۴۲ھ (جون، جولائی ۱۸۲۷ء) کے آخری مہینوں میں بیمار ہوئے تھے اور محرم ۱۲۴۳ھ (اگست ۱۸۲۷ء) میں مولانا کی وفات ہو گئی تھی۔ مولانا رشید الدین خاں کے سنہ وفات کے بارے میں بعض تذکرہ نگاروں نے ایک روایت اور بھی نقل

(۱) فراند الدھر (تذکرہ شعرائے عرب) (دہلی: ۱۸۲۷ء) ص: ۴۰۴

(۲) فراند الدھر، ص: ۴۰۶

کی ہے مگر مولانا فضل حق خیر آبادی کے ایک خط میں (جو اس وقت دہلی میں موجود تھے) مولانا رشید الدین کی شدید بیماری اور وفات کا ذکر ہے۔ مولانا خیر آبادی کے اس خط پر تاریخ تحریر درج ہے، جس سے یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ مولانا رشید الدین کی وفات محرم ۱۲۴۳ھ میں ہوئی تھی، تاریخ وفات کی اور اطلاعات صحیح نہیں (۱) اسی صراحت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ مولانا مملوک العلی کا یہ خط اواخر ۱۲۴۲ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اسلئے کریم الدین کی یہ اطلاع صحیح نہیں کہ مولانا کا یہ خط انکے زمانہ طالب علمی کا لکھا ہوا ہے۔

اس خط کے متعلق کریم الدین کی یہ اطلاع بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ یہ خط شہزادہ فیروز کے نام ہے، خط کے مضمون سے یہ جھلکتا ہے کہ یہ خط قلعہ معلیٰ کے اورنگ نشیں، اکبر شاہ ثانی (ابن شاہ عالم ثانی دور حکومت سنہ ۱۲۲۱ھ تا سنہ ۱۲۵۳ھ، ۱۸۳۷ء) کے نام لکھا گیا ہے، ممکن ہے کسی مصلحت یا آداب شاہی کے خلاف ہونے کی وجہ سے شہزادہ کو بھیجا گیا ہو، مضمون تمام تر بادشاہ وقت کے نام ہے۔

اس خط میں مولانا رشید الدین خاں کی وفات کے بعد کالج کے مدرس اوّل کے لئے مولانا سید محمد دہلوی کے نام کی سفارش کی گئی ہے کہ وہ اس کیلئے بہتر اور موزوں ہیں مگر سوال یہ ہے کہ مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کے مدرس اوّل و دوم کی تقرری کا قلعہ معلیٰ سے کیا تعلق تھا، کیا انگریز حکام اس کیلئے بادشاہ وقت سے اجازت لیتے تھے، اگر یہ خیال صحیح ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ مدرسہ دہلی کی ابتدا اور اس کیلئے مدرس اول و دوم کے لئے تقرری بھی بادشاہ سے اجازت لی گئی ہوگی، یوں مدرسہ دہلی اور دہلی کالج اکبر شاہ ثانی کی دانش مندی اور دور بینی کا ایک ثبوت بھی ہو سکتا ہے۔ اس پس منظر اور تفصیل کے بعد خط ملا حظہ ہو، مولانا نے لکھا ہے:

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله المحمود، المالک الودود، الواحد السرمد، الملک الصمد.

سمک صرح السماء ولادعام، وکل ماسواہ هالک وله الدوام ادراکہ

(۱) تفصیلات مولانا رشید الدین کے تعارف میں گذر گئی ہیں۔

کما هو محال ، ما درکہ اهل الحال، ولا علمه اهل الکیمال. مسلکہ سهل  
لکل سالک ، عدله مهلک لکل هالک.

امرہ امر و حکمہ حکم و حلالہ حلال و محرمة محرم. مطروده مردود  
و مودوده مسعود. همه اعدہمأ و سروراً، و حکمہ حصل حرّاً و حروراً. لا امد  
لدوامہ و لاراد لاحکامہ. ما سعد الا مسعودہ و ما رد الا مردودہ. اکرم  
السعداء، و علم العلماء. مرادہ معمول و معمولہ حاصل. لا حد لداقما حکمہ  
ولا ساحل. عالم الاسرار، مالک الاحرار. مسعر الاسعار، محصل الاوطار،  
مملک الامصار، مکرر الاصال و الاسجار. ما اقلہ مؤمّل الا و وصل ما مولہ،  
و ما سألہ سائل الا و ما آخرم مسؤولہ.

اللّٰهُمَّ! اکرم محل محمد المودود، اسمہ احمد و مسماہ محمود.  
مادحہ ممدوح لکل واحد، و محمودہ محمود لکل حامد. علوہ سماک  
و سموہ لو لا ک. طورہ سماء، و طورہ عطاء. حامل لواء الحمد، و مالک  
ممالک الاکرام، سالک مسالک العدل، و ممهد مهاد الاسلام.  
وارحم الہ الکرماء رهطہ الکملاء و اوداءہ السعداء.

اسلموا لله و اطاعوا رسوله الودود، و سدّدوا الاسلام و دقّروا اهل  
الصدود. هواهم دواء لکل داء، و وُدّهم محصل لکل مراد و اهواء. رحمهم  
الله و روح ارواحهم، و اکرمهم و اعلا اسماءهم.

وصل طرس مسطور، ام دوح ممطور سواده علا المسک العطر،  
وسطوره عطل سمط اللؤلؤ و سلک الدرر. مطلعہ مروح الارواح، مرآہ  
کاسرا لهمم کراح رحراح. ملحه مصلح الکلام کالملاح للطعام. الملك  
الکامل الحلال، العالم العامل. سماء العلم و العمل، المعلم للمعلم الاول. کرم  
لا عد لا لآئه، سمح لا حد لعطائه. کلامه و کلامه الصحاح الاعلام  
کالهطل و الرهام او المدره و العوام. لم لا؟ و کلام الملوک ملوک الکلام.

ملک عطاؤہ مطر ہامر، وسماحہ سمر سائر. کلامہ حلو و سلامہ سلو.  
 لله درک! ما أحلا کلامک و رعاک الله ما اعلى اعلامک. صدر امرک  
 المحکم لا سطر الطرس عاطلاً کمر سومک الاکرم. وهاا ملک العصر!  
 امله کما هو الامر، و احرر لک الحال کما هو امرک. أ امام اهل الکمال!  
 حال مملوکک حال مسرور، لا أود لسداده و الحمد لمالک الامور.  
 و صالح حال اهله و اولاده، و رهطه و سواده. امله حاصل و سروره کامل.  
 حساده حصدوا، و أعداؤه کمدوا. الا هو حر و لولائک مملوک، و درهمه  
 لوسم و دک مسکوک. الا و اساه لعدم و صالک السار، و أساءه مراک  
 المروح للروح و الکاسر للهموم الامرار. ادعولک اسحاراً و آصالاً. و أسأل  
 لک علواً و کما لا. أطاح الله حسادک، و سد د عمادک. و مد عمرک  
 و طولہ، و أعطى مرادک و حصله، مادام رعد و سماء، و مطروماء، و مارڈ  
 و کلاء، و ورد و سلاء.

والمدرس الاول حله ما حلّ مسه کسر مؤلم، و دهمه هم مد لهم. رحم  
 لسوء حاله الاسود و الاحمر، و أكده الدهر کداً و هو ادهى و أمر. و الحال  
 سدد أوده، و معدهمه و کمدہ. و اطر د امره و حلامره.  
 و السؤدد محمد المکرم الاسعد، عادل الا حوال، سالم الا وصال.  
 و اع لا سرار کلامک، و طالع لمطالع مرامک.  
 و للمملوک أوصل له سلام الملك الهمام، و هو أعاد السلام مع  
 الاکرام. و دعا لعلو کلمک و لسمو اعلام حکمک. سلمک الله و أو  
 صلک مدى الکمال و اعلاه. و السلام مع الاکرام. (۱)

(ترجمہ از مولانا عبدالرشید صاحب بستوی و ابوالحسن ارشد کاندھلوی سلمہ)

ترجمہ: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو لائق حمد، تمام چیزوں کا مالک، اپنے

(۱) فرائد الدهر مولوی کریم الدین پانی پتی ص: ۴۰۵ (مطبع العلوم دہلی: ۱۸۴۷ء)

بندوں سے محبت کرنے والا، ذات و صفات میں یکتا، ہمیشہ رہنے والا بے نیاز بادشاہ ہے، جس نے بغیر ستون کے آسمان کی چھت بلند کی، جس کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے، باقی رہنے والی ذات صرف اسی کی ہے، اس کی تمام کیفیات کے ساتھ اس کا ادراک محال ہے، نہ اصحاب حال اس کا ادراک کر سکے اور نہ اہل کمال کو اس کا سراغ لگا، اس کا راستہ ہر شخص کے لئے آسان ہے، اس کا انصاف ہر اس شخص کے لئے ہلاکت کا سامان ہے جس کے لئے ہلاکت مقدر ہے۔

اس کا حکم مستحکم ہے، اس کا حلال کردہ حلال اور حرام کردہ حرام ہے، جس کو اس نے اپنے دربار سے دھتکار دیا وہ مردود ہے اور جو اس کے نزدیک سعادت مند ہے وہ اسے محبوب اور ہر دل عزیز ہے، اس کا قصد و ارادہ موجب غم بھی ہے اور باعث مسرت بھی، اس کے فیصلہ کو کوئی ٹال نہیں سکتا، خوش بختوں کو اس نے عزت دی اور علماء کو علم سے نوازا، اس کی ہر منشا پوری ہوتی ہے، اس کی حکمتوں کے سمندر کا کوئی ساحل اور کنارہ نہیں، وہ راز ہائے سربستہ سے واقف، بندوں کی ضروریات پوری کرنے والا، اشیاء کی قیمت مقرر کرنے والا، شہروں اور ملکوں کا مالک بنانے والا، صبح اور شام کو اس کے وقت پر برابر لانے والا ہے، اس کے یہاں ہر امیدوار مراد کو پہنچتا ہے، کوئی سائل محروم نہیں ہوتا۔

اے اللہ اپنے محبوب بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ٹھکانہ بہتر بنا جن کا نام نامی اسم گرامی احمد اسم باسمی یعنی قابل تعریف ہے، جن کی تعریف کرنے والا ہر شخص کی نظر میں قابل تعریف ہے، جس کی وہ تعریف کر دیں وہ ہر مداح کے نزدیک قابل ستائش ہے، جن کی رفعت اور بلندی سماک (ایک ستارہ کا نام) اور لولاک ہے، جن کا طور آسمان بالا ہے، جو حمد کے علم برادر، عزت کی جگہوں کے مالک، انصاف کے راستے پر چلنے والے، اسلام کا راستہ ہموار کرنے والے اور اللہ کے ان معزز محبوب اور سعادت مند کامل بندوں میں سب سے زیادہ اس کے نزدیک موردِ الطاف و عنایات ہیں۔

جنہوں نے ایک اللہ کے سامنے جبین نیاز خم کر دی، اس کے محبوب پیغمبر کی فرماں برداری کی، اسلام کو استحکام بخشا، اصحاب زلیغ و ضلال کو ہلاک و برباد کیا۔ جن کی محبت ہر

بیماری کی دوا اور ہر خواہش و مراد کے حصول کی ضامن ہے۔ اللہ رب العزت اپنے ان محبوب بندوں پر رحم فرمائے، ان کی روحوں کو پاکیزہ بنائے اور انہیں ہر طرح کی عزت اور بلندی سے ہمکنار فرمائے۔

مکتوب صحیفہ موصول ہوا جس کی روشنائی مشک و عنبر پر فائق ہے، جس کی سطروں کے سامنے موتیوں کی لڑیاں گرد ہیں، اس کی آمد روح افزاء اور دیدار غم غلط کرنے کا سامان ہے، اس کے لطیفے کلام کی اصلاح کا ذریعہ ہیں جیسے نمک کھانے کے لئے، یہ صحیفہ اس عالم باعمل شہنشاہ معظم کا ہے جس نے علم و عمل کو رفعت دی جو معلم اول کا معلم ہے، جس کی بے پایاں نعمتوں اور بخششوں کو شمار میں نہیں لایا جاسکتا، جس کا کلام مسلسل برسنے والی بارش کے مانند کثیر النفع ہے، اس میں حلاوت اور شیرینی ہے، اور ایسا تو ہونا ہی چاہئے کیوں کہ بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوا کرتا ہے۔

اللہ آپ کی حفاظت فرمائے، آپ کا حکم صادر ہوا کہ آپ کے معزز مکتوب کی طرح اپنی صورت حال آپ کے سامنے رکھ دی تو اے شہنشاہ زمانہ! آپ کے حکم کے مطابق اس کا املاء کرو گا اور بہ تعمیل حکم صورت حال تحریر کروں گا:

آپ کے اس غلام (یا مملوک العلی) کا حال بہتر ہے الحمد للہ! کسی طرح کی کوئی وقت اور پریشانی نہیں ہے، گھر والے، بال بچے، خاندان کے لوگ بخیریت ہیں امیدیں برآئی ہیں، رنج و غم نام کی کوئی چیز نہیں ہے، حاسد موت کے گھاٹ پہنچ چکے ہیں، دشمن غمزدہ ہیں۔ میں آزاد ہوں مگر تیری گرم گتیریوں کا غلام ہوں، پیسوں پر تیری محبت کا نقش قائم ہے، تیری خوش کن ملاقات، اور رحمت پروردگار ہے جو ازالہ غم کا سامان ہے۔ محرومی کے باعث مغموم ہوں، صبح و شام تیرے لئے دعا گو ہوں، تیری بلندی اور کمال کا خواہاں ہوں، اللہ تیرے حاسدوں کو ہلاک کرے، تجھے رفعت عطا کرے، عمر دراز کرے اور جینک دنیا قائم رہے اور کائنات کی نیرنگیاں اور رعنائیاں برقرار رہیں تیری ہر مراد پوری ہوتی رہے۔

مدرس اول کو تو پیش آنا تھا، آچکا، تکلیف دہ مصیبت کی اچانک آمد نے تاریک کر دیا، ان کے حال پر سرخ و سیاہ سب ہی کو ترس آیا۔ زمانے نے ان کو پریشان کر دیا،

زمانہ تو شاطر اور تلخ ہوتا ہی ہے۔ ایام موجودہ نے ان کی کچی ٹھیک کردی، ان کا رنج و الم کا فور ہو گیا۔ ان کا معاملہ اب ٹھیک ٹھاک ہو گیا، ان کی تلخی بھی اب شیریں ہو چکی ہے۔ سربراہی (مولانا) محمد (دہلوی) کیلئے زیبا ہے، جو سب سے زیادہ خوش بخت، جن کے حالات سب سے زیادہ درست، جسمانی اعضاء ہر بیماری سے محفوظ ہیں۔ جو آپ کے کلام کے اسرار و رموز سے واقف ہے، آپ کے طلوع گاہ سلطنت کا نیرتاباں ہے۔

مملوک العلی کو شاہ معظم کا سلام پہنچا، اس نے بھی نہایت عزت و احترام سے جواب دیا، آپ کی شہرت، اقتدار اور حکومت کی بلندی کی دعاء کی۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے اور آپ کو کمال کی بلندیوں تک لے جائے۔ والسلام مع الاکرام۔

### مشکل الفاظ کے معنی

سمک البناء: بلند کرنا، اونچی بنانا۔ دعام جمع دعم: ستون کھمبا حرور دھوپ، آگ۔ امد جمع آماد: انتہا۔ داماء: جنگلی چوہے کا بل اور وہ مٹی جسے چوہا اپنے بل سے نکالتا ہے، جمع دوام۔ مسعر: سحر النار: آگ تیز کرنا، شعلہ زن کرنا۔ اسعار: واحد سعر: بھاؤ، ریٹ۔ اوطار مفرد وطر: حاجت و ضرورت۔ اصال واحد اصیل: شام، شام کا وقت۔ امل احدا: امید باندھنا، توقع رکھنا۔ حرم حرم رجل اشیناً: محروم کر دینا۔ سماک: ایک روشن ستارے کا نام ہے۔ طور جمع اطوار: حال۔ اوداء واحد ودید: دوست عاشق۔ سددوا: سدد الأود: کچی درست کرنا، ہموار کرنا۔ روح: خوشبو لگانا، خوشبودار بنانا۔ طرس: جمع طروس و اطراس: تحریر، خط روح مفرد روحہ: تناور اور لمبا چوڑا درخت۔ سمط: جمع سموط: بڑی جس میں موٹی پر ویا جائے۔ راح: تیز و تند ہوا۔ رحواح: وسیع و عریض۔ ملح مفرد ملحة: لطیفہ، دل چسپ بات۔ حلاحل: بہادر، بے باک۔ صحاصح: واحد صحصاح و صحصوح: محقق، ہر بات کی کھوج کر پید کرنے والا۔ هطل: هطل المطر: ہلکی ہلکی بارش ہونا۔ رهام: مفرد رھمة: ترشح جو مسلسل پڑے۔ مدرہ:

سربر آوردہ شخص . ہامر: ہمر الماء: پانی گرنا۔ سلو: سامان تسلی۔ املہ: املا  
 شیئاً: لکھنا، نوٹ کرنا۔ اود: کچی ٹیڑھاپن۔ حصد الروح: جان لینا، قتل کرنا۔  
 کمدوا: کمد الرجل: شدید رنج میں مبتلا ہونا۔ دسم: چربی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ  
 ”وسم“ واو سے ہو۔ تو اس کا معنی نشان اور داغ ہے۔ دونوں یہاں درست ہو سکتے ہیں۔  
 مسکوک: سکہ ڈھالنا۔ امرار: مفرد مر: تلخ، کڑوا۔ مارڈ: بلند چیز (پہاڑ)  
 أسلاء: گھٹیا اور گندی چیز (گندگی) مدلہم: گھنا، پھیلا ہوا، بہت زیادہ۔ اکڈ: فلانا:  
 دھتکارنا، راندہ درگاہ کرنا۔ امر: تلخ ترین۔ معد الحزن: غم دور ہونا۔ اوصال: مفرد  
 وصل: جوڑ، بند۔ مدی: انتہا، چوٹی۔



## باب (۱۵)

### مولانا مملوک العلی کے اردو کے چند اہم خطوط

**چند وضاحتیں** | مولانا مملوک العلی کی تصانیف اور مؤلفات کی طرح مولانا کے اور تحریری آثار بھی بہت کم معلوم ہیں۔ مؤلفات و تراجم کے علاوہ مولانا کے کل دس گرامی نامے اس وقت تک دریافت ہوئے ہیں، جن میں سے ایک خط عربی میں ہے جو اوپر نقل ہوا اور نو خطوط اردو میں ہیں۔ اردو کے یہ تمام خطوط مولانا نے دہلی کالج کے پرنسپل، اپنے افسر اعلیٰ، ایک علم دوست شخصیت اور معروف جرمن مستشرق، اسپرنگر (ALOYS, SPRENGER) کو لکھے تھے۔ یہ خطوط کئی پہلوؤں سے اہم اور لائق مطالعہ ہیں اور مولانا کی اردو کی بے تکلف ذاتی تحریر کا پہلا دستیاب نمونہ ہیں، انہی خطوط کے ذریعہ سے مولانا کو کلکتہ میں ملازمت کی پیش کش اور اس کے متعلقات روشنی میں آتے ہیں اور ان سے اس دور کی بعض نادر معلومات اور علمی سرگرمیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔

ان خطوط سے جو ایک اور بڑی بات معلوم ہوتی ہے اور خاص رہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر اور بڑے علماء علمی بلکہ دینی معلومات میں بھی ذہنی تحفظات اور تعصب سے بہت دور تھے، وہ علمی کاموں میں ہر ایک کی بلا تامل مدد اور رہنمائی فرماتے تھے اور جن کتابوں کے متعلق اندازہ ہوتا کہ ان کی اشاعت مفید اور ضروری ہے ان کیلئے ایسے غیر مسلم اور عیسائی اہل علم اصحاب کو بھی توجہ دلاتے رہتے تھے جو علمی دنیا میں سرگرم تھے اور ملک کے اعلیٰ طباعتی ادارے ان کی دسترس میں تھے، اور یہ عالی مرتبت حضرات اپنے چھوٹوں کی ہر طرح سے مدد ہمت افزائی اور تعاون کرتے رہتے تھے۔

ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ اگرچہ اسپرنگر کے نام خطوط میں مولانا نے اسپرنگر کے

علمی مقام اور منصب کی رعایت کرتے ہوئے مناسب کلمات استعمال کئے ہیں، مگر اس میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جس سے اسپرنگر کے غیر ضروری احترام، خوشامد، اسپرنگر کی برتری کا، اپنی کم مائیگی کا یا اس طرح کا کوئی اور احساس جھلکتا ہو۔

یہ تمام خطوط اسپرنگر کے ذاتی کاغذات میں جرمنی کی شہرہ آفاق لائبریری (Deutsche Staatbibliothek) میں چھپے ہوئے پڑے تھے، پاکستان کے نامور محقق جناب محمد اکرام صاحب چغتائی نے اس اہم لائبریری میں خاصا وقت گزارا، اسپرنگر کے سب کاغذات تفصیل سے دیکھے اور اس ذخیرہ میں حضرت مولانا مملوک العلی اور اس عہد کے ممتاز علماء اور مشاہیر کے جو خطوط موجود تھے ان کی نقول حاصل کیں، اور پھر ان پر بہت محنت سے مفصل حاشیے لکھے۔ جس میں مکتوب نگاروں کے احوال، خطوط کے مندرجات کی تحقیق و تفصیل اور کثیر حوالے درج ہیں۔ یہ تمام خطوط چغتائی صاحب کے شکر یہ کے ساتھ یہاں پیش کئے جا رہے ہیں، حواشی راقم سطور نے لکھے ہیں، جن میں چغتائی صاحب کی معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے، چند اضافے یا تصحیح و ترمیم راقم سطور نے بھی کی ہے۔

مکتوب کی ترتیب چغتائی صاحب کی ترتیب سے کسی قدر مختلف ہے

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ زیر نظر مکتوبات کی ترتیب جناب محمد اکرام چغتائی صاحب کی ترتیب سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہ کل نو خط ہیں، جن میں پہلے پانچ خطوط کی ترتیب، تاریخ تحریر اور مضمون کے لحاظ سے درست ہے، مگر اسکے بعد کی ترتیب صحیح نہیں، مولانا مملوک العلی کے پیش نظر مکتوبات میں سے مکتوب نمبر ۴ مکتوبہ ۱۶ جولائی ۱۸۵۰ء (۶ رمضان ۱۲۶۶ھ) سے مکتوب نمبر ۸ تک جس کو چغتائی صاحب نے مکتوب نمبر ۵ ستمبر ۱۸۵۰ء (شوال ۱۲۶۶ھ) قرار دیا ہے، کل چار خط ایسے ہیں جن میں کلکتہ کی ملازمت اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے، مگر غالباً ان خطوط میں سے ایک دو خطوں کی تاریخ تحریر میں کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ وہ خط جس کو چغتائی صاحب نے مکتوب نمبر ۶ قرار دیا

ہے (مکتوبہ ۱۹ اگست ۱۸۵۰ء) ۱۰ شوال ۱۲۶۶ھ وہ دراصل آٹھویں خط کی جگہ آنا چاہئے، کیوں کہ جو خط چغتائی صاحب نے آٹھ نمبر پر درج کیا ہے وہ ۵ ستمبر ۱۸۵۰ء (۲۷ شوال ۱۲۶۶ھ) کا لکھا ہوا ہے اور چغتائی صاحب کی ہی تحقیق کے مطابق وہ تھارنٹن (Thorionton) کے نام درخواست ملازمت ہے۔ اور چغتائی صاحب نے جو خط نمبر ۶ پر درج کیا ہے اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ دہلی کالج کی انتظامیہ نے مولانا کی ایک سال کی درخواست رخصت بھی منظور نہیں کی، اسلئے مولانا نے کلکتہ جانے اور مدرسہ عالیہ کی ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا ہے، اسپرنگر کے نام مولانا نے ایک خط میں لکھا ہے:

”لیکن بہت افسوس ہے کہ وہ درخواست منظور نہ ہوئی اور صاحب بہادر کو بھی اس امر کا افسوس ہوا، لہذا سب اہل رائے اور جمیع دوستوں کی عقل میں اس صورت میں کہ رخصت ایک سال کی بھی نہ ہو، چھوڑنا روزگار مدرسہ دہلی کا واسطے درخواست عہدہ کلکتہ کے مناسب نہیں، اور اغلب ہے کہ آپ کی رائے بھی ان سب کی رائے کے موافق ہوگی اور احقر کو بیچ نہ بھیجنے کی درخواست کے معاف اور معذور تصور فرماویں گے، اور آپ نے اپنے عنایت نامہ میں ارقام فرمایا کہ مجھے اس امر میں سفارش کرنے کا اختیار نہیں، ورنہ پھر احقر مکلف اس امر کا ہوتا کہ واسطے ایک ہی برس کے حضور سفارش فرماویں تاکہ کسی طرح احقر ہمراہی حضور سے محروم نہ رہے، لیکن اب حسرت اور افسوس سے کیا عرض کرے۔ واجب تھا عرض کیا۔“ (۱)

اس خط کی تاریخ تحریر چغتائی صاحب نے ۱۹ اگست ۱۸۵۰ء (۱۰ شوال ۱۲۶۶ھ) نقل کی ہے، اس خط سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا کو اسپرنگر سے توقع تھی کہ وہ مولانا کے لئے کالج کی انتظامیہ اور بڑے افسران سے سفارش کریں گے مگر اسپرنگر نے لکھ دیا:

”مجھے اس باب میں سفارش کا اختیار نہیں“

اس لئے مولانا نے کلکتہ کی ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا اور اس قصہ سے یکسو ہو گئے۔ اس واقعہ کا اس خط میں ذکر ہے۔ چغتائی صاحب نے اس کے بعد جو خط درج کیا ہے نمبر ۷ پر، اس کی تاریخ کتابت ۵ ستمبر ۱۸۵۰ء (۲۷ شوال ۱۲۶۶ھ) لکھی ہے،

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۷۴

اس خط کا ضمیمہ مکتوب نمبر ۸ ہے جو تھارن ٹن کے نام رخصت کی درخواست ہے، جس کے ساتھ اسپرنگر کی سفارش کی مولانا کو توقع تھی، لہذا یہ بات بالکل صاف ہے کہ مکتوب نمبر ۶ کی تاریخ تحریر ۱۹ اگست ۱۸۵۰ء (۱۰ شوال ۱۲۶۶ھ) میں کچھ غلطی ہے، کتابت کی غلطی ہو اور یہ بھی غیر متوقع نہیں کہ خود مولانا مملوک العلی سے تاریخ غلط لکھی گئی ہو، بہر حال میرا خیال ہے کہ اس خط کی صحیح تاریخ تحریر غالباً ۱۹ ستمبر یا ۱۹ اکتوبر ہوگی، بظاہر ۱۹ ستمبر (۱۲ ازی قعدہ ۱۲۶۶ھ) ہے کیوں کہ اس خط کے بعد تھارن ٹن کو درخواست بھیجنے اور اسپرنگر سے سفارش کی مکرر درخواست قطعاً نامناسب تھی، لہذا خطوط کی چغتائی صاحب کی پیش کی ہوئی ترتیب میں کسی قدر ترمیم ضروری معلوم ہوتی ہے، راقم سطور نے چغتائی صاحب کی ترتیب میں درج چھٹے خط کو بالکل آخر میں ذکر کیا ہے، آٹھواں خط ساتویں کا گویا ضمیمہ ہے اور جو خط آخر میں تھا وہ چھٹے خط کی جگہ پیش ہے۔ امید ہے کہ مضامین کے مندرجات کی روشنی میں یہی ترتیب صحیح ہوگی۔

ب: چغتائی صاحب نے خطوط کی نقل میں کئی موقعوں پر مولانا مملوک العلی کے طرز تحریر کی پابندی کی ہے، مگر چونکہ یہ املاء اور طریقہ تحریر اب بالکل اجنبی اور متروک ہے اس لئے راقم نے پرانے املاء کو ترک کر دیا ہے، مضمون جوں کا توں ہے۔

## مکتوب اول

غریب پرور، سلامت!

کتاب ”اصطلاحات“ مصنف کے ہاتھ کی، جس کا ذکر میں نے حضور سے کیا تھا، نام اس کا ”کشاف اصطلاحات الفنون“ ہے (۱) احقر کے گمان میں مقدار اس کی قاموس سے کم نہیں اور وہ کتاب وطن (۱) میں بعض دوستوں (۲) کے پاس ہے۔ اگر خدا چاہے اب کی بار امتحان کے بعد جو وطن کو جاؤں گا، اس کتاب کو مالک سے مستعار لے کر اپنے

(۱) کشاف اصطلاحات الفنون، اصطلاحات علوم و فنون پر قاضی محمد علی تھانوی (وفات ۱۱۹۱ھ، ۱۷۷۷ء) کی شہرہ آفاق کتاب ہے۔ مولانا مملوک العلی نے اس کا نسخہ مصنف، مولانا ابوالحسن ..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

ہمراہ لاؤں گا، بعد ملاحظہ کے صاحب کو نقل اس کی لکھوانے کا اختیار (۳) ہے، واجب تھا عرض کیا۔ فقط

مملوک العلی

مدرس اول مدرسہ دہلی

۱۲ نومبر ۱۸۴۶ء (۲۴ رزی قعدہ ۱۲۶۲ھ)

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... (خلف حضرت مفتی الہی بخش) کاندھلوی کے پاس دیکھا تھا، اس کا اسپرنگر سے ذکر کیا، اسپرنگر کو اس کے مطالعہ کا اشتیاق ہوا، مولانا مملوک العلی نے یہ نسخہ کاندھلہ سے منگا کر اسپرنگر کو دکھایا، اسپرنگر نے اس کی نقل کرائی اور کچھ تصحیح و اضافہ کے بعد کلکتہ سے شائع کرانے کا اہتمام کیا۔

ان مکتوبات کے حواشی میں کشاف اصطلاحات الفنون کے حوالہ سے محمد اکرام چغتائی صاحب کی بعض اطلاعات درست نہیں، مفصل معلومات اور قاضی محمد علی کے متعلق فرد گزاشتوں کی وضاحت کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون قاضی محمد علی تھانوی۔ مؤلف ”کشاف اصطلاحات الفنون احوال و آثار“ جو سب سے پہلے سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد پاکستان (محرم، ربیع الاول ۱۴۱۰ھ اکتوبر دسمبر ۱۹۸۹ء) میں چھپا تھا، بعد میں جزوی ترمیمات یا اضافوں کے ساتھ اور رسائل میں بھی شائع ہوا۔ اس مضمون کا خلاصہ کشاف اصطلاحات الفنون کی پاکستانی اشاعت (سہیل اکیڈمی، لاہور: ۱۴۱۳ھ) میں بھی شامل ہے۔

(۱) وطن سے وطن کا نواح مراد ہے، مولانا کا وطن نانوتہ تھا اور یہ کتاب نانوتہ کے قریب کاندھلہ میں تھی، جیسا کہ ذکر ہوا۔

(۲) دوستوں سے مولانا ابوالحسن کاندھلوی کی طرف اشارہ ہے، مولانا کے مختصر احوال و تعارف کے لئے ملاحظہ ہو:

۱۔ نزہۃ الخواطر (بالاعلام بما فی الہند من الاعلام) مولانا عبدالحمید حسنی (حیدرآباد : رائے بریلی) جلد ۸ ۲۔ حالات مشائخ کاندھلہ۔ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی ۳۔ مضمون راقم سطور مشمولہ ضمیر امداد المشتاق مولانا تھانوی (دہلی: ۱۹۸۱ء)

(۳) اسپرنگر نے مولانا کے مشورہ کے مطابق کشاف اصطلاحات الفنون کے نسخہ مصنف کی نقل کرائی تھی جو مطبوعہ نسخہ کی اساس ہے۔ یہ نقل مولوی کریم الدین پانی پتی نے کی تھی۔

## مکتوب دوم

غریب پرور سلامت!

پر و انہ حضور کا پہنچا سر بلند کیا۔ مضمون اس کا مولوی محمد مظہر (۱) کو لکھ بھیجوں گا، خط مولوی صاحب موصوف کا لکھا ہوا، ۲۶/شوال کا آیا تھا، لکھا تھا کہ بہ سبب کثرت بارش کے چلنا قافلہ کا نہیں ہو سکتا، شاید ۱۵/زدی قعدہ تک چلنا ہو، اغلب ہے کہ اب وہ قافلہ (۲) چل لیا ہوگا، لیکن اور خط نہیں آیا۔ لکھا تھا کہ بسبب گراں فروشی اور بے پروائی تاجر کے اور نیز بسبب دور ہونے مکان کے میں خریدنے میں کتب کے انتظار جواب کا نہ کر سکا اور میں اول دہلی میں اور بعد ازاں وطن میں اور بعد اس کے بنارس (۳) میں پہنچوں گا۔ خلاصہ مضمون خط کا یہ تھا، لیکن وہ خط ان کے والد (۴) کے پاس بھیج دیا، اس سبب بعینہ نقل اس کی نہیں لکھی۔ (۵)

(۱) مولانا محمد مظہر: خلف لطف علی بن محمد حسن نانوتوی۔ مولانا مملوک العلی کے چچا زاد بھائی کے بیٹے تھے، ۱۲۳۷ھ (۲۲-۱۸۲۱ء) میں ولادت ہوئی، محمد مظہر تاریخی نام ہے۔ مولانا مملوک العلی اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے تعلیم حاصل کی، چند کتابوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہم سبق رہے، مولانا عبدالغنی مجددی سے حدیث پڑھی۔ تعلیم کے بعد بنارس کے سرکاری اسکول میں مدرس ہوئے، متعدد علمی کام اور مدرسہ مظاہر علوم دینی یادگار ہے۔ ۲۴/زدی الحجہ ۱۳۰۲ھ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں وفات ہوئی۔

(۲) قافلہ سے مراد حاجیوں کا قافلہ ہے۔ مولانا محمد مظہر ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء کے اواخر میں رخصت لیکر حج کیلئے گئے تھے، یہ مولانا کا پہلا سفر حج تھا جس کا مولانا پر لکھی گئی تحریروں اور مضامین میں ذکر نہیں ملتا۔

(۳) مولانا بنارس کالج میں مدرس تھے رخصت لیکر حج کے لئے گئے تھے، رخصت ختم ہونے کا وقت آ رہا تھا اس لئے مولانا سفر حج سے واپسی پر پہلے بنارس جانا چاہتے تھے تاکہ ملازمت پر اپنی حاضری درج کرا دیں۔

(۴) شیخ لطف علی بن محمد حسن صدیقی نانوتوی، نانوتہ کے تین برگزیدہ علماء (مولانا محمد مظہر، مولانا محمد احسن اور مولانا محمد منیر) کے والد ماجد تھے، افسوس ان کے حالات معلوم نہیں۔ ۱۲۷۹ھ میں نانوتہ کے ایک بڑے قافلہ کے ہمراہ حج کے لئے گئے، ۱۶/ربیع الاول ۱۲۸۰ھ (یکم ستمبر ۱۸۶۳ء) کو سفر حج سے واپس آتے ہوئے وفات ہوئی۔ مکتوب حضرت مولانا گنگوہی بنام حافظ اللہ دیا کاندھلوی۔ شمولہ تبرکات، مرتبہ نور الحسن راشد کاندھلوی ص: ۲۹ (کاندھلہ: ۱۳۹۵ھ)

(۵) پیش نظر ماخذ، ایک نادر مجموعہ مکاتیب (ص: ۵۸) میں یہ لفظ اسی طرح لکھا ہوا ہے، بہ ظاہر یہ "اس سے" ہوگا، یعنی اس سے پہلے جو..... اور ممکن ہے کہ اسے ہی ہو، اسے یعنی مولانا محمد مظہر کو؟

پہلے اسے جو حضور نے واسطے طلب ”بخاری شریف“ اور ”جامع ترمذی“ کے حکم بھیجا تھا، احقر نے ”جامع ترمذی“ ٹیلر صاحب (۱) کی خدمت میں بھیجی تھی اور واسطے نہ دینے ”بخاری شریف“ کے یہ عذر کیا تھا کہ اگر کوئی لکھنؤ میں اسکی نقل چھاپے تو ہمارا نقصان متصور ہے، جب صاحب بہادر نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب بہادر اقرار کرتے ہیں کہ ہم وہ کتاب کسی کو نہ دیں گے تو پانچ سپارے ”بخاری شریف“ کے جس قدر چھپے تھے، (۲) صاحب بہادر کی خدمت میں آپ پہنچائے تھے اور اپنا عذر بھی عرض کیا تھا، سوانھوں نے آپکو لکھا ہوگا۔

ترمذی انشاء اللہ تین مہینے میں یا کچھ زیادہ میں تمام ہوگی، دو ورق روز چھپتے ہیں (۳) اور چھپنا بخاری شریف کا ابھی ملتوی ہے، بعد تمامی اس کتاب کے شروع ہوگا، جب حضور تشریف لاویں گے، ملاحظہ سے گزرے گا۔

احقر کو ہر وقت خیال عنایت اور اخلاق حضور کا رہتا ہے اور زبان پر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد تر ملاقات نصیب فرماوے، واجب تھا عرض کیا۔ فقط

مملوک العلی

مدرس اول ۱۹ اکتوبر ۱۸۴۸ء (۱۳ رذی الحجہ ۱۲۶۴ھ)

(۱) ایچ، جے، ٹیلر (H.J. Taylor) دہلی تعلیمی کمیٹی کے سکرٹری تھے۔ ٹیلر کی رپورٹ اور فرمائش پر دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا تھا، ٹیلر دہلی کالج کے پہلے عارضی پرنسپل مقرر کئے گئے بعد میں بھی پرنسپل رہے اور انگریزی شعبہ کے صدر آخری دن تک تھے۔ ۱۸۵۷ء میں آزادی کی تحریک کے دوران دیہاتیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ مرحوم دہلی کالج ص: ۱۳۶-۱۳۹۔

(۲) بخاری شریف، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے صحیح بخاری شریف پر جو گراں بہا حاشیہ لکھا تھا اس کا اور اس کی طباعت کا ذکر ہے۔ اس نسخہ کی سرسید احمد کے بھائی سید محمد کے مطبع سید الاخبار دہلی میں، جمادی الاول ۱۲۶۴ھ (مئی ۱۸۴۸ء) میں طباعت شروع ہوئی جو بعد میں مولانا احمد علی کے مطبع احمدی میں منتقل ہوئی تھی، دونوں جلدیں اسی پریس سے چھپیں۔ ۱۲۷۰ھ، ۱۸۵۴ء میں جلد ثانی کی طباعت مکمل ہوئی۔ ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

(۳) ترمذی کی اس طباعت کا ذکر ہے، جو مولانا احمد علی کی تصحیح و حواشی اور مولانا مملوک العلی کی تصحیح و نظر ثانی کے بعد ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) میں مطبع العلوم دہلی کالج اور مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوئی تھی اور جو مولانا مملوک العلی کے علمی باقیات میں ممتاز ترین یادگار ہے، تعارف مولانا کی تصنیفات میں گذر گیا۔

## مکتوب سوم

غریب پرور

پروانہ حضور کا پہنچا معزز اور سر بلند کیا۔ مکان مولد شریف (۱) کا جو احقر نے پچشم خود دیکھا ہے۔ بموجب اپنی یاد کے حقیقت اس کی عرض کرتا ہوں، کہ وہ مکان جانب شرقی میں بلدہ طیبہ مکہ کے واقع ہے۔ بالفعل وہاں کچھ آثار پہاڑ کے نہیں، ایک کوچہ میں دہنی طرف دروازہ مکان کا ہے، زمین کوچہ کی بلند ہے اور مکان نشیب میں ہے، کئی سیڑھی اتر کر مکان میں داخل ہوتے ہیں، اس میں ایک حجرہ ہے، اس کا دروازہ بہت بڑا ہے، اس کے اندر بوریوں اور غالیچوں کا فرش ہے، اس کی زیارت کرتے ہیں اور وہاں نماز پڑھتے ہیں اور دعاء مانگتے ہیں، اور ایسا ہی مولوی احمد علی صاحب (۲) کو یاد ہے۔

(۱) مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم: یہ رشک کائنات مبارک و اقدس مکان سوق اللیل میں واقع ہے، جو شعب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایک حصہ ہے، اسی محلہ میں بنو ہاشم رہتے تھے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مکان عقیل ابن ابی طالب کو ہبہ کر دیا تھا۔ مولانا مملوک العلی ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں ایام حج کے قریب مکہ مکرمہ پہنچے تھے اور جب ۱۲۶۰ھ (اگست ۱۸۴۴ء) میں دہلی واپس آ گئے تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ مولانا کے یہ مشاہدات ۱۲۶۰ھ کے ابتدائی مہینوں (جنوری مارچ ۱۸۴۴ء) کے ہوں گے، اس وقت سے تقریباً ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۰ء) تک یہ مبارک و بابرکت گھر اسی طرح تھا، جس کی مولانا مملوک العلی نے ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں زیارت کی تھی۔ محمد لیب البتونی نے اس مکان کا جو آنکھوں دیکھا تعارف لکھا ہے وہ مولانا مملوک العلی کی اطلاع کے قریب قریب ہے۔ جب اس کی مولانا مملوک العلی اور مؤلف الرحلۃ الحجازیہ نے زیارت کی اس وقت یہ مکان سڑک سے تقریباً ڈیڑھ میٹر نیچا تھا، میڑھیوں سے اتر کر اندر جاسی ہوتی تھی۔ ملاحظہ ہو: الرحلۃ الحجازیہ ص: ۵۲ (مصر: ۱۳۲۹ھ) مولد مقدس، یہی ہیئت اور کیفیت ابراہیم زفعت پاشا نے (مرآة الحرمین: ج ۱ ص: ۱۸۶) میں لکھی ہے۔ مگر اب نہ وہ قدیم عمارت موجود ہے نہ اس کے آثار و نشانات محفوظ، آج کل یہاں مکتبہ مکہ مکرمہ اور وزارت الحج والاوقاف کی عمارت ہیں۔

(۲) حضرت مولانا احمد علی: خلف شیخ لطف اللہ انصاری، سہارنپوری۔ تقریباً ۱۲۲۵ھ، ۱۸۱۰ء میں ولادت ہوئی، متعدد علماء سے تعلیم حاصل کی۔ شاہ محمد اسحاق اور مولانا وجیہ الدین سہارنپوری سے اجازت حدیث حاصل کی۔ تمام عمر خدمت درس حدیث کی مشغولی میں بسر فرمائی۔ ۶ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ ۱۷ اپریل ۱۸۸۰ء شنبہ میں سہارنپور میں وفات پائی۔ مولانا احمد علی کا برصغیر کے ممتاز ترین خادمان حدیث و سنت میں بہت اونچا مقام ہے، مولانا نہ صرف برصغیر بلکہ عالم اسلام کے وہ سب سے پہلے عالم ہیں ..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....



لیکن شعب ابوطالب کا احقر کو حال معلوم نہیں اور نہ کوئی جا وہاں بالفعل اس نام سے مشہور ہے، اور جو تاریخ کی کتابوں میں ہے، آپ کو خوب معلوم ہے (۱)۔  
احقر خدا تعالیٰ کی جانب سے صحیح و سالم و تندرست ہے۔ اکثر اوقات تذکار عنایتوں حضور کا بزبان رہتا ہے۔ واجب تھا عرض کیا۔ فقط  
عرضی ۲۶/ (مہینہ درج نہیں) ۱۸۳۹ء (۶۶-۱۲۶۵ھ)

### مملوک العلی مدرس اول

اس صفحہ کے اوپر مولانا مملوک العلی نے اپنے ہاتھ سے مندرجہ ذیل نقشہ بنایا ہے اور اس میں جو عبارتیں ہیں وہ بھی مولانا مملوک العلی کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں۔  
(سمتوں کی وضاحت نور الحسن راشد نے کی ہے۔)

نقشہ مبارکہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... جنہوں نے حدیث کی کتابوں کی سخت محنت، دقت نظر اور محققانہ ژرف نگاہی سے تصحیح کر کے ان کے چھپوانے پر توجہ فرمائی، مولانا کی خدمات ایک بڑی کتاب کا موضوع ہیں۔ مختصر تعارف کیلئے ملاحظہ ہو: ۱۔ تذکرہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری مرتبہ جناب سید محبوب رضوی صاحب دیوبند ۲۔ مضمون راقم سطور نور الحسن راشد شامل ضمیرہ امداد المصنق ۳۵۲-۳۶۵۔ دہلی ۱۹۸۱ء

(۱) اسپرنگر اس وقت سیرت پر ایک کتاب لکھ رہا تھا جو ۱۸۵۱ء میں الہ آباد سے شائع ہوئی اور ممتاز عہد ثابت ہوئی، اسپرنگر کو اس کتاب کیلئے ان معلومات کی ضرورت تھی۔

		مغرب		
	کوچہ	دروازہ مکان	حجرہ بیرونی	حجرہ اندرونی
جنوب	اس طرف اہل کوچہ کے مکان ہیں	یہاں دیوار میں ایک جالی لگی ہے، باہر سے اندرونی مکان کے نظر جاسکتی ہے		حجرہ اندرونی جس میں آکر لوگ نماز پڑھا کرتے ہیں
		مشرق		

اس کاغذ کی دوسری جانب یہ عبارت ہے۔

”عرضی مملوک العلی مدرس اول، یہ عرضی بیچ خدمت صاحب بہادر والا مناقب  
ڈاکٹر الویس اسپرنگر صاحب بہادر اقبالہ گزار نہیں“

### مکتوب چہارم

غریب پرور!

عنایت نامہ حضور کا بیچ خط مولوی علی اکبر کے پہنچا، باعث سرفرازی اور سر بلندی کا  
ہوا۔ نواب بڈھے صاحب سے بیچ مقدمہ خرید کتب معرفت احمد علی کتاب فروش کے  
میں نے کہلا بھیجا ہے اور فہرست کتابوں کی طلب کی ہے، جب فہرست آوے گی اور قیمتیں  
معیین ہوں گی، ان کے حال سے حضور کو مطلع کروں گا۔

ان دنوں دہلی میں گرمی شدت ہے اور مہینہ رمضان کا شروع ہوا ہے، روزہ داروں کو  
چلنا پھرنا اور بات چیت کرنا دشوار ہے، اس جہت سے جواب اب تلک حاصل نہیں ہوا، اور

تاریخ حلبی (۱) بموجب ارشاد کے ہمراہ احقر کے ہوگی۔  
 وہ جو بیچ خط مولوی اکبر احقر کے حق میں ارشاد ہے کہ ہم کو اختیار تھا کہ تم کو جلد تر کلکتہ  
 کو روانہ کریں، ہماری رائے میں دیر مناسب ہے۔ سورائے احقر کی حضور کے مطابق ہے،  
 اگر چلنا احقر کا بمعیت حضور کے ہو یا بعد تشریف فرمائی حضور کی روانگی احقر کی صورت  
 پکڑے تو مناسب تر ہے، بالجملہ پہنچنا احقر کا وقت تشریف رکھنے حضور کے کلکتہ میں احقر کی  
 دانست میں بہت اچھا ہے۔ (۲)

پہلے حضور نے ٹیلر صاحب بہادر کی چٹھی میں لکھا تھا کہ ہم نے تیری طرف سے  
 درخواست لکھ بھیجی ہے، اب مشہور ہے کہ وہ درخواست منظور ہوئی اور قرآن کلام حضور کے  
 بھی اس مطلب پر دال ہیں، لیکن اگر حضور صاف صاف حال منظوری یا عدم منظوری احقر کا  
 لکھ بھیجیں، تا بموجب اسکے فکر سفر کا یا حضر کا کروں، یا جو کچھ اس باب میں حکم ہوا ہو اس  
 سے مجھے اطلاع ہو تا کہ اگر چہ عرض معروض مناسب ہو تو عمل میں آوے، غرض اس عرض  
 سے یہ ہے کہ اس عرضی کے جواب حالی میں مفصل تحریر فرماویں۔

اور جب حضور دہلی تشریف لاویں گے سب حال اپنا عرض کروں گا، اور حسب ارشاد  
 حضور کے چلنے کی صورت بندھے گی۔ زیادہ بجز اشتیاق ملاقات کے کیا عرض کرے۔ فقط!  
 مکرر عرض یہ ہے کہ مولوی محمد مظہر (۳) بامید پرورش حضور کی دہلی میں موجود ہیں،  
 اگر حضور کو ان کا خیال رہے گا تو بندہ نوازی اور پروردہ داری سے بعید نہ ہوگا۔ زیادہ لکھنے کی  
 حاجت نہیں کہ: ”خواجہ خود روش بندہ پروری دارد“ فقط

مملوک العلی مدرس اول، ۱۶ جولائی ۱۸۵۰ء (۶ رمضان ۱۲۶۶ھ)

(۱) تاریخ حلبی، صحیح سیرت حلبی۔ انسان العیون فی سیرۃ النبی الامین المامون تالیف شیخ نور الدین علی بن ابراہیم بن احمد  
 حلبی (ولادت ۹۷۵ھ، ۱۵۶۷ء وفات ۱۰۴۳ھ ۱۶۳۵ء) جو حلبیہ کے نام سے مشہور ہے اور سیرت کی اہم کتابوں میں شمار  
 کی جاتی ہے۔ الاعلام زر کلی ص: ۲۵۱ ج: ۳ طبع رابع بیروت (۱۹۷۹ء) سیرت حلبیہ کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔  
 (۲) کلکتہ میں مولانا مملوک العلی کی ملازمت کی بات چلی تھی، اسپر نگر چاہتے تھے کہ مولانا جلد سے جلد کلکتہ پہنچیں، مگر یہ  
 منصوبہ پورا نہیں ہو سکا تھا، اس لئے مولانا کلکتہ نہیں گئے۔  
 (۳) مولانا محمد مظہر (نانوتوی) کا تعارف گذر گیا ہے۔

## مکتوب پنجم

غریب پرور!

عنایت نامہ حضور کا دستخطی معہ چٹھی اسی موٹ صاحب (۱) بہادر سکریٹری کونسل مدارس کی معرفت ٹیلر صاحب بہادر کے بیسویں جولائی کو احقر کے پاس پہنچا، معزز اور ممتاز کیا۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپکی رائے میری رائے کے موافق ہو تو اپنی درخواست معہ میری چٹھی جلد نہ بھیجیں، سو یہ تاخیر احقر کے نزدیک بہت مناسب ہے، بعد حصول جواب اس عرضی کے عشرہ اخیرا گت تک اگر خدا نے چاہا درخواست اپنی معہ حضور کی چٹھی کے بھیجوں گا۔ اور وہ بیچ باب پہنچے احقر کے اواخر اکتوبر کے اور بھیجنا اپنا اوسط نومبر میں ارقام ہوا ہے، احقر کے عندیہ میں بھیجنا احقر کا کلکتہ میں پہنچ لئے حضور کے مناسب تر ہے، آئندہ جو حکم ہوگا عمل میں آوے گا۔

احقر سب طرف سے بخیاں معیت حضور کی خوش و خرم ہے، لیکن ایک امر موجب خلجان طبیعت کا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو اپنے مزاج کا حال بیچ زبان آئندہ کے معلوم نہیں ہوتا، تو خوف اس امر کا ہے کہ مبادا بعد بھیجنے کلکتہ کے بسبب عدم موافقت آج وہو کے یا کسی اور امر کے احقر کو وہاں کاروزگار چھوڑنا پڑے اور اس صورت میں روزگار مدرسہ دہلی کا کہ احقر کے واسطے بمنزلہ وطن ہو رہا ہے مفت ہاتھ سے جاتا رہے، تو واسطے رفع اس خوب کے اور حصول اپنے اطمینان حضور کی عنایت اور مہربانی سے امید رکھتا ہوں کہ حضور سعی اور کوشش فرماویں کہ گورنمنٹ سے احقر کے لئے حکم ہو جائے کہ مجھے اختیار رہے، دو برس تک اگر چاہوں تو پھر اپنے عہدہ پر دہلی کے مدرسہ میں آ جاؤں۔

اور چونکہ احقر نے چھبیس برس (۲) مدرسہ دہلی میں طلبا کی خدمت کی ہے اور اگر

(۱) موٹ صاحب، فریڈرک جان موٹ (John Mouat) ۱۸۱۶ء میں پیدا ہوا، ہندوستان کے مختلف طبی اور فوجی عہدوں پر کام کرتا رہا، بنگال کی کونسل برائے تعلیم کا ممبر تھا۔ اس نے ہندوستان کی جدید تعلیم گاہوں کی ابتداء اور ترقی پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۷۲

(۲) دہلی کالج کی ابتداء جون ۱۸۲۵ء (شوال ۱۲۴۰ھ) میں ہوئی، ..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

مدرسوں میں پنشن کا دستور ہوتا تو استحقاق پنشن کا حاصل کیا ہے تو احقر کے حق میں بجائے پنشن کے ہونا اس حکم کا اس مدت میں جب چاہوں اپنے عہدہ پر آ جاؤں، بعید دور شناسی سے نہیں، اور بدون مدت دو برس کے حال موافقت آب و ہوا کا معلوم ہونا دشوار ہے۔ اس لئے کہ بدون رہنے ایک برس کے جو چار موسموں پر مشتمل ہے اور ہر موسم کی ہوا کا مزاج جدا ہے، موافقت آب و ہوا کی مزاج سے معلوم نہیں ہو سکتی اور پانچ چھ مہینے آنے جانے میں اور ایک دو مہینہ سامان سفر وغیرہ میں صرف ہوتا ہے تو اس لئے بدون اجازت مدت دو برس اطمینان طبع حاصل اور بدون سعی اور سفارش حضور کی، اس مدت کی اجازت احقر کو میسر نہیں ہو سکتی، احقر امیدوار جواب اس عرضی کا ہے۔

منشی اشرف علی صاحب (۱) سے حال نقل کروانے کتاب الاغانی (۲) کا پوچھا گیا انہوں نے کہا تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے چند روز میں تمام ہو جائے گی، اور الفاظ الادویہ (۳) کے مقدمہ میں یہ معلوم ہوا کہ سید محمود صاحب (۴) نے بشرکت کسی اور صاحب کے

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... اس وقت مولانا مملوک العلی یہاں مدرس دوم مقرر کئے گئے تھے، بعد میں مدرس اول ہو گئے اور عملاً سربراہ بھی وہی تھے۔ وفات (۱۱/۱۱/۱۲۶۷ھ اکتوبر ۱۸۵۱ء) تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے، مولانا کی کل مدت ملازمت چھبیس سال ہے۔

(۱) سید اشرف علی واسطی: غالباً ۱۷۹۰ء (۵-۱۲۰۳ھ) کے قریب پیدا ہوئے، تعلیمی حالات اور ذاتی کوائف دستیاب نہیں۔ اشرف علی کا دہلی میں پریس تھا بعد میں یہ مطبع دہلی کالج میں منتقل ہو گیا تھا اور اس کا نام مطبع العلوم ہو گیا تھا۔ اس پریس میں مولانا مملوک العلی اور مولانا سبحان بخش شکار پوری کا بھی حصہ اور شرکت تھی، اشرف علی کے مزید حالات نہیں ملتے۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۱۸۳ تا ص: ۱۹۸۔

(۲) اسپرنگر کو کتاب الاغانی (ابوالفرج اصبہانی) کا ایک نسخہ ملا تھا، وہ اس کی نقل کرانا چاہتا تھا، اس نے یہ کام اشرف علی کے سپرد کیا تھا، اشرف علی نے یہ نسخہ (خانوادہ شیخ عبدالحق کے آخری دور کے ایک عالم) مولانا سالم کے فرزند عبدالرزاق سے نقل کرایا، شوال ۱۲۶۶ھ (اگست، ستمبر ۱۸۵۰ء) میں یہ نقل مکمل ہو گئی تھی، اب یہ کتاب اسپرنگر کے ذخیرہ (برلن، جرمنی) میں محفوظ ہے۔ نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۷۲، ۷۳۔

(۳) الفاظ الادویہ، نور الدین محمد قرشی شیرازی کی معروف کتاب ہے۔ (مؤلفہ ۱۰۳۸ھ) یہ کتاب مطبع العلوم، دہلی سے ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں چھپی تھی، اسپرنگر کو اسی نسخہ کی ضرورت تھی۔

(۴) مطبوعہ نسخہ میں اسی طرح لکھا ہوا ہے، ممکن ہے سید محمد صحیح ہو جو سید احمد کے چھوٹے بھائی تھے، انکی ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ دسمبر ۱۸۴۵ء میں وفات ہوئی، تاریخ صحافت اردو، امداد صابری ص: ۲۲۵ جلد اول (دہلی: ۱۹۶۷ء)

چھپوائی تھی اور سب کی سب حاجی رستم علی سوداگر کے ہاتھ بیچ دی تھی، لیکن بازار میں تلاش سے مل سکتی ہے، انشاء اللہ ایک نسخہ حضور کے واسطے خرید کر کے اور جلد بنوا کر ہمراہ رکھوں گا، اور ہمراہ لے جانا صندوق کتابوں کا الہ آباد تک جہاں تک بنے گا، حسب الحکم عمل میں آوے گا، اطلاعاً عرض کیا۔ فقط

مملوک العلی مدرس اول

۲۲ جولائی ۱۸۵۰ء (۱۲ رمضان ۱۲۶۶ھ)

## مکتوب ششم

غریب پرور سلامت!

ارشادات حضور کے زبانی ٹیلر صاحب بہادر کے احقر نے سنے، حسب موقع اور بجا ہیں حسب الارشاد عرضی درخواست رخصت کی بنام تھارن ٹن صاحب (۱) بہادر کے ملفوف ہے۔ اگرچہ کچھ عبارت کی کمی بیشی منظور ہو تو اصلاح فرما کے مولوی علی اکبر سے اور عرضی لکھوایئے۔

اور احقر نے بلحاظ اس امر کے کہ شاید بسبب طویل مدت کے رخصت منظور نہ ہو ایک ہی سال کی رخصتی کی درخواست لکھی ہے، لیکن بدون ایک سال کی رخصت حال آب و ہوا کا معلوم نہیں ہو سکتا، امیدوار ہوں کہ جب حضور نے میری پرورش کے لئے اپنے اوپر بوجھ سفارش کا اٹھایا تو واسطے رخصت ایک سال کے سفارش کیجئے، یعنی میری درخواست اس عرضی کے بموجب منظور کروادیتجئے۔

شاید حضور کو گمان ہوا کہ احقر نے درخواست رخصت کی واسطے عذر کے کی ہے۔ اس میں، میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر احقر کو عذر منظور ہوتا تو عذر اور بہت تھے، اگر آپ

(۱) اس وقت تھارن ٹن نام کے کئی شخص تھے، اس لئے صحیح اندازہ نہیں کہ یہ کون سا تھارن ٹن ہے۔ غالباً یہ ایڈورڈ تھارن ٹن (Edward Thorionton) ہوگا جو ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوا، ۱۸۷۵ء میں فوت ہو گیا، اس نے ہندوستان کی تاریخ لکھی اور کئی گزیر بھی مرتب کئے۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۷۶۔

انصاف سے نظر فرمادیں گے تو احقر کو اس امر میں معذور جانیں گے، مجھ جیسے کو اگر روزگار مدرسہ چھوٹ جائے تو ویسا روزگار کہاں میسر ہو سکتا ہے۔ اس جہت سے یہی چاہتا ہوں کہ در صورت جانے کلکتہ کے اطمینان طبع حاصل رہے۔ واجب تھا عرض کیا۔ احقر کو آج ہی ارشاد حضور کا پہنچا، آج ہی عرضی لکھ کر واسطے جلدی کے معرفت ٹیلر صاحب بہادر کے روانہ کی ہے۔ واجب تھا عرض کیا۔ فقط

مملوک العلی

مدرس اول پنجم ستمبر ۱۸۵۰ء (۲۷ شوال ۱۲۶۶ھ)

## مکتوب ہفتم

غریب پرور سلامت!

بسبب خالی ہونے عہدہ ایٹنی مدرسہ کلکتہ کے ڈاکٹر اسپرنگر صاحب بہادر سے احقر زبانی درخواست اس عہدہ کی کی تھی، اور مرکز اس احقر کو یہ تھا کہ بروقت منظوری درخواست کی مدرسہ دہلی سے رخصت حاصل کر کے کلکتہ کو روانہ ہوں گا۔ اب جو صاحب بہادر نے بیچ مقدمہ تقرر احقر کے اس عہدہ پر ڈاکٹر موٹ صاحب بہادر کی خدمت میں سفارش کی اور واسطے بھیجے درخواست کے احقر کو لکھا تو احقر نے واسطے حصول رخصت کے معرفت ٹیلر صاحب بہادر قائم مقام پرنسپل مدرسہ دہلی میں گزارنی، صاحبان کمیٹی نے اس درخواست کو نامنظور کیا۔

اور احقر کو باعث حاصل کرنے رخصت کا مدرسہ دہلی سے یہ ہے کہ آدمی کو حال آئندہ کا معلوم نہیں، اگر بعد پہنچنے کلکتہ کے آب و ہوا اس شہر کی میرے مزاج سے مخالف ہو اور کوئی سبب باعث پڑے کہ مجھے ترک روزگار کا منظور ہو، تو اس صورت میں بالکل روزگار سے محروم نہ ہو جاؤں، اس لئے آپ کی عنایت اور مہربانی سے کہ اوپر سب لکھنے پڑھنے والوں کے مبذول رہتی ہے، امیدوار ہوں کہ آپ میری سفارش کو گورنمنٹ سے کر کے اجازت اس امر کی حاصل کروادیں کہ مجھے بعد پہنچنے کلکتہ میں ایک برس تک اختیار

رہے، اگر کسی سبب سے چاہوں پھر اپنے عہدہ پر آؤں، واجب تھا عرض کیا۔ الہی گلشن اقبال کا سر سبز رہے۔

مملوک العلی

مدرس اول، پنجم ستمبر ۱۸۵۰ء (۲۷ شوال ۱۲۶۶ھ)

مکتوب ہشتم

غریب پرور سلامت!

حسب ایما حضور کے کہ جو مولوی علی اکبر کے خط سے معلوم ہوتی تھی عرضی بابت رخصت کے معرفت ٹیلر صاحب بہادر کے دی تھی اور صاحب بہادر نے بسبب عرض اور معروض احقر کے سفارش بھی کی اور کچھ دلیلیں بھی لکھیں، لیکن بہت افسوس ہے کہ وہ درخواست منظور نہ ہوئی اور صاحب بہادر کو بھی اس امر کا افسوس ہوا۔ لہذا سب اہل رائے اور جمیع دوستوں کی عقل میں اس صورت میں کہ رخصت ایک سال کی بھی نہ ہو چھوڑنا روزگار مدرسہ دہلی کا واسطے درخواست عہدہ کلکتہ کے مناسب نہیں، اور اغلب ہے کہ آپ کی رائے بھی ان سب کی رائے کے موافق ہوگی اور احقر کو بیچ نہ بھیجنے درخواست کے معاف اور معذور تصور فرمادیں گے اور آپ نے اپنے عنایت نامہ میں ارقام فرمایا کہ مجھے اس امر میں سفارش کرنے کا اختیار نہیں ورنہ پھر احقر مکلف اس امر کا ہوتا کہ واسطے ایک ہی برس کے حضور سفارش فرمادیں، لیکن اب حسرت اور افسوس سے کیا عرض کرے، واجب تھا عرض کیا۔

مملوک العلی

مدرس اول ۱۹ اگست ۱۸۵۰ء (۱۰ شوال ۱۲۶۶ھ)

اس خط کی تاریخ تحریر محمد اکرام چغتائی صاحب نے ۱۹ اگست ۱۸۵۰ء (۱۰ شوال ۱۲۶۶ھ) لکھی ہے، اگر اصل تحریر میں بھی اسی

ایک وضاحت



طرح ہے تو وہ حضرت مولانا کی سبقت قلم ہے، ممکن ہے نقل یا طباعت میں سہو ہوا ہو، بہر حال اس خط اور گذشتہ خطوط کے اندراجات کی روشنی میں یہ تاریخ تحریر صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ مولانا ۱۵ ستمبر ۱۸۵۰ء کے خط میں اسپرنگر سے سفارش کیلئے کہہ رہے ہیں اور اسی تاریخ میں موٹا کو ملازمت کیلئے خط لکھ رہے ہیں۔ اسلئے قیاس چاہتا ہے کہ یہ خط سلسلہ ملازمت کا آخری خط ہے اور یہ خط غالباً ۱۹ اکتوبر کا لکھا ہوا ہے، اگست غلطی سے لکھا گیا ہے۔

## مکتوب نہم

غریب پرور سلامت!

الطاف نامہ حضور کا پہنچا، سر بلند کیا بموجب حکم کے تین نسخہ مؤطا شریف کے بنام قائم مقام ڈاکٹر موٹ صاحب کے بدستخط پرنسپل بہادر کے، جو بلحاظ تحریر حضور کے انہوں نے کر دیئے، کل کی تاریخ میں روانہ کئے۔ یہ عرضی اس نظر سے کہ حضور ان سے ارشاد کر کے دو نسخہ واسطے مدرسہ کے خرید کریں اور ایک نسخہ بطور ہدیہ کے اپنی خدمت میں رکھیں پہلے لکھ بھیجی۔

مولوی سدید الدین خاں قریب الہ آباد کے پہنچے، خط ان کا آیا تھا بسبب مخالفت ہوا کے بجرہ سواری (۱) کا کم چلتا ہے، احقر امیدوار ہے کہ گاہ بگاہ تلافی نامہ سے مع کاروبار لائق اپنے کے سر بلند اور سرفراز ہوتا رہے۔ واجب تھا عرض کیا۔ فقط

مملوک العلی مدرس اول مدرسہ دہلی

اسپرنگر کے نام مولانا کے مذکورہ بالا خطوط کی اشاعت کے بعد مولانا کا اسپرنگر کے نام ایک خط اور ملا ہے، جس کی جناب محمد اکرام چغتائی صاحب نے راقم کو خط سے اطلاع دی ہے، مگر وہ خط ابھی تک شائع نہیں ہوا، اس لئے یہاں درج نہیں، امید ہے کہ دوسری طباعت میں شامل ہوگا۔

(۱) متوسط درجہ کی گول اور خوشنما کشتی جس میں امیر لوگ بیٹھ کر دریا کی سیر کرتے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ۔ مولوی سید احمد دہلوی ص: ۳۶۸ (دہلی: ۱۹۷۳ء)

## باب (۱۶)

مولانا مملوک العلی کی تصدیق سے مزین چند اہم فتاویٰ  
اور علمی سوالات کے جوابات

حضرت مولانا مملوک العلی کی یہی ایک حیثیت نہیں تھی کہ وہ مدرسہ دہلی (دہلی کالج) کے مدرس اور نگرانِ اعلیٰ تھے، بلکہ مولانا کا دہلی کے مقتدر علماء اور غالباً ممتاز اصحابِ فقہ و فتاویٰ میں بھی شمار تھا۔ اس لئے جب دہلی میں اہم دینی علمی تحریریں مرتب ہوئیں یا ایسے فتوے لکھے جاتے جن میں دہلی اور اطراف کے ممتاز علماء کی تصدیق ضروری یا مفید سمجھی جاتی تھی، جن کے علم و فضل، تقویٰ دیانت اور انصاف پسندی پر عوام و خواص کو اعتماد تھا، تو دہلی کے نامور علماء میں سے ایک بڑا اور معتمد نام مولانا مملوک العلی کا شامل ہوتا تھا۔

اس دور میں خصوصاً تحریک سید احمد شہید اور اس کے بعد کی اصلاحی تبلیغی جدوجہد، اس کے اثرات اور اس کے متعلق دینی مباحث پر دہلی کے بڑے علماء کے متعدد فتاویٰ نکلے جس پر خانوادہ ولی اللہی اور اس خط کے اکابر علماء کے علاوہ مولانا مملوک العلی کے بھی دستخط ثبت ہیں، جس سے حضرت مولانا کے بلند علمی مقام کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ حضرت پر دہلی کے عوام کو کس قدر اعتماد تھا، نیز ان فتاویٰ پر مولانا کی تصدیقات سے متعلقہ مسائل پر مولانا مملوک العلی کی رائے کی ایک جھلک بھی سامنے آ جاتی ہے۔

یہ تحریریں اور فتوے مختلف موضوعات پر ہیں، جن میں سے کچھ معاشرتی مسائل پر ایک دو عقائد و عبادات پر ہیں، اور ایک دو میں علمی بحثیں بھی ہیں۔ اس قسم کے چند فتووں اور تصدیقات کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

**پہلا فتویٰ** مغلوں کے دورِ زوال میں جو چند برائیاں معاشرہ میں عام ہو گئی تھیں ان میں سے ایک بڑی فروشی بھی تھی، کچھ لوگ لڑکیوں، عورتوں کی خرید و فروخت کا کام کرتے تھے، ایسی عورتیں گھروں کی خدمت اور کام کے نام پر قیمت ادا کر کے خرید لی جاتی تھیں اور خریدنے والے انکو شرعی غلام اور کنیر سمجھ کر گھروں میں رکھ لیتے تھے، یہ عورتیں گھروں کے تمام کام اور خدمات انجام دیتی تھیں اور کچھ شخص ان سے جسمانی تعلق بھی کر لیتے تھے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ برائی بہت بڑھ گئی تھی، اسلئے خاندان حضرت شاہ ولی اللہ سے وابستہ علماء نے معاشرہ کی اور برائیوں کے ساتھ اسکے خلاف بھی آواز اٹھائی اور اس موضوع پر فتوے مرتب کئے۔

منجملہ ایسے فتوؤں کے ایک مفصل اور اہم فتویٰ وہ ہے جو مولانا وجیہ الدین محدث سہارنپوری نے مرتب فرمایا تھا، یہ فتویٰ جب حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق نے ملاحظہ کیا تو اس کی تحسین فرمائی اور کہا کہ ”یہ فتویٰ میری رائے کے مطابق ہے“ نواب قطب الدین نے مولانا وجیہ الدین کے اس فتوے کا (اپنے دوست) مولانا سید نذیر حسین محدث (میاں صاحب) سے ذکر کیا، مولانا نذیر حسین صاحب نے کہا کہ اس موضوع پر شاہ محمد اسحاق صاحب کا بھی ایک (مختصر) فتویٰ ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ یہ دونوں فتوے فارسی میں تھے، نواب قطب الدین نے ان دونوں کا اردو ترجمہ کر کے ان کو ”مظہر الحق“ کے نام سے مرتب کر کے شائع کرا دیا تھا۔

مظہر الحق چھوٹے سائز (۱۲-۱۹ سٹی میٹر) کے چھپیس صفحہ کا رسالہ ہے جس میں پہلے دو صفحات کی تمہید ہے، ص ۱۵ سے ص ۱۷ تک تقریباً ڈھائی صفحہ کا شاہ محمد اسحاق کا وہ فتویٰ ہے جو مولانا نذیر حسین صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ ص ۱۷ سے ص ۲۶ تک مولانا وجیہ الدین کا فتویٰ درج ہے، اسی فتویٰ کے اختتام پر ص ۲۶ پر نواب قطب الدین، مولانا سید نذیر حسین وغیرہ دس علماء کی تصدیق درج ہے، جن میں سب سے پہلے نام اور تصدیق مولانا مملوک العلی کی ہے، جس پر مولانا مملوک العلی کی مہر بھی ثبت ہے: محمد مملوک العلی (۱)

(۱) رسالہ مظہر الحق سب سے پہلے مولانا وجیہ الدین سہارنپوری کے مطبع احمدی دہلی سے ربیع الاول ۱۲۶۰ھ (اپریل ۱۸۴۴ھ) میں چھپا تھا، اس نادر اشاعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

(۲) فتویٰ نکاح بیوگان

اس زمانہ کی بری رسموں میں سے ایک بہت بری رسم یہ تھی کہ بیواؤں کا دوسرا نکاح نہ کرتے تھے اور ان کے

دوسرے نکاح کو سخت عیب سمجھا جاتا تھا، بات یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اگر کوئی بیوہ دوسرا نکاح کر لیتی تھی تو پورا خاندان اور علاقہ اس کا مقاطعہ (Boycott) کر دیتا تھا اور جو شخص کسی بیوہ سے نکاح کر لیتا تھا اس کو بھی ہر طرح سے پریشان کیا جاتا تھا بلکہ اس کے قتل کر دینے کو بھی بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان والا شان حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ تعالیٰ اس بری رسم کو ختم کرنے کیلئے کوشش فرماتے رہے۔ اس کیلئے کئی تحریرات مرتب کیں اور فتاویٰ جاری فرمائے۔

اسی کوشش کو حضرت سید احمد شہید اور شاہ محمد اسماعیل نے تحریک بنا دیا تھا۔ سید صاحب نے اعلان اور قوت کے ساتھ اس بری رسم کو توڑا، اپنے خاندان میں بیواؤں کے نکاح شروع کرائے۔ سید صاحب کے فیض صحبت سے اور علماء بھی ادھر متوجہ ہوئے۔ متعدد علماء نے اس موضوع پر تحریرات اور فتوے تحریر فرمائے، جن میں چند فتاویٰ مشہور ہوئے اور اس جدوجہد کی کامیابی میں ان فتوؤں کا بڑا حصہ ہے۔ ایسے فتوؤں میں سے ایک مفصل فتویٰ وہ ہے جو دہلی میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے مرتب کیا تھا، یہ فتویٰ فارسی میں ہے۔ اس پر دہلی اور اطراف کے اکثر نامور علماء کے دستخط ہیں۔ سب سے پہلے دستخط مولانا مفتی صدر الدین آزر دہ کے، دوسرے مولانا مملوک العلی صاحب کے ہیں۔

مشاہیر علماء میں سے مولانا نذیر حسین میاں صاحب، مولانا نواب قطب الدین دہلوی، مولانا سید محبوب علی جعفری، مولانا شاہ احمد سعید احمدی مجددی، مولانا سبحان بخش شکار پوری، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا سید محمد دہلوی (مدرس دوم، دہلی کالج) مولانا محمد حیات دہلوی، مولانا رحمت اللہ خاں دہلوی، مولانا سعادت علی سہارنپوری (بانی مظاہر علوم سہارنپور) اور مولانا ابوالحسن کاندھلوی (مؤلف گلزار ابراہیم وغیرہ) کے دستخط ہیں۔ (۱)

(۱) یہ مجموعہ فتاویٰ رسالہ نکاح ثانی کے نام سے مطبع مطبع الرحمن: دہلی سے ۱۲۶۸ھ (مارچ ۱۸۵۲ء) میں چھپا تھا جو پیش نظر ہے۔ اس طباعت سے پہلے سولہ صفحات میں شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ ہے، آخری بارہ صفحات میں مولانا احمد علی کا فتویٰ اور اس کی تصدیقات درج ہیں۔

(۳) فتویٰ نکاح بیوگان کا اردو ترجمہ | اس فتویٰ کا اردو ترجمہ نواب قطب

الدین دہلوی نے اپنی تالیف عروس

المومنین میں درج کیا ہے، اس پر بھی یہ سب دستخط ترتیب میں معمولی تبدیلی کے ساتھ درج ہیں۔ (۱)

(۴) غیر اللہ کی خوشنودی کیلئے جانور ذبح کرنا | اس دور میں ایک بری

رسم یہ بھی تھی کہ غیر اللہ

کی عظمت و احترام میں یا اسکی خوشنودی کیلئے جانور ذبح کیا کرتے تھے جو قطعاً حرام ہے۔ خانوادہ ولی اللہی کے علماء نے اس برائی کو ختم کرنے کیلئے بھی کوشش فرمائی، اس موضوع پر بھی کئی فتوے اور تحریریں مرتب ہوئیں۔ منجملہ ان کے ایک فتویٰ مولانا سید نذیر حسین (میاں صاحب) کا بھی ہے، اس فتوے پر بھی مولانا مملوک العلی کے تائیدی دستخط ہیں، یعنی اس مسئلہ میں بھی مولانا مملوک العلی فکر ولی اللہی کے ترجمان تھے۔ یہ فتویٰ فتاویٰ نذیریہ میں شامل ہے۔ (۲)

(۵) شفاعت کی تحقیق | حضرت شاہ محمد اسماعیل کی تقویۃ الایمان پر منجملہ اور

اعتراضات کے ایک اعتراض شفاعت کے انکار کا بھی

تھا، متعدد علماء نے اس اعتراض کے جواب لکھے جن میں ایک جواب مولانا سید نذیر حسین کا ہے جو مولانا نذیر حسین نے ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹-۵۰ء) میں تحریر فرمایا تھا۔ مولانا محمد حسین فقیر بنتی دہلوی نے مولانا نذیر حسین کے اس فتویٰ کو "افضل البضاعة فی حقیقة الشفاعۃ" کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ اس تالیف پر اس وقت کے متعدد علماء کی تصدیقات، دستخط یا مہریں مثبت ہیں، جن میں ایک مہر "مملوک العلی" مدرس اول مدرسہ شاہ

(۱) عروس المومنین مطبع دار السلام دہلی سے ۱۲۶۳ھ میں چھپی تھی اس میں ص: ۲۱ سے ص: ۵۲ تک مولانا احمد علی کے لکھے ہوئے فتوے کا ترجمہ اور تصدیقات شامل ہیں۔

(۲) فتاویٰ نذیریہ (مرتبہ مولانا شمس الحق ڈیانوی و مولانا عبدالرحمان مبارکپوری) ص: ۳۱۶ جلد اول (طبع اول، دہلی۔ بلاسنہ)

جہاں آباد کی بھی ہے۔ (۱)

(۶) ایک علمی نحوی صرفی بحث کی تحقیق | دہلی ہندوستان کا اہم ترین علمی مرکز تھا، دینی فقہی سوالات کے علاوہ

خالص فنی تحقیقی مسائل اور درسی علمی کتابوں کی مشکلات کیلئے بھی دہلی کے علماء سے رجوع کیا جاتا تھا۔ دہلی کے علماء میں مولانا مفتی صدر الدین کی غیر معمولی شخصیت جملہ مباحث و علوم میں مرجع اور سند کی حیثیت رکھتی تھی، مفتی صاحب کی خدمت میں علمی سوالات کا ڈھیر لگا رہتا تھا، مفتی صاحب انکے جوابات لکھتے اور جوابات ہوتے ان پر اپنے اہم دوستوں سے (جو نامور علماء تھے) تائید و تصویب کیلئے دستخط کرا دیا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کی خدمت میں آئے ایسے دو سوالات کے جوابات پر مشتمل ایک تحریر ہے جس پر مولانا مملوک العلی کے بھی دستخط ہیں۔

اس تحریر میں دو مباحث زیر گفتگو آئے ہیں، پہلا یہ کہ غیر منصرف کو ضرورتِ شعری کی وجہ سے منصرف بنا لینا صحیح ہے یا نہیں؟ ایک طبقہ اس کو درست مانتا تھا دوسرا غلط سمجھتا تھا۔ دوسری بحث، علامہ بہاری کے قول رؤسا کے اعراب کی تحقیق پر ہے، اس میں بھی علماء اور اہل نظر کے دو قول تھے، سائل نے اس میں بھی فریقین کے دلائل کا خلاصہ نقل کیا ہے اور مفتی صاحب کا فیصلہ طلب کیا ہے، مفتی صدر الدین آزر دہ نے دونوں کے فیصلہ کن جوابات لکھے ہیں اور دونوں کے آخر میں مولانا مملوک العلی کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ (۲)

فتاویٰ میں اور علماء کے فتاویٰ اور تحریرات سے قطع نظر حضرت مولانا کی خالی رائے بھی معتبر سمجھی جاتی تھی اور مسائل و معاملات میں مولانا کی ذاتی رائے پر فیصلہ ہو جاتا تھا اور حضرت مولانا کی رائے اور مشورہ اس قدر معقول ہوتا تھا کہ بلا تکلف سمجھ میں آ جاتا تھا اور اس پر فتویٰ دے دیا جاتا تھا۔ ایک واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد

(۱) یہ اشاعت دور مسائل پر مشتمل ہے افضل البضاعة اور القول الفاضل بین الحق والباطل، مؤخر الذکر رسالہ مولانا محمد حسین فقیر بنی دہلوی کی تالیف ہے، یہ مجموعہ مطبع قادری دہلی سے ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۸ء) میں چھپا تھا۔

(۲) یہ تحریر پروفیسر مولوی محمد شفیع نے دریافت کی تھی جو اورینٹل کالج میگزین لاہور اگست ۱۹۶۲ء میں چھپی تھی اور جناب عبدالرحمن پرواز اصلاحی کی تالیف مفتی صدر الدین آزر دہ میں بھی شامل ہے۔ ص: ۱۷۶-۱۸۴ (دلی: ۱۹۷۷ء)

گنگوہی سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ:

”حضرت بندوق سے جو شکار کیا جائے اور وہ بلا ذبح کئے صرف گولی لگنے سے

مر جائے اس کو اکثر مالکیہ آج کل حلال کہتے ہیں اور ابناء زمان علماء کو بھی اس میں تردد ہے، بظاہر تیر مارے ہوئے کے مثل معلوم ہوتا ہے۔

حضرت نے ارشاد فرمایا لوگوں کو اسکی حلت کا اس وجہ سے شبہ ہوا کہ فقہ میں احراق بالنار کو قاطع لکھا ہے اور اسی بنا پر بندوق کی گولی کو بھی محرق اور قاطع سمجھ کر بعض علماء نے حلت کا فتویٰ دیا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ مولانا مملوک العلی صاحب سے ہم نے اس کو دریافت کیا تھا فرمایا کہ روئی پر نشانہ لگاؤ معلوم ہو جائے گا۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا، گولی پار ہو گئی اور روئی کچھ نہ جلی، سو گولی توڑنے والی ہے محرق نہیں ہے، جب تک ذبح نہ کیا جائے بندوق کا شکار حلال نہیں۔ (۱)

(۱) تذکرۃ الرشید ص: ۱۳۹ ج: اول (سہارنپور: ۱۹۷۷ء)

## باب (۱۷)

چند اہم دینی علمی کتابوں کی تصنیف و اشاعت میں  
حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کا حصہ

حضرت مولانا دہلی کالج سے وابستگی اور اپنی بے پناہ تعلیمی تدریسی مشغولیتوں کے علاوہ اس وقت کی جملہ دینی علمی خدمات میں بھی خاصا حصہ رکھتے تھے۔ اہم علمی کتابوں کی تصنیف و اشاعت کے لئے علماء اور اشاعتی اداروں سے برابر روابط رکھتے تھے اور مختلف اہم ترین یا کسی پہلو سے ضروری موضوعات پر تصنیف و تالیف کی ضرورت یا کتابوں کے شائع کرانے کے لئے توجہ دلاتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا کی کوشش اور توجہ سے کئی اہم کتابیں لکھی گئیں یا شائع ہوئیں، یہ سب کتابیں برصغیر (ہندو پاکستان وغیرہ) کے دینی علمی ورثہ کا ایک اہم حصہ اور اس ذخیرے پر قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کتب و مطبوعات کا ذکر کئے بغیر مولانا کی علمی تصنیفی خدمات کا تذکرہ نا تمام رہے گا، اسلئے یہاں ان کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا مملوک العلی کے زمانہ  
تعلیم میں شیعہ مجتہدین  
و مصنفین خوب سرگرم تھے،  
اہل سنت کے نظریات

مولانا مملوک العلی کے اصرار پر مولانا  
رشید الدین خاں کی بعض تصانیف کی تالیف

و معتقدات کی تردید میں کثرت سے لکھ رہے تھے، ادھر سے مولانا رشید الدین خاں انکے  
جوابات تحریر فرماتے تھے اور چونکہ شیعوں کے اثرات اور یہ بحثیں لکھنؤ کے گلیاروں سے گزر



کردہلی میں قلعہ معلیٰ کے ایوان تک پہنچ گئی تھیں اور جگہ جگہ اسکے چرچے اور مناظرے ہو رہے تھے، بڑے بڑے خاندان شیعہ ہو رہے تھے اور اس بلا سے دہلی کے اطراف خصوصاً حضرت مولانا مملوک العلی کا وطن نانوتہ اور دیوبند وغیرہ بھی کسی قدر متاثر ہو گئے تھے اسلئے اس موضوع سے مولانا مملوک العلی کی دلچسپی قدرتی تھی۔ شیعیت کے اثرات ختم یا کم کرنے کیلئے دہلی اور نانوتہ میں مولانا کی خدمات کا تذکرہ مجھے نہیں ملا، لیکن دہلی اور نواح کے جو علماء اس موضوع پر درجہ استناد رکھتے تھے اور واقع کتابیں لکھ رہے تھے، ان میں سے ایک بڑے عالم حضرت مولانا رشید الدین مولانا کے استاد تھے۔

مولانا رشید الدین نے شیعہ مجتہدین کے اعتراضات و تصانیف کے جوابات میں کئی کتابیں لکھیں، جن کے وزن اور دلائل کو محسوس کیا گیا اور آج تک اس کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ مولانا رشید الدین خاں کی ان تصانیف میں اور محرکات کے علاوہ مولانا مملوک العلی کی فرمائش اور خوشنودی خاطر کا خیال بھی کار فرما رہتا تھا اور ممکن ہے کہ ان کتابوں کی تالیف و ترتیب میں مولانا مملوک العلی کی خدمت اور تعاون بھی شامل رہتا ہو۔ مولانا رشید الدین خاں کی ایک اہم تصنیف ”صولت غنفریہ“ کے متعلق صراحت ہے کہ مولانا رشید الدین نے یہ کتاب (اپنے شاگرد) مولانا مملوک العلی کی پاس خاطر سے تصنیف کی تھی کریم الدین پانی پتی نے (جو مولانا مملوک العلی کا شاگرد اور دہلی کالج کا مشہور طالب علم ہے) لکھا ہے:

”ایک روز متعہ میں کتاب لکھی ہے جس کا نام صولت غنفریہ رکھا ہے، یہ کتاب

مولوی مملوک العلی مدرس اول حالی مدرسہ دہلی کے پاس خاطر سے تصنیف کی تھی“ (۱)

جب شیعیت کا فتنہ علمائے

خاندان حضرت شاہ ولی

اللہ اور تحریک حضرت سید

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اہم تصنیف

ازالۃ الاوہام کی طباعت کا اصرار اور کوشش

احمد شہید کی بدولت فرو ہو اور اس طرف سے کسی قدر اطمینان ہوا، تو ایک اور تحریک آندھی

(۱) تذکرہ فرائد الدہر ص ۳۰۱

طوفان کی رفتار سے بڑھنے لگی، یہ عیسائیت کی تبلیغ اور پادریوں کی طرف سے اسلام اور قرآن مجید پر اعتراضات، مناظروں اور گلی کوچوں میں عیسائیت کی منادی اور تشہیر کا سلسلہ تھا، علمائے اسلام نے اس نئی آفت کا بھی نہایت ہوشمندی اور علم و استدلال کے موثر ہتھیاروں سے مقابلہ کیا، عیسائیوں کے اعتراضات کے ہر پہلو سے الزامی تحقیقی جوابات لکھے، عیسائی مبلغوں پادریوں سے مناظرے کیلئے آگے آئے۔ عیسائیوں نے اسلام پر اعتراضات اور تصنیف و رسائل کا جو سلسلہ شروع کیا تھا ان میں سے پادریوں کی تین کتابوں میزان الحق پادری فنڈر (C.G.PFANDER) بروق لامعہ، تالیف پادری اور تغلیب المطامن، کو بنیادی اہمیت حاصل تھی، کچھ عیسائیوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ ان کتابوں کے مصنفین نے اسلام اور قرآن شریف وغیرہ پر جو اعتراضات کئے ہیں، علمائے اسلام کیلئے انکے جوابات دینے مشکل ہوں گے، مگر علمائے اسلام جو بفضلہ تعالیٰ علم و کمال سے مالا مال اور عیسائیوں کے تمام مذہبی سرمایہ اور تصانیف کے حافظ اور محقق تھے، انھوں نے ان کتابوں کے ایسے جوابات لکھے کہ عیسائیوں کو شرمندہ ہونے اور ان جوابات کی حقانیت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہوا۔

منجملہ اور علماء کے حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی نے بھی عیسائیت کے مطالعہ اور پادریوں کی تصانیف و اعتراضات کے جوابات پر توجہ فرمائی، حضرت مولانا نے سب سے پہلے درج بالا تینوں کتابوں کے جوابات لکھے پھر پادریوں کے تمام اعتراضات دستیاب کئے اور ان کے جواب میں فارسی میں ایک بڑی اور مفصل کتاب ”ازالۃ الاوہام“ تصنیف فرمائی، ان کتابوں میں سے ہر ایک اپنے موضوع کی دستاویز اور عیسائیت پر ضرب کاری کی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت مولانا کی اول الذکر تینوں کتابیں اگرچہ شائع نہیں ہوئی تھیں مگر علمائے اسلام اور عیسائیوں میں ان کا خوب چرچا تھا، ان کی نقلیں عام ہو گئی تھیں اور پادریوں نے بھی ان کے دلائل کی اہمیت اور گہرائی کو تسلیم کیا تھا۔ اس لئے جب رد عیسائیت پر مولانا رحمت اللہ کی چوتھی اور بڑی کتاب ”ازالۃ الاوہام“ کی تصنیف کی خبر عام ہوئی تو اس کا

مسلمانوں میں استقبال ہوا اور عیسائی اس کے جواب کی فکر اور تیاری کرنے لگے۔  
 دہلی کے اکابر علماء کو اس کا تقاضہ ہوا کہ ازالۃ الاوہام جلد سے جلد چھپ جائے تاکہ  
 عیسائیوں کو منہ کھولنے کی گنجائش نہ رہے۔ جو علماء ازالۃ الاوہام کی اشاعت کے لئے فکر مند  
 اور سرگرم ہوئے ان میں حضرت مولانا مملوک العلی بہت نمایاں تھے۔ مولانا مملوک العلی  
 مولانا رحمت اللہ کو بار بار خط لکھتے اور ازالۃ الاوہام کا مسودہ شائع کرنے کیلئے بھیج دینے کی  
 فرمائش کرتے تھے، مولانا مملوک العلی کے اصرار پر مولانا رحمت اللہ صاحب نے ازالۃ  
 الاوہام کو چھپوانے کا ارادہ کر لیا تھا، مگر چونکہ یہ معلوم تھا کہ ازالۃ الاوہام کے چھپتے ہی  
 عیسائی فاضل اور پادری اس کے جوابات کی فکر کریں گے، اس لئے مولانا رحمت اللہ  
 چاہتے تھے کہ کوئی ایسا بڑا عالم جو اور علوم میں تبحر کے علاوہ عیسائیت پر بھی گہری علمی نظر رکھتا  
 ہو ازالۃ الاوہام کو تنقیدی اصلاحی نظر سے دیکھ لے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے بہت غور  
 و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ازالۃ الاوہام کی تصحیح اور اس کے مضامین و مستدلات پر علمی تحقیقی  
 نظر ڈالنے اور اس کے وزن کو پرکھنے کے لئے مولانا نور الحسن کاندھلوی سے بہتر کوئی عالم  
 اور صاحب نظر نہیں ہے، اسلئے مولانا رحمت اللہ نے ازالۃ الاوہام کا مسودہ مولانا نور الحسن  
 کے پاس پہنچوایا اور اس کے ساتھ ایک خط بھی لکھا جس میں اس کتاب کی وجہ تالیف اور  
 مولانا مملوک العلی کے اس کتاب کو چھپوانے کے لئے بھیج دینے پر اصرار کا ذکر ہے۔ اس  
 گرامی نامہ کی چند سطر میں یہاں نقل کی جاتی ہیں جس سے حضرت مولانا مملوک العلی کی  
 رد عیسائیت سے دلچسپی اور ازالۃ الاوہام کی طباعت کے تقاضہ اور اہتمام کا علم ہوگا، مولانا  
 رحمت اللہ نے مولانا نور الحسن کے نام گرامی نامہ میں لکھا ہے:

”و خدام جناب حضرت مولانا مملوک علی صاحب بذریعہ عنایت نامہ وہم  
 بوساطت زبانی آئندگان آں صواب ”رسالہ ازالۃ الاوہام“ را کہ از تالیفات  
 کمترین خلایق است، بارادہ طبع او طلب می فرمایند، و خشک جانی و بے جوہری احقر را  
 اگرچہ بعض اولی الابصار بخوبی واقف اند لیکن بندگان مولانا منعم بہ سبب این کہ این  
 بے نصیب گاہے در محفل فیض مشاغل شان استفادہ نہ برداشتہ و قوف کما ینبغی از کم

استعدادی اسے ہیچ میرزندارد۔

ازیں جہت از ارسال آں توفی بکار رفت کہ مبادا جناب مولانا پس ملاحظہ اش خیال طلب کردہ و بحیہ رضیہ بزرگان را کار فرمودہ خطا ہا را پوشیدہ بقالب طبع در آند و بعدش زلات و خطایا اسے سراپا خطا دست آویز بر مخالف عید گردد، و از اکثر اشخاص مرا وسیلہ چشم پیش داشتن شود۔ اسے کار خوردن بہر حال شیوہ محمود۔

و علاوہ ازیں چند متصران را مثل باسٹرام چند رو غیرہ را ارادہ رد آں بعد دستیابی نسخہ اش در دل موجود۔ زیادہ تر احتیاط بکار بردن را واجب می سازد۔

و دریں ضلع سوائے ذات مصدر حسنات دیگر کدائے نیست کہ دریں باب از ذاتش استصلاحا استفسارے دریں باب تعمیل آید لہذا اکثر اجزائش کہ بمقابلہ و نظر ثانی در آمدہ اند روانہ خدمت والامی شوند بشرط فرصت لہذا و لرسولہ نظرے بر آن فرمائند و جائیکہ بجهت کوتہی استعدادم خطائے سرزد شدہ اصلاح نمایند و اگر شومی طالع ام کل قابل محو باشد و بہ فحوائے لن يصلح العطار ما افسدہ الدهر اصلاحش بغایت شاق بر ذات مقدس باشد تا ہم شرف اطلاعی رود کہ آں چنان اورا گم کنم کہ مانند عنقا احدے بعدش جز ناش نشود، و از پوستان کردن خلایق امنیتی بدست آید۔ (۱)

ترجمہ: جناب کے خادم حضرت مولانا مملوک علی صاحب بذریعہ عنایت نامہ اور اس طرف سے آنے والوں کے زبانی پیام سے بھی ”رسالہ ازالۃ الاوہام“ کو جو اس کمترین خلایق کی تالیفات سے ہے طباعت کے لئے طلب فرما رہے ہیں اور احقر کی خشک جانی، اور بے جوہری سے اگرچہ بعض اہل بصیرت بخوبی واقف ہیں۔ لیکن مولانا مفتحم کی عالی ذات کو (چونکہ اس بے نصیب کو کبھی انکی فیض رسا مجلس سے استفادہ کا موقع نہیں ملا) پورے طور پر اس انجان کی کم استعدادی سے واقفیت نہیں،

(۱) مولانا رحمت اللہ صاحب کا یہ خط اس مجموعہ مکاتیب میں شامل ہے جس میں مولانا نور الحسن صاحب کے فرزند مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان نے مولانا نور الحسن صاحب کے نام اس عہد کے مشاہیر علماء مولانا مفتی صدر الدین آزرہ، مولانا فضل حق خیر آبادی وغیرہ کے مکتوبات جمع کئے ہیں، یہ خط حالات مشائخ کاندھلہ تالیف مولانا احتشام الحسن کاندھلوی۔ ص: ۱۳۷ تا ص: ۱۳۸ (طبع جدید کاندھلہ، ۱۳۱۷ھ) وغیرہ میں نقل ہوا ہے۔

اس وجہ سے اس رسالہ کو بھیجنے میں توقف ہو رہا ہے کہ مبادا حضرت مولانا اسکو ملاحظہ کے بعد محض اپنی طلب کی بناء پر (بزرگوں کی پسندیدہ عادت کے موافق) خطاؤں کو نظر انداز فرما کر طبع کرادیں اور بعد میں اس سراپا خطا کی خطائیں اور لغزشیں مخالف دشمن کیلئے دستاویز بن جائیں اور اکثر لوگوں سے میری نگاہ نیچی کرنے کا ذریعہ بنے۔ یہ ذلت اٹھانا بھی ہر حال میں پسندیدہ شیوہ ہے۔

اور اس کے علاوہ چند نصرانی جیسے ماسٹر رام چندر وغیرہ اس کے نسخہ کی دستیابی کے بعد اس کی تردید کا دل میں ارادہ رکھتے ہیں جس کی وجہ سے بہت زیادہ احتیاط برتنا ضروری ہو جاتا ہے۔

”اور اس ضلع میں سوائے ذات مصدر حسنات کے کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں ہے کہ اسکی ذات سے اس موضوع پر اصلاح طلب کی جائے اور اس بارے میں استفسار کیا جائے۔ لہذا کتاب کا اکثر حصہ جس کا مقابلہ اور نظر ثانی ہو چکی ہے خدمت والا میں روانہ کیا جاتا ہے۔ بشرط فرصت اللہ اور رسول کے لئے اس پر (اصلاحی) نظر فرمائیں ملاحظہ فرماویں اور جہاں میری کم استعدادی کی وجہ سے کوئی خطا سرزد ہوگئی ہو اس کی اصلاح فرماویں۔ اور اگر میری بدبختی سے سب قابل مجوہو اور موافق لن يصلح العطار ما افسده الدهر کے اس کی اصلاح جناب والا کے لئے انتہائی دشوار ہو، تب بھی مجھے اطلاع سے مشرف فرماویں، تاکہ پھر اس کو اس طرح غائب کروں کہ عنقا کی طرح کوئی اسکے بعد اس کے نام کے علاوہ نہ سنے اور مخلوق کے چیرہ دستی سے نجات ملے“

ازالۃ الاوہام ۱۲۶۷ھ میں لکھی گئی تھی، تکمیل کی تاریخ کی صراحت نہیں، مگر غالباً ۱۲۶۷ھ کے ابتدائی مہینوں میں کسی وقت مکمل ہوئی ہوگی اور اس وقت سے مولانا مملوک العلی نے اس کا مسودہ طباعت کیلئے دہلی بھیج دینے کیلئے خط لکھنے شروع کر دیئے تھے، مولانا مملوک العلی کے اصرار کی وجہ سے مولانا رحمت اللہ نے یہ نسخہ تصحیح و نظر ثانی کے لئے کاندھلہ بھیجا، مولانا نور الحسن کے یہاں یہ نسخہ کب تک رہا اس کا تذکرہ نہیں ملا۔ مگر

۱۲۶۷ھ کے آخر میں مولانا مملوک العلی کی وفات ہو گئی تھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے کتاب کا مسودہ مولانا مملوک العلی کو مل گیا ہو، شاید اسی نظام و ترتیب کے مطابق ازالۃ الاوہام کی دہلی میں سرسید کے بھائی کے مطبع سید المطابع میں طباعت شروع ہوئی اور مولانا مملوک العلی کی وفات کے تقریباً پونے دو سال بعد رمضان المبارک ۱۲۶۹ء (جون، جولائی ۱۸۵۳ء) ازالۃ الاوہام کی طباعت مکمل ہو گئی تھی۔

ازالۃ الاوہام بڑے سائز کے پانچ سو چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے حاشیہ پر مولانا آل حسن موہانی کی مشہور کتاب ”استفسار“ بھی چھپی ہے، اس لئے اس کی طباعت میں دیر ہو جانا غیر متوقع نہیں تھا۔ اگر مولانا مملوک العلی کی زندگی وفا کرتی تو یہ کتاب مولانا کے سامنے چھپ کر آ جاتی۔ لہذا ازالۃ الاوہام کی طباعت کو مولانا مملوک العلی کی حسنات میں شمار کیا جانا چاہئے۔ مولانا ہی اس کی طباعت و اشاعت کے محرک ہوئے اور ممکن ہے ناشر (سید المطابع) سے بھی مولانا نے ہی رابطہ قائم فرمایا ہو۔

## قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کی کشف اصطلاحات الفنون کے تعارف

### اور اشاعت کے لئے مولانا کی خدمت

کشف اصطلاحات الفنون قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کی شہرہ آفاق تصنیف ہے، اور ملت اسلامیہ کے مفاخر علمیہ میں شمار کی جاتی ہے اور عالم اسلام کیلئے علمائے ہند کا بڑا تحفہ ہے۔ اس کتاب کا واحد نسخہ جو مصنف (قاضی محمد اعلیٰ) کے قلم سے تھا مولانا مملوک العلی کے خاص دوست اور استاذ زادہ، مولانا ابوالحسن کاندھلوی (۱) کے ذاتی ذخیرہ میں موجود تھا جو مولانا

(۱) مولانا ابوالحسن: خلف حضرت مفتی الہی بخش بن مولانا محمد عرف شیخ الاسلام کاندھلوی تقریباً ۱۲۰۰ھ، ۱۷۸۶ء میں ولادت ہوئی، والد ماجد سے تعلیم حاصل کی، طب پڑھی اور مثنوی مولانا روم کا درس لیا، نہایت باخدا عارف کامل عالم تھے، متعدد تصانیف یادگار ہیں جن میں مثنوی بحر الحقیقت اور گلزار ابراہیم بہت مشہور ہیں، ۲۱ جمادی الثانی ۱۲۷۱ھ ۲ مارچ ۱۸۵۳ء کو کاندھلہ میں وفات ہوئی۔ مفصل معلومات کے لئے دیکھئے راقم سطور کا سلسلہ مضامین حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر کی کے ساتھ مشمولہ امداد المشتاق مطبوعہ دلی ۱۹۸۱ء۔

نے دیکھا تھا اور اس کی علمی قدر و قیمت کو محسوس فرمایا تھا، اسپرنگر دہلی کالج کا پرنسپل مقرر ہو کر دہلی آیا تو اس کا مولانا سے رابطہ ہوا اور مولانا کو بھی اس کے علمی ذوق اور کلکتہ کے علمی اشاعتی مراکز سے اسپرنگر کے قریبی روابط کا اندازہ ہو گیا تھا اس لئے مولانا نے اسپرنگر سے کشف اصطلاحات الفنون کا ذکر کیا اور غالباً اس نادر روزگار تصنیف کی اشاعت کی ضرورت پر توجہ دلائی ہوگی، اسپرنگر نے اصرار کیا کہ وہ کتاب بہت جلد لا کر دکھائیں، مولانا نے اسپرنگر کے تقاضہ پر اسپرنگر کو لکھا کہ:

”اب کی بار امتحان کے بعد جو وطن کو جاؤں گا اس کتاب کو مالک سے مستعار لے

کر اپنے ہمراہ لاؤں گا، بعد ملاحظہ کے صاحب کو نقل اس کی لکھوانے کا اختیار ہے“ (۱)

مولانا نے معلوم نہیں کس طرح اور کس حیثیت سے کشف اصطلاحات الفنون کا ذکر کیا ہوگا کہ اسپرنگر مولانا کے سفر نانوتہ کے وقت تک بھی اسکا انتظار نہ کر سکا اس نے مولانا سے مکرر اصرار کیا کہ کتاب بہت جلد منگوائیے۔ اسپرنگر کے اصرار پر مولانا نے مولانا ابوالحسن کو خط لکھا اور قاصد بھیجا کہ کشف اصطلاحات کا نسخہ مصنف ارسال فرمادیں۔ دوست (مولانا مملوک العلی) کی فرمائش تھی اس میں تامل اور دیر کر نیکا کیا موقع تھا، مولانا ابوالحسن نے اس قاصد کے ذریعہ کشف کا یہ نسخہ بھجوادیا اور اپنی بیاض میں یادداشت لکھدی کہ:

”کشف اصطلاحات حسب الطلب مولوی محمد مملوک علی، بدست علی بخش شاہ

جہاں آباد فرستادہ شد“ (۲)

مولانا مملوک العلی نے نسخہ ملنے پر اسپرنگر کو اطلاع دی، اسپرنگر نے اسکو دیکھا اور اس کی قدر و قیمت کا احساس کر کے اس کی اشاعت کیلئے متوجہ ہو گیا۔ اسپرنگر نے (مولانا کے شاگرد) کریم الدین پانی پتی سے کشف اصطلاحات کی نقل کرائی اور کلکتہ کے ممتاز علمی ادارہ ایشیاٹک سوسائٹی (ASIATIC SOCIETY) کلکتہ سے اس کی اشاعت کیلئے رابطہ کیا، یہ ادارہ کشف اصطلاحات الفنون کو چھاپنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اسپرنگر

(۱) مکتوب مولانا مملوک العلی بنام اسپرنگر محررہ ۲۲/۲۲ ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ ۱۲/نومبر ۱۸۴۶ء۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۵۳۔

(۲) بیاض قلمی مولانا ابوالحسن کاندھلوی۔

نے علماء اور ولیم ناسولیس کی مدد سے اصطلاحات الفنون پر کام کیا اور یہ کتاب پہلی بار ایشیا ٹک سوسائٹی سے شائع ہوئی (۱) مذکورہ تفصیلات سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کی طباعت کی پہلی کوشش اور بنیادی تحریک بھی مولانا مملوک العلی نے فرمائی تھی، اس طرح کی اور بھی متعدد کتابیں ہوں گی جو حضرت مولانا کے فیض کرم سے مرتب یا شائع ہوئی ہوں گی، مگر ان کی تفصیلات ہماری دسترس میں نہیں۔

(۱) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہوں قاضی محمد اعلیٰ تھانوی پر راقم سطور کے مضامین۔

الف: سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد پاکستان اکتوبر، دسمبر ۱۹۸۹ء۔

ب: رضالا بھریری جنرل رام پور شمارہ ۱، ۱۹۸۹ء۔



## باب (۱۸)

### حضرت مولانا مملوک العلی کا کتب خانہ

علم و کمال کے لئے مطالعہ اور مطالعہ کی ترقی اور آبیاری کے لئے ذاتی کتب خانہ بے حد ضروری ہے۔ مولانا مملوک العلی نے بھی جو سراسر علم و فضل، ہمہ تن علم و افادہ اور بزرگانِ سلف کی دینی علمی روایات کے امین تھے، اسلام، دینی علوم و فنون اور اپنی دلچسپی کے خاص موضوعات ادب، لغت معانی اور تاریخ وغیرہ کی عمدہ کتابوں کا ایک متوسط لیکن وسیع اور قابل ذکر ذخیرہ فراہم کر لیا تھا۔ حضرت مولانا کے زمانہ میں چھپی ہوئی کتابوں کا چلن عام نہیں ہوا تھا، اگرچہ طباعت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور برابر نئی نئی کتابیں چھپ کر آتی رہتی تھیں مگر پھر بھی اصل ذوق کتابوں کی نقل کا تھا، اسی لئے حضرت مولانا کے ذخیرہ کا بھی بڑا حصہ نادر قلمی کتابوں پر مشتمل تھا۔

حضرت مولانا نے اس کتب خانہ کی ایک مجمل فہرست جس میں صرف کتابوں کے نام لکھے تھے۔ ان کی کیفیت، سنہ کتابت، کاتب یا طباعت وغیرہ کی تفصیل نظر انداز کی گئی ہے، شعبان ۱۲۶۶ھ (جولائی ۱۸۵۰ء) میں مرتب کی تھی، یہ فہرست کالج کے پرنسپل اسپرنگر کی فرمائش پر بنائی گئی تھی، اسپرنگر قلمی کتابوں کا نہایت ذوق رکھتا تھا، وہ مختلف علماء اور نئے پرانے ذخیروں اور کتب خانوں کی فہرستیں بنا کر اپنے پاس رکھتا تھا، اسی سلسلہ کی ایک کڑی حضرت مولانا کے ذخیرہ کی یہ فہرست بھی ہے۔

اس فہرست میں تقریباً ڈھائی سو کتابوں کا اندراج ہے، مگر اس فہرست میں درج کتابوں کی بڑی تعداد عربی کی ہے، فارسی کتابوں کا آخر میں تذکرہ ہے جن میں اٹھائیس

کتابوں کے نام ذکر کئے ہیں، جس سے خیال ہوتا ہے کہ اس فہرست کا مقصد صرف عربی کتابوں کا تذکرہ ہے فارسی اردو کتابوں پر توجہ نہیں کی گئی۔ اردو کی ایک کتاب بھی اس فہرست میں شامل نہیں، ممکن ہے کہ مولانا کی مملوکہ فارسی اردو کتابوں کا ذخیرہ اس وقت دہلی میں موجود نہ ہو، نانوتہ میں مولانا کے گھر پر ہو، اس فہرست میں ان کا ذکر نہ آیا ہو۔ کیوں کہ اس کی امید کم ہے کہ حضرت مولانا کو فارسی ادبیات اور علمی سرمایہ سے دلچسپی نہ ہو، اس طرح اس وقت تک اردو میں بھی معیاری کتابیں آنی شروع ہو گئی تھیں، خصوصاً نامور شاعروں کے کئی دیوان شائع ہو چکے تھے۔ حضرت مولانا، غالب، مومن، ذوق اور اس عہد کے نامور شاعروں کے دوست اور دہلی کی علمی ادبی محفلوں کی رونق تھے، وہ اپنے مجموعے اور کتابیں حضرت مولانا کو پیش کرتے ہوں گے۔ اور بھی کتابیں آتی رہتی ہوں گی بہ ظاہر اس قسم کی کتابوں کا حضرت مولانا نے جان بوجھ کر ذکر نہیں کیا۔

مختصر یہ ہے کہ یہ فہرست جو مولانا نے اسپرنگر کیلئے تیار کی تھی، مولانا کی جملہ کتابوں کی اور مکمل فہرست نہیں بلکہ غالباً منتخب کتابوں کی اجمالی یادداشت ہے، حضرت مولانا نے کتابوں کے جو نام لکھے ہیں اس سے ایک کتاب پر بھی کسی طرح کی روشنی نہیں پڑتی مگر اور ذرائع سے ان میں سے چند کتابوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا کچھ علم ہو جاتا ہے۔

حضرت مولانا کے شاگرد کریم الدین پانی پتی نے مذکورہ فہرست کی ترتیب سے کئی سال پہلے حضرت مولانا کی کتابیں دیکھی تھیں اور اپنی کتاب فرائد الدھر (تاریخ ادب عربی) میں کئی موقعوں پر مولانا کے ذخیرہ کی چند کتابوں کا ضمیمہ ذکر کیا ہے، جس سے حضرت مولانا کے کتب خانہ میں موجود چند کتابوں کی اہمیت و معنویت کا علم ہوتا ہے۔ کریم الدین نے سب سے پہلے باخرزی (علی بن الحسن بن علی باخرزی وفات ۴۶۷ھ، ۱۰۷۵ء) کی دمیۃ القصر کے ذیل تیمیۃ الدہر (ابو المنصور عبدالملک بن محمد ثعالبی وفات ۱۰۳۸ء) کے ایک نسخہ کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:-

”واضح ہو کہ دمیۃ القصر ایک تذکرہ ذیل تیمیۃ الدہر کے تصنیف ابو الحسن علی

بن الحسن کی ہے، جس کا ذکر آگے آوے گا۔ اس مؤلف نے اپنے ہم عصروں کا ذکر

اس میں بہت لکھا ہے، وہ تذکرہ میں نے بھی دیکھا اور اس سے چند شاعروں کے شعر جن کی ضرورت تھی لکھے۔

میرے استاد جناب مولوی مملوک علی مدرس اول مدرسہ دہلی کے پاس وہ تذکرہ دہلی میں موجود ہے، گرچہ خط اسکا بہت خوب اور پرانا لکھا ہوا ہے، لیکن غلط بہت ہے“ (۱)  
مقامات حریری (قاسم بن علی بن محمد بصری حریری وفات ۵۱۶ھ، ۱۱۲۲ء) کی شروحات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”ایک شرح ابوالبقا ہے اور ایک شرح مولوی مملوک العلی صاحب مدرس اول مدرسہ دہلی کے پاس موجود ہے مگر اس کا نام مجھ کو معلوم نہیں، وہ شرح بھی بہت مطول ہے، میں نے دیکھی ہے“ (۲)  
قلائد العقیان للفتح بن خاقان کے بھی ایک نسخہ کی موجودگی کی اطلاع دی ہے، تحریر ہے:

(قلائد العقیان) یہ تذکرہ مولوی مملوک العلی مدرس اول مدرسہ دہلی کے پاس موجود ہے، میں نے بھی دیکھا ہے“ (۳)  
کریم الدین نے مولانا کے ذخیرہ میں موجود دیوان ابن الفارض اور اس کے قصیدہ تائیہ کی ایک شرح کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:  
”اس کا دیوان بہت مشہور ہے، لوگوں کے پاس موجود ہے۔ ایک نسخہ قلمی میرے ہاتھ کا میرے پاس بھی ہے اور ایک نسخہ میرے استاد مولوی مملوک العلی صاحب مدرس اول مدرسہ دہلی کے پاس ہے“ (۴)  
اسی تذکرہ میں ہے:

ایک شرح اس کی قصیدہ تائیہ کی جناب مولوی مملوک العلی مدرس اول کے پاس موجود ہے (۵)

مولانا کی مملوکہ کتابوں میں سے آخری کتاب جس کا کریم الدین نے تعارف کرایا

(۳) فرائد الدھرص: ۳۱۱

(۲) فرائد الدھرص: ۳۰۷

(۱) فرائد الدھرص: ۲۰۵

(۵) فرائد الدھرص: ۳۱۶

(۴) فرائد الدھرص: ۳۱۶

ہے ریحانة الالباء وزهرة الحیوة الدنیا (تالیف شہاب الدین احمد خفاجی) کا ہے، اس کا ایک عمدہ صحیح نسخہ مولانا مملوک العلی مکہ مکرمہ سے خرید کر لائے تھے، فرائد الدھر میں ہے:

”یہ کتاب نسخ خط بہت صحیح میرے استاد مولوی مملوک العلی صاحب کے پاس موجود ہے، بروقت جانے کعبۃ اللہ الحرام کے وہاں سے خرید کر لائے تھے، چند ادباء اور شعراء کا حال اس میں لکھا ہے، وہ خوب نسخہ ہے“ (۱)

حضرت مولانا کا کتب خانہ مولانا کی وفات بلکہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی حیات تک محفوظ اور افادہ عام کا سامان تھا، جب مدرسہ عربیہ (دارالعلوم ۱۲۸۳ھ، ۱۸۶۶ء میں) دیوبند قائم ہوا، مدرسہ کا افتتاح ہوتے ہی مولانا محمد یعقوب نے مدرسہ کی ضرورت کیلئے بنیادی کتابیں حضرت مولانا کے ذخیرہ سے عنایت فرمادی تھیں، جو مولانا یعقوب صاحب کی وفات تک مدرسہ میں رہیں، اہل مدرسہ کو ان کتابوں کی وجہ سے بہت آسانی ہو گئی تھی اور مدرسہ میں کتابوں کے حاصل کرنے کیلئے پریشانی نہیں ہوتی، مدرسہ کے استاد اور طلبہ دونوں ان کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔ مدرسہ کی انتظامیہ نے مولانا محمد یعقوب کی اس عنایت کیلئے ممنونیت اور تشکر کا بار بار اظہار و اعلان کیا، مدرسہ کی رودادوں میں اس کا شکریہ اور مولانا محمد یعقوب کی عنایت کی ہوئی مستعار کتابوں کی فہرست پابندی اور اہتمام سے چھپتی رہی۔

حضرت مولانا مملوک العلی کا یہ ذخیرہ مولانا محمد یعقوب کی وفات ۱۳۰۲ھ تک تقریباً جوں کاتوں محفوظ تھا، مگر مولانا کی اولاد میں کسی بڑے صاحب علم کے موجود نہ رہنے کی وجہ سے مولانا کے بعد منتشر ہونا شروع ہوا، لیکن بکھرتے بکھرتے بھی ۱۹۳۷ء (۶۷-۱۳۶۶ھ) تک اس کی کچھ کتابیں خصوصاً مولانا مملوک العلی اور مولانا محمد یعقوب کی خودنوشت مؤلفات و تحریرات موجود تھیں، مگر پھر اس پر ایسا زوال آیا کہ اس وقت اس کا شاید ایک ورق بھی موجود نہیں۔ اگرچہ یہ سرمایہ ضائع ہو چکا ہے مگر اس کی فہرست سے حضرت مولانا

مملوک العلی کے علمی ذخیرہ اور ذوق مطالعہ کا علم ہو جاتا ہے، اس لئے اس ذخیرہ کی جو فہرست مولانا مملوک العلی نے مرتب فرمائی تھی، وہ یہاں درج کی جا رہی ہے۔

**کلام اللہ و ما يتعلق به**  
 جمائل خوشخط۔ کلام اللہ صحیح، حوالہ محمد یعقوب،  
 کلام اللہ مترجم بفارسی۔ کلام اللہ مطبوع ترجمہ  
 اردوی۔ لغات کلام اللہ بعبارت فارسی معہ مجموعہ صرف۔ نصف اول بیضاوی۔ تفسیر بیضاوی  
 (جلد اول، دوم، سوم، لغت القرآن، خلاصہ از لغات راغب اصفہانی۔ غرائب اللغات  
 کلام اللہ۔

**کتب الحدیث و ما يتعلق به**  
 ترمذی شریف (جلد اول، دوم) مسند  
 امام اعظم مع مؤطا امام مالک، ترجمہ  
 حصن حصین مطبوع معہ رسالہ قرأت، شرح مسلم از امام نووی (جلد اول تا خامس) نہایہ  
 جزری، پارہ شرح مصابیح، نصف اخیر ترغیب و ترہیب۔ حاشیہ بخاری شریف۔ نسائی  
 شریف مطبوع۔ مفتاح شرح مصابیح نصف اول مجلد، ابوداؤد مطبوع، بلوغ المرام مطبوع،  
 ربع مسلم شریف، تیسیر الاصول مطبوع، جلد اول ترجمہ مشکوٰۃ در ہندی مطبوع، ربع مسلم  
 شریف، تیسیر الاصول مطبوع۔ جلد اول ترجمہ مشکوٰۃ شریف در ہندی مطبوع۔ حصن حصین  
 معہ دلائل الخیرات در یک جلد۔ حصن حصین مجلد۔ جلد ثالث ترجمہ مشکوٰۃ۔ دلائل الخیرات۔

**کتب الفقہ و الاصول**  
 ہدایہ نصف اول۔ فتاویٰ مغرب۔ فتاویٰ قنیہ۔ شرح  
 وقایہ۔ تعظیم الطہارۃ در فارسی۔ مفتاح الجنۃ در ہندی،  
 عضدی ناقص۔ غایۃ التحقیق حسامی۔ حاشیہ تلوتح، مجلدنا معلوم الاسم۔ تلوتح مجلدتا مقدمات  
 اربع، تلوتح از مقدمات اربع، آخر ناقص۔ جز تصریح۔ حاشیہ تلوتح۔ منار بسیار محشی۔ ربع  
 مستخلص حسامی محشی، داپر خورد، دائرہ شرح منار، فتاویٰ حمادیہ در دو جلد مطبوع۔ فتاویٰ در  
 مختار مطبوع، فتاویٰ فصول عمادی۔ شرح مسلم الثبوت مولوی مبین، مالابدمنہ مطبوع دہلی،  
 عنایہ حاشیہ ہدایہ جلد ثالث از کتاب البیوع۔ ایضاً جلد ثانی، جلد رابع عنایہ از کتاب

الودیعة تا آخر، ہدایہ مع الکفایہ مطبوع از کتاب الصلوٰۃ تا کتاب الحج، ہدایہ مع الکفایہ (جلد ثالث، رابع) حاشیہ ہدایہ کہ مصنف او معلوم نیست جلد دوم۔ ہدایہ مطبوع، فتاویٰ عالمگیری (جلد اول تا رابع) عنایہ جلد ثانی از کتاب النکاح۔ مالا بدمنہ مطبوع، فتاویٰ لکھنؤ۔

**کتب الکلام** | حاشیہ مسعود بر موقف امور عامہ۔ نواقض الروافض، رسالہ ردمتہ تصنیف خاں صاحب مرحوم۔ میرزا ہد امور عامہ تمام محشی، شرح عقائد محشی، خیالی خوشخط محشی، عبدالحکیم بر خیالی، شرح عقائد ملا جلال، حاشیہ ملا کمال بر حاشیہ ملا جلال، حاشیہ مولوی مبین بر میرزا ہد امور عامہ، حاشیہ ملا عبد اللہ بر میرزا ہد امور عامہ، حاشیہ مولوی برکت بر میرزا ہد امور عامہ، حاشیہ مولوی حسن بر میرزا ہد امور عامہ، حاشیہ قاضی مبارک بر میرزا ہد ایضاً، موقف ثانی تا ختم دو موقف شرح موافق پنجم و ششم۔

**کتب الادب و الصرف و النحو و اللغة و البلاغة** | تاریخ تیموری مطبوع، دیوان قیس معہ دیوان دیگر دو جز، مقامات حریری، شرح سبعمہ معلقہ مکتوبہ۔ مجموعہ قصاید بانٹ سعادت مجلد خورد مع بعض اجزاء قصاید شاہ عبد العزیز۔ اجزاء

مقامات بدیعی ناقص۔ شرح قصاید تانیہ شیخ ابن فارض۔ دیوان متنبتی مطبوع، الف لیلہ جلد اول مکتوبہ عرب۔ الف لیلہ جلد دوم مطبوع۔ الف لیلہ نصف اخیر مطبوع ناقص۔ شافیہ محشی مطبوع۔ کافیہ مطبوع۔ ہدایۃ النحو مطبوع۔ کتاب صرف کبیر۔ جلد اول حاشیہ عبدالحی۔ مجموعہ معراج الارواح و دستور المبتدی۔ مجموعہ شرح لا طائل وغیرہ۔ فقہ اللغة نصف اول۔ تاج المصادر۔ مختصر معانی، کہنہ محشی۔ دمیۃ القصر، تیمیۃ الدہر تکملہ شعرائے عرب، خزائن الادب معہ بدیعیات مصباح بخط نسخ۔ فراید در معانی، رسالہ محیط الاوراد۔ شرح مقامات حریری مجلد۔ شرح دیوان متنبتی در دو جلد۔ صراح در یک جلد مطبوع۔ دیوان شیخ علوی مدار۔ دیوان ابن فارض۔ تاریخ بھینی از کتب مالکان خریدہ شد۔ قاموس مطبوع۔ بدیع الادب مطبوع۔ انشاء دیگر عربی۔ تاریخ فرانس عربی مطبوع۔ مجموعہ ریحانہ و قلاب العقیان و مسجع المنطوق دیوان ابن علی الجزری مکتوبہ عرب، شرح سبعمہ معلقہ مطبوع۔

کتب ادعیہ و فنون متفرقہ دیگر | صحیفہ کاملہ خوشخط، بیاض خورد مع بعض ادعیہ صحیفہ کاملہ، عین العلم، شرح رسالہ امام رازی در

احوال میت، چند جزو حاشیہ شرح ملا، و اجزاء از دویم کتاب بلاغت، اجزاء از کتاب فرائض از اول و آخر ناقص، سررویات از اجزاء مختلفہ در جزدان سفید، سررویات در جزدان، مجموعہ قصیدہ عروض و قصیدہ من بیاض مع اجزاء کشلول، مجلد، رسالہ اساس المصلی در رسالہ لباس وغیرہ، رویات در جزدان سفید یہ خطوط وغیرہ حساب در بستہ سفید، مجموعہ رسالہ مولوی رفیع الدین در احوال میت و فضل تعزیرات، و در رسالہ شاہ ولی اللہ۔ شرح مقدمہ جزری در قراءت۔ جلد اول احیاء العلوم، مع جلد دویم تمام مجلد، صحیفہ کاملہ مطبوع مع ادعیہ ملحقات۔ دغ الباطل، قرۃ العینین در مناظرات و مسائل علوم۔

کتب المنطق و المناظرۃ | عبدالحکیم برقطنی میر، سلم العلوم شرح مسلم مولوی حسن، شرح سلم مولوی عبد اللہ، شرح سلم

فیروز، شرح سلم قاضی مبارک، شرح سلم مولوی حمد اللہ۔ شرح میرزاہد جلد کلاں، میرزاہد رسالہ تمام در یک جلد یک جز میرزاہد، حاشیہ مولوی عبد اللہ و حاشیہ مولوی حسین بر میرزاہد رسالہ، حاشیہ غلام یحییٰ و حاشیہ مولوی عظیم بر میرزاہد رسالہ، حاشیہ مولوی فضل امام بر میرزاہد رسالہ، حاشیہ ملا عماد و حاشیہ مولوی اسد اللہ در یک جلد، میرزاہد جلالیہ تا تحت موضوع بسیار محشی حاشیہ مولوی فضل امام، میرزاہد جلالیہ تمام من رسالہ قطبیہ، حاشیہ مولوی عبد العلی و قاضی مبارک و میرزاہد جلالیہ در یک جلد، منہیہ قاضی مبارک، شرح مطالع مجردات، نافعہ منہ چند جزو، حاشیہ صدر ایک جزو، شرح تہذیب ملا جلال تحت موضوع اساس الافناس، دو جزو حاشیہ جلالیہ تا تحت موضوع حاشیہ مولوی حسین بر میرزاہد جلالیہ۔

کتب الحکمة و الرياضی | میبذی بخط خود، صدرتا فلکیات بسیار محشی، حاشیہ ملا نظام الدین بر صدر، شمس بازغہ،

حاشیہ ملا نظام الدین بر شمس بازغہ، مع حاشیہ شرح حکمتہ العین، حاشیہ مولوی حمد اللہ بر شمس بازغہ، صراط مستقیم از باقر داماد، تقویات از باقر داماد، شرح ہیاکل، حاشیہ مولوی ظہور

الدین روضۃ الجنان ابوالحسن کاشی، اجزاء شرح حکمتہ العین، شرح چغمینی، قوشچی تمام شرح، شرح قوشچی فارسی مکتوبہ مولوی حیدر حسن، مجموعہ تشریح الافلاک، رسالہ خورد، عجائب الحساب، کتاب مطبوع در ہیئت انگریزی، مفتاح الافلاک چند اوراق قوشچی و تشریح الافلاک ناقص، بیاض کتاب حساب، رسالہ بطور سوال جواب مطبوعہ در ہیئت انگریزی، میبذی محشی مطبوعہ لکھنؤ، ترجمہ خلاصۃ الحساب تذکرہ در ہیئت۔

بیاض اشعار خوشخط، سبحة الابرار و تحفة الابرار، مثنوی نامعلوم الاسم، بیاض مثنویات، مثنوی نامعلوم الاسم، زلیخا ناظم ہروی، رسالہ تصوف در احوال مرزا جان جاناں، رسالہ کلاں تصوف، تحفة العرقین محشی، دیوان حافظ، سکندر نامہ ترکی از میر علی شیر مرحوم ہفت پیکر لیلی مجنون ترکی، مخزن اسرار محشی، کلیات عرفی ناقص، آداب المریدین، بیاض کلاں بطور کتاب، ہفت مثنوی سلیم قلی مع مثنوی دیگر، در یک جلد، کلیات خاقانی، اقبال نامہ جہانگیری، انشاء طاہر وحید اجزا زلیخا بیاض خورد، دیوان قاسم، دیوانہ نلد من مثنوی مرزا بیدل، چند جزا دفتر اول مثنوی شریف، ترجمہ کلیات مطبوع۔

حضرت مولانا کی کتابوں کی یہ فہرست مولانا کے قلم سے اسپرنگر کے ذاتی کاغذات

میں محفوظ ہے جو جرمنی کی قومی لائبریری میں (IBLIOTHEK PREUSSISCHER KULTURVESITZ STAATSB) برلن میں محفوظ ہیں، یہ کاغذات اکرام چغتائی صاحب نے دیکھے ہیں اور انہیں کی تحریر سے یہاں پیش کئے گئے ہیں۔



## باب ۱۹

### وفات اور مدفن

حضرت مولانا معمول کے مطابق دینی علمی تدریسی خدمات میں مشغول تھے کہ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (ستمبر اکتوبر ۱۸۵۱ء) کی پہلی تاریخ کو بیمار ہوئے، بخار ہوا تھا جو یرقان میں تبدیل ہو گیا اور یہی بیماری جان لیوا اور مرض الموت ثابت ہو گئی، گیارہ دن بیمار رہ کر وفات ہو گئی، جس سے آخری پانچ دن بہت تکلیف اور غفلت رہی، مرض کی شدت اور حضرت مولانا کی بے چینی کی کیفیت (اور غالباً موسم کی سختی) کی وجہ سے حضرت مولانا کو ہر وقت دوا سنگھانے اور پنکھا کرنے کی ضرورت تھی اس وقت حضرت مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب کے علاوہ حضرت مولانا کے اور شاگرد بھی خدمت میں حاضر رہتے ہوں گے اور ہر اک کام کو پورا کرنے اور ضرورت کی تکمیل میں ایک سے بڑھ کر ایک پیش قدمی کرتے ہوں گے، مگر مولانا محمد یعقوب کی اطلاع ہے اس خدمت و سعادت میں سب سے بڑا اور متواتر حصہ مولانا محمد قاسم صاحب کا تھا۔ مولانا محمد یعقوب جو حضرت مولانا کے فرزند تھے وہ بھی ہر وقت کی حاضری اور مصروفیات کی وجہ سے تھک جاتے تھے مگر حضرت مولانا محمد قاسم نے استاد والا مقام کی خدمت و راحت کیلئے اپنی تمام مصروفیات اور نیند و آرام قربان کر دیا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نہایت جانفشانی سے دن رات مسلسل حضرت مولانا کی خدمت و تیمارداری میں مشغول رہتے تھے، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے لکھا ہے کہ:

”ہم سو جاتے تھے اور مولوی صاحب (حضرت مولانا محمد قاسم) برابر بیٹھے رہتے تھے؟“

بہر حال جن باتوں میں شاگردوں کی قسمت میں استاد والا تبار (مولانا مملوک العلی) کی آخری خدمت کی سعادت لکھی تھی انہوں نے اس میں پورا پورا حصہ لیا اور مولانا کی خدمت میں دن رات ایک کر دئے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے حضرت مولانا کے

مرض وفات کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

اس عرصہ میں والا مرحوم کا گیارہویں ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ کو بمرض پر تان قبل السابع انتقال ہو گیا۔ ایام مرض والا مرحوم کے ممتد نہ تھے گیارہ روز کل مرض رہا مگر چار پانچ روز بہت غفلت اور کرب رہا نخلخہ سنگھایا اور پنکھا کرنا ہر وقت تھا، ہم سو جاتے اور مولوی صاحب برابر بیٹھے رہتے تھے (۱)

دوا اور خدمت کا پورا پورا اہتمام ہوا مگر آخری وقت آچکا تھا کسی خدمت اور تدبیر نے کام نہ کیا ”ان اجل اللہ اذا جاء لا یؤخر“ وقت موعود آچکا تھا، گیارہ دن کی علالت کے بعد (تقریباً) تریسٹھ سال کی عمر میں (ولادت ۱۲۰۲ھ) ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ (۷ اکتوبر ۱۸۵۱ء) سہ شنبہ کو اپنے مکان (کوچہ چیلان دہلی) میں وفات ہوئی۔ دفن کیلئے مسجد مہندیان کا انتخاب ہوا جو دلی دروازہ کے پیچھے خواجہ میر درد روڈ پر واقع ہے حضرت مولانا کو مسجد مہندیان کے صحن میں حضرت شیخ عبدالعزیز شکر بار کے قدموں قدرے مغرب کی جانب دفن کیا گیا، یہ جگہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خانوادہ کے مشہور قبرستان سے کوئی دو سو قدم پہلے شمال میں واقع ہے۔ مولانا مملوک العلی صاحب کی قبر پر ایک عرصہ تک کتبہ نصب نہیں ہوا تھا جس کی وجہ سے حضرت مولانا کی قبر کو تلاش کرنے میں پریشانی ہوئی تھی، بعد میں تقریباً ۱۳۵۰ھ میں ایک کتبہ نصب کیا گیا جو بعد میں ایک یا شاید دو بار بدلا گیا ہے۔ مگر اس کتبہ پر کندہ سنہ وفات صحیح نہیں، صحیح سنہ وفات ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء ہے۔ اس وقت جو کتبہ نصب ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

۷۸۶

استاذ الکل

مولانا مملوک العلی نانوتوی

وفات ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ

نصب کردہ محمد ایوب

نبیرہ

(۱) تذکرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ ص: ۹ (طبع اول بھاو پور ۱۲۹۷ھ)

## باب (۲۰)

### اولاد و احفاد

اور فرزند گرامی مرتبت مولانا محمد یعقوب نانوتوی

مولانا مملوک العلی کا حکیم امانت علی نانوتوی کی دختر سے نکاح ہوا تھا مگر حضرت مولانا کی تاریخ نکاح، اہلیہ محترمہ کی تاریخ ولادت و وفات اور متعلقہ معلومات دریافت نہیں۔ مولانا مملوک العلی کی جملہ اولادوں کا تذکرہ بھی نہیں ملا، تاہم جو اولادیں عمر طبعی کو پہنچیں ان میں سے دو لڑکیوں اور ایک فرزند والا مقام کے نام عموماً ملتے ہیں۔ دختر ان نجیب النساء اور مبارک النساء، فرزند مولانا محمد یعقوب، ان تینوں میں نجیب النساء غالباً سب سے بڑی اولاد تھیں حضرت مولانا کی زندگی میں جوان ہو گئیں تھیں۔

حضرت مولانا کی زندگی میں تینوں کے نکاح ہو گئے تھے اور ان کی پہلی اولادیں بھی مولانا کی حیات میں تولد ہو گئی تھیں۔

نجیب النساء کا پہلا نکاح حافظ محمود نانوتوی سے ہوا تھا، تعجب ہے کہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تحریرات، مکتوبات اور بیاض میں اور اس خانوادہ کی مؤلفات اور

مولانا کی بڑی بیٹی کے گمنام شوہر  
حافظ محمود نانوتوی

تحریرات کے ناشرین اور تذکرہ نگاروں نے اس نکاح اور حافظ محمود صاحب کا کہیں کچھ تذکرہ نہیں کیا، اسلئے کسی قدر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

حافظ محمود نانوتوی، مولانا مملوک العلی کے چچا حکیم محی الدین کے فرزند تھے، سلسلہ

نسب یہ ہے:

حافظ محمود بن حکیم غلام محی الدین بن غلام شرف، بن عبداللہ (۱)  
حافظ محمود، نیک سیرت سادہ طبیعت اور اللہ والوں سے محبت رکھنے والے شخص تھے  
حضرت میاں نجیو نور محمد کے خاص مریدوں اور متوسلین میں سے تھے، اکثر میاں نجیو صاحب کی  
خدمت میں خادم کی حیثیت سے حاضر رہتے تھے اور میاں نجیو صاحب کے خطوط وغیرہ لکھا  
کرتے تھے، حضرت میاں جیو صاحب کے ایک گرامی نامہ (بنام مولانا شیخ محمد تھانوی)  
کے آخر میں حافظ صاحب نے مولانا شیخ محمد کے نام یہ چند سطر لکھی ہیں۔

”واز حاضر الوقت خاکسار بندہ حافظ محمود نانوتوی عفی اللہ عنہ بخدمت جناب

مولوی صاحب و حافظ محمد ضامن صاحب و حافظ امداد اللہ صاحب بعد نیاز و انکسار و

آداب تسلیمات، قبول بعد“ (۲)

حضرت حاجی امداد اللہ کے ملفوظات میں بھی حافظ محمود کا ایک واقعہ درج ہے، فرمایا:  
”حافظ محمود صاحب داماد مولانا مملوک العلی صاحب ایک مرتبہ حضرت پیر مرشد  
کی خدمت میں بعد بیعت کے حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ مجھے تصور شیخ کی اجازت  
دیجئے تاکہ تصور شیخ کیا کروں، حضرت نے فرمایا کہ جب محبت و عقیدت غلبہ کرتی ہے  
تب تصور شیخ کون کرتا ہے، غلبہ محبت سے تصور شیخ خود بہ خود بڑھ جاتا ہے۔ (۳)  
حافظ محمود صاحب حج کے لئے گئے تھے سفر حج سے واپسی میں دہلی کے قریب ان کی  
وفات ہو گئی تھی، مولانا شیخ محمد تھانوی نے لکھا ہے کہ:

”حاجی حافظ محمود صاحب ساکن قصبہ نانوتہ در ضلع سہارنپور بودند و مرید خاص

آں عالی جناب مرشد حق قدس سرہ بودند، وقت مراجعت بیت اللہ شریف قریب

شاہجہاں آباد وفات یافتن و برحمت حق پیوستند“ (۴)

(۱) نسب نامہ صدیقیاں نانوتہ، ص: ۷

(۲) مکتوبات حضرت میاں نجیو نور محمد جھنجھانوی مندرجہ انوار محمدی، تالیف مولانا شیخ محمد تھانوی ص: ۲۵ (۱۲۱۹ھ)

(۳) شائلم امدادیہ تالیف حاجی محمد مرتضیٰ خاں قنوجی ص: ۱۵۸ (قومی پریس لکھنؤ ۱۳۱۴ء)

(۴) مکتوبات حضرت میاں نجیو نور محمد جھنجھانوی مندرجہ انوار محمدی، تالیف مولانا شیخ محمد تھانوی ص: ۲۵ (۱۲۱۹ھ)

ترجمہ: حافظ محمود صاحب جو نانوتہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے اور عالی جناب مرشد برحق (میاں جیونور محمد) کے خاص مرید تھے، انہوں نے حج کیا اور بیت اللہ شریف سے واپسی کے سفر میں دہلی سے قریب پہنچ کر وفات پائی اور رحمت حق سے مل گئے۔

صراحت تو نہیں ملی لیکن غالباً نجیب النساء کی حافظ محمود سے کوئی اولاد نہیں تھی، حافظ محمود کی وفات کے بعد نجیب النساء کا مولوی انصار علی انہٹوی سے نکاح ہوا جو پہلے سے بھی حضرت مولانا مملوک العلی کے گھر کے ایک فرد کی طرح تھے، انکا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

”انصار علی بن احمد علی بن قطب علی.....“

ان کے تین بیٹے تھے، احمد حسین، عبدالرحمن، اور مولانا عبداللہ انصاری (جو حضرت مولانا محمد قاسم کے تربیت یافتہ، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے خلیفہ اور ایم، اے، (M.A.O. COLLEGE) علی گڑھ کے سب سے پہلے ناظم دینیات تھے) (۱)

دوسری بیٹی مبارک النساء مولانا انصار علی کے حقیقی بھائی شاہ مجید علی (خلف احمد علی) انہٹوی سے منسوب ہوئیں، ان کے بھی تین صاحبزادے تھے، حضرت مولانا خلیل احمد انہٹوی (مہاجر مدنی شارح سنن ابوداؤد)، مولانا نظیر احمد (جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ کے خلیفہ مجاز تھے)، مولانا رشید احمد سالم انصاری (ایم، اے او کالج و فارسی کے نامور استاد، محقق، مصنف، مخطوطات کی معلومات و بصیرت میں ممتاز اور امیر خسرو کی تصانیف کے ماہر تھے) اور تینوں ہی صاحب فضل و کمال تھے۔

(۲) راقم سطور نے مولانا عبداللہ انصاری کا بھی مختصر تذکرہ مرتب کیا ہے جو زیر اشاعت ہے۔ (نور)

## حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی

حضرت مولانا مملوک العلی کے کوئی فرزند نہیں تھا صرف لڑکیاں تھیں، حضرت مولانا کو تمنا ہوگی اور دوسرے بھی چاہتے تھے کہ مولانا کے فرزند ہو، جو مولانا کے کمالات کا بھی وارث بنے۔ حضرت مولانا کے ایک خاص شاگرد، مولانا محمد حسن رام پوری تھے جو خاصانِ خدا میں سے تھے انکے زمانہ طالب علمی سے عجیب حالات تھے، حضرت مولانا نے انکے مرتبہ کو پہچان لیا تھا، اسلئے انکو رہنے کیلئے ایک علیحدہ مکان دیدیا تھا اور سب شاگردوں کو ہدایت فرمادی تھی کہ ان کے مکان میں کوئی بھی کسی وقت بھی بلا اجازت داخل نہ ہو۔ (۱)

حضرت مولانا کے شاگردوں اور نیاز مندوں کی طرح مولانا محمد حسن کو بھی اس کا احساس تھا کہ حضرت مولانا کے لڑکا نہیں ہے، ایک اور مولانا محمد حسن نے حضرت مولانا کے یہاں فرزند کے تولد کیلئے دعاء اور التجا کی جو بارگاہِ الہی میں قبول ہوئی اور ان کو امید ہو گئی کہ اس مرتبہ انشاء اللہ فرزند تولد ہوگا، مولانا محمد حسن صاحب نے اپنی تمنا اور اس دعاء کی قبولیت کا حضرت مولانا سے بھی ذکر کر دیا، مولوی نذیر حسین دیوبندی نے لکھا ہے کہ:

”ایک روز مولانا مملوک العلی سے کہا کہ شاہ غریب اللہ صاحب نے اپنے پیر و مرشد کے واسطے اولاد اور لڑکا مانگا خداوند تعالیٰ نے ان کی دعاء قبول کی، میں نے بھی اپنے استاد کے واسطے دعاء کی کہ خداوند امیرے استاد کو اب کی مرتبہ لڑکا دے کہ جو حافظ قرآن و عالم اور ولی ہو، سو قبول ہوگئی۔ مولانا مملوک العلی صاحب یہ سن کر ہنس پڑے اور مولوی محمد حسن نے اس واسطے دعاء کی کہ ان کے استاد کے لڑکیاں تھیں، چنانچہ اسی مرتبہ مولوی محمد یعقوب صاحب پیدا ہوئے اور الم شرح ہے کہ وہ ان جملہ صفات کے ساتھ موصوف تھے اور اسی وجہ سے مولوی محمد یعقوب صاحب کبھی کبھی جوش میں آکر فرمایا کرتے تھے کہ میں ازلی ولی ہوں۔“ (۲)

(۱) تذکرۃ العابدین، تالیف حاجی نذیر حسین دیوبندی ص: ۵۳ (دہلی: ۱۳۳۳ھ) (۲) تذکرۃ العابدین ص: ۵۶

**ولادت** مولانا محمد یعقوب کی ۱۳ صفر سنہ ۱۲۲۹ھ (۲ جولائی ۱۸۳۳ء) کو پیدائش ہوئی، منظور احمد، غلام حسنین اور شمس الضحیٰ تاریخی نام ہیں، ان کے اعداد سے سنہ ولادت معلوم ہو جاتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے کہ:

”بندہ کی پیدائش صفر کی تیرھویں سنہ بارہ سو اسیس ہے۔“ (۱)

مولانا یعقوب حضرت مولانا محمد قاسم کے بچپن کے رفیق اور ساتھی تھے، مولانا نے حضرت مولانا محمد قاسم کے حالات میں اپنی زندگی کے بعض واقعات کا کچھ تذکرہ یا اشارہ کیا ہے اور حضرت مولانا محمد قاسم سے بچپن کی رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”احقر اور مولوی صاحب کے (بیچ میں) علاوہ قرب نسب بہت سے روابط

اتحاد تھے، ایک مکتب میں پڑھا، ایک وطن ایک استاد سے ایک وقت میں علم حاصل کیا۔“ (۲)

مولانا محمد یعقوب نے دس سال کی عمر میں قرآن شریف کا حفظ مکمل کر لیا تھا، جب حضرت مولانا مملوک العلی حج کیلئے گئے اس وقت قرآن شریف پورا ہو چکا تھا، دور کر رہے تھے۔ مولانا مملوک العلی سفر حج سے واپسی پر سیدھے دہلی آگئے تھے کیوں کہ مدرسہ سے منظور رخصت کی مدت پوری ہو چکی تھی، اسلئے اس وقت وطن نہیں گئے، سالانہ چھٹی میں گھر جانا ہوا، اور جب اس سفر کے بعد نانوتہ سے دہلی آئے تو مولانا محمد یعقوب اور مولانا محمد قاسم، دونوں عمر طالب علم مولانا کے ساتھ دہلی آئے تھے، جب نانوتہ سے آخر ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۰، ۲ محرم سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۱ جنوری ۱۸۲۵ء) کو دہلی پہنچے اور فوراً ہی (چار محرم) کو سبق شروع ہو گئے تھے اگرچہ مولانا محمد یعقوب نے اسکی صراحت نہیں کی مگر قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی تعلیم کے درمیان ہی مولانا نے فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لی ہوگی، کیوں کہ دہلی پہنچ کر میزان اور گلستاں سے اسباق کا آغاز ہوا تھا، اگر مولانا نے پہلے سے فارسی کی کتابیں نہ پڑھی ہوتیں اور فارسی سے کسی قدر مناسبت نہ ہوگی ہوتی تو ان

(۱) و (۲) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات۔ ص: ۷۰ مرتبہ نور الحسن راشد

کاندھلوی (کاندھلہ ۱۲۲۱ھ)

کتابوں کا شروع کرانا بے فائدہ تھا، اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا یعقوب کی تقریباً آٹھ سال کی عمر میں فارسی درسیات شروع ہو گئی ہوں گی۔ اردو کی تعلیم درسیات میں شامل نہیں تھی کیونکہ علمی گھرانوں کی مائیں اور سرپرست اپنے بچوں کو باتوں باتوں میں اردو پڑھا دیتے تھے۔

مولانا مملوک العلی کا خاص طریقہ یہ تھا کہ وہ چھوٹے طلبہ کے سبق اعلیٰ درجات کے طلبہ کے سپرد فرما دیا کرتے تھے کہ وہ سبق یاد کرائیں اور سنیں، اسی ترتیب اور معمول کے مطابق مولانا محمد یعقوب کا سبق سننا اور تعلیلات پوچھنا مولانا محمد قاسم کے سپرد فرما دیا تھا۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا جمعہ کی شب میں ابتدائی کتابوں کے طلبہ کا ہفتہ وار جائزہ لیتے تھے جس سے نئے پرانے طلبہ کی صلاحیتوں اور رفتارِ تعلیم کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

خیال ہے کہ مولانا کا یہ تعلیمی سفر عمدہ صلاحیت اور تیز رفتاری سے آگے بڑھا ہوگا مگر اس میں کب کیا کتابیں پڑھیں اور حضرت مولانا مملوک العلی کے علاوہ دہلی کالج کے اور کن استادوں یا حضرت مولانا کے کس شاگرد سے تلمذ و استفادہ کا رشتہ رہا اس کی اطلاع نہیں، تاہم متوسطات کی تکمیل سے پہلے دہلی کالج میں داخلہ ہو گیا تھا، دہلی کالج میں زیر تعلیم کتابوں کی تفصیل بھی معلوم نہیں اور اس کا بھی علم نہیں کہ دہلی کالج سے کب تک وابستگی رہی، ہر چند کہ اہم بنیادی کتابیں حضرت مولانا مملوک العلی نے خود پڑھائی ہوں گی مگر کالج کے نظام اور ترتیب اسباق کی پاسداری بھی ضروری تھی، اس لئے ممکن ہے کہ مولانا نے کالج کے اور اساتذہ خصوصاً مولانا سید محمد صاحب دہلوی اور مولانا سبحان بخش سے بھی پڑھا ہو۔

مولانا دہلی کالج کی تعلیم سے کب فارغ ہوئے اس کی بھی صراحت نہیں ملتی لیکن ڈاکٹر افتخار احمد صاحب صدیقی نے محمد حسین آزاد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی ڈپٹی نذیر احمد کے ہم جماعت اور دوست تھے۔ (۱)

اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو یہ رفاقت اور ہم جماعتی پہلے تین چار سال میں رہی ہوگی، کیونکہ ڈپٹی نذیر احمد آخر تک کالج سے وابستہ رہے اور درجہ بدرجہ تمام جماعتوں کی تعلیم اور

(۱) مولوی نذیر احمد دہلوی احوال و آثار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص: ۷۹ (لاہور: ۱۹۷۱ء)



امتحان سے فارغ ہو کر نکلے، لیکن مولانا محمد یعقوب کی کالج سے مسلسل وابستگی کا ثبوت نہیں ملا، بظاہر مولانا نے تین یا چار سال کے بعد کالج چھوڑ دیا تھا، دہلی کالج نے کالج کے طلبہ کی تفصیلات پر مشتمل ایک مفصل گوشوارہ یا رجسٹر سنہ ۱۸۴۷ء میں شائع کیا تھا اس میں مولانا یعقوب کا نام درج نہیں۔ یعنی وہ اس سال کالج کی کسی جماعت میں شامل نہیں تھے۔ اس وقت سے مولانا نے تین یا چار سال کالج سے باہر گزارے، اس درمیان ان کی تعلیم کس منزل تک پہنچی تھی اور کالج چھوڑنے کے بعد اس میں کس قدر ترقی ہوئی اور کالج سے علیحدہ ہو کر کس استاذ سے وابستہ رہے، اس کا سراغ نہیں ملا، مگر سنہ ۱۸۵۱ء (۱۲۶۷ھ) میں حضرت مولانا مملوک العلی کی وفات سے ایک سال پہلے دوبارہ کالج سے وابستہ ہو گئے تھے اور کالج کی اعلیٰ ترین جماعت اسکالرس میں شامل تھے جس کو نو روپیہ مہینہ وظیفہ ملتا تھا۔

شاید اسی وجہ سے یا کچھ اور علمی مصروفیت تھی کہ مولانا محمد یعقوب دہلی میں ہوتے ہوئے بھی حضرت مولانا مملوک العلی کے ساتھ نہیں رہتے تھے، دہلی میں کسی اور جگہ رہائش تھی، والد ماجد کی وفات کے بعد اپنے مکان میں منتقل ہوئے، خود مولانا نے لکھا ہے کہ:

”بعد انتقال مولانا والد مرحوم کے احقر اپنے مکان مملوک میں جو چیلوں کے

کوچہ میں ہے جا رہا، مولوی صاحب بھی میرے پاس آرہے۔“ (۱)

غیر متوقع نہیں کہ مولانا محمد یعقوب کا یہ وقت حضرت مولانا احمد علی کے مطبع احمدی میں تصحیح کتب کی خدمت میں گزرتا ہو، حضرت مولانا احمد علی نے صحیح بخاری کا جو نسخہ بہت اہتمام سے پہلی مرتبہ شائع کیا تھا، حضرت مولانا احمد علی نے اپنی بیاض میں اس کا حساب لکھا ہے، اس میں ایک نسخہ بدصحیح برائے محمد یعقوب کا اندراج ہے۔ حضرت مولانا احمد علی کے قریبی لوگوں میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے علاوہ کسی اور محمد یعقوب کا نام مجھے نہیں ملا اس لئے اس سے مولانا محمد یعقوب نانوتوی ہی مراد ہوں گے، بخاری شریف کے متن کی تصحیح اور کتابت کی نظر ثانی کی خدمت بہت نازک نہایت وسیع اور اہم کام تھا قرین قیاس ہے کہ اس

(۱) حالات طیب یا تذکرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مع تصحیح و حواشی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (احوال آثار باقیات و متعلقات ص: ۱۸۶ مرتبہ نور الحسن راشد کاندھلوی) (کاندھلہ: ۱۳۲۱ء)

خدمت میں خاصا وقت صرف ہوتا ہوگا ممکن ہے کہ اسی زمانہ میں یا اس سے پہلے حضرت مولانا سہارنپوری سے حدیث پڑھی ہو، ان مصروفیات کی وجہ سے گھر پر رہنے میں زحمت ہو اسلئے حضرت مولانا احمد علی کے یہاں مطبع احمدی میں قیام کر لیا ہو۔

**درس حدیث** | مولانا کی دہلی کالج کی تعلیم کی تفصیل کی طرح تعلیم حدیث کی معلومات بھی مبہم اور نا تمام ہیں، مولانا نے لکھا ہے کہ میں نے حدیث شریف کی چند کتابیں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے اور چند حضرت مولانا احمد علی محدث سے پڑھیں، معروف روایت کے مطابق حضرت مولانا کو حضرت شاہ عبدالغنی سے بھی تلمذ واجازت ہے مگر اس تلمذ واجازت کا مولانا محمد یعقوب کی ذاتی تحریرات و مؤلفات (بیاض مکتوبات وغیرہ) میں ذکر نہیں ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نے اپنی بیاض میں حضرت شاہ عبدالغنی سے حضرت مولانا محمد قاسم کی سند لکھی ہے مگر شاہ صاحب سے اپنے تلمذ کا ذکر نہیں کیا۔ مولانا محمد یعقوب کی بیاض میں نقل حضرت مولانا محمد قاسم کی سند پر جو عبارت درج ہے وہ یہ ہے:

صورة الاجازة التي كتبها مولانا عبد الغني لمولانا محمد قاسم.

اور اس کے اختتام پر نام رقم کئے ہیں نیز لکھا ہے:

صورة ما خط شيخ شيخنا لشيخنا (۱)

یعنی یہ وہ تحریر (یا سند) ہے جو میرے استاد کے استاد نے میرے استاد کیلئے لکھی تھی۔

”قال الشيخ الاجل مولانا المولوى محمد قاسم ، انه قال

شيخى و استاذى قدوة العلماء مقتدى الفضلاء صاحب البركات

مولانا عبد الغنى بن“ (۲)

مگر اس تحریر میں مولانا محمد یعقوب صاحب کے حضرت شاہ عبدالغنی سے براہ راست تلمذ واجازت کا کوئی اثر و نشان نہیں ملتا ان اقتباسات سے صرف یہ جھلکتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب کو شاہ عبدالغنی سے براہ راست تلمذ نہیں صرف حضرت مولانا محمد قاسم کے ذریعہ سے ہے۔

(۱) و (۲) بیاض یعقوبی۔ ص: ۱۵۷ (طبع اول تھانہ بھون: ۱۹۲۹ء)

تاہم قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا مملوک العلی کی زندگی کے آخری ایام میں یا اس کے بعد کے سال (سنہ ۱۲۶۸ھ، ۱۸۵۲ء) میں حضرت شاہ عبدالغنی سے پڑھا ہوگا، اس کے علاوہ کوئی اور وقت ایسا نہیں ہے جس میں مولانا حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو سکتے، کیوں کہ جب مولانا دہلی کالج میں تھے اس وقت درس حدیث کیلئے ان کی عمر کم تھی اور حضرت مولانا مملوک العلی کی وفات کے ایک سال بعد جمیر چلے گئے تھے وہاں سے سنہ ۱۸۵۷ء میں اس وقت واپس ہوئے جب سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک شباب پر تھی، اس تحریک کا پوری طرح اختتام نہیں ہوا تھا کہ حضرت شاہ عبدالغنی ہندوستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئے تھے اور اس کی بھی کوئی اطلاع نہیں کہ مولانا محمد یعقوب نے مدینہ طیبہ حاضر ہو کر شاہ صاحب سے استفادہ کیا ہو۔

حضرت مولانا محمد قاسم سے درس حدیث | مولانا محمد یعقوب نے حضرت مولانا محمد قاسم سے صرف ونحو کی

ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں جس کا ذکر آچکا ہے آخر میں حدیث شریف کی اعلیٰ ترین کتابوں کا درس لیا، جن میں صحیح بخاری و مسلم شامل ہیں۔ صحیح بخاری اس وقت پڑھی تھی جب حضرت مولانا محمد قاسم سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) کے پہلے حج سے واپسی کے بعد سنہ ۱۲۷۸ھ کے تقریباً آخری مہینوں (شوال ذی الحجہ) میں نانوتہ اور دیوبند میں تھے، مولانا محمد یعقوب صاحب نے لکھا ہے کہ:

”اسی وقت میں احقر نے حضرت سے بخاری قدرے پڑھی۔“ (۱)

اس زمانہ میں منشی ممتاز علی نے اپنا مطبع دوبارہ جاری کیا اور حضرت مولانا محمد قاسم کو زحمت دی کہ وہ میرٹھ تشریف لائیں، مولانا میرٹھ تشریف لے گئے اور منشی جی کے یہاں قیام فرمایا، اس وقت حضرت مولانا محمد قاسم سے ایک جماعت نے صحیح مسلم پڑھی تھی (۲) اس میں بھی مولانا محمد یعقوب حاضر رہتے تھے۔

مولانا محمد یعقوب کی موٹا مالک کی سند بھی مولانا محمد قاسم کے واسطے سے ہے جو اس

(۱) و (۲) مولانا محمد قاسم نانوتوی، احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۲۰۵، ۲۰۶

طرح ہے:

”محمد یعقوب عن مولانا محمد قاسم عن مولانا احمد علی“ (۱)

حضرت مولانا احمد علی سے تلمذ | مولانا کا حضرت مولانا احمد علی سے بھی تلمذ تھا  
مولانا نے اپنے خطوط میں حضرت مولانا کو اپنا  
استاذ لکھا ہے، راقم کو اس تلمذ کی تفصیلات کا علم نہیں۔

دہلی کالج میں ملازمت کیلئے کوشش | حضرت مولانا مملوک العلی دہلی کالج کے  
صدر مدرس یا مدرس اول تھے، حضرت

مولانا کی وفات کے بعد یہ جگہ خالی ہو گئی تھی، اس پر نئے تقرر کی ضرورت تھی، اس لئے  
دہلی کالج کے مدرس دوم، مولانا سید محمد دہلوی کو مدرس اول بنا دیا گیا تھا، اب مدرس دوم کی  
جگہ خالی تھی یہ جگہ ضابطہ کے مطابق مدرس سوم مولانا سبحان بخش شکار پوری کا حق تھی مگر  
کالج کے مستقل ممتحن، مشیر علمی، مولانا مفتی صدر الدین آزرہ چاہتے تھے کہ مدرس دوم  
کے عہدہ پر مولانا محمد یعقوب کا تقرر ہو جائے مگر اس منصب کے لئے مولانا سبحان بخش اور  
مولانا محمد یعقوب کے علاوہ ایک امیدوار اور بھی سامنے آ گئے تھے، اسلئے انتظامیہ نے یہ  
طے کیا کہ اس کا امتحان لیا جاوے، جو امیدوار اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہو اس کا اس جگہ تقرر  
کر دیا جائے، امتحان کیلئے بھی مولانا مفتی صدر الدین آزرہ کا انتخاب ہوا مگر مفتی صاحب  
کے طریقہ کار پر کالج کے پرانے طالب علموں کو اعتراض تھا، ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ جگہ مولانا  
سبحان بخش کا حق ہے، وہ کالج کے پرانے، نہایت جید استعداد والے مستعد محنتی استاد ہیں  
انہی کو مدرس دوم بنایا جائے، اس قصہ میں غالباً کالج کے سابق پرنسپل اسپرنگر نے مداخلت  
کی جس کی وجہ سے یہ منصب کالج کے ضابطہ کے مطابق مولانا سبحان بخش کو مل گیا۔

دور ملازمت سنہ ۱۸۵۷ء تک | کالج میں مولانا سبحان بخش کے تقرر کے بعد  
مولانا نے کسی دوسری ملازمت کی جستجو کی،

بالآخر مولانا کا حضرت مولانا کی وفات کے تقریباً ایک سال بعد اجمیر کے سرکاری مدرسہ یا

(۱) مجموعہ اسانید مولانا محمد ناصر بلیاوی (مکتوبہ ۱۳۵۰ھ) نسخہ مولف مملوکہ راقم سطور

کالج میں عربی کے مدرس اول کے عہدہ پر تقرر ہو گیا، مولانا نے لکھا ہے کہ:  
 ”ایک برس دن کے قریب بعد انتقال والد صاحب مرحوم احقر دہلی رہا، پھر  
 نوکری اجمیر کے سبب دہلی چھوٹی۔“ (۱)

اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا سنہ ۱۲۶۸ھ کے آخر یا شروع سنہ ۱۲۶۹ھ  
 (۱۸۵۲-۵۳ھ) میں اجمیر گئے ہوں گے، اجمیر کالج میں مولانا کی بہت قدر و منزلت اور  
 نہایت احترام تھا، مولانا کی اعلیٰ درجہ کی لیاقت کی وجہ سے کالج کے پرنسپل نے حکومت  
 سے سفارش کی کہ مولانا بہترین صلاحیت کے بڑے باکمال شخص ہیں ان کیلئے ڈپٹی کلکٹر کا  
 منصب موزوں ہے، مولانا کو ڈپٹی کلکٹر بنا دیا جائے۔ سفارش جو کسی تجربہ کار جہاں دیدہ  
 افسر نے بھیجی تھی حکومت نے منظور کر لی اور مولانا کو ڈپٹی کلکٹر بنانے کے احکامات جاری  
 ہو گئے مگر جب مولانا کو اس کی خبر ملی تو مولانا نے اس باوقار اور کروفر کے عہدہ کو قبول کرنے  
 سے انکار کر دیا اور تعلیم و تدریس کو چھوڑ کر صاحب بہادر بننا گوارا نہیں کیا۔

اگرچہ اس وقت مولانا آزادی کی زندگی گزار رہے تھے مگر پھر بھی یہ پسند نہیں کیا کہ وہ  
 ظاہری اعزاز و احترام کی ملازمت کی وجہ سے تعلیم و تدریس کی خدمت ترک کر دیں، اسکے  
 کچھ دنوں کے بعد مولانا کابنارس کالج میں تبادلہ ہوا، جو سرکاری مدارس یا کالجوں میں ایک  
 بڑا اور باوقار ادارہ تھا، مولانا کے بنارس جانے کی وجہ سے اجمیر کالج کی جگہ خالی ہوئی تھی  
 اس کے لئے دلی کالج کی انتظامیہ نے (ڈپٹی) نذیر احمد کا نام پیش کیا مگر نذیر احمد صاحب  
 نے اس کو پسند نہیں کیا اور آئندہ کی توقعات کے لحاظ سے ڈپٹی انسپکٹری کو منظور کر لیا۔

مولانا علمی خدمت انجام دینا چاہتے تھے اور ڈپٹی صاحب بڑے عہدہ و منصب اور  
 اعلیٰ تنخواہ والی جگہ کی تلاش میں تھے، ڈپٹی صاحب کے سوانح نگار نے دونوں کا موازنہ  
 کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”نذیر احمد کے ہم جماعت اور دوست مولوی محمد یعقوب صاحب نے اپنے  
 والد اور استاد مولانا مملوک العلی صاحب، صدر مدرس عربی دہلی کالج کے نقش قدم کو

(۱) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۱۸۶

اپنے لئے مشعل راہ بنایا، اسی اجمیر کالج میں جہاں سے نذیر احمد کو آفر آیا تھا وہ عربی کے مدرس تھے، پرنسپل صاحب نے آپ کی ذہانت و ذکاوت دیکھ کر آپ سے پوچھے بغیر گورنمنٹ کو سفارش کر کے ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ منظور کرالیا، جب آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے تعلیم و تدریس کو مقدم سمجھ کر منظور نہیں کیا اور آخر کار جب مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سنہ ۱۲۸۲ھ میں دیوبند کا مدرسہ قائم کیا، اس وقت ان کے بلاوے پر ڈیڑھ سو روپے کی ملازمت چھوڑ کر تیس روپے تنخواہ پر دیوبند آ گئے، (۱)

مولانا محمد یعقوب ایک ڈیڑھ سال بنارس میں رہے، بنارس سے انسپکٹر تعلیم بنا کر رٹ کی بھیج دیئے گئے، رٹ کی میں تھے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک برپا ہوئی، جس کی وجہ سے مولانا ملازمت ترک کر کے وطن آ گئے۔

اگرچہ مولانا کے سنہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں شامل ہونے کی صراحت نہیں ملی، مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ خاندان اور بستی کے ذمہ داران تو اس میں شریک ہوں اور مولانا اس سے یکسو رہے ہوں مگر مولانا پر مقدمہ وغیرہ قائم نہیں ہوا، اس لئے جب حالات درست ہو گئے تو انگریز گورنمنٹ نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے حساب سے ان چھ مہینوں کی تنخواہ (جو اس تحریک کی نذر ہو گئے تھے) مولانا کو بھجوائی، مگر مولانا نے اس کو لینے سے انکار کر دیا۔ حکیم امیر احمد عشرتی نے لکھا ہے کہ:

”ڈیڑھ سو روپیہ کی تنخواہ پر ڈپٹی انسپکٹری پر سہارنپور تشریف لائے، پھر کچھ عرصہ بعد درسنہ ۱۸۵۷ء کا واقعہ پیش آیا، اس کے فرو ہونے کے بعد آپ کو چھ مہینہ کی تنخواہ نو سو روپے بھیجا گیا اور اصل جگہ پر بلائے گئے (مگر) آپ نے وہ نو سو روپیہ واپس فرمایا اور کہا میں نے ان چھ مہینہ میں کچھ کارسرا انجام نہیں دیا اس لئے میں یہ روپیہ نہیں لے سکتا۔ اور نیز ملازمت سے بھی استغنائی ظاہر کی اور متوکلاً متفرق کار کرتے رہے۔“ (۲)

(۱) مولوی نذیر احمد دہلوی احوال و آثار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص ۷۹ (لاہور: ۱۹۷۱ء)

(۲) تمہید مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتوی۔ مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی نانوتوی۔ ص: ۳ (مطبع احمدی علی گڑھ: ۱۳۲۷ھ)

۱۸۵۷ء کے بعد کی

ملازمت اور ذرائع معاش

سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کئی سال تک حالات ایسے سنگین تھے کہ اس وقت کہیں آنا جانا مشکل تھا، ہر طرف تفتیش اور سرکاری مخبروں کا جال بچھا ہوا تھا، معمولی

اطلاع اور شکایت پر سزائیں ملتی تھیں اور بہت سے افراد بلا وجہ اور معقول ثبوت کے پھانسیوں پر لٹکا دیئے گئے اور ان لوگوں کے لئے تو جینا دو بھر ہو گیا تھا جو اس تحریک میں شریک یا شریکوں کے مددگار یا عزیز و قریب تھے، ان کو ہر وقت مخبری گرفتاری اور زمین و جائیداد کی ضبطی کے احکامات کا ڈر رہتا تھا۔ جان کا خطرہ اور نقصانات سے کہیں بڑھ کر تھا اس لئے اکثر ذمہ دار اصحاب اپنے گھروں سے دور ادھر ادھر روپوش رہتے تھے۔

ابھی حالات درست ہو کر معمول پر نہیں آئے تھے، حضرت حاجی امداد اللہ اور حضرت مولانا محمد قاسم کی تلاش جاری تھی، حاجی صاحب کی مخبری اور گرفتاری کے لئے انگریزوں نے بڑے انعام کا بھی اعلان کر رکھا تھا، اس لئے حضرت حاجی صاحب ہجرت کے ارادہ سے ہندوستان سے نکل گئے تھے، مگر حضرت مولانا محمد قاسم وطن کے اطراف و نواح میں نیم روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جب حالات کے بہتر ہونے کے آثار نظر نہ آئے تو حضرت مولانا نے حج کا ارادہ کر لیا، حضرت مولانا محمد یعقوب وغیرہ چند اور اصحاب و اعزاء بھی ساتھ ہو گئے، یہ ظاہر یہ سفر اطلاع و اعلان کے بغیر خاموشی سے ہوا ہوگا، جمادی الاخریٰ سنہ ۱۲۷۷ھ (۱۵ نومبر ۱۸۶۰ء) میں نانوتہ سے چلے، پنجاب ہوتے ہوئے کراچی سندھ پہنچے، شعبان کے آخر میں کراچی سے کشتیوں کا سفر ہوا، آخر ذی قعدہ (۳ جون ۱۸۶۱ء) میں مکہ مکرمہ حاضر ہوئے، بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے، حج کی سعادت حاصل کی اور حضرت حاجی امداد اللہ سے شرفِ نیاز اور دولت استفادہ حاصل رہی، صفر سنہ ۱۲۷۸ھ (اگست ۱۸۸۱ء) میں واپسی کا سفر شروع ہوا جمادی الاخریٰ (ستمبر ۱۸۶۱ء) میں ایک سال سفر میں گزار کر بخیر و عافیت وطن واپس پہنچے، اسی دوران حکومت نے عام معافی کا اعلان کر دیا تھا، جہاں چاہے بے تکلف آجاسکتے تھے۔ واپسی کے بعد وطن میں قیام تھا، پھر ملازمت کے سفر پر نکل گئے۔

## مطبع مجتہائی میرٹھ

حضرت مولانا محمد قاسم کے پرانے نیاز مند منشی ممتاز علی نے اس موقع پر پھر یہ کوشش کی کہ ان کو حضرت مولانا نانوتوی کی صحبت حاصل رہے اور مولانا کی خدمت کا دوبارہ موقع ملے، حضرت مولانا ان کے اخلاص کے قدر داں تھے، اس لئے یہ درخواست و دعوت منظور فرما کر میرٹھ چلے گئے، میرٹھ میں منشی جی کا مطبع مجتہائی نشر و طباعت کا کام کر رہا تھا، حضرت مولانا محمد قاسم اس سے وابستہ ہو گئے، مولانا محمد یعقوب صاحب بھی وہیں آ گئے تھے اور وہ بھی مطبع کی متوقع اور پرانی کتابوں کو تازہ اشاعت کے لئے تیار اور صحیح کرتے رہتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم بھی اسی مقصد سے میرٹھ قیام فرماتے تھے۔

مطبع مجتہائی کی اس ملازمت کے دوران میں حضرت مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب نے جن کتابوں کی تصحیح فرمائی ان میں سے خاص کتاب اور اہم تحفہ مظاہر حق شرح مشکوٰۃ نواب قطب الدین دہلوی کے آخری حصہ کی تصحیح ہے۔ یہ حصہ اگرچہ اس سے پہلے ایک مرتبہ مطبع فخر المطابع دہلی سے مولانا سبحان بخش شکار پوری کی تصحیح سے چھپ چکا تھا، مگر اس میں بعض غلطیاں رہ گئی تھیں، دونوں صاحبان نے حضرت مصنف کے اصل مسودہ سے مقابلہ کر کے اسکے مطابق کیا اور اس میں بھی جو فروگذاشتیں رہ گئی تھیں ان کی تصحیح کی، یہ تصحیح شدہ نسخہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۶۵-۱۸۶۴ء) میں چھپنا شروع ہوا تھا سنہ ۱۲۸۲ھ میں اس کی طباعت پوری ہوئی۔

میرٹھ میں اس زمانہ میں ایک اور مطبع، مطبع ہاشمی کے نام سے بھی تھا، حضرت مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب اس سے بھی وابستہ رہے۔ مجتہائی اور ہاشمی سے وابستگی ایک ساتھ تھی اس میں کچھ فاصلہ اور کیا ترتیب و تفصیل تھی، اس کا علم نہیں، بظاہر آخر میں مطبع ہاشمی سے وابستہ تھے، میرٹھ وغیرہ کی اپنی ملازمت کا مولانا محمد یعقوب نے خود بھی ضمناً مختصر سا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

”احقر اس زمانہ میں بریلی اور لکھنؤ ہو کر میرٹھ میں اسی چھاپہ خانہ میں نوکر



ہو گیا، اس وقت ایک جماعت نے مسلم پڑھی احقر بھی اس میں شریک رہا۔“ (۱)  
مگر راقم سطور کو حضرت مولانا کی ملازمتوں کی اس ترتیب کی واقعیت میں شبہ ہے،  
جس کی مولانا محمد یعقوب کی تصحیح کی ہوئی مطبوعہ کتابوں سے تائید ہوتی ہے۔ سنہ  
۱۲۸۱-۸۲ھ (۱۸۶۴-۶۵ء) میں نول کشور میں تصحیح کتب پر مامور تھے اور احیاء العلوم کی  
درستگی و طباعت میں مولانا محمد مظہر کے معاون تھے اور اس کے فوراً بعد مطبع صدیقی بریلی  
میں علمی کتابوں کی صحت و ترجمہ میں معاون نظر آتے ہیں اور جب مدرسہ دیوبند  
(دارالعلوم) قائم ہوا اس وقت مولانا بریلی میں تھے اس لئے بظاہر مولانا کی تحریر میں کچھ  
غلطی ہے، ملازمت کے مراحل نول کشور، میرٹھ، بریلی، دیوبند صحیح معلوم ہوتے ہیں، تاہم  
مزید معلومات کی ضرورت ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب کا  
میرٹھ میں قیام بہت زیادہ نہیں ہوا، میرٹھ کی

### مطبع نول کشور لکھنؤ سے وابستگی

ملازمت ترک کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے، لکھنؤ میں نشی نول کشور کا پریس قائم ہو چکا تھا اور  
تیزی سے ترقی کر رہا تھا، اس مطبع اور ادارہ سے اسلامی علوم و فنون کی بڑی بڑی اہم اور  
نہایت نادر کتابیں بہت اہتمام اور آب و تاب سے چھپ رہی تھیں، مولانا محمد یعقوب  
سے پہلے مولانا محمد مظہر نانوتوی مصحح کی حیثیت سے وہاں ملازم تھے، مولانا کی کشش  
اور اہل مطبع کی طلب و پذیرائی مولانا محمد یعقوب کو بھی مطبع نشی نول کشور لے گئی، مولانا  
نے مولانا محمد مظہر کی شرکت میں کئی بڑی کتابوں کے مقابلہ اور تصحیح کی خدمت نہایت دقت  
نظر اور خوبی کے ساتھ سرانجام دی۔ ان کتابوں میں حضرت امام غزالی کی احیاء العلوم بطور  
خاص شامل تھی، نول کشور میں اور بھی کئی کتابوں کی تدوین ان کے علمی نسخوں سے مقابلہ اور  
تصحیح و حاشیہ نگاری میں مولانا محمد یعقوب کی خدمات شامل رہی ہوں گی مگر افسوس ہے کہ ان  
سب کے نام راقم سطور کے علم میں نہیں، تاہم اس قسم کی جن چند کتابوں کا علم ہو سکا ہے ان  
کا تالیفات کے ذیل میں ذکر آئے گا۔

(۱) حالات طیب یا تذکرہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی مع تصحیح حواشی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

مطبع صدیقی بریلی میں | جب مولانا محمد یعقوب لکھنؤ گئے تھے تقریباً اسی وقت مولانا محمد احسن نے اپنی جائے ملازمت بریلی میں

کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لئے ایک بڑا ادارہ قائم کیا تھا، ایک پریس بھی لگایا تھا، جس کو مطبع صدیقی کے نام سے موسوم کیا تھا، اس ادارہ اور مطبع نے برصغیر ہند میں علوم اسلامیہ کی بڑی بیش قیمت خدمات انجام دیں اور ایک سے ایک اعلیٰ کتابیں شائع کیں جو متاع علم و ہنر ہونے کے علاوہ جاذب قلب و نظر بھی تھیں، مولانا محمد احسن کو جلد ہی اس کی ضرورت ہو گئی تھی کہ ان کے مطبع میں اعلیٰ سے اعلیٰ ترین استعداد کے علماء جمع ہوں، اس سلسلہ کے ایک بدر منیر مولانا محمد یعقوب نانوتوی بھی تھے۔

مولانا محمد احسن نے مولانا محمد یعقوب کو لکھنؤ سے بریلی بلا کر اپنے کام میں شامل کر لیا بریلی میں مولانا محمد یعقوب کی یہی خدمت تھی، بعض قرائن و تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اور علمی مشاغل بھی رفیق تھے، درس و تعلیم سے بھی وابستگی ہو گئی تھی اور فتاویٰ وغیرہ بھی لکھے: بریلی میں مولانا محمد یعقوب کی ڈیڑھ سو روپے تنخواہ تھی اور بہت یکسوئی سے کام کر رہے تھے کہ دیوبند میں مدرسہ اسلامیہ (جو بعد میں دارالعلوم کے نام سے شہرہ آفاق ہوا) شروع ہو گیا، مدرسہ میں اعلیٰ درجہ کے مدرس کی ضرورت تھی حضرت مولانا محمد قاسم کی ہدایت مشورہ پر مدرسہ کے سرپرستان یا خود حضرت مولانا نے مولانا محمد یعقوب کو مدرسہ کے لئے مدرس اول بنا کر بلا لیا۔

## حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی سے بیعت اور اجازت و خلافت

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی جس خانوادہ اور ماحول میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے، اس میں ذاتی اصلاح اور تربیت اخلاق اور باطنی کمال حاصل کرنے کیلئے کسی شیخ کامل اور ممتاز مرشد سے رابطہ، ان سے بیعت اور اصلاح و تربیت کے مراحل سے گزرنا جیسے ایک عام معمول تھا، کم اہل علم تھے جو کسی بڑے شیخ کے دامن سے وابستہ نہ ہوں اور کم پرانے خاندان تھے جن کا کسی سے اصلاحی سلسلہ سے تعلق نہ ہو۔ نانوتہ اور رام پور خود کئی

بڑے مشائخ کا وطن تھا، یہاں سے کئی سو برس کے دوران کئی کالمین اٹھے، جن سے بہت فیض ہوا، اس لئے مولانا محمد یعقوب صاحب کا کسی شیخ یا سلسلہ ارشاد و تربیت سے وابستہ ہونا ان کی خاندانی اور وطنی روایت کے عین مطابق تھا۔

معلوم نہیں کہ زمانہ طالب علمی میں مولانا یعقوب صاحب کو مشہور مشائخ میں کس سے زیادہ نسبت و مناسبت تھی اور کیا ان کا بھی حضرت مولانا گنگوہی کی طرح حضرت شاہ عبدالغنی سے بیعت ہونے کا خیال تھا یا کوئی اور شخص یا سلسلہ جلوہ نگاہ تھا مگر جب مولانا کی جماعت کے ممتاز رفقاء اور دوست حضرت مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے تو مولانا نے بھی حاجی صاحب کا دامن پکڑ لینے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔

مولانا حضرت حاجی صاحب کو بچپن سے جانتے تھے، حاجی صاحب اپنی رشتہ داریوں کی وجہ سے نانوتہ آیا کرتے تھے، حاجی صاحب کے رشتہ دار اور مولانا مملوک العلی کا خانوادہ غالباً ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں، اس لئے مولانا اور ان کے رفیق و عزیز حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بچپن کا خاصا وقت حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں گزرا، حاجی صاحب کی ان پر عنایت کی نظر تھی، وہ ان کو چھوٹی چھوٹی کام کی باتیں سکھاتے اور بتاتے تھے، حضرت نے دونوں صاحبان کو کتابوں کی جلدیں بنانی سکھائیں، حضرت حاجی صاحب سے مولانا محمد یعقوب کا یہ پہلا تعارف اور گھر جیسا رابطہ تھا، ظاہر ہے کہ یہ رابطہ وقت گزرنے کے ساتھ بڑھا ہوگا، خصوصاً اس وقت مولانا کے دل میں حضرت حاجی صاحب کی قدر منزلت بہت زیادہ ہو گئی ہوگی، جب مولانا نے یہ دیکھا ہوگا کہ ان کے والد ماجد، حضرت مولانا مملوک العلی جو حضرت حاجی صاحب سے عمر میں بہت بڑے اور اپنے دور کی بڑی مقبول اور ممتاز شخصیت ہیں، حاجی صاحب کا بہت احترام کرتے ہیں اور ان سے ایسی دوستی رکھتے تھے کہ جب گھر سے دہلی جاتے تو تھانہ بھون اور کاندھلہ میں ضرور ٹھہرتے، اور جب دہلی سے گھر آتے اس وقت بھی دونوں جگہوں پر اترتے، ظاہر ہے کہ مولانا کے ننھے اور معصوم دل نے اس کا خاص اثر لیا ہوگا اور حاجی صاحب کی وقعت اور قدر و منزلت کا گہرا رنگ طبیعت میں جم گیا ہوگا۔ نیز مولانا یعقوب یہ بھی دیکھتے تھے کہ

جب کبھی حضرت حاجی صاحب دہلی آجاتے تو مولانا مملوک العلی کی تعلیمی مصروفیات کم ہو جاتیں اور حاجی صاحب کے ساتھ وقت گزرتا، حضرت مولانا مملوک العلی کا حاجی صاحب سے یہ رابطہ اور معاملہ ایسا نہیں تھا جس سے مولانا محمد یعقوب صاحب متاثر نہ ہوتے، مولانا مملوک العلی کی حاجی صاحب سے حسن ارادت، حاجی صاحب کے کمالات، بزرگی اور محاسن کی وجہ سے حاجی صاحب کی محبت و عقیدت کے جذبات روز افزوں ترقی کرتے رہے ہوں گے، تاہم حاجی صاحب سے محبت و مناسبت اپنی جگہ، لیکن اس وقت تک حاجی صاحب سے بیعت و استرشاد کا غالباً ارادہ نہیں ہوا تھا۔

مولانا حضرت حاجی صاحب سے کب بیعت ہوئے اس کی تاریخ یا سنہ مجھے نہیں ملا، لیکن منشی محمد قاسم نیا نگری کے نام مولانا کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجمیر کی ملازمت کے دور تک حاجی صاحب سے وابستہ نہیں ہوئے تھے، اجمیر وغیرہ کی ملازمت سے جب تقریباً پانچ سال بعد واپس ہوئے، اس وقت حاجی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہوگا، مولانا نے منشی قاسم کے نامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

”تم اس عاجز کا حال اہل اجمیر سے معلوم کرو کہ کس قدر ابر تھا کہ ستار اور راگ ناچ میں گزرتی تھی، نماز و جماعت و تقویٰ و طہارت سے کچھ بحث نہ تھی، اب ہر چند کہ بہ ظاہر اور باتوں سے توبہ کی اور حضرت مرشد الا نام حاجی مدظلہم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا“ (۱)

یہ دور وہ ہے جب سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک شروع ہو چکی تھی، مولانا ملازمت چھوڑ کر وطن آگئے تھے، غالباً اسی وقفہ میں اس تحریک کے دنوں میں یا حاجی صاحب کے سفر حجاز سے پہلے کسی وقت مولانا حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہوئے ہوں گے، مولانا کی سیر و سلوک اور سفر اصلاح و معرفت کی تفصیل بھی مفقود ہے، مولانا کو حاجی صاحب سے بیعت کے بعد کامل استفادہ اور رابطہ کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ حاجی صاحب ہندوستان سے مکہ

(۱) مکتوب مولانا، ص: ۱۸ (طبع تھانہ بھون ۱۹۲۹ء مشمولہ بیاض یعقوبی محمد یعقوب نانوتوی، مکتوب محررہ یکم رجب

۱۲۸۳ھ، (۱۰ نومبر ۱۸۶۶ء) (مطبع احمدی، علی گڑھ: ۱۳۲۷ھ)

معظمہ کے لئے روانہ ہو گئے، اس وقت مکہ معظمہ خط و کتابت کی سہولت کم تھی اور چونکہ حاجی صاحب سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں سرگرم رہے تھے اور انگریز حکومت کے ممتاز باغیوں میں سے تھے اسلئے حاجی صاحب سے خط و کتابت اور روابط میں احتیاط کی ضرورت تھی۔

اگرچہ حضرت مولانا تھانوی کے ایک ملفوظ میں ہے کہ:

”جب حاجی صاحب تھانہ بھون تشریف رکھتے تھے رات کو سب ذاکر شاغل

لوگ اٹھتے، یہ بھی اٹھتے مگر حضرت اوروں کو تو منع نہیں فرماتے تھے ان کو فرماتے، سو

رہو ہم وقت پر خود اٹھا دیں گے، اس ناز سے ان کی تربیت فرمائی گئی“ (۱)

مگر خود مولانا محمد یعقوب کی تحریرات سے یہی جھلکتا ہے کہ ان کو حضرت حاجی

صاحب کی خدمت میں زیادہ وقت گزارنے کا سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کم موقع ملا ہے، مولانا تھانوی نے جس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے ممکن ہے کہ اسی درمیانی وقفہ کا ہو۔

بعد میں جب حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا محمد قاسم کو اجازت و خلافت

سے نواز دیا جو حضرت مولانا محمد یعقوب کے استاد اور مطاع بھی تھے اس وقت مولانا

یعقوب صاحب نے حاجی صاحب سے گزارش کی کہ مجھے بھی مولانا محمد قاسم سے استفادہ

کی اجازت دیجئے اور مولانا کو بھی اس کی ہدایت فرمادیں کہ وہ میری سرپرستی اور تربیت

منظور کر لیں، معلوم نہیں کہ اس درخواست کا کیا ہوا، مگر مولانا یعقوب غالباً حاجی صاحب

کی ہی تربیت میں رہے، مولانا کی نسبت حضرت مولانا محمد قاسم کا ایک فقرہ حکیم الامت

مولانا تھانوی نے نقل فرمایا ہے کہ:

”ہر شخص میں کچھ نہ کچھ کھوٹ ہوتا ہے، جو مجاہدہ سے زائل ہوتا ہے مگر مولوی

یعقوب صاحب بے کھوٹ پیدا ہوئے“ (۲)

اصلاح و تربیت کے مرحلہ سے گزر کر سفر سلوک مکمل ہوا اور حضرت حاجی صاحب

نے مولانا کو اجازت و بیعت سے نوازا اور ارشاد و تلقین کی ہدایت فرمائی۔

(۱) و (۲) جمیل الکلام (مجموعہ ملفوظات، مولانا تھانوی شامل درالفصل للوصل) مرتبہ مولانا قاضی جمیل احمد تھانوی۔

ص: ۳۷ (طبع اول، بارہ بنکی: ۱۳۵۳ھ)

اجازت کب ملی اس کی تعیین ممکن نہ ہوئی، لیکن مولانا کے حضرت حاجی صاحب کے نام ایک خط سے یہ جھلکتا ہے کہ مولانا کو حاجی صاحب نے سفر ہجرت کے دو یا تین سال بعد مکہ معظمہ سے خط کے ذریعہ سے اجازت بیعت سے مفتخر فرمایا تھا، یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۲۷۸ھ کا ہوگا۔ حضرت مولانا کے حضرت حاجی صاحب کے نام جو مکتوبات دریافت ہیں ان میں سے پہلا خط غالباً حضرت حاجی صاحب کے اجازت نامہ کے جواب میں ہے، مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ:

”بے اختیار یہ عرض ہے کہ یہ غلام روسیہ کسی جانب اور کسی طور سے مناسبت آپ کے خدام سے نہیں رکھتا، باللہ العظیم اپنے آپ کو متوسلین کی جماعت میں گنتے ہوئے یوں یوں شرم دامن گیر ہوتی ہے، کہ ایسے شیخ آفتاب عالم کے ایسے ناکارہ خادم یہ ننگ خام بدنام کنندہ نگو نامی چند ہرگز لائق خدمت اور توجہ نہیں مگر فیض عام مخدوم کا وہ ہے جس نے اس ذرہ کو خاک سے اٹھایا اور سر بلندی کو پہنچایا، عنایت نامہ جواب و عریضہ امین ہمدست مکرمی مفتی حاجی فضل حق صاحب مرحمت فرمایا اور وہ کچھ امور زبانی ارشاد فرما بھیجے کہ ہر چند سب طرف اپنے آپ کو دیکھا مگر کہیں اس کا مصداق نہ پایا، معاذ اللہ

آپ کا ارشاد غلط نہیں اور یہ یقین اور ایمان ہے کہ کوئی دخل اور احتمال غلط اور وہم و خیال کا شائبہ نہیں مگر ہاں آپ حسن ظن کو کام فرماویں اور عیوب سے چشم پوشی اور خطاؤں سے درگزر اور عطا و عطا، اور عنایت پر عنایت فرماویں اور اس خاک ناپاک کو جو چاہیں بنا دیویں: ید اللہ فوق ایدیہم و بی یبطش کا وہ ہاتھ مصداق ہے بندہ کو ارشاد حضور سے کوئی جائے درگزر اور عذر نہیں، یہ بندہ کو تصدیق ہے کہ کا ملین جس سے چاہتے ہیں اپنا کام لے لیتے ہیں“ (۱)

افسوس ہے کہ اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں، بہر حال مولانا لمبے مجاہدہ کے بعد اجازت سے نوازے گئے اور بعد میں خود مرشد کامل ہوئے۔

(۱) مکتوب شامل در مجموعہ مکتوبات قلمی، بنام حضرت حاجی امداد اللہ، فوٹو اسٹیٹ مملوکہ راقم سطور

حضرت حاجی صاحب کے خلفاء میں سے جو (تقریباً ۱۲۹۰ھ یا اس کے بعد) حیات تھے (۱) ان میں حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم کے بعد، مولانا محمد یعقوب کا نام آتا تھا، حضرت حاجی صاحب کی تحریروں اور مکتوبات میں جہاں کہیں ان حضرات کا نام آیا ہے۔ یہی ترتیب ہے۔

حضرت حاجی صاحب کے مولانا محمد یعقوب صاحب کے نام متعدد مکتوبات مرقومات امدادیہ میں شامل ہیں، حاجی صاحب مولانا کو اپنے قائم مقام اور ممتاز وابستگان طریقت میں شمار فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ تحریر فرمایا:

”مولوی قاسم اور محمد یعقوب کو بجائے فقیر سمجھ کر ان کی خدمت سے فیضیاب ہوں“ (۲)

ایک خط میں خود مولانا محمد یعقوب صاحب کو تحریر فرمایا ہے:

فقیر آں عزیزوں کے مرتبہ کو بلند پاتا ہے آں عزیزوں کو بھی ظاہر ہوگا“ (۳)

شیخ محمد بن جعفر کتانوی مغربی دنیائے اسلام کے شہرہ آفاق جلیل القدر مصنف، علامہ عبدالحی کتانوی مغربی کے پوتے تھے، دو مرتبہ ہندوستان آئے پہلا سفر شعبان سنہ ۱۳۲۳ھ (مارچ سنہ ۱۹۲۵ء) میں ہوا تھا، ان سفروں کے دوران شیخ محمد بن جعفر نے ہندوستان کی دینی علمی سرگرمیوں کا مشاہدہ کیا، علمی آثار و مقامات دیکھے، خصوصاً بمبئی کراچی، دہلی اور دیوبند وغیرہ کا سفر کیا، یہاں کے مدرسوں اور دینی مرکزوں میں گئے، نامور علماء سے استفادہ کیا اور اجازت حدیث حاصل کی، دہلی میں سلسلہ دیوبند کے دو

(۱) حیات تھے کا اضافہ اس لئے کیا گیا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے جملہ خلفاء میں علم و فضل اور مراتب درجہ کے لحاظ سے حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم کے بعد مولانا سید عبدالرحمان کاندھلوی کا نام تھا جس کو شائم امدادیہ کے مؤلف اور حضرت مولانا کتانوی نے بھی علامہ عصر کے خطاب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان دونوں کے بعد مولانا عبدالرحمان صاحب کو اجازت ہوئی مگر علامہ عبدالرحمان کی نوجوانی میں مکہ معظمہ میں عین حالت طواف میں ۱۲ رزی الحجہ سنہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء) کو وفات ہو گئی تھی اس لئے ان کا زیادہ شہرہ نہیں ہوا تاہم حضرت حاجی صاحب کے خلفاء کی فہرست میں نام شامل ہے۔

(۲) ”داو شاں رابع سلام دعائے خیر فرمودہ دہند کہ مولوی محمد قاسم صاحب و مولوی محمد یعقوب را بجائے فقیر دانستہ از خدمت شاں فیضیاب بودہ باشند“ مرقومات امدادیہ مکتوب ص: ۱۸، مکتوبہ غالباً رجب ۱۲۸۳ھ (دہلی: ۱۹۷۹ء)

(۳) ”واحق مرتبہ آں عزیزاں را بلندی یابد، انشا اللہ تعالیٰ بر آں عزیز ہم ظاہر خواہد شد“ مکتوب ص: ۱۳، ۱۲ مرقومات امدادیہ

بڑے علماء مولانا عبد العلی میرٹھی اور مولانا حکیم عبد الوہاب نابینا سے ملاقات ہوئی تھی، اور مولانا عبد العلی نے مسلسل بالاولیۃ کی اور مولانا حکیم عبد الوہاب نابینا نے حدیث فقہ اور تفسیر کی اجازت عامہ عنایت فرمائی تھی۔

مولانا محمد یعقوب کو مولانا مملوک العلی سے اجازت و خلافت کی ایک روایت اس ضمن میں شیخ محمد بن جعفر نے جو کچھ لکھا ہے اس میں نئی قابل توجہ یہ اطلاع ہے کہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کو اپنے والد

حضرت مولانا مملوک العلی سے طریقہ چشتیہ اور قادریہ میں اجازت بیعت حاصل تھی اور مولانا مملوک العلی کو حضرت شاہ عبدالعزیز سے اجازت حاصل تھی۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے اسی سلسلہ سے حکیم نابینا کو اجازت دی اور حکیم نابینا نے محمد بن جعفر کتانوی کو، مگر تعجب ہے کہ اس سلسلہ اجازت و خلافت کا مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی کسی تحریر یا بیاض میں ذکر نہیں، وہ خود کو صرف حضرت حاجی امداد اللہ کا مجاز بیعت لکھتے ہیں اور حضرت مولانا محمد یعقوب کے خاص مستفید اور شاگرد حکیم الامت مولانا تھانوی نے بھی اس کا کہیں ذکر نہیں کیا، اس لئے شیخ محمد جعفر کتانوی کی یہ اطلاع مشتبہ معلوم ہوتی ہے، بظاہر اس میں سہو ہوا اور سلسلہ اجازت میں کہیں التباس ہو گیا ہے۔ (۱)

دیوبند میں مدرسہ اسلامیہ یا دارالعلوم دیوبند کا قیام ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے، چند برگزیدہ علماء اور اہل بصیرت اصحاب جنہوں نے سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے مغل اقتدار کے

مدرسہ اسلامیہ (دارالعلوم) دیوبند کی مسند صدارت پر

غروب کے ایام دیکھے تھے، اور پھر سنہ ۱۸۵۷ء کے خون آشام روح فرسا واقعات کا بھی مشاہدہ کیا۔ خون مسلم کی ارزانی اور مسلمانوں کی صدیوں کی محنت کو ضائع ہوتا دیکھا تھا اور دہلی کے بڑے بڑے مدارس، علمی مرکزوں اور خانقاہوں کے لٹنے اور ان کو تودہ خاک بننے

(۱) سفرنامہ شیخ محمد بن جعفر کتانوی رحلتان الی الہند۔ مجلۃ الدراسات الاسلامیہ۔ اسلام آباد، پہلی قسط شمارہ ۲، ص ۲۰۰۔ ۲۲۲



کے سب واقعات ان کے علم میں تھے اور وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کا صدیوں کا اقتدار اور نظام حکومت بے نام و نشان ہو گیا ہے، اب بظاہر اُمید نہیں کہ ویسے افراد، ویسے دینی ادارے، ویسے علم و معرفت کے مرکز پھر قائم ہوں گے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمانوں کو بہر حال یہیں رہنا ہے تو ان کی تعلیم و تربیت کے لئے کچھ انتظام کرنا ضروری ہے اور ان کی زندگیوں کو دین کے راستہ پر لانے کی کوشش کرنا سب سے پہلی ذمہ داری اور اہم ترین فریضہ ہے، یہی فکر اور خیال تھا جو دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ظاہر ہوا۔

مدرسہ دیوبند کیلئے پہلی تحریک ۱۵ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) کو ہوئی تھی، اسی دن مشورہ ہوا، اسی دن عام چندہ ہوا اور اسکے فوراً بعد تعلیم کا آغاز کر دیا گیا۔ تعلیم کب شروع ہوئی اس کی صراحت مجھے نہیں ملی، لیکن اس مدرسہ کی بنیاد کچھ ایسے اخلاص سے قبولیت کی گھڑی میں رکھی گئی تھی کہ اس کو ترقی کرتے دیر نہیں لگی، یہ دینی علمی پودا پھلتا پھولتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سایہ عالم اور ایک تنار درخت بن گیا، ایسا مبارک درخت اور ایسا پر بہار اس کا ماحول اور ثمرات کہ جہاں اس کی شاخ پہنچ گئی وہاں دین کے باغیچے لہلہانے لگے، دین کی سرسبزی کی صورت نکل آئی اور علم و عمل کے گلستاں آباد ہو گئے، مدرسہ کے افتتاح کی خبر ملتے ہی دور دراز سے علم کے شوقین طلبہ اور اہل علم و صلاح دیوبند آنے شروع ہو گئے اور سال اول کے اختتام یعنی شعبان سنہ ۱۲۸۳ھ تک مدرسہ میں اہتر (۶۹) طلبہ ہو گئے تھے۔

مدرسہ کی ابتداء کے ساتھ ہی مولانا ملاما محمود صاحب دیوبندی کو مدرس مقرر کر دیا گیا تھا، مولانا محمود کی تنخواہ پندرہ روپے ماہانہ مقرر ہوئی تھی مگر مدرسہ کے ذمہ داروں کو اس کا احساس تھا کہ یہ تنخواہ کم ہے مگر آمدنی نہیں تھی اس لئے اضافہ مشکل تھا۔ اسی دوران مولانا محمد یعقوب صاحب بھی جو بریلی میں ملازم تھے حضرت مولانا محمد قاسم کی ہدایت پر دیوبند آ گئے تھے، مولانا کو مدرسہ کا مدرس اول یا صدر مدرس مدرسہ مقرر کیا گیا تھا، مولانا کا مدرسہ میں کب تقرر ہوا، کیا کیا کتابیں اور کس قدر طلبہ مولانا کے سپرد تھے، اس کی صراحت مجھے نہیں ملی، لیکن مدرسہ کی پہلے سال کی روداد میں مولانا کا نام اور مولانا کی خدمات کا

اعتراف موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے آغاز کے بعد مولانا جلد ہی مدرسہ میں آگئے تھے۔ دیوبند آنے سے پہلے جس ملازمت پر تھے اس کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپے مہینہ تھی مگر مولانا کا خدمت دین کا جذبہ، صبر و قناعت اور اپنے بڑوں کی بات بلا تامل مان لینے کا مزاج دیکھئے کہ اکابرین مدرسہ خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم کی ہدایت پر وہ تنخواہ چھوڑ کر مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) آگئے، جہاں صرف بیس روپے ماہوار تنخواہ تھی، ایک سال کی ملازمت کے بعد تنخواہوں میں اضافہ ہوا، مولانا مولانا محمود کی تنخواہ پندرہ روپے سے بیس روپے اور مولانا محمد یعقوب کی بیس سے تیس روپے ماہانہ ہو گئی تھی۔ مدرسہ کی سنہ ۱۲۸۴ھ (۶۸-۱۸۶۷ھ) کی روداد میں لکھا ہے:

”ناظرین کیفیت سال گزشتہ کو یاد ہوگا کہ ہم نے اپنی تمنا درباب ترقی تنخواہ مدرسین ظاہر کی تھی چونکہ عنایت الہی سے چندہ میں ترقی پائی، لہذا اول ترقی مدرسین عمل میں آئی۔“

مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس اعلیٰ کی بیس روپے سے تیس روپے اور مولوی محمود صاحب مدرس دوم کی تنخواہ پندرہ روپے سے بیس روپے۔“ (۱)

مدرسہ میں پہلا سال تعلیم اور اسکے اثرات | یہ خیال ہوتا ہے کہ مدرسہ میں مرتب سلسلہ شروع ہوا کتابوں اور جماعتوں کی درجہ بندی کی گئی اسی وقت سے مولانا محمد یعقوب مدرسہ میں قیام فرماتے۔ اگرچہ اس سال کی (سب سے پہلی اور ابتدائی) روداد میں مولانا کے ذمہ درسی کتابوں اور طلبہ کی نشان دہی نہیں کی گئی، مگر اس روداد کے بعض اقتباسات کی روشنی میں یہ طے کیا جاسکتا ہے کہ درجہ اول کی سب سے پہلی اور اعلیٰ ترین چار جماعتیں حضرت مولانا کے سپرد کی گئی ہوگی، یہاں چاروں جماعتوں کے نصاب کی ترتیب وار تفصیل نقل کی جاتی ہے:

(۱) روداد مدرسہ عربی (دارالعلوم) دیوبند (سال اول ۱۲۸۴ھ) ص ۳

”درجہ اول: میں صحیح مسلم، صحیح بخاری، مؤطا“

مسودہ ترجمہ اردو سے عربی

میں اور عربی سے فارسی میں

بتفصیل بالا

درجہ دوم: بیضاوی شریف، ہدایہ، ابوداؤد

ابن ماجہ، نسائی

بتفصیل مذکور

درجہ سوم: جلالین، مشکوٰۃ، ترمذی

تاریخ یمنی، علم ادب

بتفصیل مذکور

درجہ چہارم: میبذی، شرح عقائد، توضیح تلویح

سراجی، فرائض، دیوان متنبتی

پہلے سال میں پہلے درجہ میں تین، دوسرے درجہ میں دو، تیسرے میں بھی دو اور چوتھے میں کل سات طالب علم تھے، مگر چوتھے درجہ کے طلبہ میں سے ایک طالب علم جن کے نام کی صراحت نہیں سالانہ امتحان میں موجود نہیں تھے۔

شعبان سنہ ۱۲۸۳ھ (دسمبر ۱۸۶۶ء) میں سالانہ امتحان ہوا، حضرت مولانا محمد قاسم، مولانا مہتاب علی اور مولانا ذوالفقار علی صاحبان نے امتحان لیا، ممتحنین، مدرسین کی کاوش اور طلبہ کی محنت و استعداد دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور ان کی تحسین فرمائی، حضرات ممتحنین کی رائے گرامی ملاحظہ ہو:

”ہم نے کئی روز تک امتحان مفصل ہر دفعہ کالیا اور حتی الوسع سوالات مشکل

پوچھے اور نمبر ہر طالب علم کے ہر ایک کتاب کے بابت لگائے، حال مدرسہ بالعموم

قابل تعریف پایا۔ مدرسان کی سعی اور طلبہ کی محنت اس امتحان سے بخوبی ثابت ہے، ہم

کارگزاری مدرسان سے نہایت خوش ہیں۔

العبد محمد قاسم دیوبندی۔ العبد مہتاب علی دیوبندی۔ العبد ذوالفقار علی دیوبندی“ (۱)

مدرسہ کے ذمہ داروں نے اپنے مدرسہ کے مدرسین کی محنت اور اسکے نتائج پر دلی

(۱) روداد مدرسہ عربی (دارالعلوم) دیوبند (سال اول ۱۲۸۳ھ، ۱۸۶۷ء) قلمی ص: ۱۲

مسرت کا اظہار کیا، انتظامیہ کے کلماتِ تشکر بھی مدرسہ کی روداد میں چھپے ہیں جو درجہ ذیل ہیں:

”مولانا محمد یعقوب صاحب مدرس نانوتوی خلف مولانا مولوی مملوک علی صاحب مرحوم، اور مولوی محمد محمود صاحب دیوبندی کی محنت اور توجہ کا شکریہ ہم پر واجب ہے کیوں کہ انکی توجہ سے اس تھوڑے سے عرصہ میں بہت کچھ ترقی اور استعداد ہوئی۔“ (۱)

یہ پہلے سال (یا پہلی ششماہی) کی کارگزاری یا روداد تھی، آنے والے ہر اک دن میں مولانا کی مدرسہ سے وابستگی میں، تعلیمی محنت میں، تربیتی توجہ اور مدرسہ کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھانے، ترقی دینے اور توسیع دلانے پر کوشش میں اضافہ ہوتا رہا، جس سے مدرسہ کی علمی رفعت و شان اور تعلیم کا معیار بلند سے بلند ہوتا گیا اور طلبہ کی تعداد روز افزوں بڑھتی رہی۔

حضرت مولانا مدرسہ میں صرف مدرس نہیں تھے، بلکہ اسکے تمام شعبوں پر نظر رکھتے تھے ہر ایک کی توسیع کے لئے کوشش فرماتے، جو خدمات مدرسہ کی طرف سے سپرد بھی نہیں تھیں ان کو بھی انجام دیتے، مدرسہ کے انتظامی معاملات کی خبر رکھتے تھے، طلبہ کی نگرانی و تربیت فرماتے، مدرسہ کے مقامی تعاون کے لئے جدوجہد کرتے اور مدرسہ کے مفوضہ اسباق کے علاوہ اپنے فارغ اوقات میں اور کتابوں کا درس دیتے۔ کچھ دنوں کے بعد اپنے شوق سے طلبہ کو طب پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع فرما دیا تھا، جس نے بعد میں بہت ترقی کی اور طب جو مدرسہ کا مستقل شعبہ بن گیا، یہاں تک اس کی بذات خود ایک اہمیت ہو گئی، اور اس کو اہم طبی مرکز کا درجہ مل گیا، مدرسہ کے مہتمم کی طرف سے اس شعبہ کے لئے جراحی، آپریشن کے نئے آلات (New Instruments) کی ضرورت کا اعلان ہوا اور ان کی فراہمی کی استدعا کی گئی تھی، حضرت مولانا جب تک زندہ رہے اور علوم کے علاوہ طب کی تعلیم و تدریس بھی اہم مصروفیات میں شامل رہی۔

اگرچہ اس وقت مدرسہ میں دارالافتاء قائم نہیں ہوا تھا لیکن مدرسہ کے مرکز علماء

(۱) روداد مدرسہ عربی (دارالعلوم) دیوبند (سال اول ۱۲۸۳ھ ۱۸۶۷ء) قلمی ص: ۱۰، ۱۱

ہونے کی وجہ سے جلد ہی دینی مسائل کی تحقیق پر مشتمل سوالات آنے شروع ہو گئے تھے، ان کے فقہی جوابات بھی مولانا ناخبر فرماتے تھے۔

مولانا کا مدرسہ کے ساتھ ایک اور بڑا تعاون یہ تھا کہ مدرسہ کے آغاز کے بعد سب سے پہلی ضرورت کتابوں کی تھی، جن کا بیک وقت کثیر تعداد میں حاصل ہونا سخت مشکل تھا، مولانا نے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ اپنے والد ماجد حضرت مولانا مملوک العلی کے کتب خانہ اور اپنے ذاتی ذخیرہ کا بڑا حصہ مدرسہ کو استفادہ کیلئے مستعار دے دیا، جس سے مدرسہ کی انتظامیہ کو غیر معمولی راحت اور مسرت ہوئی۔ مدرسہ کے علماء اس کتب خانہ سے بے تکلفی سے استفادہ فرماتے اور بار بار مولانا محمد یعقوب کے ممنون و شکر گزار ہوتے کہ مولانا نے اس دولت بے بہا سے فائدہ اٹھانے کا موقع بخشا، مدرسہ کی انتظامیہ بھی اس احسان سے گرانبار تھی، مدرسہ کی سالانہ رواد میں کئی مرتبہ بہت ممنونیت اور تشکر کے جذبات کے ساتھ اس عطیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا کا مدرسہ سے رابطہ بڑھتے بڑھتے اس درجہ کا ہو گیا تھا کہ مدرسہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب گویا ایک جان دو قالب بن گئے تھے، جس کا چھوٹے بڑے ہر ایک کی زبان پر تذکرہ اور اقرار و اعتراف تھا کہ مدرسہ کی ترقی، مقبولیت اور پذیرائی میں منجملہ اور اسباب کے اس کا بھی خاص دخل اور حصہ ہے کہ مولانا محمد یعقوب اس کے خاص سرپرست اور مربی ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت مولانا کے طالب علمی اور نوعمری سے واقف سرسید احمد خاں اور حضرت مولانا کے متوسلین اور اہل مدرسہ سب ہی اس کے قائل تھے اور یہی تذکرہ فرماتے رہتے تھے۔

حضرت حاجی امداد اللہ کے دل میں مولانا محمد یعقوب کی کیسی قدر و منزلت تھی اور وہ مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) کے لئے مولانا محمد یعقوب کو کس قدر ضروری اور اہم سمجھتے تھے اور حضرت حاجی صاحب کے ارشاد کے مطابق مدرسہ کو مولانا سے کس قدر فائدہ تھا اس کا اس ہدایت نامہ اور خط سے علم ہوتا ہے جو حضرت حاجی صاحب نے حاجی عابد حسین صاحب کو لکھا تھا، اس میں تحریر ہے کہ:

”مولوی محمد یعقوب کی خاطر داری اور دل جوئی کو اپنے اوپر لازم کر لیں بظاہر

مدرسہ کا وجود ایسے ہی بزرگوں کی موجودگی سے ہے۔“ (۱)

نیز مولانا کے ایک متوسل (اور دیوبند کی نواحی بستی املیا کے ایک فاضل شخص) جو مدرسہ کو اول دن سے دیکھنے والوں میں سے تھے، مدرسہ پر اپنی مثنوی میں مولانا کے مرتبہ اثرات اور اہمیت کا یوں ذکر کرتے ہیں:

مدرسہ کو باعث عز و وقار  
آپ ہی پر ہے مدار مدرسہ  
درہم برہم ہوں سب دین کے کام  
زخم بھرنے نہیں پائے ہنوز  
اور ہی دین کو جلوہ ہے اب (۲)

آپ ہیں دین کو وجہ افتخار  
آپ ہی ہیں افتخار مدرسہ  
آپ کا چندے نہ ہووے گر قیام  
آپ اک اس جا نہیں تھے چند روز  
آپ کے قدموں کی برکت کے سبب

اسی مثنوی کے اس ضمن میں چند شعر اور لائق مطالعہ ہیں، مولانا عبدالکریم فروغ کہتے ہیں:

ہے وہ حضرت پیر و مرشد کے سبب  
آج کیا کچھ حق نے دی ہے اس کوشاں  
کیسا کچھ ہوگا وہ مقبول الہ  
جملہ اہل دین کے ہیں وہ پیشوا  
ہادی دین سرگروہ مہتدیں  
ہیں وہ مقبول خدائے عز و جل  
ایک گوشے میں طبیعت کے ہیں سب  
ذکر میں ان کا نہیں کرتا یہاں  
کچھ کرے تشریح جو انکی بیاں (۳)

خیر و برکت مدرسے میں جو ہے اب  
یہ سمجھ لینا ذرا اے مہرباں  
ہے بدولت جس کے یہ سب عز و جاہ  
اور کیا رتبہ ہے اس سے فوق تر  
جا نشیں خاص ختم المرسلین  
سنت احمد پہ ہے ان کا عمل  
حکمت و معقول و منقول و ادب  
اور جو کچھ علم ہیں دل میں نہاں  
کیوں کہ اس لائق نہیں میری زباں

(۱) مرقومات امدادیہ، ص: ۱۱۵

(۲) مثنوی فروغ، مولانا عبدالکریم فروغ دیوبندی، ص: ۳۶ (دیوبند ۱۳۹۸ھ) (۳) مثنوی فروغ ص: ۳۹، ۴۰

سر سید احمد کو اگرچہ مدرسہ کے طریقہ کار سے بہت اتفاق نہیں تھا، مگر وہ دینی مدرسوں اور تعلیم گاہوں کی ضرورت و افادیت کے پوری طرح قائل تھے اور خصوصاً دیوبند کے علماء میں سے متعدد بڑے علماء اور مولانا ذوالفقار علی، حضرت مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب صاحبان سے ذاتی طور سے زمانہ طالب علمی سے واقف تھے اور ان کے کمالات کے دل کی گہرائیوں سے معترف بھی تھے۔ بہر حال سر سید احمد نے مدرسہ کی ایک رپورٹ (سالانہ روداد) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس مدرسہ کے چلنے کی وجہ سے وہاں مولانا محمد قاسم جیسے مادرزاد ولی اور مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے مخلص کا ہونا ہے، اس میں مولانا محمد یعقوب کے متعلق جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہاں درج کئے جاتے ہیں:

”دوسرا بڑا سبب مولوی محمد یعقوب کا ہے جو مدرس اول اس مدرسہ کے ہیں، انہوں نے صرف پینتیس روپیہ ماہواری مدرسہ سے لینا قبول کیا ہے اور قناعت و زہد سے اس قدر قلیل میں اوقات بسر کرتے ہیں، اگر وہ نہیں تو کیا دوسرا کوئی شخص اس قلیل مشاہرہ پر ان کے علوم پڑھانے کو ملے گا، جو اس مدرسہ میں پڑھائے جاتے ہیں۔ بس یہ مدرسہ صرف انہیں بزرگوں کی دعاء پر قائم ہے“ (۱)

اور مدرسہ کے کارکنان اور طلبا بھی مولانا کے مقام و مرتبہ کو خوب پہچانتے تھے اور جانتے تھے کہ مدرسہ کی دینی علمی تعلیمی ترقیات میں حضرت مولانا بھی ایک بنیادی فرد اور رکن رکیں کی حیثیت رکھتے ہیں اور مدرسہ کے ابتدائی بزرگوں اور سرپرستوں کی جماعت ایسی مخلص ایسی باخدا اور اس طرح ایک دوسرے سے جڑی ہوئی اور گندھی ہوئی تھی کہ اس میں ہر ایک اگرچہ دوسرے کو خود پر ترجیح دیتا تھا اور بنیادی کام اور اثر اسی کا سمجھتا تھا، اپنی خدمات اور قربانی کو معمولی ذمہ داری کی ادائیگی سے تعبیر کرتا، لیکن ان میں سے ہر ایک کی حیثیت ایسی تھی کہ ایک کے جگہ سے ہٹ جانے یا ہل جانے سے پوری عمارت ہلتی اور متاثر ہوتی تھی، اس میں حضرت مولانا محمد یعقوب بھی شامل تھے۔

(۱) ماہ نامہ تہذیب الاخلاق، ص: ۵۸ (جمادی الثانی ۱۳۰۴ھ)

مولانا کے شاگرد | تعلیم و تربیت مولانا کے والد ماجد کا خاص ورثہ اور مولانا کا بنیادی ذوق تھا، جس کی وجہ سے مولانا نے ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ کو

بھی نا منظور کر دیا تھا۔ اسی میں زندگی بسر فرمائی۔ بنارس اور اجمیر کالج میں اور دارالعلوم دیوبند میں مسند صدارت کو زینت بخشی، اس خاصے طویل دور میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے مولانا سے استفادہ اور تلمذ حاصل کیا ہوگا، جس میں وہ صاحب و افراد بھی ہونگے جو بعد میں علمی دنیا کے افق پر بہت آب و تاب سے چمکے اور ان کی خدمات، علمی کارناموں اور بصیرت نے ملک و ملت کے مختلف شعبوں و محکموں کو عزت و توانائی بخشی، مگر اور علماء کی طرح مولانا کے بھی بہت کم شاگردوں کے نام ہمارے علم میں ہیں۔

حضرت مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں تقریباً بیس سال تک مختلف علوم و فنون کی بیسیوں کتابوں کا درس دیا، اور ہر ایک کتاب پڑھنے والوں کی ایک مستقل جماعت ہوتی تھی، کچھ طالب علموں کو درسیات کے مقررہ نصاب کے علاوہ بھی متعدد کتابیں پڑھائیں یعنی یہ چشمہ علم اپنی زندگی تک پوری آب و تاب سے بہتا رہا، اس کے کناروں پر تشنگان علم اترتے اور سیراب ہوتے رہے۔

مولانا کے فیض یافتگان میں سے چند شاگردوں کے نام یہاں ذکر کئے جاتے ہیں، اسی سے اس گلستاں کی طراوت اور گل پروری کا اندازہ ہو جائے گا۔

مولانا سید احمد حسن امر و ہوی (نیز شاگرد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی)

مولانا محمد مراد پٹی فاروقی (بانی مدرسہ مرادیہ، مظفرنگر)

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی

مولانا حکیم حسین شریف بنگلوری

حضرت مولانا خلیل احمد انبھوی (مہاجر مدنی)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا عبداللہ انصاری انبھوی

مولانا منفعت علی دیوبندی



مولانا عبدالقدیر دیوبندی  
 مولانا عبدالمومن دیوبندی  
 مولانا فتح محمد تھانوی جلال آباد  
 مولانا امیر باز خاں سہارنپوری  
 مولانا کرامت اللہ خاں دہلوی  
 مولانا سید محمد عرفان ٹونکی  
 مولانا جمال الدین سہنپوری، بجنوری، دہلوی  
 مولانا شیخ عمر حنفی رامپوری

جب دارالعلوم دیوبند اور اسلامی مدرسوں کے موجودہ دور کا آغاز ہو رہا تھا اس وقت تعلیم کے ساتھ تربیت ضروری تھی، اور تربیت کا لازمہ اصلاح باطن و سفر معرفت تھا، طالب علم اپنے ذوق اور سہولت و صلاحیت کے مطابق اپنے استادوں اور مشائخ میں سے کسی کے دامن تربیت سے جڑ جاتے اور فیض و کمال کی منزلیں طے کرتے رہتے تھے، جو استاد و علماء تعلیم کے ساتھ تربیت باطن میں بھی عالی مرتبہ رکھتے تھے ان میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ممتاز تھے۔ دارالعلوم کے متعدد طالب علم اور دوسرے اصحاب بھی مولانا کے توسط سے ارشاد و معرفت میں جڑے اور فیض معنوی حاصل کیا۔

دارالعلوم کے زمانہ تعلیم میں جن طلبہ نے مولانا سے بطور خاص اور ہمہ جہت وسیع استفادہ کیا ان میں سب سے ممتاز اور سرفہرست نام حضرت مولانا کے عزیز اور محبوب شاگرد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا ہے۔ حضرت مولانا تھانوی نے حضرت مولانا محمد یعقوب سے تلمذ کے علاوہ بھی کثیر استفادہ کیا، مولانا کے علوم، افادات و کلمات محفوظ کئے، حضرت الاستاذ کے کمالات و صفات کو اپنے میں سمونے کی بھرپور کوشش کی اور مولانا کے علوم کے ترجمان و نمائندہ اور مولانا کی زبان ثابت ہوئے۔ یہاں ایک اور نام مولانا کے ایک مسٹر شد مولانا محمد قاسم نیاگری کا بھی لیا جاسکتا ہے جنہوں نے مولانا کے گرامی قدر مکتوبات کو سینہ سے لگا کر محفوظ رکھا اور ان کو مرتب کر کے ایک قابل قدر دینی علمی یادگار چھوڑی۔

علمی خدمات، تصانیف و ترجمے اور تصحیح کتب | مولانا نے اپنے اساتذہ  
حدیث حضرت مولانا احمد علی

محدث سہارنپوری اور مولانا محمد قاسم نیز اس دور کے اور ممتاز علماء کی محتاط اور قدیم روایت کے مطابق معاش کے لئے تصحیح کتب کی ملازمت پسند کی تھی، جس کی تفصیلات گذر گئی ہیں۔ ان ملازمتوں کے زمانہ میں غالباً بیسیوں کتابوں کی تصحیح کا موقع ملا ہوگا مگر رقم کو ایسی صرف چند کتابوں کا علم ہے جن کے قلمی نسخوں کا مقابلہ اور تصحیح یا حاشیہ لکھنے کے کام میں حضرت مولانا کی شرکت رہی، یہ کتابیں بخاری شریف، مظاہر حق کی آخری چوتھی جلد، امام غزالی کی احیاء العلوم اور کنز الدقائق ہیں۔

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی شائع کی ہوئی صحیح بخاری جس کے آخری تین پاروں کا حاشیہ حضرت مولانا محمد قاسم کا لکھا ہوا ہے محتاج تعارف نہیں، اس نسخہ کی تصحیح میں

صحیح بخاری مرتبہ محبشی حضرت  
مولانا احمد علی میں تعاون

مولانا محمد یعقوب کی بھی شرکت رہی تھی، مولانا محمد یعقوب صاحب نے (حالات طیب مولانا محمد قاسم میں) صحیح بخاری کے اس حاشیہ کی تالیف اور اس میں حضرت مولانا محمد قاسم کی شرکت کا تو ذکر کیا ہے مگر اس میں اپنے تعاون اور خدمت کا کچھ تذکرہ نہیں کیا، لیکن بخاری شریف کے اس نسخہ کے اصل مرتب و محقق، حضرت مولانا احمد علی کی بیاض میں اس نسخہ کی اشاعت سے متعلق جو اندراجات ہیں ان سے اس بڑے کام میں ضمناً مولانا محمد یعقوب کی شرکت کا علم ہوتا ہے۔

حضرت مولانا احمد علی کی بیاض میں اس نسخہ کی طباعت کے جملہ اخراجات کا ذکر ہے، اور جو اہم ترین اصحاب اس عظیم خدمت میں معاون تھے، ان کو دیئے گئے معاوضہ یا کتاب کے نسخوں کا بھی تذکرہ ہے، بیاض کی ترتیب اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کو نقد معاوضہ دیا گیا ان کو نسخہ عطا نہیں ہوا، اور جن صاحبان کو نسخہ دیا ان کو غالباً نقد کچھ نہیں دیا گیا، نقد کا حساب کئی صاحبان کا ہے اور نسخہ عنایت کرنیکا صرف ایک، حضرت مولانا احمد علی

نے لکھا ہے کہ:

”بابت تصحیح دو نسخہ، حافظ احمد علی یک، محمد یعقوب یک“

اس اشاعت کے کل تین سو پچیس نسخے چھپے تھے، جن میں سے ایک حضرت مولانا احمد علی نے خود رکھا دوسرا نسخہ اس نسخہ کی درستگی، مقابلہ اور صحت کے کام میں تعاون کی وجہ سے محمد یعقوب کو دیا گیا جو اس کام میں حضرت مولانا احمد علی کے راست معاون تھے، یعنی اس خدمت کے اعتراف کے طور پر حضرت مولانا نے ان کو یہ نسخہ عنایت فرمایا تھا، یہ خدمت (غالباً) حضرت مولانا محمد یعقوب کے سفر اجمیر و بنارس سے پہلے انجام دی گئی ہوگی اور (جیسا کہ اوپر ذکر ہوا) شاید اسی مصروفیت کے سبب مولانا محمد یعقوب (حضرت مولانا مملوک العلی کی زندگی کے آخری سال) میں اپنے مکان کوچہ چیلان میں قیام پذیر نہیں تھے بلکہ (غالباً) مطبع احمدی میں یا اس کے قریب کہیں رہتے تھے۔

مگر افسوس! اس کا پتہ نہیں چلتا کہ مولانا محمد یعقوب نے اس کام میں کس طرح کا تعاون یا شرکت فرمائی تھی، ممکن ہے متن صحیح بخاری کے قلمی نسخوں سے مقابلہ اور صحت میں مولانا کی خدمت شامل ہو، یا پھر حواشی کے مآخذ اور حضرت مولانا احمد علی کے لکھے ہوئے حاشیوں کی اصول سے مطابقت اور نظر ثانی کا کام مولانا محمد یعقوب کے سپرد کیا گیا۔ ہو سکتا ہے کچھ اور کام ہو مگر بہر صورت اس نہایت عظیم الشان، بابرکت، سراپا تقدس اور غیر معمولی خدمت میں جو مولانا محمد یعقوب کے سپرد فرمائی ہوگی اس کی بھی کچھ خاص وجہ ضرور ہوگی کہ:

”دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوارد بیکھ کر“

تصحیح مظاہر حق ربع چہارم | مظاہر حق مولانا نواب قطب الدین دہلوی کا ایک بڑا علمی دینی کارنامہ اور مشکوٰۃ المصابیح کے لئے نہایت

اہم شرح ہے۔ اس شرح کی ابتدائی طباعتیں اس وجہ سے بہت اہم ہیں کہ وہ حضرت نواب صاحب کی نگرانی اور سرپرستی میں چھپی تھیں اور بعض کی تصحیح اس زمانہ کے نامور اور برگزیدہ علماء نے کی تھی۔ انہیں طباعتوں میں مظاہر حق کی آخری جلد کی وہ طباعت بھی ہے جو پہلی مرتبہ مولانا سبحان بخش شکار پوری کی تصحیح سے اور دوبارہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور

مولانا محمد یعقوب کی نظر ثانی اور کاوش سے چھپی تھی۔

ذکر آچکا ہے کہ پہلے سفر حج سے واپسی کے بعد مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب صاحب میرٹھ کے مطبع مجتبائی میں تصحیح کتب کیلئے قیام فرماتے تھے، اس وقت منجملہ اور کتابوں کے مظاہر حق کے ربع چہارم کی تصحیح بھی فرمائی تھی، جس کو منشی ممتاز علی صاحب نے اہتمام سے شائع کیا تھا، اس طباعت کے خاتمۃ الطبع میں اسکا تفصیل سے ذکر آیا ہے، اس کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس سے اس میں مولانا محمد یعقوب کی شرکت اور انکے کام کا علم ہوگا۔ منشی ممتاز علی نے حمد و نعت کے بعد مظاہر حق کا کسی قدر تعارف کرایا ہے، پھر لکھا ہے کہ:

”تمہ ربع رابع کا حافظ نیاز احمد صاحب کے مطبع میں اور کچھ منشی باقر کے چھاپہ

خانہ میں اور ابواب فضائل صحابہ وغیرہ کہ اس وقت چھپی نہ تھی اس کو تمہ ربع رابع کا حافظ نیاز احمد صاحب نے چھاپا مگر اکثر کاغذ اور چھاپا درست نہ تھا بلکہ بعضی جائے تو بالکل مسودہ کی صورت تھی اب باعانت الہی اس عاجز کو توفیق اس کے چھاپنے کی ہوئی۔

باجازت من توکل علی اللہ و آخر سن بارہ ۱۲۸۱ھ الیاسی میں شروع کیا اور بامداد تصحیح و نظر جناب عالم ظاہر و باطن زیب ادوار زیست زماں جامع معقول و منقول جناب حاجی حافظ مولوی محمد قاسم صاحب و فرزند رشید جناب مولانا مولوی مملوک العلی صاحب مرحوم مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی و ناظم بے بدل و ناثر بے مثل عالم جامع و اعظاہل ایمان آمر بالمعروف مولوی محمد حسین صاحب.....

یک سال کی شب و روز کی مشقت و محنت میں جیسے جی چاہتا تھا انجام کو پہنچی

اور بہر صورت مکمل و تمام ہوئی فالحمد للہ“

تقریباً ایک صفحہ کے خاتمۃ الطبع کے اختتام پر تواریخ کے عنوان کے تحت پہلے عربی کا ایک فقرہ تاریخ ہے: قلتم الكتاب بعون الله الجواد الوهاب (۱۲۸۲ھ) اس کے بعد پانچ قطع تاریخ مولانا محمد یعقوب کے لکھے ہوئے ہیں، جن میں چار قطع اردو میں اور ایک فارسی میں ہے، مذکورہ قطع کے صرف مصرع ہائے تاریخ ملاحظہ ہوں:

کہ حدیث نبی مترجم ہے ۱۲۸۲ھ	لکھ ترجمہ چھاپا ہے احادیث نبی کا ۱۲۸۲ھ
مظاہر حق چہ زیبا سال طبخش ۱۲۸۲ھ	زہے طبع مظاہر زیب دادا ۱۲۸۲ھ

مقبول ہوئی کتاب چھاپی کیا مرغوب  
۱۲۸۲ھ

اس کے بعد دو قطعات تاریخ اور ہیں جو دونوں فارسی میں ہیں، ان میں سے پہلا حضرت مولانا محمد قاسم کا لکھا ہوا ہے دوسرا مولانا عبدالحق پر قاضوی کا، اسی پر اس نسخہ کا اختتام ہو گیا ہے، آخری سطر میں منشی ممتاز علی مطبع مجنبا کی کے دستخط و مہر ثبت ہے۔

**تصحیح احیاء العلوم** | حضرت امام غزالی کی شہرہ آفاق تصنیف احیاء العلوم منشی نول کشور کے شہرہ آفاق مطبع نے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس وقت مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی مطبع نول کشور میں مصحح کی حیثیت سے ملازم تھے، اسلئے یہ بہت اہم اور نازک خدمت انہیں دونوں کے سپرد کی گئی۔ مولانا محمد مظہر صاحب نے احیاء کے آٹھ نسخوں کی مدد سے اس منصوبہ کو مکمل کیا، مولانا کے پیش نظر موجود سات قلمی نسخوں میں سے ایک نسخہ اعلیٰ درجہ کا تصحیح کیا ہوا اور نامور علماء کی تصحیحات سے مزین تھا اور نسخے بھی قابل قدر تھے اور مطبوعہ نسخہ مصر کی اولین طباعت بھی سامنے تھی، ان نسخوں کی مدد سے اپنے نسخے کی تصحیح و تکمیل کی، ضروری اعراب لگائے اور مختصر حاشیہ بھی لکھا، اس کام میں خصوصاً تصحیح کی خدمت میں مولانا محمد یعقوب مولانا محمد مظہر کے رفیق تھے۔ مولانا محمد مظہر نے اس نسخہ کے خاتمۃ الطبع میں اپنے کام کا کسی قدر تعارف کرایا ہے جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

”وقد اعاننی فی ذالک اخی و حبیبی الشاب الصالح ووزیری

فی المصالح البارع فی العلوم المولوی محمد یعقوب بن.....“

اس نسخہ پر بھی مظاہر حق کے مذکورہ نسخہ کی طرح متعدد قطععات تاریخ درج ہیں جن میں پانچ قطععات مولانا محمد یعقوب کی فکر کا نتیجہ ہیں، جو عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس نسخہ کی طباعت ۱۲۸۱ھ میں مکمل ہوئی تھی، اس کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

**تصحیح شرح وقایہ** | مولانا محمد یعقوب کی تصحیح سے شائع کتابوں میں شرح وقایہ بھی شامل ہے، مولانا نے یہ کام غالباً اپنے دہلی قیام کے زمانہ میں کیا ہوگا، یا ممکن ہے اجمیر میں اس کا موقع ملا ہو، بہر حال یہ کتاب مطبع احمدی دہلی سے شعبان ۱۲۷۱ھ (اپریل مئی ۱۸۵۵ھ) میں چھپی تھی، اس پر مولانا محمد یعقوب کی تصحیح کی صراحت ہے۔

**منہاج العابدین امام غزالی کے اردو ترجمہ** | مولانا محمد منیر نانوتوی نے امام غزالی کی مشہور کتاب منہاج العابدین کا اردو میں ترجمہ کیا تھا، جو سراج السالکین کے نام

سے چھپا۔ مولانا محمد یعقوب نے اس ترجمہ کی اصلاح اور نظر ثانی کی اور مختصر حاشیہ لکھا۔ تصحیح و نظر ثانی اور حاشیہ نویسی تینوں کا مولانا محمد منیر نے کتاب کی تمہید میں اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے:

”میں نے ان دونوں مولانا محمد احسن اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے معاونت لی چنانچہ انہوں نے باوجود قلت فرصت کے اس ترجمہ کی اصل سے مطابقت کی بلکہ مولوی محمد یعقوب صاحب نے بکمال عنایت خود تخریب فرمایا۔“

یہ حاشیہ لکھنے کا خود مولانا محمد یعقوب صاحب کی تحریر میں بھی ذکر ہے۔

مطبع احمدی اور اس دور کے مطابق اور کتابوں کے معمول کے مطابق اس کتاب کے آخر میں بھی متعدد قطععات تاریخ شامل ہیں جن میں صفحہ ۲۲۸ پر درج تین قطععات جو عربی فارسی اور اردو میں ہیں دوسرے صفحہ ۲۲۹ پر پہلے دو قطععات مولانا محمد یعقوب صاحب کے ہیں، جن میں صراحت ہے کہ اس کا حاشیہ مولانا محمد یعقوب نے لکھا ہے۔  
عنوان یہ ہے:

”قطعہ تاریخ عربی از جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی متخلص بہ گمنام

محتیٰ این کتاب“

یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۲۸۰ھ میں مطبع صدیقی بریلی سے چھپا تھا اس نسخہ کے آخر میں اس نسخہ کے کاتب کا نام بھی درج ہے جو عبرت کے لئے نقل کیا جاتا ہے۔ لکھا ہے:

”بقلم کمترین خلاق مٹھوالا عفی عنہ“

دیکھئے پچھلے ڈیڑھ سو برس میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے، جب ہمارے اندر دین کی کچھ رمت اور غیرت تھی تو دوسرے ہماری تقلید میں مسرت محسوس کرتے تھے اور اب ہم دوسروں کے بے دام غلام بنے ہوئے ہیں:..... آہ!

ان نینوں کا یہ ہی بسیکھ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

ضیاء القلوب اصول سلوک اور حضرت حاجی امداد اللہ کے طریقہ ارشاد و تعلیم و تربیت اور ان خانوادوں کی تعلیمات پر حضرت حاجی

ضیاء القلوب تالیف حضرت حاجی امداد اللہ کا عربی میں ترجمہ

صاحب کی بہت ممتاز اور گویا دستاویزی تالیف ہے جو حضرت حاجی صاحب نے سنہ ۱۲۸۴ھ (۶۸-۱۸۶۷ء) میں تالیف فرمائی تھی اور حضرت حاجی صاحب کی ہدایت کے مطابق اسی وقت مطبع مجتہبائی میرٹھ سے چھپ گئی تھی۔ حضرت حاجی صاحب کا حلقہ ارشاد و ارادت چونکہ بہت وسیع تھا جو ہندو پاک کے علاوہ حجاز، عرب ممالک اور ترکی تک پھیل گیا تھا، اسلئے ضرورت ہوئی کہ اس دستاویزی کتاب کا عربی میں ترجمہ کرایا جائے تاکہ وہ مریدین اور متعلقین جو فارسی یا اردو سے استفادہ نہیں کر سکتے اس سے فائدہ اٹھا سکیں، اس ضرورت کی وجہ سے حضرت حاجی صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب کو ہدایت فرمائی کہ وہ اس کا ترجمہ کریں، مولانا محمد یعقوب صاحب اس خدمت کو بجالائے، ترجمہ کر کے حاجی صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا، حضرت حاجی صاحب کو اس سے بہت خوشی ہوئی اور اس کی طباعت کا اہتمام کیا اور ہدایت فرمائی۔

چونکہ یہ کتاب یا ترجمہ قطعاً ناپید و نایاب ہے اور ایک قلمی نسخہ کے علاوہ اس کا کوئی اور نسخہ اس وقت تک دریافت نہیں ہوا اس لئے اس کا کسی قدر مفصل تعارف مناسب ہے۔ اس ترجمہ کی تمہید یا ابتدائی کلمات کا درج ذیل الفاظ سے آغاز ہوا ہے:

”الحمد لله الذي ضياء القلوب والارواح، والشكر له نور البواطن والا شباح، وجوده محيط لا اول له ولا آخر وجوده، بحر لا تنفى منه ولا تنهر، نور السموات والارض، قيوم لا يتوده حفظهما، لاتأخذه سنة ولا نوم، بيده رفعهما وخفضهما، ذكره نور القلوب والاسرار غذاء الارواح ومطنى طى الا ستار، الفكر فيه حيران اعمى، والعقل سعى الى جنابه فأحفى، ظهر من جبين كل موجود نوره، وبطن في قلب كل شى ظهوره، اول لا اول قبله آخر لا آخر مثله، ليس كمثل شىء، بل حقيقة كل شى واصله، من راقب اسمہ زمانا فازالى المطلوب، ومن لاحظ نوراً منه نجى من مدانات الكروب.

والصلوة على ابى الا شباح وروح الا واح ثمرة الكون مغزاه مبداء الكمالات ومنتهاها، اولى الصفات و اخراها جمع الجمع بالانفراد، وواسطة العقود بلانفاد، سيد الانبياء، وتاج الاصفيا، وامام الرسل، هادى السبل، سيد العالم سيدنا ومولانا محمد المصطفى صلى الله عليه وعلى اصحابه، اساطين الهداء ونجوم الاهتداء، ورجوم الاشقياء، الاشداء على الكفار رحماء بينهم، اذلة على المومنين اعزة على الكافرين، نفوسهم مرتاضة مطمئنة بنور النبوة، واخلاقهم سمحة لطيفة بكمال الفتوة، وعلى آله سفينة النجاة ووسيلة الشفاعة، انموذج النبى والبقية وابقية ومعاكس الكمالات. ومظاهر النقية بلا تقية و بعد. فيقول محمد يعقوب النانوتوى. غفر الله ذنوبه وستر عيوبه فان قضاء الله جذبنى الى زيارة الحرم بل شرفنى بلثم تراب اقدام حضرت الشيخ المحترم ميزاب رحمة



للعالمین نور جمال الکاملین لامنتهی أوصافه العلی بلسانی و  
 قلمی، ولا استطیع ان افوه بها بنطقی و فمی فانه امداد اللہ، جاء نا  
 بصورة بشریة و صفات ملکیة و انوار محمدیة و اخلاق رحمیة،  
 سیدی و سندی و وسلیة یومی و غدی حضرۃ الشیخ الحاج امداد اللہ  
 الفاروقی الجشتی القادری النقشبندی السهروردی ثم المهاجر  
 المکی ادام اللہ ظلہ علینا و افاض من برکاته الینا.

اس کے بعد مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی وجہ ترجمہ بیان کرتے ہوئے لکھا  
 ہے کہ قضا و قدر کے فیصلے نے مجھے حرم شریف کی زیارت کی توفیق بخشی، اس موقع سے اپنے  
 شیخ حضرت حاجی امداد اللہ کی خدمت عالی میں حاضر ہونے کی سعادت بھی میسر آئی، تو  
 معلوم ہوا کہ اس علاقہ (حجاز اور عرب) کے حضرت حاجی صاحب کے مریدین و مستفیدین  
 ضیاء القلوب سے استفادہ کے خواہشمند ہیں، جو فارسی میں ہے، اس لئے اس کتاب کے  
 عربی ترجمہ کی ضرورت ہے۔ جب اس کا اصرار ہوا تو میں نے استخارہ کیا اور اپنے پیر و مرشد  
 اور کتاب کے مؤلف حضرت حاجی امداد اللہ سے اس کی اجازت طلب کی، اس کے بعد اس  
 کام کا ارادہ کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ اس کے فضل کرم سے یہ خدمت میرے ہاتھوں انجام پائی  
 اور جو کام میرے سپرد کیا گیا تھا وہ امید کے مطابق پورا ہو گیا۔ آخر میں حضرت شیخ اور اس  
 کتاب سے استفادہ کرنے والوں سے دعاء کی درخواست کی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اس  
 خدمت کو کامیاب فرمائے اور مجھے اس کا اجر و ثواب عطا فرمائے۔

قلت: ضیاء القلوب بالعربی کے اعداد سے اس کا سنہ ترجمہ ۱۲۹۵ھ معلوم  
 ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب کی تمہید کا حاصل ہے اس کے بعد اصل کتاب کے ترجمہ سے پہلے  
 چار پانچ سطروں میں حضرت حاجی صاحب کا نام نامی لکھا ہے، تحریر ہے:

”قال الشیخ الاجل الاكمل اوحد زمانہ و شمس اوانہ تاج  
 الشریعة سباح تیأر الحقیقة سیاح بیداء الطریقة، عریف العالم ابن  
 بجدتہ جهنة الحق و قطب کرتہ میزاب الرحمة، سیدی و سندی  
 مرشدی شیخی و شیخ العالمین قطب الزمان و غوث العالم حضرۃ

الحاج امداد اللہ مد اللہ تعالیٰ ظلال کرامتہ الی یوم التناد آمین۔“  
پھر اصل فارسی کتاب کا ترجمہ شروع ہو گیا ہے۔ ذیل میں اصل ضیاء القلوب کے  
ابتدائی فقرے اور ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

”تمامی مراتب حمد مرذات واحد را کہ اوست معبود کل و موجود مطلق تعالیٰ شانہ  
و جمیع مدارج نعت خاص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کہ اوست مظہر عالم و نائب حق،  
صلی اللہ علیہ وسلم و علی آلہ و اصحابہ اجمعین (۱)۔“

”جميع المحامد. لذات الواحد الذي هو الذي المعبود للكل  
والموجود المطلق تعالیٰ شانہ، و كل مدارج النعت خاصة برسولنا  
الاکرم، هو مظہر العالم و خلیفة الحق، صلی اللہ علیہ وسلم و علی  
آلہ و اصحابہ اجمعین“

یہ ترجمہ ۹ صفر ۱۲۹۵ھ (فروری ۱۸۷۸ء) کو بیت اللہ شریف کے سامنے مکمل ہوا  
مترجم نے کتاب کی آخری سطور میں اس کی بھی صراحت کی ہے:

”الحمد لله الذي بجلاله و نعمته تتم الصالحات و الصلوة  
و السلام علی رسولہ صاحب الشفاعات و علی آلہ شقائق البرکات،  
و علی اصحابہ نجوم الهدایات۔“

شکراً لک علی ما انعمت من تمام ما وفقنی لا بتدائہ و ایدنی  
فی اثنائہ من نقل ضیاء القلوب من کسوة اللسان الفارسیة الی خلعة  
اللغة العربیة، فی الحرم المحترم و البلد المکرم مکة المعظمة تجاه  
البيت الشریف و المقام الحنیف۔“

لتسعة مضین من صفر المظفر من شهر سنة خمس و تسعين من  
المائة الثانية بعد الالف من سنين الهجرة، فالحمد لله اولاً و آخراً۔  
فقط“

(۱) ضیاء القلوب فارسی (طبع اول مجتہائی دہلی: شعبان ۱۲۸۳ھ)

یہ نسخہ جو راقم سطور نے دیکھا ہے نہایت خوبصورت، خوش قلم نسخہ ہے، جو نسخ میں کتابت ہوا ہے، حضرت حاجی صاحب کی خدمت کے حاضر باش خادم، مولوی کوثر علی خیر آبادی نے تالیف کے دو سال بعد ۱۲۹ھ (۱۸۸۰ء) میں نقل کیا ہے۔

اس ترجمہ کی تکمیل سے حضرت حاجی صاحب کو بہت خوشی ہوئی تھی، حضرت حاجی صاحب کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا

شاہ محمد حسین الہ آبادی نے اس کی طباعت کا انصرام کیا جب مولانا الہ آبادی سفر حج کے بعد ہندوستان واپس آئے تو اس نسخہ کی نقل طباعت کے لئے ساتھ لائے، حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کو ایک خط میں اسکی اطلاع دی۔ تحریر ہے:

”ترجمہ عربی رسالہ ضیاء القلوب مصنفہ فقیر، عزیزم مولوی محمد حسین صاحب الہ

بادی طبع کرنے کو لے گئے ہیں“ (۱)

مولانا الہ آبادی کی کوشش سے اس ترجمہ کی نہایت عمدہ طباعت ہوئی جو حضرت حاجی صاحب کو بھی پسند آئی، یہ طباعت غالباً ۱۳۱۶ھ میں مکمل ہوئی تھی، یہ رسالہ مکہ معظمہ پہنچا اور حضرت حاجی صاحب نے ملاحظہ کیا تو پسند فرمایا، مولانا تھانوی کے نام ایک اور خط میں اس کا اس طرح تذکرہ فرمایا ہے:

”ضیاء القلوب عربی بھی پہنچ گئی، فقیر کا جو منہیہ [ہے] شاید اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے“ (۲)

مولانا محمد یعقوب نے ضیاء القلوب کے عربی ترجمہ سے فارغ ہو کر اس پر ایک حاشیہ بھی لکھا تھا، یہ حاشیہ بھی بظاہر عربی میں

ہوگا، یہ حاشیہ مختصر تھا یا مفصل اور یہ عربی نسخہ پر شائع ہوا یا نہیں اس کا سراغ نہیں ملا، لیکن ضیاء القلوب کے عربی ترجمہ کا جو نسخہ راقم سطور نے دیکھا ہے (جس کا تعارف گذر چکا ہے) اس میں یہ حاشیہ شامل نہیں، حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کو اس کے مطالعہ کی تمنا تھی مگر حضرت مولانا کو بھی نہیں ملا تھا، حضرت مولانا تھانوی کے ایک ملفوظ سے اس

(۱) مکتوب حضرت حاجی صاحب، بلا تاریخ، مکتوبات امدادیہ مع صد فوائد اشرفیہ (مکتوبات بنام مولانا تھانوی) مکتوب ۸، ص: ۱۳، ۱۴ (تھانہ بھون ۱۳۹۱ھ)

(۲) مکتوبات امدادیہ، مکتوب مرقومہ یکم جمادی الثانی ۱۳۱۶ء مکتوب: ۴۳، ص: ۵۰ (۱۷ اکتوبر ۱۸۹۸ء)

حاشیہ کے ایک نسخہ کی موجودگی کا علم ہوتا ہے جو مولانا حکیم جمیل الدین صاحب (غالباً نگیںوی) کے ذخیرہ میں تھا۔ ایک مجلس میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

”ہمارے حضرت کے علوم نہایت عالی ہوتے تھے مگر الفاظ بہت سلیس اور

فارسی تو اہل زبان کی سی تھی۔ ضیاء القلوب کی ایسی اچھی فارسی ہے۔ مولانا محمد یعقوب

صاحب نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، مولوی جمیل الدین صاحب کہتے تھے کہ وہ

ان کے پاس ہے اور کہتے تھے کہ مولانا نے اس پر حاشیہ بھی لکھا ہے۔ میں بھی اس

کتاب کی زیارت کا متمنی تھا مگر اتفاق نہیں ہوا اور اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ (۱)

مولانا محمد یعقوب کی جو تصانیف معلوم یا دستیاب  
حالاتِ طیب مولانا محمد قاسم

ہیں ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب ”تذکرہ

یا حالاتِ طیب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی“ ہے، جس میں فاضل مرتب نے اپنے بچپن

کے رفیق، عزیز محبوب دوست، ہم وطن تقریباً ہم عمر اور ہم استاد، حضرت مولانا محمد قاسم

کے دیدہ و شنیدہ ضروری ضروری مختصر مگر بہت جامع احوال رقم فرمائے ہیں۔

یہ مرتب تذکرہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ دراصل ایک یادداشت سی ہے، جو مولانا محمد

یعقوب نے حضرت مولانا مرحوم اور اپنے احباب اور متوسلین کی فرمائش پر غالباً بہت عجلت

میں مرتب کی اور اسی وقت چھپ بھی گئی، اس میں نہ تمام احوال و واقعات کا احاطہ ہے نہ

اس کی ترتیب سوانح و تذکرہ کی ترتیب ہے اور نہ ہی اس کی حیثیت ایک تصنیف کی ہے۔

مولانا محمد یعقوب کی ہمہ وقتی اور بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے جو یاد آیا وہ اس میں مختصر

مختصر لکھ دیا، لیکن اس اختصار اور ناتمامی کے باوجود اس میں احاطہ اور جامعیت کی خاص

جھلک محسوس ہوتی ہے، اس کو مولانا محمد یعقوب کا کمال کہنے یا ان کے تصرف کے اثرات

کہ اس کے بعد سے حضرت مولانا محمد قاسم کے احوال پر جو کچھ بھی چھپا وہ تقریباً اسی پر مبنی

اور اسی اجمال کی تشریح ہے۔ مولانا نے اپنے بعض فقروں کو ایسا دریا بکوزہ بنایا ہے اسکی

تفصیل کو جہاں تک چاہے پھیلا لیجئے مگر پھر بھی ایک بات باقی رہ جاتی ہے، مولانا محمد

(۱) جمیل الکلام، مجموعہ ملفوظات مولانا تھانوی مرتبہ: مفتی جمیل شامل الفصل للوصل ص: ۲۸، ۲۹ (بارہ بنکی: ۱۳۵۳ھ)

یعقوب اس پر صرف ایک فقرہ یا جملہ لکھ کر آگے بڑھ گئے ہیں، پڑھنے والے اس کی گہرائی اور معنویت پر غور کرتے رہیں اور اسکی روشنی میں نئے معنی و مضامین تلاش کرتے رہیں۔ یہ رسالہ جیسا کہ عرض کیا گیا مختصر سا اور صرف چونتیس (۳۴) صفحات پر مشتمل ہے اور حضرت مولانا محمد قاسم کی وفات (۴ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ) کے صرف چار مہینے کے بعد شوال ۱۲۹۷ھ (ستمبر ۱۸۸۰ء) میں مطبع صادق الانوار بھاول پور سے شائع ہو گیا تھا ظاہر ہے کہ اس کی تالیف و طباعت میں بھی کچھ وقفہ ہوا ہوگا، بہر حال یہ رسالہ چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا، اس لئے جلد ہی شوال میں ہی دوبارہ بھی چھپا اور بعد میں بھی کئی مرتبہ شائع ہوا مگر المیہ یہ ہے کہ دوسری طباعت کے بعد یہ اہم دستاویزی حیثیت کی تالیف جب جب بھی چھپی اس کے متن میں کچھ تبدیلی یا ترمیم کر دی گئی، اس لئے اس کی بعد کی اشاعتوں پر اس قدر اعتماد نہیں کیا جاسکتا جو پہلی ابتدائی طباعتوں پر ہے۔ اس ضرورت کی وجہ سے راقم نے پہلی دوسری طباعت کو سامنے رکھ کر اس کا صحیح نسخہ مرتب کیا ہے جس کو اصل کے مطابق رکھنے کی پوری کوشش کی ہے، مزید افادہ کے لئے اس پر ضروری حاشیے بھی لکھ دیئے ہیں یہ کاوش ۱۴۲۱ھ (۲۰۰۱ء) میں شائع ہو چکی ہے (۱)

موجودہ اطلاعات کے مطابق حالات طیب مولانا محمد قاسم مولانا محمد یعقوب کی پہلی اور آخری اردو تالیف ہے۔

**بیاض یعقوبی** | بیاض عموماً ذاتی، علمی اور ادبی دنیا میں متفرق بے ترتیب یادداشتوں کا مجموعہ ہوتی ہے، اسکا تصانیف و مؤلفات میں شمار کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا لیکن مولانا محمد یعقوب صاحب کی بیاض اپنے بعض نسخوں اور اندراجات کی وجہ سے کثرت سے چھپتی رہتی ہے اور عام قارئین اس سے واقف ہیں اسلئے اس کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ بیاض پانچ بڑے عنوانات پر تقسیم ہے: تاریخیات، علمیات، عشقیات، عملیات، طبیات۔ جن میں سب سے اہم تاریخیں اور طبی حصہ ہے، تاریخیں حصہ میں مولانا کے پہلے

(۱) یہ نسخہ راقم کی تالیف قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات میں شامل ہے۔ مذکورہ کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

سفر حج کی تفصیلی روداد بھی (جو روزنامچہ کی ترتیب پر ہے) شامل ہے، جس سے مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اور پھر چند تاریخی حوالے درج ہیں، دوسرے حج کا بھی اجمالاً تذکرہ ہے، طبی حصہ میں امراض کے مختصراً مجرب نسخے اور علاج درج ہیں۔

بیاض کی پہلی اشاعت حضرت مولانا تھانویؒ کی توجہ کی بدولت ہوئی، حضرت نے اس پر ضروری فوائد یا حاشیے لکھے اور ایک جید طبیب مولانا حکیم مصطفیٰ میرٹھی سے اس کے نسخوں کی تحقیق کرائی اور جہاں ضروری ہو حاشیہ میں کچھ وضاحت فرمادی۔

حضرت مولانا تھانویؒ نے اسکی حاشیہ نویسی کا کام جمادی الاول ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۲ء) میں مکمل کیا تھا، صفر ۱۳۴۳ھ (ستمبر ۱۹۲۵ء) میں نظر ثانی اور تکمیل سے فراغت ہوئی اور ۱۹۲۹ء (۲۸-۱۳۴۷ھ) میں اشرف المطابع تھانہ بھون سے کتابی صورت میں پہلی بار چھپی، بعد میں مکتوبات کے ساتھ بھی اور صرف بیاض دونوں طرح سے چھپی ہے، یہ دونوں اشاعتیں عموماً دستیاب ہیں، ایک وہ جس میں مکتوبات شامل ہیں، ابتدائی حصہ مکتوبات کا ہے دوسرا بیاض کا۔ آخر میں حضرت مولانا تھانوی نے دونوں کو یکجا کر کے بھی چھپوایا تھا، موجودہ بیاض کے ساتھ مولانا کے مکتوبات بھی شامل ہیں مگر جو مکتوبات سب سے پہلے علیحدہ کتابی صورت میں چھپے تھے ان کا علیحدہ تعارف مناسب ہے۔

جس سال مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) قائم ہوا اور مولانا محمد یعقوب اس کے صدر مدرس بنائے گئے، اس سال راجستھان کے مشہور قصبہ بیاور جس کو اس وقت نیا نگر کہتے تھے مولانا محمد

مکتوبات مولانا محمد یعقوب

مرتبہ مولانا محمد قاسم نیا نگری

قاسم حضرت مولانا محمد یعقوب کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے اور مولانا سے بہت پابندی سے خط و کتابت کرتے رہے۔ حضرت مولانا کے جو گرامی نامے آتے تھے ان کو اہتمام سے محفوظ رکھتے تھے بعد میں اس کا ایک مجموعہ مرتب کر لیا تھا جس کو حضرت مولانا نے بھی دیکھا تو پسند فرمایا اور ایک صاحب کو خط میں لکھا کہ:

”جو تحریرات میاں قاسم نے نیا نگر میں جمع کی ہیں واقعی وہ مجموعہ عجیب ہے، مگر

میاں چھینا تو ایک امر بعید ہے اور نقل دشوار ہے۔ میرا خود اسکی نقل کو جی چاہتا ہے  
شائد اوروں کو نفع پہنچے اور اس ناکارہ کو بھی ثواب مل جاوے، اگر تمہیں فرصت ہو تو  
نقل اس کی کر لو، انشاء اللہ تعالیٰ بہت مفید ہوگا“ (۱)

حضرت مولانا کی تمنا تھی کہ یہ مجموعہ مکتوبات چھپ جاتا، مکتوب علیہ منشی محمد قاسم  
صاحب نے بھی اس کی کوشش کی مگر حضرت مولانا کی زندگی میں اس کی طباعت نہ ہو سکی۔  
مولانا کی وفات کے کئی سال بعد مولانا کے برادر زادہ حکیم امیر احمد عشرتی نے مولانا کے  
اس خیال کو عمل میں لانے کا ارادہ کیا، اس کے لئے مکتوبات کی نقل حاصل کی، اس پر عمدہ  
اور جامع مقدمہ لکھا اور اس مجموعہ کو مولانا کے بھانجے مولانا رشید احمد سالم انصاری کے  
پریس مطبع احمدی علیگڑھ سے ۱۳۲۷ھ میں شائع کرادیا۔

یہ پہلی طباعت متوسط پیمائش کے چھپن (۵۶) صفحات پر مشتمل ہے، اس میں  
صرف اکیس (۲۱) خط ہیں، یعنی یہ کل مکتوبات کا ایک تہائی سے بھی کم حصہ ہے، اس  
اشاعت کے آخری صفحہ پر جملہ مکتوبات کی فہرست اور ان کے مضامین کا مختصر تعارف بھی  
درج ہے، یہ کل اکہتر (۱۷) مکتوبات تھے، حصہ اول کی اشاعت میں دوسرے حصہ کی  
اشاعت کا اعلان ہوا تھا مگر غالباً اس پر عمل نہیں ہوا۔ مطبع احمدی کا چھپا ہوا مکتوبات کا دوسرا  
تیسرا حصہ اب تک نہیں ملا غالباً چھپا ہی نہیں جس کی حضرت مولانا نانوتوی کے الفاظ سے  
تصدیق بھی ہوتی ہے کہ مکتوبات کا صرف یہی ایک حصہ چھپ کر رہ گیا تھا، علی گڑھ سے بعد  
کے مکتوبات پر مشتمل اور حصہ شائع نہیں ہوا۔

مکتوبات کے اس مکمل مجموعہ کی طباعت کی سعادت حضرت مولانا نانوتوی کے حصہ  
میں آئی، حضرت مولانا نے اس پر مختصر تمہید تحریر فرمائی، مختصر حاشیہ بھی لکھا اور اس کے ساتھ  
بیاض یعقوبی کا متن شامل کر کے دونوں کو یکجا شائع کرادیا۔ یہ نسخہ ۱۹۲۹ء میں تھانہ بھون  
سے چھپا تھا، اس مجموعہ میں بھی کل مکتوبات میں سے صرف چونٹھ (۶۳) خط آئے ہیں،  
ان میں سے چند خطوط حضرت مولانا نانوتوی کو دستیاب نہیں ہوئے اور دو خط ذاتی حالات

(۱) مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتوی، ص: ۱، مطبع اول مطبع احمدی علی گڑھ

پر مشتمل تھے کسی مصلحت کی وجہ سے اس میں شامل نہیں کئے گئے۔ حضرت مولانا تھانوی نے لکھا ہے کہ:

”ان مکتوباتِ زائدہ میں سے بعض تو دستیاب نہیں ہوئے اور دو بوجہ استعمال

حالات خانگی قصد ادرج نہیں کئے گئے“ (۱)

ان مکتوبات میں عجیب و غریب تعلیمات اور جوہرات بکھرے ہوئے ہیں، تصوف کی تعلیمات کا عطر اور جوہر اس میں جمع ہو گیا ہے، ایسی بڑی بڑی گراں قدر باتیں فقروں میں لکھ دی گئی ہیں جو زندگی بھر رہنمائی کریں اور حصول مقصد کی کلید ثابت ہوں، ذاتی حالات اور اس دور کی بعض اطلاعات و معلومات کا اضافہ مزید ہے، اس مجموعہ مکتوبات کا ذکر کرتے ہوئے ایوب قادری صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ:

” (یہ خطوط) سلوک و معرفت کا مرقع اور حقائق و تصوف کا دستور العمل ہیں،

سالک کے لئے وہ ایک مکمل ہدایت نامہ ہیں، ان خطوط میں ہمیں اکابر صوفیہ کی تعلیمات کی مکمل تصویر ملتی ہے، اسی زمانہ میں راقم الحروف کو چشتی سلسلہ کے مشہور شیخ مخدوم جہانگیر اشرف کچھوچھوی (۸۰۸ھ) کے مکتوبات عالیہ کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکتوباتِ اشرفی (فارسی) کا مختصر اردو ایڈیشن ہے“ (۲)

مولانا محمد یعقوب صاحب کے اس مجموعہ مکتوبات کے علاوہ بھی چند اور مکتوبات

غالباً پچیس، تیس مکتوبات مختلف کتابوں اور قلمی مجموعوں میں بکھرے ہوئے ہیں جن میں تین اہم خط حضرت حاجی امداد اللہ کے نام اور متعدد اپنے اعزہ، دوستوں اور مختلف اصحاب کے نام ہیں۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں جب مدرسہ فتاویٰ میں دارالافتاء قائم نہیں ہوا تھا مگر دینی، فقہی خطوط اور سوالات آنے لگے تھے اس وقت ان کے جواب لکھنے کی خدمت مولانا محمد یعقوب صاحب انجام دیتے تھے، چونکہ

(۱) تمہید مکتوباتِ یعقوبی، ص: ۱۵ (تھانہ بھون ۱۹۲۹ء)

(۲) تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی، محمد ایوب قادری، ص: ۱۹۷ (کراچی ۱۹۶۶ء)



مدرسہ میں ایسے جوابات یا فتاویٰ کی نقل کا اہتمام نہیں تھا اس لئے اس کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں، اس لئے یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ مولانا نے کس قدر فتوے یا جوابات تحریر فرمائے تھے، لیکن اس دور کی مختلف قلمی کتابوں اور یادداشتوں وغیرہ میں مولانا کے لکھے ہوئے بہت سے مفصل و مختصر فتوے مطبوعہ موجود و محفوظ ہیں، ان سب کو جمع کر لیا جائے تو ایک مفید اور مختصر مجموعہ ہو جائیگا۔

مضامین، تحریریں اور تقریریں | مولانا اپنی کثیر مصروفیات اور علمی مشاغل کے باوجود ملک میں جو علمی دینی رسائل چھپتے تھے

ان پر بھی نظر رکھتے تھے اور جو مضمون مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے تھے ان کی تصحیح و تنقید پر توجہ فرماتے اور اپنے خیالات و مضامین دینی رسائل و اخبارات میں چھپواتے رہتے تھے۔ مختلف اخبارات و رسائل میں شائع مولانا کے کئی مضامین کا ذکر ملتا ہے، اور مولانا کی متعدد تقریریں بھی مطبوعہ یا قلمی صورت میں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ حضرت مولانا کے افادات کو مرتب کر کے شائع کیا جائے، حضرت تھانوی کے ملفوظات و مواعظ میں مولانا محمد یعقوب کے جو افادات ہیں وہ سب یکجا ہو کر معارفِ یعقوبی کے نام سے شائع ہو چکے ہیں مگر یہاں جن تحریروں یا افادات کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس مجموعہ سے مختلف عموماً کم یا ب اور نامعلوم ہیں۔

زندگی کے آخری المناک ایام | حضرت مولانا اپنے معمول کے مطابق مدرسہ کی خدمت اور تعلیم و افادہ میں مشغول تھے کہ اچانک حضرت مولانا کو یہ محسوس ہوا کہ قصبہ دیوبند اور نواح پر کوئی قدرتی آفت آنے والی

اور متواتر حادثے

ہے جو کثرت سے صدقہ کرنے سے دور ہو سکتی ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے اس کشف اور الہام کو لوگوں پر ظاہر بھی فرما دیا کہ اگر عافیت چاہتے ہو تو کثرت سے صدقہ کرو، بعض ناخدا ترس لوگوں نے مولانا کے اس ارشاد کو جو سراسر خیر و ہدایت تھا، خود غرضی اور مدرسہ کے مفاد کی وجہ سے سمجھا اور کہہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے مدرسہ میں کچھ ضرورت پیش آگئی ہے،

یہ فقرہ مولانا کو پہنچا تو مولانا بہت ناراض ہوئے اور فرمایا:  
 ”یعقوب اور یعقوب کی اولاد اور سارا دیوبند، یعقوب اور یعقوب کی اولاد

اور سارا دیوبند“

اس فقرہ کو کئی مرتبہ دہرایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے کیا کہ وہی ہوا جو مولانا کے منہ سے نکلا تھا۔  
 دیوبند اور اس کے آس پاس سخت وبا آئی ایسی کہ گھر کے گھر خالی ہو گئے، بیس پچیس  
 جنازوں کی نماز ایک ساتھ ہوتی تھی، یعنی دیوبند قصبہ حقیقتاً آبادی سے محروم ہو گیا۔

اس وبا میں مولانا کے خاندان کے اور اصحاب کے علاوہ صرف گھر کے چودہ پندرہ  
 افراد فوت ہو گئے تھے۔ یہ وبا آخر ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ (ستمبر ۱۸۸۴ء) میں شروع ہوئی اور  
 لحوں میں آندھی اور طوفان کی صورت اختیار کر گئی، اس حادثہ میں سب سے پہلے مولانا کی  
 اہلیہ (بی بی اکرامن) کا انتقال ہوا، پھر مولانا کے محبوب فرزند (مولوی علاء الدین) جن کو  
 چند مہینوں پہلے دارالعلوم سے سند فراغت ملی تھی اور وہ علم و عمل میں جانشین ہو سکتے تھے  
 رخصت ہو گئے، مولانا کو انکی وفات کا بے انتہا رنج و غم ہوا، مگر سلسلہ حوادث اسی پر نہیں رکا،  
 بلکہ اسکے بعد مولانا کے گھر سے اس تیزی سے جنازے نکلنے شروع ہوئے جیسے صدمات و  
 حوادث کی لڑی ٹوٹ گئی ہو، تقریباً پچاس دنوں کے معمولی وقفہ میں مولانا کے گھر کے چودہ  
 افراد انتقال کر گئے، اس غیر معمولی اور ناقابل برداشت سخت حادثہ کا حضرت مولانا گنگوہی  
 نے اپنے ایک خط میں بہت صدمہ اور حسرت و افسوس کے ساتھ یوں ذکر فرمایا کہ:

”یہاں کے حادثات کیا لکھوں مولوی علاء الدین پسر مولوی محمد یعقوب  
 صاحب، جن کو سال گذشتہ میں دستار اجازت بندھائی تھی ذی الحجہ کی دسویں کو فوت  
 ہوئے تھے اور سوائے ان کے تین پسر اور چار پوتے اور دو پوتیاں ایک زوجہ ایک بہو  
 اور ایک نواسہ مولوی محمد یعقوب صاحب مرحوم کا فوت ہوا۔ اب ۲ ربیع الاول کو خود  
 مولوی محمد یعقوب صاحب مرحوم نے نانوتہ آ کر وفات پائی اور ایک سخت حادثہ  
 مدرسہ اور لوگوں پر ڈالا“ (۱)

(۱) مکاتیب رشیدیہ، ص: ۶۳ (طبع اول میرٹھ: ۱۳۲۴ھ)

اس غیر معمولی وبا اور نہایت غیر معمولی حادثہ میں مولانا کے خاندان کے چودہ افراد چار بیٹے ایک بیوی ایک بہو چار پوتے دو پوتیاں ایک نواسہ فوت ہوئے۔ مگر مولانا صبر و استقامت کا پہاڑ بنے رہے، پائے صبر میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ اس دوران ایک مرتبہ میں نے مولانا کو یہ شعر تو پڑھتے ہوئے سنا کہ:

غیر تعلیم و رضا کو چارہ در کفِ شہرِ زخو خوارہ (۱)

کوئی اور بات بے صبری کی مولانا سے ظاہر نہیں ہوئی۔ اس وبا کی وجہ سے جب گھر اور تقریباً پوری بستی ہی خالی ہو گئی تو مولانا کو دیکھا گیا کہ آسمان کی طرف منہ کئے ایک دن یوں فرما رہے ہیں:

”میں نے تو سمجھا تھا کہ میرا بھی وقت آ گیا، کیا ابھی دیر ہے“

**وفات اور مدفن** شاید یہ وقت قبولیت کا تھا، اس بات پر چند دن ہی گزرے تھے کہ مولانا دیوبند سے اپنے وطن نانوتہ گئے، وہیں ۲ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ (۲۲ دسمبر ۱۸۸۴ء) کو مختصر بیماری کے بعد وفات ہو گئی۔ مرض وفات کیا تھا اس کے متعلق کئی روایتیں ہیں، مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند کی روداد میں لکھا ہے کہ:

”بہ مرض فاجِ جنت الفردوس کو تشریف لے گئے“ (۲)

مولانا کے قریبی دوست مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی اطلاع ہے کہ مولانا کو کسی نے حلوہ کھلایا تھا جس میں زہر ملایا گیا تھا، اس کو کھاتے ہی مولانا کی حالت غیر ہو گئی، اسی میں وفات ہوئی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

”والناس عجب من موتہ حیث کان قداکل نوعامن الحلاوی فشرب علیہ الماء فتغیر حالہ، فمات غذا من غیر ما قال شیء، ولذالک ظن انه سم“ (۳)

(۱) ارواحِ ثلاثہ، مرتبہ مولانا ظہور الحسن، ص: ۲۴۰ (طبع اول سہارنپور ۱۳۵۲ء)

(۲) روداد مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند ص:

(۳) مجلہ شفاء الصدور، لاہور شمارہ ۱۵ جنوری ۱۸۸۵ء ص: ۴

اور مولانا کی ذاتی بیاض کے آخر میں (غالباً خاندان کے کسی قریبی اور عزیز فرد نے لکھا) ہے کہ:

”درہیفنہ مبتلا شدہ بیہوش شدند“ (۱)

ہیفنہ میں مبتلا ہو کر بیہوش ہو گئے، پیر کی شب میں تقریباً ایک بجے وفات ہوئی، نانوتہ میں اپنے بیٹے حکیم معین الدین کے باغ میں جو سہارنپور جانے والی سڑک پر سرراہ واقع ہے، دفن کئے گئے۔ رحمة الله عليه رحمة واسعة

(۱) بیاض یعقوبی، ص: ۱۵۳، طبع اول (تھانہ بھون ۱۹۲۹ء)

## باب (۲۱)

حضرت مولانا مملوک العلی کے چند شاگرد

فہرست اور تعارف

حضرت مولانا مملوک العلی نے تمام زندگی تعلیم و تدریس اور پڑھنے پڑھانے میں گذاری۔ مولانا کی زندگی کا اصل سرمایہ اور تمام محنتوں کا بہترین حاصل ان کے شاگرد تھے جو حضرت مولانا کی زندگی میں ہی برصغیر ہند (پاکستان) کے دینی، علمی، عملی افق پر نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی چمک اور خوبی بڑھتی گئی اور پھر ایک دور وہ بھی آیا کہ دین و شریعت، علم و عمل، تصنیف و تالیف، ارشاد و تلقین، وزارت و حکومت اور سیاست و اقتدار ہر اک شعبہ میں حضرت مولانا کے شاگرد صف اول میں شامل ہوئے اور اپنی اپنی جگہ قائد و رہنما سمجھے گئے۔

دین و علم کی بات ہو یا تعلیم و افادہ کی، تربیت و تلقین کا تذکرہ ہو یا تصنیف و ترجمہ کا، دینی علمی ادارے ہوں یا مشرقی تعلیم کے مراکز، کالج ہوں یا اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں، ہر اک میں مولانا کے شاگرد اونچے مرتبوں اور عہدوں پر فائز تھے، ہر جگہ دین و شریعت، اخوت و انسانیت کی دولت بانٹنے اور نئی نسلوں کو بہترین مسلمان، بہترین انسان اور سراپا اخلاص و تربیت بنانے کی کوششوں میں محو نظر آتے تھے۔

ہندوستان کی دینی علمی تاریخ پر حضرت مولانا کے شاگردوں کے اثرات ایسے گہرے اور لازوال ہیں کہ ان کو برصغیر کی تاریخ اور مستقبل کی دینی علمی تعلیمی ترقی سے علیحدہ کرنا ممکن ہی نہیں، جب کہیں بھی اور جہاں بھی برصغیر ہند کے دینی علمی سفر کا ذکر آیرگا، حضرت مولانا مملوک العلی کے فخر روزگار شاگردوں کا تذکرہ ضرور ہوگا، اور جیسے جیسے ہمیں اپنے

بڑوں بزرگوں کی دینی علمی خدمات کا ادراک اور انکے علمی احسانات کا عرفان بڑھے گا، اسی قدر حضرت مولانا مملوک العلی اور انکے شاگردوں کی خدمات و عنایات کی قدر و منزلت زیادہ ہوگی اور یہ خیال تازہ رہیگا کہ اخلاص کا درخت کس قدر گھنا، ثمر دار اور پر بہار ہوتا ہے، اور ایک شجر سایہ دار کی ہوائیں کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہیں، اور انکے اثر سے فضا میں کیسی تر و تازہ، شاداب و دلربا ہو جاتی ہیں، اور یہاں تو معاملہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

مولانا کے شاگردوں کے اثرات، ان کے دائرہ کار کی وسعت، ان کے دیر پا فائدوں، اس کے منافع اور تقریباً پونے دو سو سال پر محیط تاریخ کے علمی تعلیمی گوشوں پر ان کی چھاپ بلکہ گہری گرفت کا جائزہ بلکہ تعارف بھی ایک بڑی کتاب کا موضوع ہے، اس کا مختصر تذکرہ بھی آسان نہیں ہے۔

یہ تعارف و تذکرہ اس وقت بھی آسان نہیں تھا جب حضرت مولانا حیات تھے، اس وقت بھی ہندوستان کے کونہ کونہ میں حضرت مولانا کے شاگردوں کا غلغلہ بلند تھا، مولانا کے فضل و کمال اور بے نظیر شاگردوں کی شہرت ہندوستان سے نکل کر افغانستان تک پہنچی ہوئی تھی، قدیم غیر منقسم ہندوستان اور افغانستان کے شہروں میں مولانا کے ایسے ایسے شاگرد موجود تھے جو اپنے علم و کمال کی وجہ سے ممتاز تھے اور جو کریم الدین پانی پتی کے الفاظ میں (اپنا) ”نام پیدا کر گئے تھے“ کریم الدین پانی پتی جو مولانا کا شاگرد، دہلی کالج کا فیض یافتہ اور مولانا کی علمی مصروفیات اور طلبہ سے خوب واقف ہے، لکھتا ہے:

”رات دن سوائے مدرسہ کے ان کے گھر پر طلبا پڑے رہتے ہیں۔ ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے۔ سب کو پڑھاتے ہیں تمام شب اور دن میں شانہ دو پہر رات کو آرام کرنا ان کو نصیب ہوتا ہوگا۔ والا نہ رات دن درس وہی طلبہ میں گذرتا ہے اور باوجود اس کثرت درس اور فیض رسائی کے پابند شرع شریف کے ایسے ہیں کہ اس طرح کے آدمی کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ غرض کہ جتنی ان کی تعریف میں لکھوں، بجا ہے“ (۱)

(۱) طبقات شعرائے ہند، کریم الدین پانی پتی صفحہ ۶۴ (لکھنؤ ۱۹۸۳)

”صد ہاشاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے، درمیان اکثر بلاد افغانستان کے اور ہندوستان کے اپنا نام پیدا کر گئے۔ (۱)

ذیل میں حضرت مولانا کے شاگردوں کی ایک فہرست اور ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے جس سے کم سے کم یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت مولانا کے حلقہ تربیت سے کیسے ابرگہر بار نکلے اور ان سے ہمارا معاشرہ، تمدن، تعلیمی ادارے اور علمی دینی حلقے کس طرح فیض یاب ہوئے۔ اس کا دائرہ یا حلقہ اثر کس قدر وسیع ہو اور کہاں کہاں تک پہنچا۔

مولانا کے معلوم شاگردوں کی اجمالی فہرست | حضرت مولانا مملوک العلی نے کم سے کم چھتیس سال

درس و افادہ میں مشغول بسر فرمائے خصوصاً دہلی کالج کی ملازمت اور دہلی میں مستقل رہائش کے بعد سے مولانا کی طرف طلبہ کا رجوع اور حضرت مولانا کی درسی مشغولیات بہت بڑھ گئی تھیں، طلبہ ہر وقت مولانا کو گھیرے رکھتے تھے، جو طلبہ مولانا سے مولانا کے گھر پر پڑھتے تھے ان کی فہرست تو اس وقت بھی موجود نہیں ہوگی کیوں کہ یہ طلبہ مختلف علاقوں اور دور دراز خطوں کے رہنے والے تھے جو دہلی کی مختلف مسجدوں اور محلوں میں اپنے اپنے انتظام سے رہتے تھے، اور اپنی اپنی سہولت اور اوقات کی ترتیب کے مطابق حضرت مولانا کی خدمت میں تعلیم و استفادہ کے لئے آتے تھے، اور چند طالب علم (جن کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی) حضرت مولانا کے مکان پر بھی مستقل رہتے تھے، ان کے مصارف بہ ظاہر حضرت مولانا ہی برداشت کرتے ہونگے، مگر افسوس کہ حضرت مولانا کے ان شاگردوں کی بھی جامع فہرست دستیاب نہیں جو دہلی کالج میں مولانا سے فیض یاب ہوئے تھے۔

حضرت مولانا کے دہلی کالج کے چھبیس سالہ دورِ تدریس میں سے ہر اک سال میں اگر کالج میں صرف بیس طالب علم بھی مولانا کے درجہ میں شامل رہے ہوں (یہ تعداد کم سے کم ہے، مولانا کے شاگرد اس سے زیادہ ہوتے ہوں گے) تب بھی کالج میں حضرت

(۱) تاریخ شعرائے عرب (ترجمہ فرائد الدہر) ص: ۱۰۳ (طبع اول دہلی ۱۸۴۷ء)

مولانا سے تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد تقریباً سو اچھ سو تک پہنچتی ہے مگر ہمیں دہلی کالج کے ایسے پچاس طلبہ کے نام بھی معلوم نہیں جو مولانا کے شاگرد تھے، اور جو طلبہ حضرت مولانا سے گھر پر پڑھتے تھے ان کا شمار اس سے بھی زیادہ ہوگا کیوں کہ گھر پر پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کالج سے بھی زیادہ رہتی تھی اور ان کے اسباق اور کتابیں بھی کالج کے نصاب اور معمول سے زیادہ متنوع موضوعات پر مشتمل ہوتی تھیں، لہذا قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا کے دہلی کے قیام کے زمانہ میں تقریباً ایک ہزار طالب علموں نے حضرت مولانا سے استفادہ کیا ہوگا اور ان کو حضرت سے تلمذ ہوگا مگر افسوس کہ ہمیں اس بڑی تعداد میں سے گنتی کے چند نام معلوم ہیں جو سب ملا کر پچاس تک پہنچتے ہیں، ان کی اجمالی فہرست یہاں درج کی جا رہی ہے۔

### ﴿قسم اول﴾

(۱) منشی جمال الدین کتانوی

### ﴿قسم دوم﴾

(۲) مولانا سبحان بخش شکار پوری

(۳) مولانا نور الحسن کاندھلوی

(۴) مولانا شیخ محمد تھانوی

(۵) مولانا احمد علی سہارنپوری

(۶) قاری عبدالرحمن پانی پتی

(۷) سید عالم مراد آبادی

(۸) مولانا محمد مظہر نانوتوی

(۹) مولانا محمد حسین رامپوری



- (۱۰) مولانا محمد سعید اندرابی  
(۱۱) مولانا عبد الحمید خاں جلال آبادی

﴿قسم سوم﴾

- (۱۲) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی  
(۱۳) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی  
(۱۴) مولانا محمد یعقوب نانوتوی  
(۱۵) مولانا محمد احسن نانوتوی  
(۱۶) مولانا مفتی محمد ایوب پھلتی  
(۱۷) مولانا محمد منیر نانوتوی  
(۱۸) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی  
(۱۹) مولانا فصیح الدین عثمانی دیوبندی  
(۲۰) مولانا فضل الرحمن عثمانی  
(۲۱) مولانا انصار علی انبھٹوی  
(۲۲) مولانا محمد حسن راپوری  
(۲۳) مولانا حکیم امین الدین دیوبندی

﴿قسم چہارم﴾

- (۲۴) مولانا محمد یوسف خلف مفتی عبدالقیوم بڈھانوی  
(۲۵) مولانا سدید الدین دہلوی  
(۲۶) ڈپٹی نذیر احمد بجنوری  
(۲۷) مولوی ضیاء الدین دہلوی  
(۲۸) منشی ذکاء اللہ دہلوی

- (۲۹) مولوی سمیع اللہ دہلوی  
 (۳۰) مولوی انوار الحق دہلوی  
 (۳۱) مولانا سید عبداللہ دہلوی  
 (۳۲) مولانا سید ہاشم علی دہلوی  
 (۳۳) مولوی علی احمد بجنوری  
 (۳۴) مولوی کریم الدین پانی پتی  
 (۳۵) مولوی حکیم عبدالرحمن حیرت  
 (۳۶) مولوی کریم بخش دہلوی  
 (۳۷) مولانا محمد یعقوب علی بدایونی  
 (۳۸) حکیم مرزا منور علی ہاپوڑی  
 (۳۹) قطب الدین دلاور علی طرزی پوڑی

﴿قسم پنجم﴾

- (۴۰) مشتاق احمد  
 (۴۱) وجیہ اللہ  
 (۴۲) مولانا علیم اللہ بجنوری  
 (۴۳) حافظ فخر الدین گنگوہی کے والد ماجد  
 (۴۴) مولوی خدا بخش  
 (۴۵) عبدالرحمن  
 (۴۶) شمس الدین  
 (۴۷) ریاض الدین  
 (۴۸) حاجی احمد علی احراری رامپوری

## ﴿قسم ششم﴾

(۴۹) مولوی برکت علی تھانیسری

(۵۰) علی اکبر سونی پتی

(۵۱) علی اصغر سونی پتی

اس فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضرت مولانا کے علمی فیوض کا بادل کہاں کہاں تک برسا ہے اور اس سے کیسے کیسے لعل و گہر پیدا ہوئے ہیں، حضرت مولانا نے جس کسی سنگ پارے کو تراش دیا وہ لعل شب چراغ کی صورت اختیار کر گیا اور جس کسی کو حضرت مولانا کی صحبت میسر آگئی وہ علم و عمل کا خوگر اور علمی دنیا کا کیسا مرد میدان ثابت ہوا۔

یہ فہرست اگرچہ بہ ظاہر چند اصحاب پر مشتمل ہے مگر ان میں سے اکثر اصحاب وہی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر ایک دبستان، ایک مکتب فکر اور مرکز علم و عمل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی دینی خدمات دیکھئے تو ان کی حدود کا سراغ ملنا مشکل، ان کے علمی تدریسی کام کو دیکھئے تو اس کا احاطہ دشوار، اور ان کی تصنیف اور علمی آثار کو ملاحظہ کیجئے تو اس کا جائزہ بے پناہ اور ان کے شاگردوں پر نظر کیجئے اور بعد کے دور پر ان کے اثرات کا جائزہ لیجئے تو اس کے اثرات یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے، حضرت مولانا کے براہ راست شاگردوں کا تو کہنا ہی کیا ہے ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی اس مرتبہ کے ہیں کہ ان میں سے بہت سے اپنے اپنے دور کے قائد و رہنما اور دینی علمی قافلوں کے میر کارواں تھے، ہر ایک کے احوال و خدمات ایک مستقل جامع کتاب بلکہ کتابوں کا موضوع ہیں، جوں جوں وقت گزرتا رہے گا اس دریا کی روانی اور اس سے سیراب علاقوں کی وسعت اور مردم خیزی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

آئندہ صفحات میں اسی ترتیب کے مطابق ان حضرات کا مفصل یا مختصر تعارف درج ہوگا مگر تعارف کے مطالعہ سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ فہرست نہ حروف تہجی کی

ترتیب پر ہے نہ سن وفات پر، بلکہ اس میں ترتیب مراتب کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اسی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے چھ (۶) درجات پر تقسیم کی گئی ہے۔

﴿۱﴾ قسم اول میں صرف ایک ہی شاگرد کا تعارف آئے گا۔ یہ شاگرد مولانا منشی جمال الدین کتانوی مدارالمہام، ریاست بھوپال ہیں۔ منشی جی حضرت مولانا کے ایسے معلوم منفرد شاگرد ہیں جو حضرت مولانا کے ہم استاد بھی ہیں، منشی جی صاحب نے امام الکل زبدۃ الحمدین حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت شاہ رفیع الدین سے براہ راست استفادہ کیا ہے، ان کو حضرت شاہ عبدالعزیز سے تلمذ بھی حاصل ہے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب سے استفادہ میں حضرت مولانا مملوک العلی سے فائق ہیں، ان کا خاصا وقت حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں گذرا ہے اور شاہ صاحب سے کثیر استفادہ کیا ہے، اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ مولانا منشی سید جمال الدین، دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی کے سب سے پہلے شاگرد یا ابتدائی چند شاگردوں میں سے ایک ہوں۔ ان وجوہات و خصوصیات کی وجہ سے ان کا تذکرہ حضرت مولانا کے اور شاگردوں سے مقدم ہے۔

﴿۲﴾ دوسری قسم کے تحت حضرت مولانا کے ان شاگردوں کا تعارف درج ہوگا جو حضرت شاہ محمد اسحاق کے براہ راست شاگرد ہیں، ان کو شاہ محمد اسحاق سے تلمذ اور اجازت حدیث حاصل ہے۔ راقم سطور کو معلوم حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگردوں میں اس مرتبہ کے صرف دس (۱۰) اصحاب ہیں ان سب کا اس قسم میں ذکر آئے گا۔

﴿۳﴾ تیسری قسم کے تحت حضرت مولانا کے ایسے شاگردوں کا تعارف ہے جو برصغیر ہندو پاكستان میں احیائے اسلام، احیائے دین نیز مدارس اسلامیہ کے مؤسس اور داعی و نقیب ثابت ہوئے، ہمارے دور میں حضرت مولانا مملوک العلی کا تذکرہ و تعارف عموماً ان ہی اکابر علماء کی وجہ سے ہے، مگر ان حضرات کی دینی خدمات اور علمی کمالات کے پورے اعتراف کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ (حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی کے علاوہ) ان میں کوئی بھی حضرت شاہ محمد اسحاق کے دامن فیض سے براہ راست وابستہ نہیں،

اسلئے ان حضرات و علماء کا تذکرہ حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ کے بعد ہی آنا چاہئے۔

﴿۴﴾ چوتھی قسم ان صاحبان کے تذکرہ پر مشتمل ہوگی جو برصغیر میں اردو زبان و ادب کے ممتاز ترین افراد میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کی کوششوں اور تصانیف و تحریرات سے اردو کی نثری روایت، زبان و ادب، تصنیف و تحریر اور صحافت و اخبار نویسی کو نئی زندگی، نئی سوچ، نیا رنگ اور مستقبل کے طویل سفر کیلئے نئے نشان قدم ملے اور یہ اصحاب ملی تحریکات کے بھی رفیق اور سرگرم قائد رہے اور ان کے متعدد خیالات کی صدائے بازگشت اب بھی سنائی دیتی ہے اور کبھی کبھی نوائے جس کا کام کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان اصحاب کی متعدد تحریریں، کوششیں اور پیام ایسے ہیں کہ ان سے اہل نظر فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارے عہد کے دانشوروں کے ایک بڑے گروہ نے ان کے نظریات و خیالات سے گہرا اثر قبول کیا ہے اور تازہ تحریرات اور کتابوں میں حضرت مولانا کے اس طبقہ کے شاگردوں کی فکر اور تحریروں کا اثر اور ترجمانی صاف نظر آتی ہے۔ اگرچہ علمائے کرام کو ان کے متعدد نظریات سے صاف اور برحق اختلاف ہے مگر اس کی وجہ سے ان کو حضرت مولانا کے تلامذہ سے خارج نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کتاب میں ان کے تعارف و تذکرہ کے شامل کئے جانے سے ان کے خاص نظریات کی تصدیق و تحسین متوقع ہے، ہمیں ان کے بعض خیالات و نظریات سے ہزار اختلاف ہو مگر حضرت مولانا مملوک العلی سے ان صاحبان کا تلمذ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

﴿۵﴾ پانچویں قسم میں حضرت مولانا کے غیر متعارف یا ایسے شاگردوں کا ذکر ہے جن کے حالات مفقود ہیں اور ان کی کسی دینی علمی تصنیفی خدمت کا ہمیں علم نہیں، تاہم وہ حضرت مولانا کے شاگرد تھے، اس فہرست اور تعارف میں ان کا تذکرہ ضروری ہے، ممکن ہے کہ اہل علم و ذوق کو ان کے حالات یا کوئی ایسی تحریر و تالیف مل جائے جو ہمارے علمی ذخیرہ میں اضافہ ثابت ہو۔

﴿۶﴾ چھٹی اور آخری قسم میں حضرت مولانا کے ایسے شاگردوں اور مستفیدین کا تعارف ہوگا جو عقیدہ و نظریہ کے لحاظ سے حضرت مولانا کے عقیدہ و نظریہ سے

بالکل مختلف تھے، یہ مولانا کے شیعہ تلامذہ ہیں جو دہلی کالج میں اپنی اپنی جماعت کے عمدہ طالب علم گئے جاتے تھے، جس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ پرانے زمانے سے چلی آرہی یہ روایت حضرت مولانا میں بھی پوری طرح موجود اور کارفرما تھی کہ وہ تعلیم و افادہ میں صرف لیاقت کو دیکھتے تھے، نظر یہ اور عقیدہ کا اختلاف بھی ان کی راہ اور افادہ میں رکاوٹ اور مانع نہیں ہوتا تھا۔

### ﴿قسم اول﴾

[مولانا مملوک العلی کے وہ تنہا شاگرد، جو مولانا کے ہم استاد بھی ہیں]

[۱] مولانا منشی جمال الدین کتانوی (۱)

(مدارالمہام ریاست بھوپال)

حضرت مولانا کے شاگردوں میں سب سے پہلے مولانا منشی جمال الدین کتانوی بھوپال کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مولانا جمال الدین مولانا مملوک العلی کے ایسے منفرد شاگرد ہیں جو حضرت مولانا مملوک العلی کے ہم استاد بھی ہیں، منشی جی مولانا مملوک العلی کے استاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں برسوں پابندی سے حاضری ہوئے ہیں اور بہت استفادہ کیا ہے۔ منشی جی نے حضرت شاہ رفیع الدین کی بھی صحبت اٹھائی ہے اور اس خانوادہ کے علماء کی متاخر نسل یا سلسلہ میں سے حضرت شاہ محمد اسماعیل، شاہ محمد یعقوب، شاہ محمد اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے ہر ایک کی خدمت میں منشی جی کو حاضری کا موقع ملا ہے، ہر ایک سے استفادہ کیا ہے۔ منشی جی کو حضرت شاہ محمد یعقوب سے تلمذ و تعلم کی نسبت بھی حاصل ہے۔ حضرت مولانا مملوک العلی کے معلوم شاگردوں میں منشی جی کے علاوہ کسی شاگرد کو بھی حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ اسلئے منشی جی کا احوال دیگر تذکروں پر مقدم کیا گیا۔

**وطن اور خاندان** | ایک صدیقی خاندان جس کا سلسلہ نسب حضرت قاسم بن محمد کے واسطے سے حضرت صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے (۱) سہارنپور کی ایک چھوٹی سی بستی یا قصبہ بوڑیہ میں رہتا تھا۔ مگر مغلوں کے آخری دور میں جب یہ سارا علاقہ گوجروں، جاٹوں اور سکھوں کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے تاراج و خاشاک ہوا، اس وقت اس خانوادہ کے ایک ممتاز شخص حسام الدین بوڑیہ سے سکونت ترک کر کے کتانہ (۲) (ضلع میرٹھ، حال ضلع باغپت مغربی یوپی) آگئے تھے، مولانا منشی جمال الدین انہی کی اولاد میں سے تھے، مولانا منشی جمال الدین کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

مولانا منشی سید جمال الدین بن حسام الدین بن محی الدین بن حسام الدین الخ (۳)

**ولادت اور تعلیم** | منشی جمال الدین کی ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۳ء) میں کتانہ میں ولادت ہوئی۔ (۴) غالباً بارہ تیرہ سال کی عمر میں تعلیم کے لئے دہلی بھیج دیئے گئے تھے۔ حکیم نور الدین (قادیانی) کے حوالے سے اکبر شاہ نجیب آبادی نے منشی جی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

میں نے دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی (یہ دہلی کالج کے قائم ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے) اور حضرت شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز کی

- (۱) آثار صدیقی یا سیرت والا جاہی۔ ص ۲۸، ۲۷ جلد دوم لکھنؤ۔
- (۲) کتانہ دور مغلیہ میں اچھی آبادی کا قصبہ یا شہر تھا جو بیگم شہرود کے عہد تک پر بہار قصبہ اور تجارت کا بڑا مرکز رہا، اب اجڑی بستی اور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس قصبہ میں متعدد بڑے مشہور بزرگ علماء اور کالمین پیدا ہوئے۔ قدیم دور کے بزرگوں میں حضرت سید طہ کتانوی (وفات ۱۰۸۴ھ) سب سے ممتاز تھے اور آخری دور میں مولانا منشی جمال الدین صاحب سرآمد روزگار شخص تھے۔ اس قصبہ میں اور بھی ممتاز اور معزز علماء پیدا ہوئے۔ موجودہ دور کے کئی نامور اہل دانش اسی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پاکستان کے موجودہ فوجی حکمران پرویز مشرف بھی اسی بستی کے صدیقی خاندان سے ہیں مگر یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ: امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں
- (۳) آثار صدیقی یا سیرت والا جاہی، نواب نور الحسن۔ ص ۲۴ ج ۲ (لکھنؤ: ۱۳۴۳ھ) نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی۔ ص ۱۲۴ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۴۰۲ھ)
- (۴) نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی حسنی۔ صفحہ ۱۲۴ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۴۰۲ھ) آثار صدیقی میں سن ولادت ۱۲۱۶ھ چھپا ہوا ہے جو بہ ظاہر کتابت کی غلطی ہے، مولانا حسنی کی اطلاع درست اور محقق معلوم ہوتی ہے۔

خدمت میں اور ان کی مجالس و وعظ و ارشاد میں مسلسل حاضر ہوتے رہے۔

دہلی میں قیام کے زمانہ میں دہلی کی ایک خاتون جو منشی جی کی والدہ کی ملنے والی تھیں تمیں روپے ماہوار تعلیم کے مصارف کے لئے دیتی تھیں، پیسے کی وجہ سے منشی جی بری صحبت میں پڑ گئے، یہاں تک کہ حضرت شاہ صاحب کے وعظ میں جانا بھی بند ہو گیا، شاہ صاحب نے جب کئی دن تک منشی کو مجلس و وعظ میں موجود نہ پایا تو معلوم کیا اور خود منشی جی کے گھر تشریف لائے۔ شاہ صاحب کی اس عزت افزائی نے منشی جی پر گہرا اثر ڈالا اور اس وقت سے ہمیشہ کیلئے مستعد طالب علم، اتباع سنت اور خدمت دین کا نمونہ بن گئے تھے۔ حضرت شاہ غلام علی سے بے حد استفادہ کیا اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے شیخ کامل، شاہ محمد آفاق سے بیعت کی ان کی خدمت میں حاضر رہے، شاہ محمد یعقوب اور شاہ محمد اسحاق سے بھی پڑھا۔

خاندان شاہ ولی اللہی کے آفتاب و ماہتاب علماء اور دہلی کے بڑے مشائخ اور کالمین سے استفادہ کے ساتھ ہی ادبی محفلوں سے بھی گہرا رابطہ تھا، مومن خان مومن، شیخ ابراہیم ذوق، امام بخش صہبائی سے روابط اور مراسم تھے، منشی جی ان کی صحبتوں سے فائدہ اٹھاتے اور شعر و سخن سے رشتہ استوار رکھتے تھے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر تلاش معاش میں اندور پہنچے، ملازمت کو زیادہ وقت نہیں ہوا تھا کہ ایک خواب دیکھا جس کی وجہ سے اس ملازمت سے نفرت ہو گئی، ملازمت چھوڑ کر اندور سے بھوپال آ گئے، اس وقت منشی جی الی عمر تینتیس سال تھی اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ منشی جی ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۳۲ء) میں بھوپال پہنچے ہوں گے۔ (۱)

بھوپال میں اول ایک معمولی کام کیلئے ملازم ہوئے، محنت و دیانت اور عمدہ کارکردگی کی وجہ سے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں نائب اول کے عہدہ کے لئے تقرر ہوا، اسی ملازمت

(۱) آثار صدیقی یا سیرت والا جاہی تالیف نواب نور الحسن خاں میں لکھا ہے کہ منشی جمال الدین کی ملازمت کے لئے شاہ رفیع الدین نے سفارشی خط لکھا تھا۔ (ص ۴۶ حصہ دوم) مگر یہ اطلاع صحیح نہیں۔ منشی جی شاہ رفیع الدین کی وفات کے تقریباً چودہ سال بعد سنہ ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۳۲ء) میں بھوپال ملازمت کے لئے گئے تھے۔



کے زمانہ میں ایک مرتبہ نواب سکندر جہاں بیگم، والیہ بھوپال پر قاتلانہ حملہ ہوا تو مولانا نے ان کو بچانے کی بھرپور کوشش کی جس کی وجہ سے بیگم صاحب کا مولانا پر اعتماد بہت بڑھ گیا تھا اور مولانا تمام معاملات میں بیگم صاحب کے مشیر اور معتمد بن گئے تھے، مولانا کے منصب میں اس قدر ترقی ہوئی کہ وہ ریاست بھوپال کے تمام ملازمین اور عہدہ داروں سے ممتاز شمار کئے جاتے تھے۔

۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں مدار الہمام کے ممتاز عہدے اور اس کے خطاب سے نوازے گئے، ریاست کی طرف سے بڑی جاگیر عطا ہوئی اور نہایت اعزاز اور قدر و منزلت کا معاملہ ہوتا رہا۔

منشی جی نے پوری زندگی نہایت اعزاز و احترام سے گزاری، دیانت داری بیدار مغزی اور معاملہ فہمی میں بے نظیر تھے، مولانا کی ہوشیاری اور انصاف پسندی کی وجہ سے ریاست کے حکام اور انگریز افسران، دونوں کو مولانا پر یکساں اعتماد تھا، منشی جی دونوں کی نگاہوں میں محترم اور لائق اعتماد تھے، زندگی کے آخری لمحات تک اسی شان بان سے زندگی بسر کی، نواب نور الحسن خاں کے الفاظ میں:

”اس وقت کوئی دعوے دار ریاست اور حریف ان کا مد مقابل نہ تھا“ (۱)

مولانا اگرچہ اپنی درباری ملازمت کی وجہ سے ایک بڑے منصب دار اور ریاست بھوپال کے غالباً سب سے بااثر شخص تھے، لیکن منشی جی کی نظر میں اس عہدہ و منصب کی کچھ وقعت نہیں تھی۔ مولانا کا اصل ذوق و مزاج درس قرآن و حدیث، علماء و صلحاء کی محبت اور طلبہ کی خدمت و نگہداشت کا تھا، سرکاری مصروفیات سے فارغ تمام وقت منشی جی کے یہاں علمی مجلس گرم رہتی تھی۔ منشی جی قرآن شریف کا درس دیتے تھے، حدیث وغیرہ کے سبق پڑھاتے تھے اور طلبہ کی معاشی سرپرستی اور دینی و اخلاقی تربیت میں مشغول رہتے تھے، نواب نور الحسن نے لکھا ہے:

”سب سے بڑھ کر جس شے سے ان کو شیفتگی تھی وہ وعظ و نصیحت اور قرآن حکیم

(۱) آثار صدیقی یا سیرت والا جاہی ص۔ ۴۷، ۴۸ جلد دوم لکھنؤ

کا ترجمہ تھا، یہ شیفٹنگی درجہ عشق تک پہنچ گئی تھی، ترجمہ قرآن کریم کے درس و تدریس کے ذوق میں ہمیشہ سرشار رہا کرتے، انہوں نے ایک کتاب فرہنگ قرآن لکھی تھی جس کا نام کوکب دری رکھا تھا، وہ بذاتِ خاص طلبہ کو قرآن مجید و کتب حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور طلبہ کی تکمیلِ تعلیم کے لئے انہوں نے بیشِ قرار تنخواہوں پر متعدد اساتذہ علم کو اپنے صرفِ خاص سے مقرر کیا تھا۔“ (۱)

بھوپال کے علماء اور اکثر طلبہ منشی جی کے ممنونِ احسان رہتے تھے، منشی جی کا ہاتھ نہایت کھلا ہوا تھا، ہر وقت سخاوت و عطایا کا سلسلہ جاری رہتا تھا، جس کا جب جی چاہے منشی جی کی دولتِ سرا میں منشی جی سے مل سکتا تھا، دربان و ملازم سے سفارش یا تعاون کی ضرورت نہ تھی، جہاں تک منشی جی کے اختیار اور گنجائش میں ہوتا وہ کسی کی درخواست اور سوال کو رد نہیں کرتے تھے، دن رات کی سخاوت اور دریادلی کے علاوہ منشی جی کا دسترخوان بھی بہت وسیع تھا، جس میں تقریباً پانچ من (دو کونٹل) آٹا روزانہ پکتا تھا، منشی جی کے ساتھ پچاسوں علماء اور طالب علم دونوں وقت کھانے میں شریک رہتے تھے۔

منشی جی نے اپنے محل (نور محل) میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا تھا، جس میں معقول تنخواہوں پر متعدد علماء ملازم تھے، طلبہ کی بھی خاصی تعداد رہتی تھی، ان سب کی تنخواہوں، کھانے کیڑے کا خرچہ اپنی جیبِ خاص سے ادا کرتے تھے، علماء اور طلبہ سے نہایت خوش دلی سے ملتے، بہت اعزاز کرتے اور ان کے سامنے گویا بچھ جاتے تھے۔

منشی جی کو مسجدیں اور مدرسے بنوانے کا خاص شوق تھا، جن میں دینی تعلیم کا اہتمام کرتے اور ان پر پوری توجہ رکھتے تھے، مولانا عبدالحی حسنی نے لکھا ہے کہ بھوپال میں جو دینی چرچا ہے اور ہر طرف مسجدیں آباد نظر آرہی ہیں یہ منشی جمال الدین کا ہی فیض اور لامتناہی صدقہ جاریہ ہے۔ (۲)

منشی جی کا ایک بہت بڑا ناقابل فراموش کارنامہ (بلکہ ہندی مسلمانوں پر ایک بڑا

(۱) آثار صدیقی یا سیرت والا جاہی ص ۴۹ جلد دوم لکھنؤ

(۲) نزہۃ النواظر مولانا عبدالحی حسنی۔ ص ۱۲۵ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۴۰۲ھ)

دینی احسان) یہ ہے کہ منشی جی نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نادر روزگار تصانیف خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء کو چھپوا کر عام کیا۔ ان کتابوں کے نسخے کم یاب تھے، منشی جی نے ہندوستان کے ایک مشہور ناشر، جید عالم اور مصنف و محقق مولانا محمد احسن نانوتوی سے جو حضرت شاہ صاحب کی کتابوں کے ماہر تھے، فرمائش کی کہ وہ دونوں کتابوں کو مقابلہ و تصحیح کے بعد شائع کر دیں، مصارف کی منشی جی نے ذمہ داری لی، مولانا محمد احسن نے قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے دونوں کے متن کی اغلاط درست کیں، صحیح متن مرتب کیا، دونوں پر مختصر مگر جامع اور فاضلانہ حاشیے لکھے اور برسوں کی محنت و جاذبہ کی بعد دونوں کتابوں کو نہایت عمدہ شایان شان طریقہ پر شائع کر دیا۔ ان دونوں کتابوں کی یہ اشاعتیں ایسی بابرکت اور مبارک ثابت ہوئیں کہ آج تک دنیا بھر میں حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفاء کے جو نسخے چھپ رہے ہیں وہ سب انہی اشاعتوں پر مبنی ہیں، ازالۃ الخفاء اس کے بعد ایک مرتبہ ہی چھپی جو مولانا احسن کے اسی نسخہ کا عکس ہے، حجۃ اللہ البالغہ بار بار چھپی ہے اور کثرت سے پڑھی جاتی ہے مگر اس کی بھی اس وقت تک کی تمام اشاعتیں اسی پہلی اشاعت پر مبنی ہیں، ان کتابوں کی طباعت منشی جی کا امت کے لئے بہت بڑا علمی تحفہ اور لافانی صدقہ جاریہ ہے جس کا فیض ہمیشہ جاری رہے گا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف کے علاوہ منشی جی نے تفسیر و حدیث شریف وغیرہ کی اور بڑی کتابیں بھی اسی اہتمام و فیاضی سے چھپوائیں، جس میں مخدوم علی مہائمی کی تفسیر مہائمی (تبصیر الرحمن) اور فتح الباری بھی شامل تھی۔

منشی جی کی ایک بڑی خدمت اور انکی اشاعت و خدمت قرآن کا مظہر قرآن شریف کے متعدد نسخوں کی اشاعت اور تقسیم ہے، منشی جی نے بڑی رقم خرچ کر کے قرآن شریف کے ترکی اور پشتو میں ترجمے کرائے اور دونوں ترجموں کو اہتمام سے چھپوا کر ترکی اور افغانستان میں تقسیم کرا دیا۔ منشی جی نے ایک قرآن شریف اور شائع کرایا تھا جس میں فارسی، اردو اور پشتو کے تین ترجمے شامل تھے، یہ ترجمہ تین بڑی جلدوں میں چھپا تھا اور منشی جی کی طبع کرائی ہوئی کتابوں کی طرح بلا قیمت علماء اور مستحق اصحاب کی خدمات میں بھیجا گیا۔ (۱)

(۱) اس طباعت کا ایک مکمل نسخہ ہمارے ذخیرہ کتب میں موجود ہے۔

منشی جی کی خدمات، محاسن اور کمالات کا دائرہ بہت وسیع ہے، زیر نظر سطور میں اس کی گنجائش نہیں، مولانا عبدالحی حسنی نے منشی جی کے تذکرہ میں لکھا ہے:

”وبا لجملة انه كان على قدم الصحابة“ (۱)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ وہ حضرات صحابہؓ کے قدم بہ قدم تھے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا صفت و تعریف ہو سکتی ہے جس کا ذکر کیا جائے۔

منشی جی کی تقریباً بیاسی سال کی عمر میں ۲۷ محرم الحرام ۱۲۹۹ھ (۲۰ دسمبر ۱۸۸۱ء) کو وفات ہوئی، رات کے گیارہ بجے باغ دل کشا میں پہلی نماز جنازہ ہوئی جو نواب صدیق حسن خاں نے پڑھائی مگر لوگوں کے آنے کا سلسلہ چلتا رہا اس لئے وقفہ وقفہ سے نماز جنازہ ہوتی رہی، گیارہ مرتبہ نماز جنازہ ہوئی، مختلف مدرسوں میں اور اہل حدیث علماء نے غائبانہ نماز جنازہ ادا کی، شاعروں نے مرثیے لکھے، اہل ذوق نے فقرات تاریخ کہے اور مدت تک ماتم پیا رہا۔ (۲)

منشی جی کے پسری اولاد نہیں تھی، فقط دو لڑکیاں تھیں، رجبی بیگم اور ذکیہ بیگم، دونوں کے پہلے نکاح رام پور منہیاران (ضلع سہارنپور) میں ہوئے تھے، دونوں کے شوہر انتقال کر گئے تھے، اسلئے چھوٹی بیٹی ذکیہ بیگم کا دوسرا نکاح نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپال سے ہوا، جن سے نواب علی حسن اور نواب نور الحسن وغیرہ تولد ہوئے۔ (۳)

(۱) نزہۃ الخواطر ص ۱۲۵ ج ۷ (حیدرآباد: ۱۴۰۲ھ)

(۲) آثار صدیقی یا سیرت والا جاہی نواب علی حسن خاں ص: ۵۶ ج دوم (لکھنؤ: ۱۳۴۲ھ)

(۳) منشی جی کے اوصاف و کمالات کی تفصیل اور مزید معلومات کے لئے دیکھئے:

۱- تذکرہ روز روشن۔ از مظفر حسین صبا صاحب۔ ص: ۵۹۳ تا ۵۸۸ (بھوپال: ۱۲۹۶ھ)

۲- آثار صدیقی یا سیرت والا جاہی۔ نواب علی حسن خاں ص: ۳۴ تا ۵۷ ج: ۲

۳- نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحی حسنی ص: ۱۲۳-۱۲۵ ج: ۷

۴- مرقاۃ الیقین فی حیات نور الدین (حالات حکیم نور الدین قادیانی) مرتبہ: اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔ ص: ۸۰-۸۷

اور ص: ۱۲۸-۱۳۱ (طبع اول لاہور: بلاسنہ)

## ﴿قسم دوم﴾

[مولانا مملوک العلی کے وہ شاگرد جو حضرت شاہ محمد اسحاق کے بھی شاگرد تھے]

### [۲] مولانا سبحان بخش شکار پوری (۱)

شکار پور ضلع مظفر نگر (مغربی یوپی) کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، جو مظفر نگر سے بڑھانہ جانے والی سڑک پر شاہ پور سے سات کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ایک پرانی آبادی ہے، جو کبھی نہایت آباد اور پر رونق بستی تھی (۱) اور اب گویا اک ویرانہ ہے، جس کی صحیح تاریخ، وہاں کے اصحاب فضل و کمال اور مصنفین کے حالات اور علمی و ادبی شخصیتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں۔

مولانا سبحان بخش کے والد اور خاندان کی تفصیلات کا علم نہیں، مگر یہ خاندان صدیقی نسبت سے مشہور ہے، اس خاندان کے افراد سنہ ۱۸۵۷ء تک شکار پور میں رہتے تھے، اس وقت تک شکار پور اچھا خاصا قصبہ تھا، مگر معلوم نہیں اس قصبہ پر کیا آفت آئی کہ وہاں کی آبادی ختم ہو گئی۔ جو پرانے خاندان اور گھرانے رہ گئے تھے وہ بھی یہاں سے دوسری جگہوں پر منتقل ہو گئے تھے، جن میں مولانا سبحان بخش کا گھرانہ بھی شامل تھا، مولانا سبحان بخش صاحب غالباً طالب علمی کے زمانے سے ہی دہلی میں رہتے رہے، مولانا کے ایک بھائی

(۱) کہا جاتا ہے کہ شکار پور خاصی پرانی آبادی ہے۔ مگر اس کی قدیم تاریخ نہیں ملتی جو چند روایتیں نقل کی جاتی ہیں ان کی تصدیق و تحقیق بہت مشکل ہے، شکار پور کی بستی کا پہلا حوالہ تیمور کے دور کا ہے کہا جاتا ہے کہ تیمور سنہ ۸۰۱ھ (۱۳۹۹ء) میں یہاں آیا تھا۔ دوسرا حوالہ عہد سلطنت کا ہے جب سکندر لودی کے عہد حکومت (۸۹۳ھ - ۹۲۳ھ - ۱۲۸۹ء - ۱۵۱۷ء) میں مخدوم جہاں گشت کے پڑپوتے شیخ عبدالدین قطب الدین (بن سید کبیر بن سید اسماعیل بن ناصر الدین محمود بن مخدوم جہانیاں) یہاں آئے۔

شیخ اپنے وطن اوج (سندھ) سے دہلی پہنچے تھے، جہاں شکار پور ہے یہاں قیام کا ارادہ کیا اس وقت یہاں گھنے جنگلات تھے، شیخ نے اسی میں اپنی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا، بہلول لودھی نے شیخ کے ساتھ آنا چاہا تھا مگر شیخ نے سختی سے منع فرمادیا، بہلول لودھی شیخ کی زیارت و ملاقات کے لئے شکار کے بہانے سے شکار پور آیا تھا، غالباً اسی نے شیخ کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا تھا، شیخ عبداللہ قطب اور بہلول لودھی کے یہاں آنے کا شیخ عبدالرشید قادری کیرانوی نے اپنی تالیف تاریخ قادریہ مؤلفہ سنہ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں ذکر کیا ہے، (عکس نسخہ فخر و نہ خدا بخش لائبریری پٹنہ) مملوکہ راقم سطور۔

مولوی عبدالرحمان سنہ ۱۸۵۷ء میں شکار پور سے ترک وطن کر کے جلال آباد (ضلع مظفرنگر) چلے گئے تھے، مولانا عبدالرحمن بھی عالم و فاضل شخص تھے کچھ دنوں کے بعد مولوی عبدالرحمن کی اولاد جلال آباد سے کیرانہ ضلع مظفرنگر آگئی تھی۔ (۱)

مولانا سبحان بخش کی صحیح تاریخ ولادت یا سنہ پیدائش معلوم نہیں، مگر کریم الدین پانی پتی نے طبقات شعرائے ہند میں لکھا ہے کہ:

”اس وقت سنہ ۱۸۴۷ء میں عمر ان کی قریب چالیس برس کی ہے“ (۲)

اگر کریم الدین کا یہ اندازہ صحیح ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی تقریباً سنہ ۱۸۰۶ء (۲۲-۱۲۲۱ھ) میں ولادت ہوئی ہوگی۔

مولانا کی تعلیم کا حال دریافت نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ مولانا نے درسیات کی اعلیٰ کتابیں دہلی میں پڑھیں، مولانا دہلی کالج کے طالب علم رہے یا نہیں، اس کی صراحت نہیں ملتی، قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کالج کے ابتدائی دور کے طالب علموں میں شامل ہوں گے۔ مولانا نے مولانا مملوک العلی نانوتوی سے غالباً کالج کے آغاز کے بالکل ابتدائی سالوں میں اور بظاہر علیحدہ بھی پڑھا ہے۔ (۳)

(۱) مولانا عبدالرحمن شکار پوری کے پوتے، حکیم نجیب الرحمان کیرانوی جید عالم، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، فنون عقلیہ، فلسفہ و کلام کے ماہر تھے اور طب میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے، تقریباً ستر سال عمر ہوئی، حکیم صاحب کے عقیدہ اور فلسفہ و کلام کے موضوع پر تین چار چھوٹے رسائل یا مختصر مطبوعہ تالیفات ہیں، ان کی اس وقت کے جید علماء اور اہل نظر نے تعریف کی تھی، ان ہی میں سے ایک تالیف ”عقیدہ توحید و مسئلہ تقدیر“ میں حکیم صاحب نے اپنے دادا تک اپنے نسب اور مولانا سبحان بخش سے نسبت کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ:

”احقر حکیم نجیب الرحمان ولد مولوی عزیز الرحمن ابن مولوی عبدالرحمن برادر مولوی سبحان بخش مرحوم تلمیذ شاہ اسحاق محدث دہلی“

گزارش و دیباچہ عقیدہ توحید و مسئلہ تقدیر، حکیم نجیب الرحمان (مطبوعہ: ۱۹۵۷ء)

(۲) طبقات شعرائے ہند۔ کریم الدین پانی پتی، ص: ۴۶۶ (عکس طبع اول، لکھنؤ: ۱۹۸۳ء)

(۳) مولانا مملوک العلی کے ایک نامور معاصر اس عہد کے دہلی کے قاضی القضاة اور غالب کے ممدوح مولانا مفتی رحمت علی خاں دہلوی عرف میرلال نے اپنی کتاب ”سراج المعرفت میں ایک موقع پر مولانا سبحان بخش کا ضمناً ذکر کیا ہے اور مولانا سبحان بخش کو مولانا مملوک العلی کا شاگرد لکھا ہے۔ سراج المعرفت نسخہ قلمی (مملوکہ راقم سطور)

مولانا سبحان بخش نے حدیث شریف کی اعلیٰ کتابیں دہلی (بلکہ ہندوستان کے) نامور عالم اور محدث حضرت شاہ محمد اسحاق سے پڑھیں۔ مولانا سبحان بخش نے شاہ محمد اسحاق سے اپنے تلمذ کا دو موقعوں پر ذکر کیا ہے، اپنی تصحیح کی ہوئی سنن ترمذی کی تمہید میں لکھا ہے:

”انی سمعت هذا الكتاب من الشيخ المكرم المفخم المشتهر

بين الآفاق المرحوم المغفور مولانا اسحاق و اجازنی به“ (۱)

مولانا سبحان بخش کو شاہ محمد اسحاق سے حصن حصین کی بھی اجازت ہے، جس کا مولانا محمد احسن نانوتوی نے خیر متین ترجمہ حصن حصین کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے، مولانا محمد احسن نے لکھا ہے کہ:

”میری سند اس کتاب کی یہ ہے کہ مجھ کو اسکی اجازت تین شخصوں سے حاصل

ہوئی اول مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری، دوم مرشدی شاہ عبدالغنی مجددی، سوم

مولانا سبحان بخش شکار پوری۔ اور ان تینوں حضرت کو اجازت مرشد آفاق مولانا محمد

اسحاق دہلوی سے ہے“ (۲)

مولانا سبحان بخش کے حقیقی بھائی مولانا عبدالرحمان شکار پوری کے پوتے حکیم نجیب

الرحمن کیرانوی نے بھی اپنی تالیف عقیدہ توحید و مسئلہ تقدیر میں مولانا سبحان بخش کو حضرت

شاہ محمد اسحاق کا شاگرد لکھا ہے۔ (۳)

مولانا کی تعلیم کی معلومات کی کمیابی کے باوجود کہا جاسکتا ہے کہ مولانا سبحان بخش

نے بہت محنت اور توجہ سے پڑھا ہوگا اور ان کا اپنی جماعت اور ہم عصر طلبہ میں ممتاز درجہ

ہوگا، قرین قیاس ہے کہ امتحانات میں بھی اول آتے ہوں گے اور اپنی اسی اعلیٰ صلاحیت

اور عمدہ تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے نوعمری میں دلی کالج کے مدرس سوم بنائے گئے ہوں گے۔

(۱) مقدمہ سنن ترمذی (مطبوعہ فخر الطابع، دہلی: ۱۲۷۰ھ)

(۲) خیر متین ترجمہ حصن حصین، مولانا محمد احسن نانوتوی، (مطبع مجتہائی دہلی) نیز تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی، ایوب

قادی ص: ۳۲ (کراچی: ۱۹۸۶ء)

(۳) عقیدہ توحید و مسئلہ تقدیر حکیم نجیب الرحمن کیرانوی، ص: ۲ (مطبوعہ دیوبند: ۱۹۵۷ء)

مولانا کا ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۳۲ء (یکم جمادی الاخریٰ ۱۲۵۰ھ) کو  
**دہلی کالج میں تقرر** | دہلی کالج میں مدرس سوم کے منصب کیلئے تقرر ہوا (۱) اس تقرر

سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ کالج کی انتظامیہ خصوصاً کالج کے مدرس اول و دوم مولانا  
 مملوک العلی اور مولانا سید محمد دہلوی (۲) دونوں زمانہ طالب علمی سے مولانا سبحان بخش کی  
 اعلیٰ علمی اور اخلاقی خوبیوں سے خوب واقف ہوں گے اور سب کی نظر میں مولانا سبحان  
 بخش کی خاص وقعت ہوگی، دونوں مولانا سبحان بخش کا خاص خیال رکھتے ہوں گے اور انہی  
 کی وجہ سے مولانا کالج میں اعلیٰ درجوں کے استاد نامزد کئے گئے ہوں گے، ان دونوں کی  
 نگاہ توجہ اور منظوری کے بغیر مولانا سبحان بخش کا کالج میں تقرر مشکل تھا۔

مولانا نے جلد ہی کالج کے عہدہ داروں،  
**کالج میں مولانا کی عہدہ کار کردگی** | استادوں اور طلبہ میں اپنا ایک خاص مقام بنا

لیا تھا، مولانا کی اعلیٰ لیاقت، محنت و صلاحیت اور عمدہ طریقہ تعلیم کا سب کی زبانوں پر  
 تذکرہ اور تحسین تھی (۳) کالج کے پرنسپل اساتذہ اور سب ہی طلبہ مولانا کی لیاقت اور علمی  
 کمال کے مداح و معترف رہتے تھے، بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ:  
 ”مولوی سبحان بخش..... دہلی کالج کے قابل اور کار گزار مدرس تھے، پرنسپل

نے اپنی رپورٹوں میں جا سبحان کی تعریف کی ہے“ (۴)

سنہ ۱۸۴۷ء (۶۳-۱۲۶۲ھ) میں مولانا سبحان بخش کے درجہ میں اکیس طالب علم  
 پڑھتے تھے، (۵) انکی علمی صلاحیت اعلیٰ درجہ کی تھی اور وہ امتحان میں بھی اچھے نمبر لاتے تھے۔

(۱) مولانا محمد احسن نانوتوی، ایوب قادری، ص: ۱۷۳۔ قادری صاحب نے اس اطلاع کے لئے رپورٹ جنرل کمیٹی  
 آف پبلک انسٹرکشن سنہ ۱۸۴۲-۳ء کا حوالہ دیا ہے۔

(۲) مولانا سید محمد عشق دہلوی (ولادت تقریباً ۱۷۷۷ء وفات ۱۸۵۲ء) دہلی کالج کے مدرس سوم پھر مدرس دوم ہوئے  
 دہلی کی نامور علمی شخصیت اور دہلی کالج کے ممتاز استاد تھے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ایک نادر مجموعہ مکاتیب مرتبہ محمد  
 اکرام چغتائی: ۳۰۵ تا ۳۰۳۔

(۳) مولانا محمد احسن نانوتوی۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ص: ۱۷۳ (کراچی: ۱۹۶۶ء)

(۴) مرحوم دہلی کالج، ص: ۱۵۳ (دہلی: ۱۹۴۵ء)

(۵) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، مرتبہ ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی۔



مولانا متعلقہ خدمات انجام دے رہے تھے کہ  
۱۱/۱۲۶۷ھ (۷/اکتوبر ۱۸۵۱ء) کو کالج  
کے مدرس اول، مولانا مملوک العلی نانوتوی کی چند

مدرس سوم سے مدرس دوم  
کے عہدے پر ترقی

روزہ بیماری کے بعد وفات ہو گئی، اس وقت مولانا سید محمد دہلوی مدرس دوم اور مولانا سبحان  
بخش مدرس سوم تھے، مولانا مملوک العلی کی وفات کے بعد کالج کی انتظامیہ نے مدرس دوم،  
مولانا سید محمد دہلوی کو مدرس اول نامزد کر دیا جس کی وجہ سے مدرس دوم کا عہدہ خالی ہو گیا  
تھا، یہ عہدہ نظام کی ترتیب اور منصب کے مطابق مولانا سبحان بخش کا حق تھا، لیکن مولانا  
سبحان بخش کے تقرر میں دیر ہوئی، الجھن یہ تھی کہ اس عہدہ کے لئے دو امیدوار اور بھی  
سامنے آ گئے تھے، مولوی حسن علی خان، جو فارسی شعبہ میں استاد تھے اور مولانا محمد یعقوب  
نانوتوی، جو مرحوم مدرس اول مولانا مملوک العلی کے فرزند تھے۔

مولانا یعقوب اگرچہ کالج میں مدرس یا ملازم نہیں تھے کسی جگہ کی تلاش میں تھے مگر  
دہلی کے اصحاب جو دہلی کالج کے لئے مولانا مملوک العلی کی خدمات سے واقف اور ان  
کے قدردان تھے، چاہتے تھے کہ مولانا مملوک العلی کا منصب ان کے بیٹے مولانا یعقوب کو  
مل جائے، مولانا مفتی صدر الدین آزرده (جو دہلی کالج کے مشیر اور ممتحن بھی تھے) اور  
مولانا سید محمد (جو اب مدرس اول ہو گئے تھے) ان دونوں کی بھی یہی کوشش تھی کہ اس عہدہ  
پر مولانا محمد یعقوب کا تقرر ہو جائے (۱) کالج کی انتظامیہ کے لئے ان دونوں کی سفارش کو  
نظر انداز کرنا مشکل ہو رہا تھا، اس لئے انتظامیہ نے طے کیا کہ متوقع تینوں امیدواروں کا  
ایک امتحان لے لیا جائے، جس کے جوابات سب سے عمدہ ہوں، اس کا اس منصب پر تقرر  
کر دیا جائے۔ اس امتحان کے لئے بھی مفتی صدر الدین آزرده ممتحن بنائے گئے تھے مگر

(۱) مولانا مملوک العلی کی وفات کے بعد اس عہدہ کے لئے امیدواروں اور متعلقہ امتحانات وغیرہ کی تفصیل کا علی اکبر  
اور برکت علی کے ان خطوط سے پتہ چلتا ہے جو دونوں نے اسی وقت اسپرنگ کو لکھے تھے۔ یہ خطوط ایک نادر مجموعہ مکاتیب  
مرتبہ جناب محمد اکرام صاحب چغتائی سے ماہی اردو کراچی (۸۶-۱۹۸۳ء) میں شامل ہیں۔ ملاحظہ، ص: ۳۳۳-۳۳۶

کالج کے چند پرانے طالب علموں کا (جن میں سے ایک کالج میں غالباً ابتدائی درجہ کے استاد بھی تھے) خیال تھا کہ یہ امتحان دیانت داری سے نہیں ہو رہے ہیں بلکہ مفتی صاحب نے اپنی پسند کے امیدوار (مولانا محمد یعقوب نانوتوی) کی تقرری کیلئے یہ راستہ نکالا ہے، اسی لئے مفتی صاحب نے سوالات کا پرچہ بھی بہت آسان بنایا ہے جس کا مقصد امتحان میں مولانا یعقوب کو فائدہ پہنچانا ہے، دہلی کالج کے پرانے طالب علم یہ چاہتے تھے کہ اس منصب پر مولانا سبحان بخش کا ہی تقرر ہو، جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے کالج کے تمام مدرسین سے ممتاز ہیں اور یہ منصب ان کا حق بھی ہے، انہوں نے اس مقصد کیلئے دہلی کالج کے پرنسپل اسپرنگر (L. SPRENGER) کو خطوط بھی لکھے تھے کہ وہ اس معاملہ میں مداخلت کر کے مدرس دوم کے عہدہ پر مولانا سبحان بخش کا تقرر کرادیں، علی اکبر سونی پتی نے اسپرنگر کو جو خط لکھا تھا اس کا اقتباس اوپر گزر چکا ہے۔

یہی بات دہلی کالج کے ایک اور پرانے طالب علم (اور کالج میں مدرس کے امیدوار) مولوی سید برکت علی نے بھی لکھی تھی (۱) اس امتحان کے نتائج کا تو سراغ نہیں ملا، لیکن برکت علی وغیرہ کی یہ کوشش کامیاب ہو گئی اور مولانا سبحان بخش کالج کے مدرس دوم کے عہدہ کے لئے نامزد کر دیئے گئے، جو سنہ ۱۸۵۷ء (میں کالج کے ختم ہونے) تک اسی اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔

سنہ ۱۸۵۷ء میں مولانا سبحان بخش کہاں تھے، اس کا علم نہیں۔  
سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں مولانا کا کیا کردار رہا اس کا بھی

۱۸۵۷ء کے بعد کالج کی تجدید، مولانا کا کالج میں دوبارہ تقرر اور سبکدوشی

سراغ نہیں ملتا، لیکن سنہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ کے سات سال بعد سنہ ۱۸۶۴ء میں جب کالج دوبارہ کھلا (۲) تو اس وقت بھی مولانا کو مدرس اعلیٰ نامزد کیا گیا۔ کالج کے دوسرے دور

(۱) مولوی برکت علی کے اس خط کے لئے ملاحظہ ہو: ایک نادر مجموعہ مکاتیب، چغتائی، ص: ۲۲۳-۲۲۴۔

(۲) مرحوم دہلی کالج، ص: ۶۳ (دہلی: ۱۹۳۵ء)

میں مولانا صرف عربی درجات کے مدرس اول نہیں تھے بلکہ عربی، فارسی، اردو تینوں شعبوں کے سربراہ تھے۔ مولانا سبحان بخش نے ”مجاورات ہند“ کی وجہ تالیف میں اپنے تعارف میں لکھا ہے کہ:

”سبحان بخش ساکن شکار پور، ضلع مظفرنگر کہ غدر سے پہلے دہلی کالج میں مدرس دوم عربی اور بعد غدر کے پھر کالج دہلی میں مدرس عربی و فارسی واردو تھا اور اب پنشن دار ہے، عرض کرتا ہے کہ:“ (۱)

مولانا سبحان بخش کے ان الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا ملازمت کی قانونی عمر (یادت) پوری ہونے تک کالج سے مسلسل وابستہ رہے، مگر اس کا سراغ نہیں ملتا کہ یہ ملازمت کب ختم ہوئی، بہ ظاہر دہلی کالج کے ٹوٹنے یا لاہور منتقل ہونے سے پہلے مولانا کالج سے سبکدوش ہو گئے ہوں گے۔

دہلی کالج اپریل سنہ ۱۸۷۷ء میں ختم کر کے لاہور کالج میں ملا دیا گیا تھا، اور دہلی کالج کے تمام استاد اور ملازمین بھی دہلی سے لاہور بھیج دیئے گئے تھے (۲) ملازمین کے اس قافلہ میں مولانا سبحان بخش صاحب شامل نہیں ہوں گے کیوں کہ اس وقت مولانا کی عمر تقریباً ستر (۷۰) سال ہو چکی تھی، قیاس چاہتا ہے کہ مولانا اس سے پہلے ہی کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہوں گے۔

مولانا اگرچہ کالج سے سبکدوش ہو گئے تھے، مگر لمبی ملازمت اور خاصی عمر کے باوجود اس کے بعد بھی آخر تک خوب سرگرم اور علمی کاموں میں مشغول رہے، تصنیف و ترجمہ کا کام ہوتا رہا بلکہ اس میں شاید کچھ اور وسعت اور تیزی آگئی تھی، درس و تعلیم کا مشغلہ بھی جاری تھا جو زندگی کے آخری دنوں تک اس طرح چلتا رہا۔

مولانا سبحان بخش جید عالم، ماہر مدرس، عمدہ مترجم و مصنف تھے۔ دہلی کالج کی انتظامیہ اور طلبہ دونوں مولانا کی لیاقت و صلاحیت کے مداح اور

علمی مرتبہ

(۱) مجاورات ہند، مولانا سبحان بخش شکار پوری، ص: ۲ (مکتبہ جامعہ دہلی: ۱۹۹۳ء)

(۲) مرحوم دہلی کالج، ص: ۱۱۱۔

مولانا کے علمی مرتبہ کے معترف تھے، مولوی عبدالحق کی اطلاع ہے کہ:

”(مولوی سبحان بخش) دہلی کالج کے قابل اور کارگزار مدرس تھے، پرنسپل نے اپنی رپورٹوں میں جا بجا ان کی تعریف کی ہے“ (۱)

دہلی کالج کے طالب علم بھی مولانا کے فضل و کمال اور طریقہ تعلیم کی منہ بھر بھر کر تعریف کیا کرتے تھے، مثلاً کریم الدین پانی پتی نے سنہ ۱۸۴۷ء میں لکھا ہے کہ:

”مولوی سبحان بخش صاحب مدرس سوم عربی، مدرسہ دہلی کے بہت فہمیدہ اور عقلمند اور عالم آدمی ہیں، علم ان کو اچھا ہے، مہارت فنون مستعملہ میں اچھی رکھتے ہیں مدت سے مدرسہ دہلی میں ملازم ہیں۔“ (۲)

اسی کالج کا ایک بہت ذہین اور تیز طالب علم (علی اکبر سونی پتی) مولانا کے متعلق اپنا خیال یوں ظاہر کرتا ہے:

”یہ شخص یعنی مولوی سبحان بخش مستحق عہدہ مدرس دوم عربی کے ہیں، جب کبھی خیال ہو، اور کیوں مستحق نہ ہوں کہ وہ بڑے بڑے عالم ہیں، رات دن پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہتے ہیں، اپنے مکان پر بھی یہی چرچا رکھتے ہیں اور مدرسہ میں تو اس کام کی نوکری ہی پاتے ہیں اور اسی واسطے کتابیں تحصیل ان کو خوب یاد ہیں، ابتداء سے لے کر انتہاء تک کئی بار پڑھایا ہے، فی الحقیقت بڑی استعداد کامل رکھتے ہیں۔ سو اس کے بڑی بات یہ ہے کہ وہ طالب علموں پر بڑی محنت کرتے ہیں اور ان سے بہت محنت لیتے ہیں، خواندگی سننے اور ترکیب عبارات عربی کے لکھوانے اور جواب مضمون کا لکھوانا اور ان میں اصلاح دینی، تمام دن ان کا انہیں باتوں میں جاتا ہے، چاہئے کہ کوئی دم ذرا آپ دم لیں یا طالب علم کو دم لینے دیں، کیا ممکن!

حقیقت حال یہ ہے کہ طالب علم کی انہیں کی جماعت میں آن کر استعداد درست ہوتی ہے، وجہ اسکی یہ ہے کہ آپ بھی شوق سے پڑھاتے ہیں اور طالب علموں

(۱) مرحوم دہلی کالج: مولوی عبدالحق، ص: ۱۵۳ (انجمن ترقی اردو، دہلی: ۱۹۴۵ء)

(۲) طبقات شعرائے ہند، کریم الدین پانی پتی، ص: ۳۶۶ (عکس طبع اول لکھنؤ: ۱۹۸۳ء)

کو بھی شوق دلاتے ہیں، اور محنت پر برا بیچتے کرتے ہیں، پس طالب علم خواہ مخواہ مستعد اور محنت کش ہو چاہئے“ (۱)

اس زمانے کے اور اہل فضل و کمال بھی مولانا سبحان بخش کے کمال علمی کے مدح خواں تھے، گارساں دتاسی کا قول ہے:

”تذکرۃ الحکماء اور تذکرۃ المفسرین ان دونوں کے مؤلف مولانا سبحان بخش

ہیں، اس زمانے کے فرزانہ اور ظریف ہندوستانی مصنف ہیں“ (۲)

دتاسی نے اپنی دوسری تالیف میں مولانا سبحان بخش کو فضلاء کبار میں سے شمار کیا ہے (۳) مولانا مملوک العلی کی وفات کے بعد مولانا سبحان بخش کا مدرس دوم کے عہدہ پر تقریر ان اطلاعات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس ترقی اور مدرس دوم نامزد کئے جانے سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ کالج کی انتظامیہ بھی مولانا کی مرتبہ شناسی اور ان کے علم و فضل کے اعتراف میں کسی سے پیچھے نہیں تھی۔

دینی علمی تصانیف، تراجم اور حاشیے | مولانا سبحان بخش تعلیم و افادہ میں اپنے استادوں کے قدم بہ قدم تھے ہر وقت

درس اور سبق کا سلسلہ جاری رہتا، کالج سے فارغ اوقات میں گھر پر بھی طلبہ کو پڑھاتے تھے، جب تک کالج سے وابستہ رہے اس زمانہ میں شاید تعلیم اور کالج کی ذمہ داریوں کے بوجھ کی وجہ سے تحریر و تصنیف کا کام بہت زیادہ نہیں ہوتا تھا تاہم کالج اور دہلی سوسائٹی کی جانب سے جو کتابیں ترجموں کے لئے مولانا کے سپرد کی گئی تھیں مولانا نے ان کے اعلیٰ درجہ کے ترجمے کئے، ان میں سے کئی کتابوں کے ترجمے کالج سے شائع بھی ہوئے، لیکن کالج کے زمانہ تدریس میں کالج کی جانب سے مفوضہ خدمات یا ترجموں کے علاوہ اس دور کی کسی اور تالیف یا ترجمہ کا راقم کو علم نہیں، لیکن مولانا جب کالج کی ذمہ داریوں سے

(۱) مکتوب علی اکبر، بنام اسپرنگر۔ مکتوبہ ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۵۱ء ایک نادر مجموعہ مکاتیب (مکتوبات مشاہیر ہند بنام اسپرنگر)

مرتبہ ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی، ص: ۳۳۴-۳۳۵ (سہ ماہی اردو، کراچی: اپریل، جون ۱۹۸۶ء)

(۲) ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف، ص: ۹۷ (سہ ماہی اردو اورنگ آباد: اپریل ۱۹۲۸ء)

(۳) ملاحظہ ہو: رسالہ تذکرات دتاسی، مترجمہ مولوی ذکاء اللہ، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ص (دہلی: ۱۹۶۸ء)

سبکدوش ہو گئے تھے اس وقت تحریری تصنیفی کام تیزی سے ہوا، اس وقت سے وفات تک مولانا ہمیشہ علمی کاموں اور تصنیف و ترجمہ وغیرہ میں مصروف رہے، کئی کتابوں کے ترجمے اور تصانیف کیں، علمی اشاعتی کاموں میں نامور علماء خصوصاً مولانا نواب قطب الدین دہلوی کے رفیق و معاون رہے۔

مولانا سبحان بخش کی معلوم تصانیف اور ترجموں کو تین موضوعات پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، علوم اسلامیہ (حدیث، فقہ، دینیات وغیرہ)، تاریخ اور اردو ادب، پہلی قسم کی تالیفات اور خدمات میں پہلا اہم کام سنن ترمذی کی پہلی طباعت (جو مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے حاشیہ اور تصحیح و اہتمام سے چھپی تھی) کا دوبارہ مقابلہ اور تصحیح کی، اس کے حوالوں کو جانچا پرکھا، اور دوسری اشاعت کے لئے تیار کیا۔

سنن ترمذی کی تصحیح و تعلق کے علاوہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور کتاب مجالس الابرار کا اردو ترجمہ کیا، فقہ شافعی کے نامور عالم شیخ ابوشجاع اصفہانی کی فقہ شافعی پر مختصر کا بھی اردو ترجمہ کیا، ابن حجر کندی کی منہیات کو فارسی میں منتقل کیا، شیخ عبدالحق کی ماثبت بالسنة کا بھی اردو ترجمہ کیا، ایک فارسی کتاب کے اردو ترجمہ میں مولانا نواب قطب الدین دہلوی کے رفیق رہے۔

ادبی لسانی موضوعات میں محاورات ہند پر مولانا کی دستاویزی تالیف تقریباً سو برس سے اہل ذوق کی مدد اور رہنمائی کر رہی ہے۔

مولانا کے معلوم ترجموں اور تالیفات کا مختصر تعارف آئندہ صفحات میں پیش ہے۔

سنن ترمذی علم حدیث کی بنیادی اور چند اہم ترین کتابوں میں سے ہے، یہ کتاب پوری دنیا میں سب سے پہلے حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے شائع کی تھی۔

حاشیہ و تصحیح سنن ترمذی  
(مطبوعہ دہلی: ۱۲۷۰ھ)

حضرت مولانا احمد علی نے ترمذی کا جو نسخہ شائع کیا تھا،

اس کی تصحیح، مقابلہ اور نظر ثانی کی خدمت مولانا مملوک العلی نے انجام دی تھی، اس نسخہ کی طباعت سنہ ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۸-۴۹ء) میں مولانا احمد علی کے (ذاتی پریس) مطبع احمدی

میں مکمل ہوئی تھی۔ سنن ترمذی کو دوسری اشاعت کیلئے مولانا سبحان بخش نے مرتب کیا، نیا حاشیہ لکھا اس کے متن کا مقابلہ اور تصحیح کی۔ مولانا سبحان بخش نے لکھا ہے:

”يقول العبد الضعيف الراجي الى رحمة رب العرش  
سبحان بخش الساعى فى انطباع هذا الكتاب المستطاب ثانيا و  
تصحيحه و مقابلته مع الطبع الاول“

مکمل ہو گیا۔ مولانا سبحان بخش نے لکھا ہے جو اس کتاب کی دوسری طباعت کے لئے کوشش کر رہا ہے اور اس نے اس کا پہلی طباعت سے مقابلہ تصحیح کی ہے۔“

سنن ترمذی کا یہ نسخہ حافظ نیاز احمد (جوش) کیرانوی (۱) کے مطبع فخر المطابع دہلی سے شائع ہوا تھا، اس کی طباعت شوال میں شروع ہو کر ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۰ھ ستمبر (۱۸۵۴ء) میں مکمل ہوئی۔

(۱) شیخ اللہ دیا معروف بہ نیاز احمد: فرزند حافظ عبداللہ بن مولوی الہی بخش کیرانوی ان کا خاندان کیرانہ کارہنے والا ہے، حافظ عبداللہ اور ان کے والد بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخر کے مصاحب اور معتمد افراد میں سے تھے، اور قلعہ معلیٰ میں شاہی پریس (سلطان المطابع) کے نگراں تھے۔ جوش کے والد آخر تک قلعہ کے مطبع سلطانی سے وابستہ اور قلعہ کی مطبوعات وغیرہ کے نگراں رہے مگر جوش نے مرزا فخر کی مناسبت سے فخر المطابع کے نام سے اپنا الگ چھاپہ خانہ بھی کھول لیا تھا، اس مطبع نے بھی متنوع موضوعات پر عمدہ کتابیں شائع کیں۔

جوش کا عین نوجوانی میں صرف پچیس سال کی عمر میں سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴-۵۵ء) میں انتقال ہو گیا تھا۔ جوش اور اس کے والد کا علمی ادبی مقام، ذوق کے شاگردوں میں نیاز کا مرتبہ اور نیاز کا رنگ کلام اور دریافت اشعار کا اور ان کے مطبع کی مطبوعات کا تعارف ایک علیحدہ مفصل مضمون کا طالب ہے۔ جوش نہایت ذہین ذکی طباع اور باصلاحیت شخص تھے، شعر و سخن میں ذوق سے استفادہ کیا تھا، ذوق اپنے سب شاگردوں میں انہیں کو قابل ترین اور طباع سمجھتے تھے۔ اگر جوش کی زندگی وفا کرتی تو ذوق کے جانشین ہوتے جوش لالہ سری رام کے بقول:

”از سر تا پا استاد کے حق میں ڈوبے ہوئے تھے، وہی زبان بندش وہی لطف محاورہ، غرض سارے اسلوب وہی تھے“ خم خانہ جاوید ص: ۲۸۴ ج: ۲

جوش کے تعارف کیلئے دیکھئے طبقات شعرائے ہند کریم الدین پانی پتی، ص: ۴۳۰-۴۳۱ لکھنؤ سنہ ۱۹۸۳ (۲) گلستاں سخن قادر بخش صابر مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی ص: ۳۷۹-۳۸۰ جلد اول لاہور: سنہ ۱۹۶۶ (۳) سخن شعراء انساخ ۱۱۳-۱۱۵

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی وفات سنہ  
۵۶۱ھ (۱۱۶۶ء) کا دنیائے اسلام میں جو  
مقام و مرتبہ ہے، اس سے کوئی لکھا پڑھا

خزینۃ الاسرار ترجمہ مجالس الابرار  
(مطبوعہ: ۱۲۷۹ھ)

مسلمان شاید ہی ناواقف ہو۔ مجالس ابرار حضرت شیخ جیلانی کی مشہور ترین تالیف ہے، یہ  
کتاب اور ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی خاصی مقبول تھی، اس کتاب کی تعلیمات و  
ہدایات کو عام لوگوں تک پہنچانے کیلئے مولانا سبحان بخش نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جو اس  
بڑی کتاب کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔

یہ خاصا رواں صاف ستھرا ترجمہ ہے، یہاں اس کتاب کے عربی کے چند جملے اور ان  
کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے جس سے ترجمہ کی زبان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

”المجلس السبعون فی بیان حرمة الاحتکار و سائر ما يتعلق  
به من الاحکام الشرعية قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من  
احتكر فهو ..... هذا الحديث من صحاح المصابيح رواه عمر  
بن عبد الله و معناه ان من جمع الطعام الذي يجلب الى البلد  
ويحبسه لبيعه وقت القلاء فهو اثم“

ترجمہ: سترویں مجلس میں بیان احتکار کی حرمت کا، اور تمام احکام شرعی جو  
اس سے متعلق ہیں، ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے احتکار کیا پس  
وہ خطاوار ہے، یہ حدیث مصابیح کی صحیح حدیثوں میں سے ہے، عمر بن عبد اللہ کی  
روایت سے اس کے یہ معنی ہیں کہ جو شخص غلہ جمع کرے جو کہ شہر کی طرف رسد آتی  
ہے اور اس کو روک رکھے اس لئے کہ گراں کر کے بیچے تو وہ گنہگار ہے“ (۱)

خزینۃ الاسرار کا جو نسخہ میرے پاس ہے اس کے شروع کے چند صفحات ضائع ہو چکے  
ہیں، اس لئے یہ معلوم نہیں کہ کتاب کے آغاز پر مترجم نے اس ترجمے کے متعلق کیا لکھا  
ہے، مگر کتاب کی آخری سطور میں مولانا سبحان بخش کی یہ صراحت درج ہے کہ میں نے یہ

(۱) خزینۃ الاسرار ترجمہ مجالس الابرار، ص ۵۲۸ (طبع اول ۱۲۷۹ھ)



ترجمہ مولانا نواب قطب الدین دہلوی کی فرمائش اور ہدایت پر کیا ہے۔  
یہ ترجمہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۹ھ (ستمبر اکتوبر ۱۸۶۲ء) میں پورا ہوا تھا، مولانا کی چند  
سطریں ملاحظہ ہوں:

”اما بعد احقر العباد سبحان بخش عفی عنہ ساکن قصبہ شکار پور ضلع مظفرنگر عرض کرتا  
ہے کہ کتاب مجالس الابرار..... نواب صاحب مستغنی عن الاوصاف  
جناب مولانا واولنا مولوی حاجی قطب الدین صاحب کو واسطے افاضہ عام اور فیض  
تمام کے اس کے ترجمہ کا خیال آیا کہ اس کتاب کے مضامین عام فہم ہو جاویں.....  
اور اس کا نام خزینۃ الاسرار ترجمہ مجالس الابرار تجویز کر کر جناب موصوف کی خدمت  
میں پیش کیا۔ مولانا صاحب نے سارے ترجمہ کو بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا اور پسند کر  
کراجازت طبع کی دی“

ترجمہ مجالس الابرار کی مطبع مصطفائی دہلی میں طباعت شروع ہوئی تھی اور مطبع مجتبائی  
دہلی میں مکمل ہوئی، آخر میں سنہ طباعت درج نہیں، ممکن ہے ان ابتدائی صفحات میں ہو جو  
راقم کے نسخہ میں موجود نہیں۔

یہ کتاب مع متعلقات بڑے سائز کے چھ سوسترہ صفحات پر مشتمل ہے، اصل کتاب  
صفحہ ۶۱۵ پر ختم ہوگئی ہے، کتاب کے صفحہ ۶۱۶ پر مولانا محمد حسین فقیر بنتی دہلوی کی عربی میں تقریظ  
ہے، صفحہ ۱۸-۶۱۷ پر غلط نامہ۔ اس طباعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

غایۃ الاختصار مذہبی  
شرعی مسائل و معاملات  
پر شافعی مسلک کے ایک  
بڑے عالم اور فقیہ، شیخ ابو

ترجمہ رسالہ فقہ شافعی

تالیف ابوشجاع احمد اصفہانی (مطبوعہ: ۱۲۸۶ھ)

شجاع احمد بن حسین بن احمد اصفہانی (ولادت ۵۳۳ھ، ۱۱۳۸ء، وفات ۵۹۳ھ، ۱۱۹۷ء)  
کی مشہور اور معتبر کتاب ہے، جس کو تقریب بھی کہتے ہیں، یہ کتاب فقہ شافعی کے اہم  
ترین مراجع میں شمار کی جاتی ہے۔ مولانا سبحان بخش صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا،

مگر اس میں مترجم نے اس ترجمہ کی وجہ، اسکی ضرورت بلکہ اپنا نام تک ذکر نہیں کیا، صرف سرورق پر مترجم مولانا سبحان بخش کا نام چھپا ہوا ہے، جسکے الفاظ یہ ہیں:

”مؤلفہ مولانا سبحان بخش صاحب مدظلہ“

یہ ترجمہ فقہ شافعی کے نام سے مطبع احمدی دہلی سے سنہ ۱۲۸۶ھ (۷۰-۱۸۶۹ء) میں شائع ہوا تھا، چھپا سٹھ صفحات پر مشتمل ہے، ترجمہ صاف اور رواں ہے، اس کی بھی ابتدائی چند سطرین نقل کی جاتی ہیں:

”کہتا ہے قاضی ابوشجاع احمد بیٹا حسین کا پوتا احمد کا، رہنے والا اصفہان کا،

رحمت اللہ کی اوس پر۔

تمام ستائش اللہ کی ہے کہ پروردگار تمام عالم کا ہے، اور درود اللہ کے خاتم النبیین پر، اور انکے تمام اصحاب پر، پھر بعد اس کے یہ ہے کہ بعضے یاروں کے اللہ کی رحمت ان پر ہو، مجھ سے یہ خواہش کی کہ میں ایک رسالہ مختصر علم فقہ میں موافق مذہب امام شافعی رضی اللہ عنہ کے تالیف کروں نہایت مختصر اور موجز کہ طالب کو اس کا پڑھنا میسر ہو سکے، اور مقتدی کو اس کا یاد کرنا آسان ہو جائے“

اس کتاب کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

منہیات ابن حجر کندی کی، احادیث نبوی کی (ایک غیر معتبر) مگر مشہور تالیف ہے، جو عوام میں کثرت سے پڑھی جاتی ہے، یہ کتاب عربی میں ہے، مولانا سبحان بخش

فارسی ترجمہ منہیات ابن حجر کندی

(مطبوعہ: ۱۲۸۸ھ، ۱۸۷۱ء)

نے شیخ ناصر علی کی فرمائش پر اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، یہ ترجمہ تحت اللفظ ہے مگر سادہ، رواں اور تعقید سے پاک ہے۔

ترجمہ کی ابتداء ایک تمہید سے ہوئی ہے جو ایک صفحہ پر مشتمل ہے، جس میں مولانا نے لکھا ہے کہ میں نے یہ ترجمہ شیخ ناصر علی تاجر کتب دہلی کی فرمائش پر کیا ہے اور یہ خدمت ماہ رجب سنہ ۱۲۸۸ھ (اکتوبر ۱۸۷۱ء) میں انجام پائی ہے، مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”اما بعد احقر الناس سبحان بخش ساکن قصبہ شکار پور ضلع مظفر نگر میگوید کہ دریں زمان نجستگی تو امان یعنی ماہ رجب المرجب سنہ ۱۲۸۸ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، حسب فرمائش مشفق شیخ ناصر علی صاحب تاجر کتب متوطن شہر دہلی و بہ ترغیب و وساطت صاحب مراتب علیا و مدارج عظمیٰ مورد الطاف سرمدی مظہر فتوحات ایزدی، مجمع اخلاق مرزا عبد الرزاق منصرم مطبع مجتہائی دہلی لازالت شمس کمالا تہم ترجمہ کتاب افاضت انتساب اعنی منہیات ابن حجر عسقلانی بفارسی کردہ شد باین لحاظ کہ مترجم اردو و آن دیار کہ مسلمان آنجا ازیں زبان بہرہ ندارند بیکاری بود و آنکساں از فوائد چنین کتاب محرومی مانند“ (۱)

تمہید کا اختتام اس اطلاع پر ہوا ہے کہ میں نے اس کتاب کا حق طباعت شیخ ناصر علی صاحب کو دے دیا ہے، اس کے بعد اس کتاب کی طباعت کی کسی اور کو اجازت دینے کا مجھے بھی حق نہیں رہا۔

”و واضح باد کہ حق تصنیف ترجمہ کتاب مذکورۃ الصدر شیخ ناصر علی صاحب مولوف دادہ مالک طبع آن کردہ شد بعد ازیں مارا در طبع آن حقے نیست و نماندہ، و دیگر اہل مطابع ہم بے اجازت مومی الیہ قصد طبعش نفرمایند“ (۲)

اس کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

ہندوستان کے مشہور عالم شیخ عبد الحق محدث دہلوی (وفات: ۱۰۵۲ھ، ۱۶۲۲ء) نے ہجری سال کے بارہ مہینوں کی خصوصیات، انکے خاص فضائل و مسائل پر

اعمال الماثورۃ فی الایام المشہورۃ  
ترجمہ ماثبت بالسنة (مطبوعہ: ۱۳۰۹ھ)

ایک کتاب ماثبت بالسنة فی احکام السنة کے نام سے لکھی تھی مگر اس وقت تک غالباً اس کا اردو ترجمہ نہیں ہوا تھا، مولانا سبحان بخش نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا، یہ ترجمہ

(۱) منہیات ابن حجر عسقلانی، ص: ۳

(۲) اس ترجمہ کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

عربی متن کے ساتھ شائع ہوا تھا، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ماثبت بالسنہ کا تعارف کراتے ہوئے اس ترجمہ کا بھی ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

”سنہ ۱۳۰۹ھ میں (مولانا) سبحان بخش شکار پوری نے دہلی سے اس کو مع

ترجمہ شائع کیا اور اعمالِ ماثورہ نام رکھا تھا“ (۱)

اس سے پہلے بھی مطبعِ مجتبائی نے اس کا ایک ایڈیشن اور شائع کیا تھا جو تقریباً دو سو

صفحات پر مشتمل تھا۔ (۲)

فلاح دارین اسلامی عقائد اور سلوک و تصوف کے  
تکمیل ترجمہ فلاح دارین

موضوع پر مشہور عالم دین مولانا نواب قطب الدین دہلوی کی تالیف ہے جو نواب صاحب کے خاندان کے بزرگ (پردادا) بحر العلوم علامہ محمد مصطفیٰ تھانیسری کی کتاب مغنی الطالب فارسی کے آخری باب کا ترجمہ ہے، اس ترجمہ کا ابتدائی حصہ مولانا قطب الدین کا کیا ہوا ہے، مولانا سبحان بخش نے نواب قطب الدین کی فرمائش پر اس ترجمہ کی تکمیل کی ہے، فلاح دارین مطبعِ منشی نول کشور لکھنؤ سے سنہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) چھپی تھی، فلاح دارین کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

تلاش کیا جائے تو مولانا کی اور بھی علمی تالیفات و تراجم دستیاب ہوں گے، مولانا کی تالیفات و تراجم سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے اکثر اوقات تحریری و تصنیفی کام میں گذرتے تھے۔ اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ترجمہ کا کام خاصی تیزی سے کرتے تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ مولانا کی اور بھی متعدد تصانیف یا ترجمے ہوں۔

علمی تصنیفی کام میں مولانا کی نواب  
قطب الدین کے ساتھ شرکت اور تعاون

مولانا کی کتابوں کے تعارف میں گذر گیا ہے کہ مولانا نے کئی علمی کام اور ترجمے اپنے استادوں یا نواب قطب الدین کی رفاقت میں کئے ہیں اور مشترک تصنیف کی روایت کو

(۱) حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، خلیق احمد نظامی ص: ۱۷۱ (ندوة المصنفین دہلی: ۱۳۷۳ھ)

(۲) فہرستِ مجتبائی دہلی۔

آگے بڑھایا ہے، ان کتابوں کے علاوہ جن کا یہاں ذکر ہوا، مولانا سبحان بخش نے اور بھی کئی کتابوں کی اشاعت اور تصحیح میں نواب صاحب کی خاصی مدد کی جن میں مولانا نواب قطب الدین دہلوی کی مشہور کتاب مظاہر حق (شرح مشکوٰۃ المصابیح) کی طباعت و تصحیح بھی شامل ہے، مظاہر حق کی پہلی جلد مولانا سبحان بخش کی کوشش سے مولانا کی اصلاح کے بعد پہلی مرتبہ مطبع فخر المطابع دہلی سے سنہ ۱۲۶۸ھ میں چھپی تھی۔

دہلی کالج کے کئی شعبے اور متعدد پہلو تھے، جن میں تعلیم کے بعد سب سے اہم پر جوش اور فعال شعبہ تصنیف و اشاعت کا شعبہ تھا، دہلی کالج نے مغربی اور مشرقی دونوں قسم کی زبانوں کی اعلیٰ ترین علمی

دہلی کالج کے تحریری و تصنیفی کام میں مولانا کا حصہ

اور مفید کتابوں کے اردو میں ترجموں اور انکی طباعت و اشاعت کا بڑا اور اہم منصوبہ مرتب کیا تھا، جسکے لئے دہلی کالج کے ممتاز استادوں کا ایک بورڈ اور علمی تصنیفی کمیٹی بنائی گئی تھی، اگرچہ اس شعبہ کی ابتداء ایف بٹروس (F. Boutros) کے زمانے میں ہو گئی تھی، مگر اس کو ایک طاقتور بڑے علمی ادارہ یا اکیڈمی کی شکل اسپرنگر نے دی، بٹروس کے بعد جب مسٹر اسپرنگر (سنہ ۱۸۴۳ء میں) پرنسپل بنائے گئے تو انہوں نے اس کام کو بڑی توجہ اور اہتمام سے آگے بڑھایا۔ اسپرنگر کے دور میں کالج کے اس شعبہ میں اہم عنوانات و موضوعات پر اول درجہ کی طبع زاد کتابیں لکھی جا رہی تھیں، ہندوستانی اور مشرقی و مغربی زبانوں کی عمدہ کتابوں کے اردو میں ترجمے ہو رہے تھے۔ جس کی وجہ سے علمی حلقوں میں ایک نئی جان پڑ گئی تھی۔ کالج کے بڑے استاد مدرس اول اور مدرس دوم و سوم یعنی مولانا مملوک العلی، مولانا سید محمد دہلوی اور مولانا سبحان بخش اس تحریک کے رہنما اور اس قافلہ کے سالار تھے، یہ اساتذہ خصوصاً مولانا مملوک العلی اور ان کے بعد مولانا سبحان بخش کالج کے تمام علمی کاموں، تصنیف و اشاعت اور کالج کے اخبارات و رسائل کی نگرانی کرتے تھے ان کی تصحیح و درستگی کی فکر اور ان کے علمی معیار کی نگرانی کرتے تھے۔

حضرت مولانا مملوک العلی زندگی کے آخری لمحات تک کالج کے مدرس اعلیٰ اور اس

کے علمی سرپرست اور نگرانِ اعلیٰ رہے، جب مولانا کی (ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ میں) وفات ہوئی تو مولانا سید محمد مدرس اول اور مولانا سبحان بخش مدرس دوم بنائے گئے۔

حضرت مولانا مملوک العلی مدرس اعلیٰ، مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) کے ہمہ جہت سربراہ تھے کالج کا ہر اک کام مولانا کے مشورہ سے اور مولانا کی نگرانی میں ہوتا تھا، مولانا مملوک العلی کی وفات کے بعد مولانا کے اکثر معاملات اور شعبوں کی ذمہ داری مولانا سبحان بخش پر آگئی تھی۔

مولانا سبحان بخش نے کالج کی تصنیفی تحریک میں سرگرم حصہ لیا، مولانا کالج کے ایک ذیلی مگراہم شعبہ دہلی سوسائٹی (VERNACULAR TR.....) کے بھی روح رواں تھے، مولانا نے کالج کے شعبہ تصنیف و تالیف اور دہلی سوسائٹی دونوں کیلئے بھرپور علمی کام کیا، کئی کتابوں کے ترجمے کئے، خلاصے تیار کئے، نئی کتابیں بھی لکھیں، اگرچہ مولانا کی کتابوں کا کم تذکرہ ملتا ہے۔ تاہم جس قدر کتابوں یا ترجموں کا راقم سطور کو علم ہے ان کا آئندہ صفحات میں ذکر کیا جائے گا۔

مولانا کی تعلیمی اور تحریری وہ تصانیف اور ترجمے جو دہلی کالج کیلئے کئے | دونوں صلاحیتیں دہلی کالج

میں پہنچ کر کھلیں اور عام ہوئیں، نصاب کی کتابوں کے پڑھانے کی عمدہ لیاقت اور تعلیم کی قوت کی شہرت ہوئی، تصنیفی، قلمی، تحریری کام بھی وہیں شروع ہوئے اور عروج کو پہنچے۔ مولانا نے سب سے پہلے کیا کتاب لکھی تھی اور کس کتاب کا ترجمہ کیا تھا اس کی تحقیق نہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے تحریری کام جلد ہی شروع کر دیا ہوگا، جس کو دہلی کالج کی انتظامیہ کے اعتماد کی وجہ سے خاص طاقت اور پذیرائی حاصل ہوئی، مولانا نے کالج کے تصنیفی تحریری منصوبوں کو آگے بڑھانے اور پورا کرنے میں بڑی توجہ اور لگن سے بھرپور حصہ لیا۔

مولانا نے دہلی کالج یا دہلی سوسائٹی کے لئے کس قدر کتابیں لکھیں یا ترجمے کئے اور ان میں سے کون کون سی کتابیں یا ترجمے شائع ہوئے اور کالج کی مطبوعات میں شامل

مولانا کی پہلی تالیف یا ترجمہ کونسا ہے اس کا صحیح علم نہیں، مگر مولانا کی جس قدر تالیفات اور ترجموں کا راقم سطور کو سراغ ملا ہے، ان میں سب سے پہلی کاوش تاریخ ہند کے اردو ترجمہ میں مولانا کی شرکت ہے، اس کے علاوہ مولانا کے کئے ہوئے چار اور کتابوں کے ترجمے دہلی کالج سے چھپے تھے، یوں کالج سے مولانا کی کل پانچ کتابیں شائع ہوئیں جن کے نام یہ ہیں:

- (۱) ترجمہ تواریخ ہند  
(۲) ترجمہ تزک تیموری  
(۳) ترجمہ تذکرۃ العلماء  
(۴) ترجمہ تذکرۃ المفسرین  
(۵) ترجمہ وفيات الاعیان

(۱) ترجمہ تواریخ ہند | اردو ترجمہ میں مولانا کی دہلی کالج نے تاریخ ہند پر کم سے کم تین کتابیں چھاپی تھیں، جن میں سے ایک کتاب وہ ہے جس کا عموماً ترجمہ تاریخ ہند کے نام سے ذکر آتا ہے، یہ ایک بڑی کتاب ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے، اس کا کالج کے تین استادوں نے مل کر ترجمہ کیا تھا۔

پہلا حصہ جو ہندوستان میں ہندوؤں کے ابتدائی نظام حکومت اور ریاستوں کے عہد سے عہد مغلیہ تک کے احوال پر مشتمل ہے۔ یہ مارش مین (MARSHMAN) کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے، جو کالج میں انگریزی درجہ کے استاد ماسٹر نور محمد نے کیا تھا، دوسری جلد مغلوں کے عہد حکومت کی روداد ہے، یہ دو حصوں میں ہے، اسکے پہلے حصہ یا دفتر کا ترجمہ مولانا امام بخش صہبائی نے کیا تھا، دوسرے حصہ کو مولانا سبحان بخش نے اردو کا لباس پہنایا۔

تیسرے حصہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائے عملداری سے سنہ ۱۸۴۰ء تک کے حالات ہیں، یہ تینوں جلدیں (یا چاروں حصے) ایک جگہ چھپے تھے۔

شاید اسی وجہ سے اس کتاب یا ترجمہ کا مولانا امام بخش صہبائی اور مولانا سبحان بخش کی تالیفات و ترجموں اور دہلی کالج کی مطبوعات کی فہرستوں میں نام نہیں آیا، اس پہلو سے یہ کتاب ایک دریافت شمار کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کے ناشر نے کتاب کے تعارف میں

لکھا ہے کہ:

”تواریخ ہند مشتمل تین حصوں پر، حصہ اول تواریخ ہند، پہلے سے پہلے زمانہ ہندوں سے سلطنت مغلیہ تک، منشی نور محمد مدرس مدرسہ انگریزی نے مارش صاحب کی کتاب سے زبان اردو میں ترجمہ کیا۔ حصہ دوم خلاصہ سیر المتاخرین کا ابتدائے سلطنت تیموریہ سے محمد شاہ تک۔ پہلے دفتر کا ترجمہ مولوی امام بخش مدرس اول فارسی کالج نے مولوی عبدالکریم کے خلاصہ سے زبان اردو میں ترجمہ کیا، دوسرے دفتر کا ترجمہ مولوی سبحان بخش مدرس چہارم عربی نے کیا، تیسرے دفتر کا ترجمہ مولوی احمد علی مدرس سوم فارسی نے کیا۔“

حصہ سوم تواریخ بنگال، ابتدائے عملداری کمپنی سے سنہ ۱۸۴۱ء عیسوی تک منشی نور محمد مذکور صدر نے ترجمہ کیا۔

دہلی اردو اخبار پریس مکان مولوی محمد باقر گذر اعتقاد خان میں باہتمام پنڈت موتی لعل سنہ ۱۸۴۳ء

اس اندراج سے معلوم ہوا کہ دوسرے دفتر یا حصہ کا ترجمہ مولانا سبحان بخش نے کیا تھا، یہ حصہ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے، (صفحہ ایک سو چھیتر سے صفحہ تین سو چھیس تک) یہ حصہ یا دفتر ۳۲۶ صفحہ پر ختم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد تیسرے دفتر کا آغاز ہوا ہے۔

(۲) ترجمہ تزک تیموری | مشہور روزنامہ یا تاریخ ہے، ابوطالب خراسانی نے

ان یادداشتوں کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، پھر شاہ جہاں کے زمانہ (۱۰۴۷ھ، ۳۸-۱۶۳۷ء) میں محمد افضل بخاری نے اس کو دوبارہ مرتب کیا۔ ابوطالب خراسانی نے اس میں جو الحاق کر دیئے تھے، وہ نکال دیئے اور تیمور کی یادداشتوں میں سے جو یادداشتیں اس میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں ان کا اضافہ کیا، افضل بخاری کی اس فارسی کتاب کا مولانا سبحان بخش نے اردو ترجمہ کیا تھا۔

یہ ترجمہ غالباً سنہ ۱۸۴۵ء (۶۱-۱۲۶۰ھ) میں مکمل ہوا، اور اسی سال دہلی اردو اخبار



پریس سے پنڈت موتی لعل کے اہتمام سے شائع ہوا، یہ نسخہ آٹھ سو چوراسی صفحات پر مشتمل ہے، آخر میں دو صفحات کا غلط نامہ بھی ہے، اس اشاعت کے سرورق پر انگریزی اور اردو میں کتاب اور مترجم کا نام تحریر ہے۔ اردو میں مطبع وغیرہ کی تفصیل بھی موجود ہے، ملاحظہ ہو:

### ترجمہ توزک تیموری

ترجمہ اس کتاب کا اول سے آخر تک مولوی سبحان بخش مدرس سوم عربی مدرسہ نے سنہ ۱۸۴۵ء میں کیا۔

باہتمام پنڈت موتی لعل پرنٹر پبلشر، دہلی اردو اخبار افس مکان متعلقہ امام باڑہ موقوفہ مولوی باقر صاحب، واقع گذراعتقاد خاں میں چھاپہ ہوا سنہ ۱۸۴۵ء۔

(۳) نسخہ رہنما یعنی قانون مال کا اردو ترجمہ | قانون مال پر ایک اہم فارسی تالیف کا کالج نے

اردو ترجمہ کرایا تھا، یہ ضخیم کتاب تینتیس ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے پہلے نو ابواب کا ترجمہ مولانا سبحان بخش نے کیا، دسویں باب کا مولوی احمد علی (مدرس دہلی کالج) نے، گیارہ سے چودہ تک تین باب مولانا امام بخش صہبائی نے اردو میں منتقل کئے، پندرہ سے تیسویں باب تک میر سید محمد خوش نویس نے اور چوبیس سے آخر کتاب یعنی تینتیسویں باب تک کا ترجمہ مولوی حسن علی خان مدرس فارسی کا کیا ہوا ہے۔

یہ کتاب بڑے سائز کے ساڑھے پانچ سو (۵۴۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ دہلی اردو اخبار پریس دہلی سے سنہ ۱۸۴۶ء (۱۲۶۲ھ) میں شائع ہوئی تھی۔ اس ترجمہ یا کتاب کا مولوی عبدالحق نے ذکر نہیں کیا (۱) مگر مالک رام صاحب نے مختصر تعارف کرایا ہے۔ (۲)

(۱) ملاحظہ ہو مرحوم دہلی کالج سوسائٹی کے ترجموں اور تالیفات کی فہرست، مولوی عبدالحق ص ۱۳۹ تا ۱۴۵۔

(۱) انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۵ء

(۲) قدیم دلی کالج، مالک رام ص ۷۴ (مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۷۶ء)

(۶، ۵، ۴) ترجمہ تذکرۃ الحکماء، ترجمہ  
تذکرۃ المفسرین اور ترجمہ تذکرۃ الفقہاء  
یہ تینوں کتابیں دہلی کالج کے  
شعبہ تصنیف و ترجمہ کے منصوبہ  
تالیف و اشاعت کا ایک حصہ

تھیں، ان تینوں کا دہلی کالج کی مطبوعات کی فہرست میں علیحدہ علیحدہ ذکر آتا ہے۔ اور مولوی سبحان بخش کی علمی باقیات میں بھی تینوں کے نام شمار کئے جاتے ہیں، یہ تینوں ترجمے ایک ساتھ چھپے تھے۔ مترجم مولانا سبحان بخش نے تذکرۃ الحکماء اور تذکرۃ المفسرین کو (دنیاۓ اسلام کے نامور عالم اور مصنف) علامہ جلال الدین سیوطی (وفات ۹۱۰ھ) سے منسوب کیا ہے، یہ اطلاع تذکرۃ المفسرین کے لئے تو درست ہو سکتی ہے، علامہ سیوطی کی مؤلفات میں تذکرۃ المفسرین کا نام آتا ہے، مگر اس کے تعارف میں یہ بھی صراحت ہے کہ علامہ کی یہ تالیف نا تمام ہے، مکمل نہیں ہوئی تھی (۱) لیکن مولانا سبحان بخش کے اس ترجمہ کا ایک اہم اور قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ مولانا سبحان بخش کی صراحت کے مطابق مولانا نے علامہ سیوطی کے اصل نسخہ سے یہ ترجمہ کیا ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ:

”تمام ہوا یہ رسالہ جس قدر کہ مؤلف کے خط میں تھا“

اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو تذکرۃ المفسرین کے خطی نسخوں کی تکمیل میں مولانا سبحان بخش کے ترجمہ سے کسی قدر مدد ملنی چاہئے۔

لیکن تذکرۃ الحکماء کا علامہ سیوطی سے انتساب درست معلوم نہیں ہوتا، علامہ سیوطی کی تالیفات و مصنفات کی فہرستوں اور علامہ سیوطی کے تعارف اور تراجم میں بھی اس موضوع پر علامہ سیوطی کی کسی تالیف کا نام درج نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ابن القطفی کی کتاب (تاریخ الحکماء) کا خلاصہ ہو، مگر یہ خلاصہ بھی علامہ سیوطی کا نہیں ہے۔

یہ کتاب یا ترجمہ علامہ ابن خلکان (وفات ۶۸۱ھ، ۱۲۸۳ء) کی شہرہ آفاق تالیف

(۱) دلیل منخطوطات السیوطی واماکن وجودہا، احمد الخازندار، ص: ۲۳۹ (مکتبہ ابن تیمور، کویت: ۱۴۰۳ھ)  
مولانا شکار پوری کی ان تینوں ترجموں کا گارہاں دتاسی نے اپنے خطبات، ص: ۱۷۲، ۱۷۶، ۱۸۸ (اورنگ آباد: ۱۹۳۵ء)  
اور رسالہ تذکرات (ترجمہ منشی ذکاء اللہ مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی) ص: ۲۵ (دہلی: ۱۹۶۸ء) میں بھی ذکر کیا ہے۔

وفیات الاعیان کے ایک خلاصہ کا ترجمہ ہے، وفیات الاعیان ایک بڑی کتاب ہے، یہ ترجمہ وفیات الاعیان میں مذکور فقہاء کے حالات پر کسی مختصر ترین خلاصہ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے، مگر اس میں شبہ ہے کہ یہ علامہ سیوطی کی تالیف یا تلخیص ہو، اگرچہ علامہ سیوطی کی تالیف کی فہرستوں میں ”نثر الہمیان فی وفیات الاعیان“ کے نام سے ایک کتاب کا اندراج ہے (۱) مگر اس کی کسی اشاعت کا مجھے علم نہیں، اس کے قلمی نسخے بھی کم یاب ہیں، اس لئے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وفیات الاعیان کے کس خلاصہ کا ترجمہ ہے، اور یہ خلاصہ کس نے کیا تھا۔

تذکرۃ الحکماء اور خلاصہ وفیات الاعیان کے مؤلف جو بھی ہوں، تینوں کا مولانا سبحان بخش نے ترجمہ کیا تھا، یہ ترجمہ ایک مشترک کتاب کی صورت میں دہلی کالج کے پریس مطبع العلوم سے سنہ ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا، اس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

”ترجمہ تاریخ الحکماء اور تذکرۃ المفسرین مؤلفہ علامہ عبدالرحمان جلال الدین

سیوطی اور تذکرۃ الفقہاء خلاصہ وفیات الاعیان ابن خلکان کا، مولوی مولانا سبحان

بخش مدرس سوم، عربی مدرسہ دہلی میں چھپا سنہ ۱۸۴۸ء“

یہ مجموعہ تراجم و تالیفات تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ایک سو پینتیس حکماء اور طبیبوں کا تذکرہ ہے، جس کو تذکرۃ الحکماء کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ ترجمۃ الاسماء (یا تذکرۃ الفقہاء) از کتاب وفیات بن خلکان ہے۔

تیسرا حصہ ترجمۃ الاسماء طبقات مفسرین از علامہ حافظ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی شافعی۔

اس مجموعہ پر صفحات کا شمار مسلسل نہیں ہے، تینوں کتابوں کیلئے علیحدہ صفحات ڈالے گئے ہیں، پہلے حصہ میں ایک سو اٹھائیس صفحات، دوسرے میں ایک سو اہتر، تیسرے میں صرف چوالیس صفحات ہیں، پوری کتاب تین سو اکتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱) ملاحظہ ہو: کشف الظنون، امیر کاتب چلبی، کالم: ۱۹۲۸ء جلد ۲ (دارالمثنیٰ بغداد: بلاسنہ) اور دلیل مخطوطات

السیوطی واماکن وجودہا۔ احمد الخازندار، ص: ۲۳۳ شمارہ ۸۲۶ (بیروت: ۱۴۰۳ھ)

مرحوم دہلی کالج نے جو علمی تصنیفی کام کرائے تھے، اس کا اکثر حصہ چھپا نہیں اور جو چھپا ہے وہ ناپید اور مفقود ہے اور اس کی معتبر اور مکمل فہرست بھی

بیاگرافیکل ہسٹری کا ترجمہ

(مطبوعہ: ۱۸۴۸ء)

دریافت نہیں، اسلئے اس کا فیصلہ آسان نہیں کہ کالج کے لئے تصنیف و ترجمہ کا جو کام ہوا اس میں کس استاد کا کس قدر حصہ ہے، اور اس کی مکمل روداد کیا ہے۔ کالج کی مصنفات یا ترجموں کی جو فہرستیں مولوی عبدالحق یا مالک رام صاحب نے ذکر کی ہیں وہ نا تمام ہیں، اس میں بہت سی کتابوں کے مترجمین کے نام موجود نہیں، جن کتابوں پر مترجمین کے نام درج ہیں، ان میں سے بھی کئی ایک تحقیق طلب ہیں، دونوں فہرستوں پر اضافہ اور ترمیم ہر وقت متوقع ہے، ایسی کتابوں میں سے ایک کتاب جس کا مرحوم دہلی کالج اور قدیم دہلی کالج دونوں میں ذکر نہیں بیاگرافیکل ہسٹری (Biographical) کا اردو ترجمہ ہے، اس ترجمے کے متعلق کم معلومات ہیں، ڈاکٹر مرزا حامد صاحب نے سجاد مرزا دہلوی کی مرتبہ الفہرست (حیدرآباد دکن: ۱۹۳۳ء) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مولانا سبحان بخش نے اس

کتاب کا ترجمہ کیا تھا، جو دہلی سے سنہ ۱۸۴۸ء (۶۵-۱۲۶۴ھ) میں چھپا تھا۔ (۱)

دہلی کالج کی تالیفات و مطبوعات کی فہرست میں مولانا کی اور تالیفات یا ترجموں کا شامل ہونا غیر متوقع نہیں، مگر ان کا تذکرہ نہیں ملتا، اگرچہ مولانا کے کئے ہوئے ترجموں کی تاریخی حیثیت ہے اور اردو نثر کے ارتقاء میں مولانا کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، مگر یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ یہی چند تالیفات یا ترجمے مولانا کی یادگار ہیں، مولانا نے اس کے علاوہ بھی بڑے بڑے کام کئے، جن میں سے اکثر دینی موضوعات پر مشتمل ہیں، جس کا کچھ تذکرہ گذر گیا ہے۔

مولانا کی تصانیف میں سے ایک کتاب ایسی بھی ہے جو نہ دہلی کالج کی مطبوعات میں شامل ہے، نہ مولانا کی

مولانا کی ایک اور تالیف محاورات ہند

(مؤلفہ: ۱۳۰۴ھ، ۸۷-۱۸۸۶ء)

(۱) کتابیات تراجم، مرثیہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، ص: ۴۷ شمار نمبر ۸۳ (اسلام آباد: ۱۹۸۸ء)

دینی کتابوں کے ترجموں میں شمار کی جاسکتی ہے، اس کی وجہ تالیف دونوں سے مختلف ہے، مگر غلطی سے اس کا دہلی کالج کی تصانیف اور مطبوعات میں ذکر کیا جاتا ہے، یہ تالیف محاورات ہند ہے، مولوی عبدالحق اور متعدد اہل قلم نے اس کو دہلی کالج کے مؤلفات و مطبوعات میں ذکر کیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔

مولانا سبحان بخش نے یہ کتاب اس وقت مرتب کی تھی جب مولانا کو دہلی کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے برسوں گزر گئے تھے اس درمیان دہلی کالج بھی تحلیل کر دیا گیا تھا، اس کا کام اور تذکرہ تاریخ کا حصہ بن چکے تھے، مولانا سبحان بخش نے محاورات ہند کی تمہید میں اسکی وجہ اور سنہ تالیف کا ذکر کیا ہے، یہ اقتباس گذر چکا ہے، ایک مرتبہ اور پڑھ لیجئے:

”بندہ ہیچ میرز سبحان بخش ساکن قصبہ شکار پور ضلع مظفرنگر کہ غدر سے پہلے کالج دہلی میں مدرس دوم عربی اور بعد غدر کے پھر کالج دہلی میں مدرس عربی و فارسی وارد ہوا تھا اور اب پنشن دار ہے عرض کرتا ہے“

پھر اسی صفحہ میں چند سطروں بعد لکھتے ہیں کہ:

”اس خاکسار نے حسب تحریک مولوی حافظ محمد عبدالاحد مالک و مہتمم مطبع مجتبائی دہلی کے یہ خدمت اہل ملک کی اپنے اوپر واجب سمجھ کر ایک رسالہ محاورات و امثال کا مرتب کیا، اور ان کے معانی اور مراد بولنے کا محل بھی بیان کیا اور اس کا نام محاورات ہند رکھا“ (۱)

اس صراحت سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ محاورات ہند کی تالیف کا دہلی کالج سے کچھ تعلق نہیں، یہ کتاب مطبع مجتبائی دہلی کے مالک مولوی عبدالاحد کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں مؤلف نے اردو کے محاورات کا اچھا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، خصوصاً ان محاوروں کا جو مغربی یوپی اور دہلی میں بولے جاتے ہیں، مؤلف نے اپنے علاقہ یعنی ضلع مظفرنگر (مغربی یوپی) کے چند قصبوں میں جو چند محاورات ان قصابات کی نسبت سے زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں وہ بھی اس کتاب میں شامل کر لئے ہیں، جیسے ایک محاورہ لکھا ہے:

(۱) محاورات ہند، مولانا سبحان بخش شکار پوری، ص: ۲ (مکتبہ جامعہ دہلی: ۱۹۹۳ء)

”ڈنڈا سی پونچھ بڈھانہ کاراستہ“

ایک جگہ ہے:

”یا گورِ غریباں یارِ خست جھنجھانہ“

مرتب نے محاورہ کے مفہوم کی طرف اشارہ کر دیا ہے، کہیں کہیں کسی قدر وضاحت بھی کی ہے، یہ کتاب مولانا کی مشہور ترین مؤلفات میں سے ہے اور اسی کی وجہ سے آج تک مولانا کا نام زبانوں پر ہے، محاوراتِ ہند کی تالیف سنہ ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) میں شروع ہو کر سنہ ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۷ء) میں مکمل ہوئی، لطائف بے نظیر کے اعداد ۱۳۰۲ھ سے سنہ تالیف کا آغاز اور بیانِ ظرفاء ہند ۱۳۰۴ھ سے سنہ اختتام کا علم ہو جاتا ہے، محاورات تالیف کے فوراً بعد اسی سال مطبعِ مجتہائی سے پہلی بار شائع ہوئی۔ اسی مطبعِ مجتہائی سے دوسرا ایڈیشن بھی چھپا۔

دہلی کالج کے پریس میں حصہ داری | جب اسپرنگر (Sprengr) دہلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، تو اسپرنگر

نے کالج کے اور شعبوں کی توسیع و ترقی کے علاوہ کالج کے لئے ایک پریس کا بھی انتظام کیا اور اس پریس کو آسانی سے چلانے کیلئے اس کے حصص فروخت کئے، اسپرنگر کے اثرات اور پریس کے کاروبار سے نفع کی امید برآئی، دہلی کالج کے کئی استاد بھی پریس کے کاروبار کے حصہ دار (شیئر ہولڈر) ہو گئے تھے، جن میں مولانا سبحان بخش بھی شامل تھے، مگر سنہ ۱۸۴۸ء میں اسپرنگر کو مخطوطات اودھ کا جائزہ لینے اور ان کی فہرست بنانے کیلئے لکھنؤ بھیج دیا گیا، اسپرنگر اودھ کے مخطوطات کی ترتیب سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اس کو مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بنا کر کلکتہ جانے کا حکم ہوا، اس وقت کالج کے پریس پر بھی زوال آیا اس کی کتابوں کی فروخت کم ہو گئی، طباعت کا کام بھی متاثر ہوا، اس کو نقصان میں دیکھ کر پریس کے حصہ داروں نے اپنے اپنے حصے فروخت کرنے شروع کر دیئے، جن میں مولانا سبحان بخش بھی شامل تھے، مطبع کے مہتمم اشرف علی نے مطبع کے نقصان اور حصہ داروں کے اس معاملہ کا اسپرنگر کے نام اپنے ایک خط میں یوں ذکر کیا ہے:

”اور جناب عالی جس روز سے حضور یہاں سے تشریف لے گئے تو شرکائے مطبع نے مثل مولوی مملوک العلی مرحوم اور مولانا سبحان بخش اور مولوی امام بخش اور میر سید محمد خوشنویس اور اکثر طلبہ وغیرہ نے قریب پچاس حصوں کے بعض نے پورے پورے اور بعض نے کچھ کم پر بیچ دیئے، در صورت لا چاری واسطے جاری رکھنے چھاپہ خانہ کے اس نیاز مند نے قریب تیس حصوں کے اور قریب بیس حصوں کے لالہ رادھا کشن خراچی نے خرید لئے“ (۱)

اشرف علی نے پریس کے حصوں کی فروخت اور اپنی مشکلات کا مطبع کے باقی حصہ داروں کے نام اپنی ایک اپیل یا مفصل خط میں بھی ذکر کیا ہے، مگر یہ معلوم نہیں کہ مولانا سبحان بخش اور مطبع کے اور شرکاء کو اس پریس سے کتنی آمدنی تھی، اور کس قدر عرصہ تک اس میں حصہ داری رہی۔

مولانا سبحان بخش کا اسپرنگر کے نام ایک خط اسپرنگر کے ذاتی ذخیرہ سے ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی صاحب نے دریافت کیا ہے، مگر یہ خط (غالباً) اب تک شائع نہیں ہوا، افسوس ہے کہ مولانا سبحان بخش کی زندگی کی اور خدمات و مصروفیات اور آخر دور کی سرگرمیوں کا حال دریافت نہیں، یہ بھی معلوم نہیں کہ مولانا زندگی کے آخری ایام میں کہاں رہتے تھے، دہلی میں، اپنے وطن شکار پور میں یا کہیں اور، مولانا کی تاریخ وفات بھی معلوم نہیں اور یہ بھی اطلاع نہیں کہ وہ کہاں دفن کئے گئے، قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ مولانا سبحان بخش کی سنہ ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء) کے قریب وفات ہوئی ہوگی، اور اگر دہلی کالج میں تقرر کے وقت سنہ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۲ء) میں مولانا کی عمر پچیس سال رہی ہو تو سنہ ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء) میں اسی (۸۰) سال سے زائد ہونی چاہئے، اگرچہ معلومات کا فقدان ہے، مگر تاثر یہی ملتا ہے کہ مولانا نے آخر تک مصروف زندگی گزاری اور گراں قدر علمی سرمایہ اور تصنیفات اپنی یادگار چھوڑ گئے۔

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص: ۲۳

## [۳] مولانا نور الحسن کاندھلوی (۲)

کاندھلہ کے مشہور دینی علمی خاندان سے وابستہ تھے، سلسلہ نسب اس طرح ہے:

”مولانا نور الحسن بن مولانا ابوالحسن بن حضرت مفتی الہی بخش بن مولانا حکیم

محمد عرف شیخ الاسلام بن حکیم قطب الدین بن شیخ عبدالقادر“ (۱)

۲۶ ربیع الثانی ۱۲۲۷ھ (مئی ۱۸۱۲ء) کو پیدا ہوئے، محمد میاں نام رکھا گیا تھا مگر

والد کے نام کی مناسبت سے نور الحسن کے نام سے مشہور ہوئے۔

نہایت ذہین و فطین اور بچپن سے پاکیزہ اطوار اور نیک طبیعت تھے، سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ اس وقت سے تاحیات تلاوت کا معمول رہا۔ اپنے دادا اور نامور عالم حضرت مفتی الہی بخش سے فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ شافیہ تک درسی کتابیں گھر پر والد صاحب اور دادا سے مکمل کیں، مزید تعلیم کیلئے دہلی بھیج دیئے گئے، پرانے خاندانی روابط و تعلقات کی وجہ سے حضرت شاہ محمد اسحاق کے مدرسہ میں قیام رہتا تھا۔ دہلی میں کیا کیا کتابیں کن علماء اور استادوں سے پڑھیں اسکی تفصیل مجھے نہیں ملی۔

دہلی کالج میں تعلیم کا اعلیٰ درجہ کا انعام اور مولانا مملوک العلی سے تلمذ

مولانا ۱۲۳۵ھ (۱۸۲۹ء) میں دہلی کالج میں نور الانوار وغیرہ پڑھتے تھے، اس سال کالج کی عربی فارسی جماعتوں کا نتیجہ اعلیٰ درجہ کا نکلا تھا، جس سے کالج کے منتظمین، پرنسپل اور استادوں کو قدرتی طور پر بہت خوشی ہوئی۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ یہ سال کالج کے بڑے عروج کا سال تھا، امتحان کی کامیابی پر عام طور سے بڑی تعریف و تحسین ہوئی، سکریٹری صاحب اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ:

”جس قدر انعام ہم نے رکھے تھے اس سے زیادہ دینے پڑے“ (۲)

(۱) نسب نامہ کی تفصیل اور متعلقات کے تعارف کیلئے دیکھئے اشاعت خاص سہ ماہی احوال و آثار کاندھلہ بیاد مولانا

انعام الحسن ص: ۳۵ تا ۱۰۳ (کاندھلہ: ۱۹۹۷ء)

(۲) مرحوم دہلی کالج ص ۲۸



اس وقت کالج کے طلبہ اور اس امتحان میں مولانا نور الحسن بھی شامل تھے، مولانا کو اس موقع پر جو تعریفی انعامی سرٹیفکیٹ دیا گیا تھا وہ بفضلہ تعالیٰ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے، اس پر مولانا کا نام لکھا ہوا ہے، اور یہ فقرہ تحریر ہے:

”قد جوزی بهذا العطاء لحسن التحصیل فی نور الانوار“

اس توصیف نامہ پر..... کے دستخط ہیں اور ۳۰ جنوری ۱۸۲۹ء (۲۳ رجب ۱۲۴۴ھ) کی تاریخ درج ہے۔ اس توصیف نامہ سے مولانا نور الحسن کے کالج کے اعلیٰ درجہ کے عمدہ طالب علم ہونے کی تصدیق ہو رہی ہے اور اس اطلاع سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ مولانا، مولانا مملوک العلی کے بھی شاگرد تھے۔

اگرچہ مولانا نور الحسن کی جو تحریریں اور یادداشتیں میری نظر سے گذری ہیں ان میں اس کی صراحت نہیں کہ مولانا نور الحسن کو مولانا مملوک العلی سے بھی تلمذ تھا، مگر دہلی کالج کے درج بالا توصیف نامہ سے مولانا کے کالج میں نور الانوار پڑھنے کی تصدیق ہو رہی ہے۔

نور الانوار کا کالج کی متوسط درسیات میں شمار تھا جو اس وقت مولانا مملوک العلی پڑھاتے تھے، مولانا نور الحسن نے بھی مولانا مملوک العلی ہی سے پڑھی ہوگی، اسلئے مولانا نور الحسن کو مولانا مملوک العلی کے شاگردوں میں بلا ترد شامل کیا جانا چاہئے۔

مولانا مفتی صدر الدین آزر دہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے تلمذ

دہلی کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا مفتی صدر الدین آزر دہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے حلقہ تلامذہ میں شامل، اور مفتی صاحب کے شاگردوں میں داخل ہوئے اور طویل استفادہ کیا، اسکے لئے دہلی میں کب تک قیام رہا اسکی تفصیل معلوم نہیں، مگر ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱-۳۲ء) تک دہلی میں تھے۔ مولانا نور الحسن نے دہلی کے اسی زمانہ قیام میں ۱۲۴۷ھ میں حضرت شاہ محمد اسحاق سے پہلی مرتبہ بخاری شریف پڑھی تھی، جس کی مولانا کی تحریروں میں صراحت ہے۔

ممکن ہے کہ مولانا فضل حق سے بھی دہلی میں کچھ پڑھا ہو لیکن جب مولانا خیر آبادی

تخصیلاً رہ کر نکوڑ ضلع سہارنپور چلے گئے تو مولانا نور الحسن صاحب بھی سہارنپور پہنچ گئے تھے۔ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء) میں سہارنپور میں تھے اور مولانا خیر آبادی سے معقولات پڑھ رہے تھے، مولانا نور الحسن کی متعدد تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶-۳۷ء) تک نکوڑ میں تھے اس کے بعد وطن آ کر اپنے والد مولانا ابوالحسن سے بخاری شریف پڑھی، ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں دوبارہ دہلی چلے گئے، یہ سفر حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب سے حدیث شریف کی تکمیل کے لئے ہو رہا تھا، اس مرتبہ شاہ صاحب سے پہلے بخاری شریف پڑھی جو ذی قعدہ ۱۲۵۵ھ (جنوری ۱۸۴۰ء) میں شروع ہو کر ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۴ھ (اگست ۱۸۴۰ء) کو ختم ہوئی، پھر مسلم شریف وغیرہ حدیث کی اور اعلیٰ کتابیں شاہ صاحب کے درس میں پڑھیں، غالباً یہی مولانا نور الحسن کے تعلیمی سفر کا اختتام ہے۔

اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی آگرہ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر کر دیئے گئے، مولانا کی اس ملازمت اور اس عہدہ کے امتیاز کا سرسید احمد نے بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

”مولانا اس زمانہ میں آگرہ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے جب

ایسے کالجوں میں عربی کی اعلیٰ درجہ کی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی۔“ (۱)

تقریباً چار سال تک اس منصب پر کام کرتے رہے۔ اس ملازمت کے زمانہ میں سرسید احمد نے مولانا سے تعلیم حاصل کی، مولانا کا آگرہ اور نواح میں بڑا اعزاز و احترام تھا لیکن مولانا کو کالج کے سکریٹری کے متعصبانہ رویہ کا بہت احساس تھا، اسی وجہ سے کالج کی ملازمت سے استعفاء دے دیا۔

آگرہ سے آ کر ۵ محرم الحرام ۱۲۶۲ھ (۴ جنوری ۱۸۴۶ء) کو نکوڑ میں قائم مقام تخصیلاً مقرر ہوئے، دو سال بعد تخصیلاً رہ کر ۱۲۶۷ھ (اپریل

(۱) یہ الفاظ سرسید احمد نے مولانا علاء الحسن کاندھلوی کے سارٹیفکیٹ میں لکھے ہیں۔ یہ اصل سارٹیفکیٹ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

۱۸۵۱ء) میں اس ملازمت کو بھی چھوڑا۔ چند مہینے کاندھلہ میں رہے پھر الور کے مہاراجہ کی طلب پر الور چلے گئے تھے، ذی قعدہ ۱۲۶۷ھ (ستمبر ۱۸۵۱ء) میں الور پہنچے، یہ مولانا کی آخری اور معاشی لحاظ سے سب سے بہتر ملازمت تھی، الور میں سرکاری منصب و مصروفیات کے علاوہ بڑی مشغولیت درس و افادہ کی تھی، طلبہ کی ایک جماعت حاضر خدمت رہتی تھی، جس کے مصارف مولانا اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے۔

اس دوران مولانا نور الحسن کی کوشش سے مولانا فضل حق خیر آبادی بھی الور آگئے تھے۔ مولانا نور الحسن نے جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ (جنوری ۱۸۶۰ء) میں الور کو بھی خیر باد کہا اور وطن آگئے، وطن میں تمام اوقات درس و تعلیم کی نذر فرمادیئے، ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے جید طالب علموں کی بڑی بڑی جماعتیں مولانا کی خدمت میں حاضر رہتی تھیں اور حسب صلاحیت حصول تعلیم و استفادہ کرتی تھیں۔

چند شاگرد | مولانا نور الحسن نے تقریباً تیس سال تک درس و تعلیم کی خدمت کی مگر افسوس کہ مولانا کے صرف چند شاگردوں کے نام ملتے ہیں، جو یہ ہیں:

۱۔ مولانا محمد احسن مراد آبادی وفات ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱-۷۲ء)

۲۔ مولانا مفتی ریاض الدین کاکوری وفات ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء)

۳۔ مولانا لطف علی راج گیری وفات ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء)

۴۔ مولانا عبداللہ بلگرامی وفات ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۷-۸۸ء)

۵۔ مولانا عبدالحق بن فضل حق خیر آبادی وفات ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰-۱ء)

۶۔ مولانا شیخ محمد بن غلام رسول سورتی وفات ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۶-۷ء)

۷۔ مولانا عبداللہ بایزید پوری وفات ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۹-۲۰ء)

۸۔ مولانا محمد حسین بٹالوی وفات ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹-۲۰ء)

۹۔ مولانا سید محمد تقی نصیر آبادی

۱۰۔ مولانا عبدالرحمان کلیانوی حج ریاست اودے پور

۱۱۔ مولانا ابراہیم انصاری کیرانوی

۱۲۔ سرسید احمد

سرسید احمد نے مولانا سے باقاعدہ پڑھا اور مسلسل استفادہ کیا ہے، سرسید احمد نے اپنی تالیفات میں مولانا سے تلمذ و استفادہ کا اعتراف کیا ہے اور آثار الصنادید میں بھی مولانا نور الحسن کا تذکرہ لکھا ہے جس کا اختتام ان الفاظ پر ہوا ہے:

”راقم آثم کے حال پر ان حضرات کی نگاہ توجہ کو اب مصروف کر دیا ہے کہ بدرجہ غایت نظر تربیت استادانہ سے منظور فرماویں تا کہ شاید یہی نظر عنایت بارگاہ کریم میں اس احقر کی نجات کا سبب ہو جائے، کوتاہ شب و فسانہ بسیار، زبان قلم قاصر ہے کہاں تک کہے..... (۱)

**تالیفات** | مولانا کی صرف چار تالیفات کا تذکرہ ملتا ہے جو یہ ہیں:

۱۔ حاشیہ ہدایہ اولین

۲۔ تاریخ ریاست الوری (بے نقط الفاظ میں)

۳۔ رسالہ فرائض (میراث)

۴۔ انتخاب احادیث استبصار تالیف مولانا آل حسن موہانی (۲)

یہ چاروں کتابیں عربی میں ہیں، حاشیہ ہدایہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے اور کتابوں کے مکمل نسخے دریافت نہیں۔

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی نے حاشیہ دیوان متنبی اور مائتہ مسائل حضرت شاہ محمد اسحاق کا بھی بعض روایتوں کی وجہ سے مولانا نور الحسن سے انتساب کیا ہے، مگر یہ اطلاع صحیح نہیں ہے۔ (۳)

(۱) آثار الصنادید ص: ۷۰ باب چہارم لکھنؤ۔ (اکتوبر ۱۹۰۰ء)

(۲) مفصل حالات کیلئے دیکھئے، حضرت مولانا انعام الحسن نمبر (مجلہ احوال و آثار)

مرتبہ نور الحسن راشد، (کاندھلہ) لاہور: ۱۹۹۸ء

(۳) تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون باقیات آزرده مجلہ غالب نامہ دہلی (جنوری ۱۹۸۳ء) ص: ۲۱۲-۲۱۳

**وفات** مولانا نور الحسن کی تقریباً اٹھاون سال کی عمر میں ۱۱ محرم الحرام ۱۲۸۵ھ (مئی ۱۸۶۸ء) کو کاندھلہ میں وفات ہوئی۔ خاندانی قبرستان میں جو موجودہ عید گاہ سے ملحق ہے دفن کئے گئے۔

## [۴] مولانا شیخ محمد تھانوی (۳)

تھانہ بھون ایک پرانی بستی ہے، جس میں ایک فاروقی خانوادہ اکبر کے زمانہ حکومت میں تھانیر (پنجاب) سے آکر آباد ہوا تھا، اس خاندان میں علم کی روایت بہت مضبوط اور تابندہ تھی، اس کی مختلف شاخوں میں کئی بڑے عالم اور کالمین پیدا ہوئے، اسی خاندان کی ایک شاخ سے مولانا شیخ محمد بھی وابستہ تھے۔ مولانا کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

”مولانا محمد بن شیخ حمد اللہ بن حکیم محمد بخش بن قاضی محمد رحم بن حافظ اعظم“ (۱)

مولانا شیخ حمد اللہ فاضل اور باصلاحیت شخص تھے، سرکاری ملازم تھے، مولوی عبدالقادر

چیف رامپوری نے مولوی حمد اللہ سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ (۲)

مولانا شیخ محمد کی ۲۰ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) کو ولادت ہوئی۔ مولانا شیخ

حمد اللہ کے اکلوتے بیٹے تھے، پانچ سال کی عمر تھی کہ والدہ رحلت کر گئیں اور دس سال کی عمر

میں والد کے سایہ سے محروم ہو گئے تھے مگر خاندان کے افراد نے مولانا کی تعلیم و تربیت

کر کے اس محرومی کی تلافی کرنیکی کوشش کی۔ مولانا نے دس سال کی عمر میں قرآن شریف

حفظ کر لیا تھا، اسکے بعد فارسی شروع ہوئی، مقامی علماء مولانا عبدالرحیم تھانوی اور مولانا سید

محمد قلندر جلال آبادی سے عربی فارسی کی درسیات پڑھیں، (۳) شیخ محمد نے لکھا ہے:

”قد سمعت من استاذی مولانا محمد قلندر الجلال آبادی

بحوالہ شیخی و استاذہ المولوی الہی بخش الکاندھلوی

(۱) تحقیق وحدۃ الوجود والشہود مع حالات مولانا شیخ محمد تھانوی مرتبہ ثناء الحق ص: ۱۷

(۲) علم و عمل ترجمہ وقائع عبدالقادر خانی مرتبہ ایوب قادری۔ ص: ۳۳۳ جلد اول (کراچی: ۱۹۷۰ء)

(۳) نثر محمدیہ مولفہ حکیم محمد عمر چر تھانوی ص: ۵ (مولفہ ۱۲۹۷ء) (مطبع عثمانی میرٹھ بلاسنہ)

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں:

وقد سمعت شیخی و استاذی مولانا محمد اسحاق قدس سرہ

و مولانا عبد الرحیم الفقیہ التھانوی..“

بظاہر مولانا شیخ محمد نوجوانی میں اعلیٰ تعلیم کیلئے دہلی بھیج دیئے گئے تھے۔ دہلی کب پہنچے اس کی صراحت مجھے نہیں ملی لیکن مولانا نے جامع مسجد دہلی میں مختلف مؤذنون کی موجودگی اور اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں سنہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) میں دہلی میں موجود تھا۔ (۱)

اس وقت مولانا کی عمر صرف دس سال تھی، اس لئے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اس کم سنی میں یہ سفر تعلیم کے لئے ہوا ہوگا، مگر اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا نوعمری سے دہلی کے علماء اور علمی حلقوں سے کچھ واقف تھے، اسلئے جب ابتدائی یا متوسطات کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو اپنے علاقہ کے باذوق اور مستعد طلبہ کی طرح مزید تعلیم کیلئے دہلی پہنچے، دہلی کے نامور علماء کی مجلسوں میں حاضر ہو کر سیراب ہوئے اور مرتبہ کمال حاصل کیا۔

مولانا نے دہلی میں جن علماء سے پڑھا، ان میں حضرت مولانا مملوک العلی، مولانا فضل حق خیر آبادی اور حضرت شاہ محمد اسحاق کے نام ممتاز اور سرفہرست ہیں مگر مولانا نے ان کے علاوہ اور علماء سے بھی استفادہ کیا ہے، مولانا کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سبحان بخش شکار پوری، مولانا عبد الرزاق بانپتی اور مولوی نصیر الدین سونی پتی دہلوی بھی مولانا کے استادوں میں ہیں۔

مذکورہ استادوں میں سے کس سے کیا کیا پڑھنے کی توفیق ملی، اس کی تفصیل دریافت نہیں، تاہم اس تلمذ کی مولانا کی ایک تحریر سے اجمالاً تصدیق ہو رہی ہے، مولانا نے اپنی کتاب دلائل الاذکار فی اثبات الجہر و الاسرار میں لکھا ہے کہ:

”واما اکتساب علوم ظاہری نقلی از پیش خدمت استاد وقت مسند آفاق مولانا و بفضل اولانا حضرت الحاج مہاجر محمد اسحاق الحمد ث الشاہ جہاں آبادی نبیرہ حضرت

(۱) افادات سنن نسائی، حاشیہ باب ہل یوزنان جمیعاً وفرادی مشمولہ آخر سنن نسائی۔ ص: ۳۸۱ جلد اول (مجتبائی دہلی ۱۳۱۶ھ)

مولانا شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ الحمد و جین است۔

امادرفن معقول ہم ازیں خاندان عالیشان بذریعہ مولانا الحاج المدرس مولوی مملوک العلی نانوتوی مرحوم و مولانا الحاج مولانا قلندر جلال آبادی مغفور وغیرہ وہم از خاندان بحر العلوم مولانا عبد العلی قدس اسرار ہم، بوساطت عنایت افضل الفضلاء النبلاء موجد المعقول مزین المنقول حافظ مولانا محمد فضل حق خیر آبادی مدظلہ العالی“ (۱)

مولانا شاہ محمد نے مولانا مملوک العلی سے کیا کیا پڑھا دیگر معلومات کی طرح اس کی تفصیل بھی موجودہ مآخذ میں دستیاب نہیں ہے، مگر مولانا شاہ

مولانا مملوک العلی سے تلمذ اور دہلی کالج میں تعلیم

محمد نے مولانا سبحان بخش شکار پوری کو بھی اپنا استاد لکھا ہے، اس لئے یہ خیال شاید غلط نہ ہوگا کہ مولانا شاہ محمد نے دہلی کالج میں بھی تعلیم پائی ہے جس میں مولانا مملوک العلی مدرس اول اور مولانا سبحان بخش مدرس سوم تھے، یہ تعلیم کب ہوئی اس کے سنہ کا تذکرہ نہیں ملتا مگر یہ واقعہ ۱۲۲۵ھ اور ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۵ء-۱۸۲۹ء) کے درمیان کا ہو سکتا ہے۔

حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں آخر میں سند الحمد ثین حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں حاضر ہوئے،

حدیث پڑھی اور سند و اجازت حاصل کی۔ مولانا نے حضرت شاہ صاحب سے کیا کیا پڑھا اسکی تفصیل بھی مفقود ہے مگر مولانا کی سند حدیث حضرت شاہ محمد اسحاق کے واسطے سے ہے۔ مولانا شاہ محمد نے حاشیہ سنن نسائی میں ایک جگہ ضمناً صراحت کی ہے کہ مجھے حضرت شاہ صاحب سے صحاح ستہ کی اجازت ہے۔

مولانا کو حضرت شاہ صاحب سے بہت عقیدت و محبت تھی، جو مولانا کی تحریروں سے جھلکتی ہے، مولانا نے شاہ صاحب کے درسی افادات قلم بند کئے تھے، اور نسائی کے حاشیہ میں بھی حضرت شاہ صاحب کے افادات کثرت سے نقل کئے ہیں۔

(۱) دلائل الانکار فی اثبات الجہر والاسرار: ص: ۳۷ (مطبوعہ نثر الطابع دہلی: ۱۲۷۰ھ)

حضرت شاہ صاحب کی مولانا پر خاص شفقت و عنایت کی نظر تھی، شاہ صاحب چاہتے تھے کہ اپنی صاحبزادی کا نکاح مولانا شیخ محمد سے کر دیں، مگر شیخ محمد کی والدہ اس پر تیار نہ ہوئیں اس لئے یہ رشتہ نہ ہو سکا۔

تعلیم کے بعد مولانا کی مصروفیات کی تفصیل موجود نہیں کہ کیا مشاغل رہے اور کہاں قیام تھا، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون میں تھے، مگر اس وقت انگریز کے خلاف جدوجہد سے متفق نہیں تھے، ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں تھانہ بھون کے اجرٹ جانے کے بعد رام پور منہیاران ضلع سہارنپور چلے گئے تھے، کئی سال وہیں رہے، جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو رام پور سے نکلے، کچھ دن میرٹھ میں قیام کیا پھر نوب ٹونک کی طلب پر ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱-۶۲ء) میں ٹونک چلے گئے۔ ۱۲۸۳ھ تک ٹونک میں قیام ہوا، ٹونک سے واپسی کے بعد زیادہ وقت وطن میں گزارا، وہیں وفات ہوئی۔

سفر سلوک و معرفت | مولانا شیخ محمد کو زمانہ طالب علمی سے سیر سلوک کا شوق تھا اس لئے سب سے پہلے مولانا نصیر الدین سونی پتی دہلوی

(جو شیخ محمد کے استاذ بھی تھے) سے بیعت ہوئے، استفادہ کیا، اس کے بعد حضرت میاں جیونور محمد جھنجھانوی کے زمرہ خدام میں داخل ہوئے، آخر میں حضرت شاہ محمد اسحاق کے بھائی شاہ محمد یعقوب کا دامن پکڑا، مولانا نصیر الدین سے کب بیعت ہوئے تھے اور کس قدر وقت مولانا کی تربیت میں گذرا اس کی صراحت نہیں ملی، مگر حضرت میاں جیونور محمد کی خدمت میں کم وقت گذرا، کیوں کہ (۱۲۵۶ھ) تک مولانا نصیر الدین حیات تھے، ان کی وفات کے بعد ہی میاں جیو صاحب سے وابستہ ہوئے ہوں گے اور رمضان المبارک یا شوال ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں میاں جیو بھی رحلت فرما گئے تھے (۱) اس لئے خیال یہ ہے کہ مولانا کو میاں جیو صاحب سے استفادہ کا زیادہ موقع نہیں ملا لیکن آخر میں میاں جیو نے اجازت و خلافت سے نوازا دیا تھا۔

میاں جیو کی وفات کے بعد میاں جیو صاحب کی ہدایت کے مطابق میاں جیو کے خلیفہ اول

(۱) بیاض دلکش مولانا نصر اللہ خویشگی۔ ص: ۵۹ (مطبع فتح الاخبار کول: ۱۲۶۸ھ؟)



حافظ محمد ضامن شہید سے استفادہ کیا (۱) سفر حج کے وقت حضرت شاہ محمد یعقوب کی خدمت میں حاضر رہ کر سلسلہ نقشبندیہ کا فیض حاصل کیا اور اس سلسلہ میں اجازت پائی۔ مولانا شیخ محمد کے کئی خلفاء تھے، جن میں قاضی محمد اسماعیل منگلوری کو بہت شہرت ہوئی، ایک اور مجاز بیعت مولانا حکیم محمد عمر چرتھاؤلی تھے، حکیم صاحب نے مولانا شیخ محمد کی تالیفات خصوصاً دفتر ہفتم مثنوی مولانا روم کی طباعت کا اہتمام کیا اور مولانا کے حالات پر نثر محمدیہ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

**تصانیف** | مولانا شیخ محمد نے مختلف موضوعات پر تقریباً تیس کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر شائع نہیں ہوئیں، دس بارہ کتابیں چھپی ہیں، مگر اب ان میں سے بھی اکثر معدوم و مفقود ہیں، اور ان کے قلمی نسخے بھی کم یاب ہیں۔ یہ کتابیں نہ ملنے کی وجہ سے تذکرہ نگاروں نے ان کتابوں کے متعلق کچھ باتیں ایسی لکھ دی ہیں جو بے حقیقت اور ناقابل تسلیم ہیں، یہاں تفصیلات کی گنجائش نہیں۔

مولانا کی جو تالیفات معلوم ہیں ان کے نام ذیل میں تحریر ہیں، جن سے مولانا کے ذوق و مزاج اور تالیفات کے مضامین کا اندازہ ہو جاتا ہے:

- (۱) رسالہ گل لالہ یعنی تنقیہ الاعتقاد مؤلفہ (۱۲۵۹ھ)
- (۲) رسالہ وحدۃ الوجود والشہود (۱۲۶۳ھ) ❖
- (۳) دلائل الاذکار فی اثبات الجہر والاسرار (۱۲۷۰ھ) ❖
- (۴) سلک التتبیح فی اثبات جواز التسبیح (۱۲۷۰ھ) ❖
- (۵) مثنوی دفتر ہفتم (۱۲۷۶ھ) ❖
- (۶) شرح حزب البحر (۱۲۷۷ھ)
- (۷) ارشاد محمدی (۱۲۷۷ھ) ❖
- (۸) انوار محمدی (۱۲۹۱ھ) ❖
- (۹) قسطاس فی موازنۃ اثر ابن عباسؓ (۱۲۹۳ھ) ❖

(۱) ارشاد محمدی، مولانا شیخ محمد تھانوی۔ ص: ۱۶ (مطبع دارالعلوم میرٹھ)

- (۱۰) حاشیہ سنن نسائی (۱۲۹۶ھ) ❖  
 (۱۱) حاشیہ شرح عقاید نسفی  
 (۱۲) مناظرہ محمدیہ ❖  
 (۱۳) تصفیۃ الفواد من الکفر والارتداد  
 (۱۴) بیاض عملیات (بیاض محمدی) ❖  
 (۱۵) تاریخ تھانہ بھون ❖  
 (۱۶) آداب الطالین (قلمی نسخہ) (۱)

**وفات** | مولانا شیخ محمد اپنی آخری تالیف حاشیہ سنن نسائی کی ترتیب میں مشغول تھے اسی دوران لرزہ اور بخار کی شکایت محسوس ہوئی، اس سے افاقہ ہوا تو رمضان المبارک شروع ہو گیا، رمضان میں قرآن مجید سنایا اور فرمایا آئندہ سال ماہِ صیام تک حیات مقدر نہیں، یہی ہوا۔

رمضان کے بعد طبیعت کچھ سنبھلی تو نسائی کے حاشیہ کو تیزی سے مکمل کیا، اس کے بعد ریاست چھتاری اور میرٹھ کا سفر کیا، اس سفر میں مرض کا دوبارہ حملہ ہوا اور وہی مرض الموت بن گیا، لمبی بیماری کے بعد ۷ ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ (یکم اپریل ۱۸۷۹ء) کو تھانہ بھون میں وفات ہوئی، وہیں دفن کئے گئے۔ (۲)

(۱) اس فہرست کی جن کتابوں پر (❖) کا نشان لگا ہوا ہے ان کا ایک ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے، آخر الذکر آداب الطالین کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کے ذخیرہ میں تھا۔  
 (۲) مزید معلومات کے لئے دیکھئے حالات نثر محمدیہ از حکیم محمد عمر چر تھا ولی۔ مقدمہ تحقیق وحدۃ الوجود والشہود۔ ثناء اللہ صدیقی۔ ص: ۱۶ تا ۱۰۷ (کراچی)

## [۵] حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (۴)

**خاندان و نسب** | سہارنپور میں ایک قدیم انصاری خاندان جو حضرت ابویوب انصاریؓ کی اولاد میں سے ہے، صدیوں سے آباد ہے۔ اس خانوادہ میں کئی بڑے علماء اور مشائخ پیدا ہوئے جن میں سے ایک شیخ ابوسعید شیخ چوہر تھے، جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی (وفات ۹۲۵ھ) کے خلیفہ اور مکتوب الیہ تھے۔ (۱) شیخ ابوسعید کے اخلاف میں سے شیخ لطف اللہ عرف پیرنٹھو سہارنپور کے معزز اشخاص میں تھے، ان کے کئی بیٹے تھے، جن میں ایک مولانا احمد علی محدث سہارنپوری بھی ہیں۔ حضرت مولانا کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

”حضرت مولانا احمد علی، بن شیخ لطف اللہ معروف بہ پیرنٹھو، بن شیخ محمد جمیل معروف بہ شیخ چوہر، بن محمد خلیل، بن شیخ احمد، بن شیخ بدرالدین، بن شیخ صدرالدین، بن شیخ الاسلام شیخ ابوسعید معروف بہ شیخ چوہر انصاری۔“ (۲)

**ولادت** | صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں، تقریباً سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں ولادت ہوئی ہوگی۔

مولانا ابتدائے عمر میں تعلیم کی طرف متوجہ نہیں تھے، سولہ سترہ سال کی عمر میں تعلیم کی ابتداء کی، قرآن شریف حفظ کیا اور مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان کاندھلوی کی اطلاع کے مطابق:

”ان حضرت نے اخیر عمر مفتی صاحب میں تحصیل شروع کی اور حیات حضرت مفتی صاحب مرحوم میں ان فراغ تحصیل علوم سے حاصل نہیں ہوا تھا اتمام علوم کا حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب سے فرمایا ہے۔“ (۳)

(۱) مکتوبات قدوسیہ۔ ص: ۶۰ (دہلی: ۱۲۹۷ھ)

(۲) سراج النسب

(۳) حالات مفتی الہی بخش، مکتوبہ و مولفہ مولانا ریاض الحسن کاندھلوی، متونی: ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۸ء

مفتی صاحب سے استفادہ کے بعد دہلی گئے، دہلی میں مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کرتے رہے، دہلی کب جانا ہوا اسکی تاریخ نہیں ملی مگر جب حضرت حاجی امداد اللہ سنہ ۵۰-۱۲۲۹ھ (۱۸۳۳-۱۸۳۵ء)

دہلی کا تعلیمی سفر اور مولانا مملوک العلی سے تلمذ

میں پڑھنے کیلئے دہلی گئے اس وقت حضرت مولانا احمد علی مولانا مملوک العلی کی خدمت میں موجود تھے، حضرت مولانا نانوتوی نے حضرت حاجی صاحب کا گلستاں کا سبق حضرت مولانا احمد علی کے سپرد فرمایا تھا۔ (۱)

اساتذہ | مولانا احمد علی نے چند کتابیں مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوری سے پڑھیں، اور صحیح بخاری کا اکثر حصہ مولانا وجیہ الدین صدیقی محشی سہارنپوری سے، دوبارہ حدیث کی سب کتابیں اور صحاح ستہ حضرت شاہ محمد اسحاق سے دہلی اور مکہ معظمہ میں مکمل پڑھیں۔ مکہ معظمہ کے سفر میں مولانا احمد علی حضرت مولانا مملوک العلی کے ساتھ تھے (اس کی تفصیلات اپنے موقع پر گذر چکی ہیں) مولانا نے ایک سال سے زائد حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں گزارا، شاہ صاحب کی مجلس درس میں صحاح ستہ کی تکمیل کی، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بعض حصہ کی قراءت اور بعض کی سماعت کی، سنن ترمذی کی تمام قراءت خود ہی کی۔ صحاح ستہ کی تکمیل کے بعد استاد عالی مقام نے خدمت حدیث کی وصیت فرمائی اور سند عطاء کی۔

دہلی میں قیام | حجاز سے واپسی کے بعد دہلی میں قیام کیا اور حدیث شریف کی اہم ترین بنیادی کتابوں کو صحت اور مفصل حاشیوں کے ساتھ شائع کرنے کا ایک لمبا منصوبہ شروع کیا، اور ساتھ ہی ایک مطبع بھی شروع کر دیا جو مولانا اور دوسرے مصنفین کی نیز درسی کتابیں تصحیح کے اہتمام اور عمدگی کے ساتھ چھاپتا تھا، اس تجارتی ادارہ پر پریس کا نام مطبع احمدی تھا۔

(۲) شہانم امدادیہ (ملفوظات حضرت حاجی امداد اللہ) ص: ۲۱۷-۲۱۸ (لکھنؤ: ۱۳۱۲ھ)  
نیز امداد المشاق مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ص: ۱۹۶-۱۹۷ (تھانہ بھون: طبع اول)

مطبع احمدی اور اس کی خدمات

مطبع احمدی نے ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت اور ہر موضوع اور فن کی اعلیٰ درجہ

کی کتابوں کے اعلیٰ ترین ایڈیشن چھاپنے کا بڑے پیمانے پر کام کیا، جس کا بے حد فائدہ ہوا اور علمی دینی ادبی کتابوں کے ایسے قابل اعتماد نسخے شائع کئے جو اہل علم اور ناشرین کے لئے نمونہ اور مثال بن گئے، خصوصاً درسیات، قرآن کریم اور مختلف مضامین و مباحث پر ایسی ایسی کتابیں چھاپیں کہ ان میں بعض کے عکس آج تک چھپ رہے ہیں۔

اس مطبع نے سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) سے سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ تک مسلسل کام کیا،

اس ہنگامہ میں جب پورا ملک اور پوری دہلی زیرِ وزر ہو گئی، تو یہ پریس کیسے باقی رہتا، یہ پریس بھی ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی حضرت مولانا کا تصنیفی و اشاعتی منصوبہ بھی بند ہو گیا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب حالات کچھ درست ہوئے تو مولانا نے اپنے اس مطبع کو اسی پرانے نام سے میرٹھ شہر میں دوبارہ شروع کیا، جس نے صحیح بخاری کا حضرت مولانا احمد علی کا مرتب کیا ہوا نسخہ اور متعدد کتابیں مکرر شائع کیں مگر مطبع احمدی کی اس دور کی مطبوعات میں وہ بات نہیں جو احمدی دہلی کی مطبوعات میں تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد سہارنپور و میرٹھ میں قیام

دہلی میں مطبع ختم ہونے کے بعد تقریباً دو سال تک وطن

سہانپور میں قیام کیا، اس کے بعد شیخ الہی بخش (لال کرتی میرٹھ) کے یہاں ملازم ہو گئے، شیخ الہی بخش اور ان کے بھائی عبدالکریم بڑے تاجر اور ٹھیکیدار تھے، پشاور سے کلکتہ تک انگریزی فوج کی چھاؤنیوں کو ضروری سامان پہنچانے کا ٹھیکہ ان دونوں کے پاس تھا، شیخ صاحب نے حضرت مولانا کو اپنے کلکتہ کے تجارتی دفتر کا نگران مقرر کر دیا تھا، اس ملازمت کی وجہ سے تقریباً دس سال تک مولانا کا کلکتہ میں قیام رہا۔

اس ملازمت کو دس بارہ سال ہو گئے تھے کہ حضرت مولانا حاجی عبدالکریم کے ساتھ حج کے لئے گئے، اس وقت حضرت

کلکتہ سے ترکِ ملازمت اور سہارنپور میں تدریسی خدمات

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مکہ معظمہ میں قیام فرماتے تھے، دونوں کی حضرت حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی تو حاجی صاحب نے حضرت مولانا سے فرمایا کہ:

”مولانا مملوک العلی صاحب نے میرا سبق گلستاں آپ کے سپرد کیا تھا اس وجہ سے آپ میرے استاد ہیں، مگر میں ایک بات عرض کروں گا اگر ناگوار نہ ہو، انہوں نے فرمایا کہ میں آپ کو اپنا بزرگ جانتا ہوں جو کچھ فرمائیے بسر و چشم منظور ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا یہ منصب نہیں ہے کہ حافظ عبدالکریم آپ کو کام کا حکم دیں بلکہ ان کو آپ کا محکوم ہونا چاہئے، لیکن نوکری میں بجز محکومی چارہ نہیں، اب آپ اپنے مکان پر درس حدیث نبویہ ﷺ کا فرمایا کریں تاکہ خلق کو فیض ہو، مولانا نے قبول کر کے فرمایا آپ حرم میں میرے لئے دعاء کریں“ (۱)

حضرت مولانا نے حاجی صاحب سے فرمایا تھا کہ:

”میں آپ کو اپنا بزرگ جانتا ہوں جو فرمائیے بسر و چشم منظور ہے“

اس لئے حج سے واپسی کے بعد حضرت حاجی صاحب کے مشورہ کے مطابق کلکتہ کی ملازمت چھوڑ کر سنہ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں سہارنپور واپس آگئے، اس سے آٹھ سال پہلے سہارنپور میں ایک دینی مدرسہ کی ابتداء ہو چکی تھی، جس کا حضرت مولانا نے مظاہر علوم نام تجویز کیا تھا۔ سہارن پور آ کر اس مدرسہ میں حدیث شریف کا درس شروع کیا، جس نے حضرت حاجی صاحب کے الفاظ میں:

”صد ہا طلبہ کو محدث بنا دیا۔“

سہارنپور آنے کے بعد پہلے گھر پر درس حدیث جاری کیا، مدرسہ مظاہر العلوم کی سنہ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴-۷۵ء) کی روداد میں لکھا ہے کہ:

”طالب علموں اور علوم دینیہ کے شائقین کو مژدہ ہو کہ امسال مولوی احمد علی صاحب مد فیوضہ کلکتہ سے ترک تعلق کر کے سہارنپور میں مقیم ہیں، غرض اصلی یہی ہے کہ جس قدر بن پڑے علوم دینی کے پڑھانے میں اوقات صرف کیجئے۔“

(۱) شائم امدادیہ (ملفوظات حضرت حاجی امداد اللہ) ص: ۲۱۷-۲۱۸

ساقیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تک بس چل سکے ساغر چلے  
چنانچہ طالبان علم حدیث مسافت بعیدہ سے یہ مژدہ سن کر فراہم ہو گئے اور کچھ  
مدرسہ کے طالب علم بھی ان سے پڑھتے ہیں۔ اکثر روز درس و تدریس میں  
گزرتا ہے۔ بلکہ رات کو بھی بعض طالب پڑھتے ہیں اور ان کے سہارنپور کے قیام  
سے کتابوں کی مدد بھی طالب علموں کو بہت ملتی ہے۔“

”امد اللہ فیضہ و افاض علی العالمین برکتہ“ (۱)

ایک سال تک گھردار العلوم بنا رہا، سنہ ۱۲۹۲ھ سے مدرسہ مظاہر علوم میں حدیث کے  
سبق شروع کئے جو حضرت مولانا کے مرض و وفات تک جاری رہے۔ مدرسہ کے علاوہ گھر پر  
بھی سبق ہوتے تھے، فجر کی نماز سے عشاء کے بعد تک سبق جاری رہتے تھے، کوئی وقت  
فارغ نہیں تھا، گھر سے مدرسہ جاتے ہوئے اور مدرسہ سے گھر آتے وقت بھی طلبہ ساتھ  
ہوتے اور افادہ و تعلیم کا دریا بہتا رہتا تھا، شام کو گھوڑے پر سوار ہو کر تفریح کیلئے جانے کا  
معمول تھا اس وقت بھی طلبہ ساتھ ہوتے، گھوڑے کے ساتھ دوڑتے رہتے اور پڑھتے  
رہتے تھے:

حضرت مولانا کے اخلاص اور خدمت حدیث کی لگن اور طلباء کی محنت اور شوق و ولولہ  
کی وجہ سے ہر سال متعدد کتابوں کے دو-دو، تین-تین مرتبہ پڑھانے کی نوبت آتی تھی۔  
مدرسہ مظاہر علوم کی روداد میں مولانا کی پڑھائی ہوئی کتابوں کی تفصیل کئی مرتبہ شائع ہوئی،  
یہاں سنہ ۱۲۹۲ھ کی مقدار خواندگی نقل کی جاتی ہے:

”صحیح مسلم تمام دوبار، سنن ابی داؤد مکرر، بخاری شریف تمام پھر گیارہ پارے،  
مشکوٰۃ شریف، نسائی، ابن ماجہ، جامع ترمذی، موطا امام محمد، جامع صغیر، تفسیر جلالین،  
ترجمہ کلام مجید، احیاء العلوم یک ربع، در مختار ص: ۳۲ تک، شمائل ترمذی، مقدمہ  
ترمذی، شرح ملاح: ۳۲ تک، قدوری“ (۲)

(۲) روداد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور ص: ۵

(۱) روداد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، ص ۳۳-۳۴ (۱۲۹۱ھ)

مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوری کی وفات سنہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) کے بعد سے مدرسہ کیلئے کسی مہتمم کا انتخاب نہیں ہوا تھا اور یہ عہدہ خالی تھا، حضرت مولانا کے سہارنپور تشریف لانے کے بعد مدرسہ کے جلسہ عام میں اتفاق رائے سے حضرت مولانا کو مہتمم بنایا گیا اور اس سال سنہ ۱۲۹۱ھ کی روداد پر بحیثیت مہتمم حضرت مولانا کا نام شائع ہوا۔

حضرت مولانا کا دارالعلوم دیوبند سے بھی خاص تعلق رہا ہے، دارالعلوم کے ابتدائی دور کے متعدد اکابرا اور اساتذہ حضرت مولانا سے شاگردی کی نسبت رکھتے تھے اور دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت نودرہ کا سنگ بنیاد بھی حضرت مولانا کے ہاتھ سے رکھوایا گیا، روداد مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند میں اس تاریخی واقعہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

”اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا مولوی احمد علی صاحب نے اپنے دست مبارک

سے رکھا اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد

صاحب اور مولانا مولوی مظہر نے ایک ایک اینٹ رکھی“ (۱)

حضرت مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ جس کیلئے برصغیر ہند و پاک کے تمام اہل علم مولانا کے ممنون احسان ہیں۔ حدیث کی کتابوں کی تصحیح اور ان کی اشاعت ہے۔ حضرت مولانا نے صحیح بخاری، جامع ترمذی اور مشکوٰۃ المصابیح پر حاشیے لکھے اور ان کی تصحیح کی، صحیح مسلم کی بھی تصحیح کی اور پہلی بار شرح نووی کے ساتھ شائع کی، سنن ابوداؤد کے کئی نسخوں کو سامنے رکھ کر صحیح نسخہ تیار کیا جسے مولانا کے خاص شاگرد مولانا محمد حسین فقیر بنتی دہلوی نے بہت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ اس عقد ثریا کا گوہر شب تاب حاشیہ صحیح بخاری ہے، حضرت مولانا نے اس کی تصحیح اور حاشیہ لکھنے میں غیر معمولی کاوش و کوشش فرمائی۔ متعدد ممتاز علماء سے اس میں مدد لی اور خود بھی دس سال سے زائد عرصہ تک اسی خدمت میں مصروف رہے۔

اس پیش بہا تاریخی نسخہ کی پہلی طباعت سید عبد الغفور کے مطبع سید الاخبار میں ۱۸ جمادی الآخر ۱۲۶۳ھ ۲۲ مئی ۱۸۴۸ء کو شروع ہوئی۔ اس پریس میں صرف ایک سو چوراسی صفحات چھپے تھے کہ مولانا نے طباعت کا کام اپنے مطبع احمدی میں منتقل کر لیا۔ صفحہ

(۱) ملاحظہ ہو روداد سال اول مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند نیز سوانح قاسمی، مولانا مناظر حسن گیلانی، ص ۳۲۵ ج ۲



۱۸۵ سے آخر تک دونوں جلدیں مطبع احمدی ہی سے شائع ہوئیں، جلد اول کی طباعت ۲۷ رجب ۱۲۶۷ھ ۲۵ مئی ۱۸۵۱ء کو اختتام پذیر ہوئی اور دوسری جلد کی اشاعت سنہ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں تکمیل کو پہنچی، اس ایڈیشن کے کل ۳۲۵ نسخے شائع ہوئے اور فی نسخہ بارہ روپے لاگت آئی، اس طباعت کا دوسرا ایڈیشن مطبع عبدالغفور دہلی سے محرم سنہ ۱۲۷۲ھ (ستمبر، اکتوبر ۱۸۵۵ء) میں شائع ہوا۔

اس طباعت کے بعد بھی حضرت مولانا نے صحیح بخاری کی تصحیح اور اس پر نظر ثانی کا کام جاری رکھا۔ پچھلے ایڈیشن میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں انکی موقع پر تصحیح کی، اور حواشی میں بھی کسی قدر اضافہ ہوا، سب سے اہم اضافہ رجال کے انساب اور کنی کا ہوا۔ اس نسخہ کی سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں طباعت شروع ہوئی اور سنہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں پوری ہوئی۔

صحیح بخاری کی پہلی اشاعت کے خاتمۃ الطبع میں حضرت مولانا نے صحیح مسلم کی طباعت بھی شروع کر نیکا ذکر کیا ہے۔ غالب گمان ہے کہ ایک دو سال میں اسکی طباعت مکمل ہوگئی ہوگی، یہ ایڈیشن طباعت کے بعد جلد ہی ناپید ہو گیا تھا اور اب تک ہمیں اس کے کسی نسخہ کا سراغ نہیں ملا، اس ایڈیشن کے فروخت ہو جانے کے بعد صحیح مسلم کا دوسرا ایڈیشن مولانا محمد حسین فقیر اور شیخ ظفر علی کے اہتمام سے مطبع فضل المطابع شاہدرہ (دہلی) سے شائع ہوا۔

تیسری اہم کتاب جس پر حضرت مولانا نے حاشیہ لکھا اور اس کی تصحیح کی، جامع ترمذی ہے، سنن ترمذی کا پہلا ایڈیشن حضرت مولانا کی تصحیح اور حاشیہ کے ساتھ سنہ ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں مطبع العلوم دہلی سے اشرف علی واسطی کے اہتمام سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن رمضان سنہ ۱۲۸۲ھ (جنوری فروری ۱۸۶۶ء) میں پورا ہوا۔

متون حدیث کی ان اہم کتابوں کے علاوہ حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح پر بھی حاشیہ لکھا اور اپنے مطبع سے شائع کرایا، مگر حضرت مولانا کو ہمیشہ اس کا افسوس رہا کہ مشکوٰۃ کی پوری خدمت نہیں ہو سکی، مشکوٰۃ کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا اور اس کی کیا اہمیت تھی، افسوس ہے اس کی تفصیلات حاصل نہیں ہو سکیں۔ دوسرا ایڈیشن مطبع احمدی میں سنہ

۱۲۷۲ھ میں شائع ہوا، اس ایڈیشن کے متعلق یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسے مفت تقسیم کرنے کے لئے شائع کیا گیا تھا، اس نسخہ کی پہلی جلد کے ٹائٹل اور پہلے صفحہ پر جلی قلم سے الوقف اللہ الکریم، اور دوسری جلد کے اکثر صفحات پر الوقف چھپا ہوا ہے۔

حدیث کی کتابوں کی اس جلیل القدر خدمت کے علاوہ مولانا کی کم از کم ایک تالیف اور متعدد مطبوعہ فتاویٰ یادگار ہیں۔ یہاں صرف تالیف ”الدلیل القوی علی ترک قراءۃ المقتدی“ کا ذکر کیا جاتا ہے، یہ کتاب قراءۃ خلف الامام کے موضوع پر مولوی محمد شاہ لدھیانوی کے اصرار پر تالیف فرمائی تھی۔ اس میں نہایت متین اور علمی زبان میں قراءۃ خلف الامام کے متعلق حنفی نقطہ نظر واضح کیا گیا ہے، پیش نظر نسخہ شعبان سنہ ۱۲۷۰ھ (مئی ۱۸۵۴ء) میں مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ اسکے بعد کم از کم ایک مرتبہ اور چھپا ہے۔

بعض احباب کے اصرار پر خود حضرت مولانا نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی اسی نام ”الدلیل القوی علی ترک قراءۃ المقتدی“ سے رجب سنہ ۱۲۹۵ھ (جولائی ۱۸۷۸ء) میں مطبع رحیمی واقع سرانے نواب علی محمد خاں (?) سے شائع ہوا۔

حضرت مولانا نے ان درسی اور تصنیفی خدمات کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی اصلاح اور معاشرہ کی درستی کے لئے بھی مسلسل جد جہد کی، خصوصاً بدعات کی بیخ کنی اور بیواؤں کے نکاح ثانی نہ کرنے کی مشرکانہ رسم کو ختم کرنے کیلئے بہت کوشش کی۔ ان موضوعات پر فتاویٰ لکھے، انھیں شائع کرایا اور مختلف علاقوں کے سفر کر کے وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے عوام کو بدعات و رسومات کی برائی اور ان کے نقصانات سے آگاہ کیا اور صحیح اسلامی طریقہ اور سادہ چلن پر زور دیا۔

حضرت مولانا کے معاصرین میں شاید ہی کسی استاذ و محدث کو اتنی بڑی تعداد میں ایسے منتخب اور بلند مرتبت شاگرد میسر آئے ہوں، جیسے حضرت مولانا کو ملے۔ حضرت مولانا کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے، تقریباً ساٹھ شاگردوں کے نام ہمارے سامنے ہیں۔ اس فہرست میں سے صرف چند نام ذکر کئے جاتے ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی،

مولانا عبداللہ انصاری انبھٹوی، مولانا احمد حسن امر وہوی، مولانا عبدالعلی میرٹھی، مولانا محمد علی مونگیری، علامہ شبلی نعمانی اعظمی اور حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر کی (حضرت حاجی صاحب نے مولانا سے گلستاں کے سبق پڑھے تھے)۔

حضرت مولانا سنہ ۱۲۹۷ھ کے شروع میں فالج کے عارضہ میں مبتلا ہوئے اور اسی مرض میں ۶ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۹۷ھ (۱۷ اپریل ۱۸۸۰ء) کو شنبہ کے دن سہارنپور میں وفات ہوئی، عید گاہ کے قریب قبرستان میں دفن کئے گئے۔ نساخ نے تاریخ کہی:

چو آں احمد علی نیک باطن	بہ سوئے خلد زیں دار الفنا رفت
برائے سال ترحیلش بہ نساخ	ملک گفتا ز دنیا مقتدا رفت (۱)

(۱) تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون بر حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری مشمولہ ضمیرہ امداد المشتاق بہ مقدمہ ڈاکٹر ثار احمد فاروقی ص: ۳۵۲ تا ۳۶۵ (دہلی: ۱۹۸۲ء)

## [۶] مولانا قاری عبدالرحمن انصاری پانی پتی (۵)

مولانا قاری عبدالرحمان پانی پتی کے قدیم انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے، اس خاندان میں پہلے بھی کئی بڑے علماء اور کالمین پیدا ہوئے۔ اسی خاندان کے ایک ذی علم صاحب کمال شخص مولانا قاری شاہ محمد، حضرت قاری صاحب کے والد ماجد تھے، سلسلہ نسب اس طرح ہے:

”قاری عبدالرحمان، بن قاری خواجہ محمد، بن خواجہ خدا بخش، بن غلام بوعلی، بن خواجہ کمال محمد، بن خواجہ غلام محمد“ (۱)

مولانا کے والد قاری شاہ محمد نے پانی پتی کے فخر روزگار قاری، قاری مصلح الدین عرف قاری لالہ سے قرآن شریف پڑھا، تجوید کی مشق کی، بالغ ہونے کے بعد دہلی گئے، حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین سے تعلیم حاصل کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز سے بیعت ہو گئے تھے اور شاہ صاحب کی قربت کے شوق میں دہلی رہتے تھے، سنہ ۱۲۴۰ھ میں چالیس سال کی عمر میں دہلی میں وفات ہوئی۔

قاری عبدالرحمان اپنے نانا پیر محمد ماہ پانی پتی کے گھر میں سنہ ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں پیدا ہوئے، تاریخ ولادت محفوظ نہیں۔ پانچ سال کی عمر میں قرآن شریف کی تعلیم سے علمی سفر کی ابتداء ہوئی، والد صاحب نے قرآن شریف، فارسی کی درسی کتابیں، نحو و صرف کے رسالے پڑھائے، ہدایۃ النحو، تک تعلیم کے بعد قراءت سبعہ کی مختلف روایتوں کی تعلیم حاصل کی۔

والد صاحب اس وقت دہلی میں تھے، اس لئے قاری صاحب بھی وہیں رہتے تھے، والد صاحب کے ساتھ حضرت شاہ عبدالعزیز کے مواعظ میں جایا کرتے تھے، اگرچہ کم سنی کی وجہ سے شاہ صاحب سے علمی استفادہ نہیں ہوا، مگر اس وقت کے بعض مشاہدات یاد

(۱) تذکرہ رحمانیہ قاری عبدالحلیم انصاری ص: ۱۲ (ادارہ نشریات اسلام لاہور ۱۴۰۰ھ)

تھے، قاری صاحب کی تیرہ سال کی عمر تھی کہ والد صاحب رحلت فرما گئے۔

والد صاحب کی وفات کی وجہ سے سخت صدمہ ہوا اور تعلیم سے طبیعت اچاٹ ہو گئی، دو سال اسی حال میں گزرے۔ سنہ ۱۲۲۲ھ میں والدہ صاحبہ کے سمجھانے اور بعض مفاجات کی وجہ سے دوبارہ تعلیم کی طرف توجہ ہوئی، تعلیم کے لئے دوبارہ دہلی کا سفر ہوا، دہلی میں مولانا رشید الدین خاں دہلوی اور مولانا مملوک العلی نانوتوی اور مولانا سید محمد دہلوی کے حلقہٴ درس میں حاضر رہے، مولانا رشید الدین خاں سے نحو کی، حضرت مولانا مملوک العلی سے ادب، فقہ، معقولات و اصول وغیرہ کی کتابیں پڑھیں، جن میں مختصر المعانی پر خاص طور سے محنت کی تھی، قاری عبدالرحمان صاحب فرماتے تھے کہ:

”مجھے خارج از مدرسہ مختصر المعانی پڑھا دیجئے“ مولانا نے فرمایا ایک کچی گھڑی وقت دے

سکتا ہوں (موجودہ گھڑیوں کے حساب سے یہ پون گھنٹہ ہوتا ہے)۔

میں نے مختصر المعانی سے زیادہ کسی کتاب پر محنت نہیں کی اور میں اپنی موجودہ قابلیت اسی

کتاب کی بدولت پاتا ہوں“ (۱)

تذکرہ رحمانیہ کی اطلاع میں تضاد ہے۔ ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قاری عبدالرحمان صاحب نے حضرت مولانا مملوک العلی سے مدرسہ دہلی (یا دہلی کالج) میں نہیں پڑھا، مدرسہ سے فارغ وقت میں حضرت مولانا نانوتوی سے پڑھا، مگر دہلی کالج کے ایک امتحان میں شریک ہوئے اور عمدہ طریقہ پر کامیاب بھی ہوئے، مگر تذکرہ رحمانیہ میں ہی مولانا قاری عبدالرحمان کے استادوں میں مولانا مملوک العلی کے علاوہ دہلی کالج کے دونوں بڑے استادوں مولانا رشید الدین خاں اور مولانا سید محمد دہلوی کے نام بھی درج ہیں جو اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ مولانا قاری عبدالرحمان دہلی کالج کے باقاعدہ طالب علم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کالج کے تینوں بڑے استادوں سے تعلیم حاصل کی، مولانا سید محمد دہلوی ابتدا میں مدرسہ سوم تھے مولانا رشید الدین خاں کی وفات (محرم ۱۲۳۳ھ) کے بعد مدرسہ دوم بنا دیئے گئے تھے۔ اس وقت مولانا مملوک العلی مدرسہ اول

(۱) تذکرہ رحمانیہ مولانا عبدالحلیم انصاری، ص: ۳۶، ۳۷ (لاہور: ۱۴۰۰ھ)

تھے۔ قاری عبدالرحمان کے استادوں میں تینوں علماء کے نام شامل ہونے سے یہی تاثر ہوتا ہے کہ قاری صاحب نے دہلی کالج میں پڑھا ہے۔

حضرت مولانا مملوک العلی کے یہاں سبق میں مولانا محمد مظہر نانوتوی قاری صاحب کے ہم سبق تھے، قاری صاحب اور مولانا مظہر نے چند کتابوں کا بغیر پڑھے اعلیٰ درجہ کا امتحان دیا تھا، جس کا مولانا مملوک العلی کے حالات میں تذکرہ آچکا ہے۔

قاری عبدالرحمان صاحب حضرت مولانا مملوک العلی سے استفادہ کے بعد جلال آباد ضلع مظفرنگر پہنچ کر ایک بڑے عالم اور مدرس مولانا سید محمد قلندر جلال آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور:

”علوم عقلیہ و نقلیہ کی جو کتابیں پہلے مولانا مملوک العلی صاحب سے ناتمام پڑھی تھیں اب پوری توجہ اور نہایت انہماک سے ان کو از سر نو پڑھا۔“ (۱)

مولانا عبدالحلیم انصاری پانی پتی کی اطلاع کے مطابق مولانا قاری عبدالرحمان صاحب نے مولانا محمد قلندر سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کے علاوہ ثلث صحیح بخاری اور دینیات کی بعض اور کتابیں پڑھیں، اگرچہ اور کتابوں کے نام درج نہیں لیکن صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ متوسط یا معمولی کتابیں نہیں تھیں بلکہ حدیث و فقہ کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں تھیں، جن کی تکمیل حضرت مولانا قلندر کے حلقہ درس میں کی۔

مولانا قلندر کے درس میں معقولات و منقولات کی تعلیم و اسباق مکمل ہو گئے تھے، اور حدیث شریف کی کچھ کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر حضرت شاہ ولی اللہ کے سلسلہ بلکہ گھرانے سے قریبی انتساب اور حدیث شریف کی اجازت و سند کیلئے سنہ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں حضرت شاہ محمد اسحاق کی مجلس درس میں حاضر ہوئے، شاہ صاحب سے حدیث پڑھی، اجازت و سند حاصل کی اور سنہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں تعلیم و درسیات کا سفر اختتام کو پہنچا۔

شاہ صاحب کے اسباق میں مولانا سید عالم علی مراد آبادی اور مولانا علیم الدین کاندھلوی، قاری عبدالرحمان کے ساتھ تھے، حضرت قاری صاحب کو یہ بڑی سعادت اور

(۱) تذکرہ رحمانیہ، مولانا عبدالحلیم انصاری، ص: ۳۶ (لاہور: ۱۴۰۰ھ)

اعزاز حاصل ہے کہ جب ۱۶ ایشوال سنہ ۱۲۵۸ھ (۲۰ نومبر ۱۸۴۲ء) کو شاہ صاحب نے قاری صاحب کو سند حدیث عطا کی تو فرمایا کہ:

”میں قاری صاحب کو الفاظ حدیث کی تحصیل کی سند دے رہا ہوں، معانی احادیث میں نے خود ان سے اخذ کئے ہیں“ (۱)

قاری صاحب نے دوبارہ حدیث پڑھی، یہ درس مکہ معظمہ میں شاہ صاحب کے سفر ہجرت کے بعد ہوا، جس میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری مولانا قاری عبدالرحمان کے ہم درس تھے۔

مرزا حسن علی محدث سے استفادہ | مولانا قاری عبدالرحمان کی تعلیم کے زمانہ میں شاہ محمد اسحاق بوا سیر کی سخت تکلیف

میں مبتلا ہو گئے تھے چھ مہینہ تک عالم یاس رہا، اس وقت حضرت شاہ صاحب نے قاری عبدالرحمان سے فرمایا کہ ”مرزا حسن علی سے پڑھ لیا کرو!“ قاری صاحب نے صحیح مسلم ابوداؤد، ترمذی مولانا مرزا حسن علی سے پڑھیں۔ (۲)

ملازمت | تعلیم کے بعد مولانا پانی پت میں تھے کہ حضرت شاہ محمد اسحاق نے مولانا کو باندہ جانے کی ہدایت فرمادی، باندہ کے نواب ذوالفقار علی خاں حضرت شاہ

عبدالعزیز سے بیعت تھے، انہوں نے حضرت شاہ محمد اسحاق سے درخواست کی تھی کہ اپنا کوئی خلیفہ باندہ میں رہنے کے لئے مقرر فرمادیں۔ شاہ صاحب نے مولانا کو باندہ کے لئے منتخب فرمایا تھا، مولانا باندہ پہنچے اور سادگی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ نواب صاحب کو جب مولانا کے کمالات کا اندازہ ہوا اور قاری صاحب کے جوہر کھلے تو ان کا اعزاز و اکرام کیا

(۱) تذکرہ رحمانیہ، مولانا عبدالحمید انصاری، ص: ۳۹ (لاہور: ۱۳۰۰ھ)

(۲) اگرچہ مرزا حسن علی حضرت شاہ عبدالعزیز کے معروف شاگرد ہیں، بلاشبہ مرزا صاحب نے شاہ صاحب سے بھی پڑھا ہے لیکن نواب حبیب الرحمن شردانی (صدر یار جنگ) نے خود مولانا قاری عبدالرحمان سے نقل کیا ہے کہ:

”مولوی حسن علی صاحب مولوی الہی بخش کے شاگرد تھے، مولوی بخش شاہ عبدالعزیز کے۔“

مضمون: قاری عبدالرحمن صاحب محدث پانی پتی مشمولہ مقالات شردانی ص: ۲۸۰ (علی گڑھ ۱۳۶۵ھ)

اور انکے لئے ایک علیحدہ مدرسہ کا انتظام کر دیا، جہاں قاری صاحب کا درس ہوتا اور طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔

حضرت قاری عبدالرحمن سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک سے بالکل یکسو رہے وہ اس کو مسلمانوں کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے، باندہ میں اس کا زور ہوا تو باندہ سے نکل گئے تھے، اس زمانہ میں لمبے عرصہ تک مختلف علاقوں اور پہاڑوں میں وقت گزارا، حالات پرسکون ہو گئے تو باندہ واپس آ کر معمول کے مطابق درس و افادہ میں مشغول ہو گئے۔ حضرت مولانا سنہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳-۶۴ء) تک باندہ میں قیام فرما رہے اسکے بعد پانی پت آ گئے تھے، اس وقت سے زندگی کے آخری دنوں تک پانی پت میں قیام کیا، درس و تدریس، وعظ، اصلاح و تربیت اور قرآن شریف کی خدمت میں مشغول رہے۔

حضرت قاری صاحب اتباع سنت، سادگی، اخلاق نبوی اور بزرگان سلف کا بہترین نمونہ اور ایسی یادگار تھے جو اُس زمانہ میں بھی کم یاب تھی، قاری صاحب نے پوری زندگی اسی روش پر گذاری، قرآن پاک کی تعلیم، حدیث کا درس، اخلاص و تقویٰ کی ہدایت، وعظ و نصیحت اور سراپا کردار و عمل کی زندگی قاری صاحب کا امتیاز تھی۔

قاری صاحب نے تصنیف و تالیف پر کم توجہ کی، چار پانچ مختصر تالیفات تحفہ نذریہ، فیوض رحمانی، کشف الحجاب، جوابات اسولہ غیر مقلدین، محو الفساد فی تلفظ الضاد، علمی یادگار ہیں۔ قاری عبدالحکیم انصاری (مرتب تذکرہ رحمانیہ) نے قاری صاحب کے فتاویٰ کا مجموعہ مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا، جو شاید پورا نہیں ہوا۔

قاری صاحب کا ہندوستان کے ممتاز اساتذہ حدیث میں شمار کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے علماء قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر سماعت و اجازت حدیث کو بڑا اعزاز اور فخر سمجھتے تھے۔ نامور علمائے ہند میں سے مولانا محمد یعقوب نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، حکیم الامت مولانا تھانوی، مولانا راغب اللہ پانی پتی، نواب حبیب الرحمن شروانی (صدر یار جنگ) مولانا پیر جماعت علی شاہ، مولانا الطاف حسین حالی، قاری عبدالرحمان نابینا پانی پتی، مولانا گل حسن سرحدی (مؤلف تذکرہ غوثیہ) کو بھی حضرت



مولانا سے اجازت و سند حدیث یا تلمذ حاصل ہے۔

**وفات** | قاری صاحب کی چند روزہ بیماری کے بعد ۵ ربیع الثانی (۱) سنہ ۱۳۱۴ھ (۱۲ ستمبر ۱۸۹۶ء) کو چھبیس سال کی عمر میں وفات ہوئی، پانی پت میں دفن کئے گئے۔ افسوس ہے کہ اب اُس جلیل القدر عالم و محدث کی قبر ایک شمشان گھاٹ کے بیچ میں آگئی ہے، جس کا پتہ نشان بتانے والے افراد بھی پانی پت میں نہیں رہے۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

## [۷] مولانا سید عالم علی مراد آبادیؒ (۶)

مولانا عالم علی، بن کفایت علی، بن فتح علی۔ نگینہ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ مراد آباد آگئے تھے، یہیں رہے یہیں وفات ہوئی۔ مولانا عالم علی کا سن ولادت معلوم نہیں، نگینہ اور رامپور کے علماء سے ابتداء سے متوسطات تک پڑھا، غالباً اعلیٰ تعلیم اور درسیات مکمل کرنے کیلئے دہلی آئے۔ دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی، حضرت شاہ محمد اسحاق سے حدیث پڑھی، حکیم شریف خاں کے شاگرد حکیم نصر اللہ خاں اور حکیم غلام حیدر خاں سے غالباً طب پڑھی۔

تعلیم کے بعد اکثر وقت مراد آباد میں گزرا، کچھ دنوں تک ریاست رام پور سے بھی وابستہ رہے، رام پور سے تیس روپے مہینہ وظیفہ ملا کرتا تھا۔ احمد علی شوق نے لکھا ہے کہ نہایت متواضع اور زاہد تھے، پابندی وقت کا سخت لحاظ تھا (۲) چند کتابیں مولانا نے یادگار چھوڑیں، رسالہ فضائل رسول مقبول ﷺ، رسالہ فضائل صیام، رسالہ قراءت ضاد معجمہ، رسالہ تعدد جمعہ، اور شرح ضابطہ شرح تہذیب یزدی۔

(۱) تذکرہ رحمانیہ میں ص: ۲۶۱ پر تاریخ وفات ۵ ربیع الاول لکھی ہے۔ جو غالباً سہو کتابت ہے۔ صحیح تاریخ ۵ ربیع الثانی ہوگی۔ جس کی ۱۳ ستمبر سے مطابقت صحیح ہے۔ اسی مہینے میں دو شنبہ کو ۵ ربیع الثانی تھی، ربیع الاول میں نہیں۔

(۱) نزہۃ الخواطر ص: ۲۳۵ جلد ۷ اور کمالان رامپور ص: ۸۸-۸۹ (پٹنہ ۱۹۸۶ء)

تریسٹھ سال کی عمر میں ۲۰ رمضان المبارک سنہ ۱۲۹۵ھ (۱۸ ستمبر ۱۸۷۸ء) کو پنجشنبہ کی شام کو وفات ہوئی، مراد آباد میں دفن کئے گئے۔

## [۸] حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی (۷)

مولانا محمد مظہر خلف جناب حافظ لطف علی، بن محمد حسن صدیقی نانوتوی۔ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کے ہم خاندان ہم جد بلکہ گویا گھرانہ کے ایک فرد تھے۔ سنہ ۱۲۳۷ھ (۲۲-۱۸۲۱ء) میں پیدا ہوئے، محمد مظہر تاریخی نام ہے، جس سے سنہ ولادت معلوم ہو جاتا ہے۔ ابتدائی حالات کا علم نہیں، مگر بظاہر نوعمری سے حضرت مولانا مملوک العلی کے ظل عاطفت میں آگئے تھے، مولانا کے ساتھ مزید تعلیم و تربیت کے لئے دہلی گئے، دہلی کالج کے طالب علم رہے اور حضرت مولانا سے طویل استفادہ کیا، متعدد درسی کتابیں مولانا سے پڑھیں، مختصر المعانی وغیرہ متوسط درسیات کے سبق میں مولانا قاری عبدالرحمان پانی پتی مولانا کے رفیق تھے۔ دہلی کالج میں کب داخل ہوئے اس کا صحیح علم نہیں۔ خیال کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کا ۵۳-۱۲۵۲ھ (۱۸۳۷ء) میں مدرسہ دہلی میں داخلہ ہوا ہوگا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کالج میں اور حضرت مولانا سے علیحدہ تعلیم دونوں بیک وقت جاری تھے۔

دہلی کے بڑے علماء میں سے مولانا مفتی صدر الدین آزرہ سے بھی تعلیم حاصل کی اور حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں بخاری شریف پڑھی، نیز صحیح بخاری اور حدیث شریف کی اعلیٰ ترین کتابیں (صحاح ستہ) حضرت شاہ عبدالغنی مجددی سے بھی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

شاہ عبدالغنی نے حضرت مولانا محمد قاسم کو جو سند عطا فرمائی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد مظہر بعض کتابوں خصوصاً (موطا امام مالک) کی قراءت و سماعت میں مولانا

محمد قاسم کے ساتھ تھے، تحریر فرمایا ہے:

”و مؤطا مالک بن انس سمع بعضہ بقراءۃ ابن اخی المولوی مظہر.“ (۱)

تعلیم سے فراغت کے بعد عمدہ لیاقت و قابلیت کی وجہ سے تقریباً  
**دورِ ملازمت** | سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴-۴۵ء) میں بنارس کالج کے مدرس اول مقرر  
 کئے گئے، بیاسی روپے تنخواہ تھی۔ مولانا نے اس ملازمت اور تنخواہ کا اپنی ایک درخواست  
 میں ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

”اس احقر رامت چہار سال است کہ مدرس اول عربی مدرسہ بنارس بمشاہرہ ہشتاد و دو  
 روپیہ، بحسب منظوری صدر و خوبی لیاقت خویش مقرر شدہ بود“ (۲)

بنارس کے کالج میں دو سال تک خدمت تدریس کے بعد حج کے لئے جانے کا خیال  
 ہوا، اس کیلئے ایک سال کی رخصت کی درخواست گزاری جو منظور ہو گئی۔ اس وقت سرکاری  
 مدرس کا قاعدہ یہ تھا کہ لمبی رخصت پر جانے والے استاد اپنی ملازمت پر اپنے کسی معتمد یا  
 عزیز کو قائم مقام مقرر کر سکتے تھے، جب تک اصل مدرس واپس آتا قائم مقام اس کی جگہ  
 کام کرتا۔ مولانا محمد مظہر نے بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی ملازمت پر  
 اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد احسن کو طے کر دیا تھا، مولانا احسن اس عہدہ پر کام کرتے  
 رہے، ادھر اس سفر میں مولانا محمد مظہر کا اندازہ سے زیادہ وقت گذرا، دو سال صرف  
 ہو گئے۔ رخصت ایک سال کی تھی، اسلئے جب مولانا دو سال بعد غالباً سنہ ۱۲۶۵ھ  
 (۱۸۴۹ء) میں بنارس واپس آئے تو مولانا کا خیال تھا کہ ان کو جلد ہی کلکتہ میں ملازمت  
 مل جائے گی، اس لئے مولانا نے اپنی بنارس کی جگہ پر مولانا محمد احسن کو رہنے دیا اور خود اس  
 سے مستعفی ہو کر وہلی آ گئے۔

مولانا محمد مظہر کو ہندوستان پہنچتے ہی یہ اطلاع ملی تھی کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے امین  
 مولانا احمد کبیر کی وفات ہو گئی ہے، ان کی جگہ نیا تقرر ہوگا، مولانا نے چاہا کہ میں بھی اس

(۱) اس اصل سند کا عکس سوانح قاسمی، مرتبہ مولانا گیلانی، جلد اول مابین ص: ۲۶۰-۲۶۱ میں شامل ہے۔

(۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص:

کے لئے کوشش کروں، مولانا نے اس عہدہ کیلئے درخواست دی مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ غالباً اسی درمیان مولانا بنارس کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر دہلی آگئے تھے، دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی نے بھی مولانا کے لئے کوشش کی۔

کچھ وقت گزرا تھا کہ مولانا محمد مظہر کو مولانا مفتی صدرالدین آزرہ کی عدالت میں سرشتہ دار کی ملازمت مل گئی تھی، تیس روپے ماہانہ تنخواہ ملے ہوئی یہ ملازمت مولانا کو پسند نہیں آئی، اس لئے چند دنوں کے بعد اس سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن کے قریب رڑکی میں ایک سرکاری ملازمت قبول کر لی مگر اس ملازمت پر بھی کم رہنا ہوا، مولانا کے دہلی میں قیام کے آخری دنوں میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرسہ کیلئے چند نوجوانوں کا ملازمت کے لئے امتحان ہوا تھا جن میں مولانا محمد مظہر بھی شامل تھے، مولانا اس میں کامیاب ہو گئے تھے، لیکن مولانا کو جلد ہی اجمیر کالج میں مدرسہ اول کی جگہ مل گئی، اس لئے رڑکی کی ملازمت ترک کر کے اجمیر چلے گئے۔ صراحت نہیں ملی مگر خیال کیا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) کے انقلاب تک اجمیر میں تھے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں یہ ملازمت چھوڑ کر وطن آگئے تھے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے سرکار کے معتبوب ہوئے، کئی سال روپوشی میں گزارے، جب حالات معمول پر آگئے تو وطن سے نکلے اور لکھنؤ پہنچ کر منشی نول کشور کے پریس میں مصحح کی حیثیت سے ملازم ہو گئے، سو روپیہ ماہانہ تنخواہ تھی (۱) چند اہل قلم اور تذکرہ نگاروں نے مولانا کی مطبع منشی نول کشور کی ملازمت کا انکار کیا ہے مگر یہ رائے درست نہیں۔ مولانا نے منشی نول کشور پریس میں بڑی کتابوں کو سخت محنت سے قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے اور تصحیح و حاشیہ کے ساتھ شائع کیا، جن میں امام غزالی کی احیاء العلوم اور علامہ طاہر پٹنی کی مجمع البحار ممتاز ہیں، اس خدمت میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی مولانا محمد مظہر کے رفیق و شریک تھے۔ (۲)

(۱) مولانا محمد احسن نانوتوی، ڈاکٹر محمد ایوب قادری ص: ۱۵۵ (کراچی: ۱۹۶۶)

(۲) تفصیلات کے لئے راقم سطور کی مختصر تالیف تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی کا انتظار فرمائیے۔

مولانا کا ایک اور بڑا علمی کارنامہ اور یادگار تالیف، حاشیہ موطا امام مالک مولانا محمد مظہر غالباً شروع سے تصنیفی ذوق رکھتے تھے، جس کا پہلا اہم مظہر موطا امام مالک کا حاشیہ ہے، یہ حاشیہ مولانا نے اپنے اجیر کے قیام و ملازمت کے زمانہ میں تالیف کیا تھا، اسی زمانہ میں شائع ہوا۔ اس حاشیہ کی تالیف و اشاعت کا حضرت مولانا مملوک العلی کے ایک شاگرد اور مولانا محمد مظہر سے قریب واقف شخص علی اکبر سونی پتی نے اپنے مکتوبات میں ذکر کیا ہے، علی اکبر اسپرنگر کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے کہ:

”مولوی مملوک العلی صاحب نے ایک نسخہ موطا کا ہدیہ و تحفہ حضور کے واسطے رکھا ہے جس طرح حکم ہو بھیجا جاوے۔“ (۱)

علی اکبر کا یہ خط ۳ فروری سنہ ۱۸۵۱ء (یکم ربیع الثانی ۱۲۶۸ھ) کا لکھا ہوا ہے، اس کے ڈیڑھ مہینہ بعد خود مولانا مملوک العلی نے اسپرنگر کے نام ایک گرامی نامہ میں علی اکبر کی اطلاع کا اپنے طور پر کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے، تحریر ہے:

”بموجب حکم کے تین نسخہ موطا شریف کے بنام قائم مقام ڈاکٹر موٹ صاحب کے بدست خط پر نپیل بہادر کے، جو بلحاظ تحریر حضور کے انہوں نے کر دیئے کل کی تاریخ میں روانہ کئے، یہ عرضی اس نظر سے کہ حضور ان سے ارشاد کر کے دو نسخہ واسطہ مدرسہ کے خرید کریں اور ایک نسخہ بطور ہدیہ کے اپنی خدمت میں رکھیں، پہلے سے لکھ بھیجی۔“ (۲)

حضرت مولانا کا یہ خط ۱۱ جمادی الاول سنہ ۱۲۶۷ھ (۱۵ مارچ ۱۸۵۱ء) کا لکھا ہوا ہے جس سے علی اکبر کی مذکورہ اطلاع کی تصدیق ہو رہی ہے اور علی اکبر کے خط سے ضمناً یہ رہنمائی بھی مل رہی ہے کہ مولانا محمد مظہر کی مرتبہ موطا امام مالک فروری سنہ ۱۸۵۱ء (ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ) سے پہلے شائع ہو گئی تھی۔ جب یہ نسخہ اسپرنگر کو ملا تو اس نے اپنے معمول کے مطابق ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے علمی مجلہ (جرنل) میں شائع اپنے مضمون میں تازہ کتابوں اور مطبوعات کے ساتھ موطا امام مالک مرتبہ مولانا محمد مظہر کا بھی ذکر کیا تھا اور

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب محمد اکرام چغتائی ص: ۳۲۸

(۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب محمد اکرام چغتائی ص: ۷۹

لکھا تھا ہے کہ:

”موطا کو مولوی مظہر نے شائع کرایا، مولوی صاحب ان دنوں اجمیر میں تھے۔“ (۱)  
یہ نسخہ حضرت مولانا احمد علی کے مطبع احمدی دہلی میں سنہ ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹-۵۰ء) میں  
شائع ہوا تھا، اس اشاعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ کتب میں موجود ہے، اس نسخہ کے  
سرورق پر درج عبارت سے سنہ طباعت معلوم ہوتا ہے، جو یہ ہے:

”قد شرع طبعہ باہتمام احقر الانام ظفر علی فی المطبع الاحمدی

الواقع فی الدہلی۔“ ۱۲۶۶ھ

علی اکبر سونی پتی کے خط کے درج بالا اقتباس سے معلوم ہو گیا کہ فروری سنہ ۱۸۵۱ء  
(۱۲۶۶ھ) سے پہلے یعنی سنہ ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰ء) کے آخر میں اس نسخہ کی طباعت کا کام  
مکمل ہو گیا تھا۔ موطا امام مالک کا یہ حاشیہ آج تک بلا کسی وقفہ کے مسلسل چھپ رہا ہے  
برصغیر ہندو پاکستان کے جملہ دینی مدرسوں اور حدیث کی درسگاہوں میں یہی حاشیہ طلبہ،  
اساتذہ اور محدثین کے ہاتھوں میں رہتا ہے، عجیب بات یہ ہے کہ اس وقت سے زمانہ حال  
تک کی اکثر طباعتوں کا سرورق بھی پہلی طباعت کے مطابق ہے، اس کے پہلے صفحہ پر  
فارسی میں حضرت امام مالک کے حالات بستان الحدیث وغیرہ سے اخذ کر کے شائع کئے  
تھے، جو آج تک اسی طرح چھپ رہے ہیں، یہ حضرت مولانا محمد مظہر کے اخلاص کی برکت  
ہے کہ اس کو عظمت و دوام کی ایسی خلعت نصیب ہوئی اور یہ بھی مولانا محمد مظہر کا اختصاص  
اور فرطِ اخلاص ہے کہ مولانا نے پوری کتاب میں کہیں بھی اپنا نام نہیں لکھا۔

مولانا، منشی نول کشور کے پریس کے لئے کام کر رہے

تھے کہ سہارنپور میں مولانا سعادت علی سہارنپوری کی

تحریک اور سرپرستی میں رجب سنہ ۱۲۸۳ھ (نومبر

دسمبر ۱۸۶۶ء) میں ایک دینی مدرسہ کی ابتداء ہوئی،

مگر یہ صحیح معلوم نہیں کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب اس مدرسہ کی تشکیل میں پہلے سے

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

کا قیام اور اس کی سرپرستی

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، بحوالہ لٹریٹری انٹیلیجنس (Literary Intelligence) جلد ۲۰، شماره ۳، ص: ۲۸۲ (۱۸۵۱ء)

شریک تھے یا بعد میں تشریف لائے، بظاہر شروع سے موجود نہیں تھے، اس کا قرینہ یہ ہے کہ مظاہر علوم کی سال اول، دوم کی روداد میں مولانا کا نام کہیں درج نہیں، مدرسہ کی مطبوعہ روداد میں مولانا کا پہلا تذکرہ مدرس اول کی حیثیت سے سنہ ۱۲۸۵ھ کی روداد میں آیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:

”(اس سال) تمام بارِ تعلیم صرف ذمہ مولوی محمد مظہر مدرس اعلیٰ رہا“ (۱)

بہر حال مولانا غالباً سنہ ۱۲۸۵ھ میں مطبع منشی نول کشور کی ملازمت سے فارغ ہو کر سہارنپور آگئے تھے، یہاں پہنچ کر پوری توجہ اور انہماک سے اس مدرسہ کی خدمت و ترقی کے کام میں جٹ گئے۔ اس وقت سے زندگی کے آخری لمحات تک مولانا کی زندگی کا ایک ہی کام ایک ہی مصروفیت تھی، مدرسہ مظاہر علوم کی سرپرستی، تعلیم و تدریس، مدرسہ کے تمام معاملات کی نگرانی، طلبہ اور اہل مدرسہ کی ہر وقت فکر، درس حدیث کا اہتمام مولانا کا شبانہ روز کا مشغلہ اور مقصد حیات بن گیا تھا، اور جیسا کہ اس دور کے علماء کا معمول تھا مدرسہ کی خدمت سے فارغ وقت بھی گھر پر اور مسجد میں درس و افادہ اور طلبہ کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہتے تھے۔

مولانا محمد مظہر نے چار سال بنارس کالج میں پڑھایا، چھ سال تک اجمیر کالج میں عربی کے استاد رہے اور تقریباً سترہ سال مدرسہ مظاہر علوم میں علوم عالیہ اسلامیہ خصوصاً حدیث، فقہ و تفسیر وغیرہ پڑھاتے

حضرت مولانا محمد قاسم کا  
مولانا محمد مظہر سے تلمذ

رہے، اس تقریباً ایک تہائی صدی یا ستائیس سال میں مولانا سے کس قدر طلبہ نے فیض حاصل کیا ہوگا، اس کی تفصیل دشوار ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ حضرت مولانا کے شاگردوں کی بہت بڑی اور نہایت اہم فہرست ہوگی، جس میں بیسیوں شاگرد ایسے ہوں گے، جنہوں نے بعد کے دور میں علمی، دینی اور ملی خدمات انجام دی ہوں گی مگر افسوس ان کی تفصیل دستیاب نہیں۔

(۱) روداد مدرسہ عربی سہارنپور سنہ ۱۲۸۵ھ ص ۲ مطبوعہ در ضمیرہ۔ نجم الاخبار میرٹھ۔ ص: ۲

مولانا کے جو چند شاگرد معلوم ہیں ان میں سب سے پہلا اور اہم ترین نام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا ہے، جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب تعلیم کے لئے دہلی گئے تو حضرت مولانا مملوک العلی نے جو مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد قاسم دونوں کے خاندانی سرپرست اور استاد تھے، مولانا محمد قاسم کی ابتدائی کتابوں کا سبق مولانا محمد مظہر کے سپرد فرمایا تھا۔

”شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے لکھا ہے:

وعن مفاخره ان الشيخ العلامة بحر العلوم النانوتوی اخذ عنه بعض

الکتب الابتدائية“ (۱)

اگرچہ بعد میں مولانا محمد مظہر حدیث شریف کی چند کتابوں کی قراءت و سماعت میں مولانا محمد قاسم کے ہم سبق رہے، تاہم ابتدائی کتابوں کی تعلیم کی اہمیت اپنی جگہ ہے، اسلئے وہ حضرت مولانا محمد قاسم کے استاد ہیں، مولانا محمد قاسم اس تلمذ کا ہمیشہ خیال اور احترام فرماتے رہے۔

عموماً مولانا کے دو جوں کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن سب سے پہلے حج کا، جو پہلی سفر حج ملازمت کے زمانہ میں کیا تھا اس کا ذکر نہیں کیا جاتا، مولانا نے (جیسا کہ ذکر ہوا) پہلا حج تقریباً سنہ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء) میں اس وقت کیا تھا جب وہ بنارس کالج میں عربی کے مدرس اول تھے، اس سفر سے دو سال میں واپسی ہوئی۔ دوسرا حج مولانا محمد یعقوب، حاجی عابد حسین وغیرہ علماء کے قافلہ کے ساتھ سنہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰-۶۱) میں کیا، تیسرا اور آخری سفر حج شوال سنہ ۱۲۹۳ھ (اکتوبر نومبر ۱۸۷۷ء) میں اس قافلہ کے ہمراہ کیا جس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی شامل تھے۔

مولانا کے گردہ میں پتھری کی شکایت تھی، جس سے سخت تکلیف ہوتی تھی، دو

(۱) مقدمہ اوجز المسائل الی موطا مالک ص: ۳۳ جلد اول (مکتبہ سہارنپور طبع اول ۱۳۳۸ھ)

یہ مولانا ثابت علی صاحب مدرس مدرسہ مظاہر العلوم کی اطلاع ہے وہ خود بھی مولانا مظہر کے شاگرد تھے۔

مکتوب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا۔ مندرجہ انوار قاسمی ص: ۱۶ (طبع اول لاہور ۱۳۸۹ھ)



مرتبہ سخت بیمار ہوئے مگر لمبی بیماری کے بعد صحت کچھ بہتر ہو جاتی تھی، ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۲ھ میں بھی یہی عارضہ ہوا مگر اس مرتبہ شفا نہ ہوئی، اسی میں مبتلا رہ کر ہفتہ ۲ ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۲ھ (۳ اکتوبر ۱۸۸۵ء) کو وفات ہوئی، اسی شام سہارنپور کے قبرستان حاجی شاہ کمال میں مدرسہ کے اپنے رفیق اور مدرسہ کے دست و بازو منشی فضل حق کے برابر میں دفن کئے گئے۔ (۱)

## [۹] مولانا محمد حسین رام پوری سہارنپوریؒ (۸)

مولانا مملوک العلی کے وطن نانوتہ کے قریب ایک قصبہ رام پور منہیاران کے رہنے والے تھے۔ نسب وغیرہ اور والد کا نام راقم سطور کو نہیں ملا، غالباً انصاری خاندان سے وابستہ تھے، کوٹلہ بشارت خاں، محلہ پیرزادگان رام پور میں رہتے تھے۔ ان کے دو بھائی اور تھے مولوی محمود اور ناظر جی سلطان احمد جو حیدرآباد دکن میں رہتے تھے۔ (۲)

ایک تالیف کشتی نصیحت مولانا کی تحریری یادگار ہے۔

## [۱۰] علامہ مولانا محمد سعید اندرابی کشمیریؒ (۹)

علامہ سعید اندرابی نے اپنے والد میر سید جمال الدین اندرابی (وفات سنہ ۱۲۷۱ھ)

(۱) تفصیلات کے لئے راقم سطور کی تالیف تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی کا انتظار فرمائیے۔

(۲) مولانا ۱۲۸۵ھ (۶۹-۱۸۶۸ء) میں حج کیلئے گئے تھے واپسی میں جہاز گرداب میں پھنس گیا کئی دن تک ہوا بھی مخالف چلتی رہی، مولانا نے دعاء کی اور اس مصیبت سے نجات ملی جس کی وجہ سے جہاز کے مسافر مولانا کے ممنون ہوئے اور ان سے محبت کا معاملہ کرنے لگے اسی وقت ایک رفیق سفر نے جو ریاست بے پور میں ملازم تھے، مولانا سے چند نامہ عطار کے منظوم ترجمے کے لئے گزارش کی، مولانا نے اسی وقت ترجمہ شروع کر دیا تھا، ترجمہ پورا نہیں ہوا تھا کہ جہاز ممبئی کے ساحل پر پہنچ گیا، بعد میں مولانا نے اس ترجمہ کو پورا کیا، یہ ترجمہ کشتی نصیحت کے نام سے اسی زمانہ میں (حضرت مولانا احمد علی کے) مطبع احمدی دہلی سے چھپا تھا اس کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

اور حضرت شیخ اکبر ہادی تارہ بلی کشمیری (وفات سنہ ۱۲۴۳ھ) سے بعض علوم اور کتابیں پڑھیں، پھر دہلی گئے، دہلی میں کئی سال قیام کیا اور منطق و فلسفہ کی کتابیں مولانا مفتی صدرالدین آزرہ سے، ہیئت اور ہندسہ مولانا مملوک العلی نانوتوی سے اور حضرت شاہ محمد اسحاق سے حدیث پڑھی۔ مولانا محمد شریف سے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں تکمیل سلوک کی۔ تعلیم کے بعد کشمیر آگئے تھے لمبے عرصہ تک مخلوق خدا کو فیضیاب فرماتے رہے۔ سنہ ۱۲۸۲ھ (۶۶-۱۸۶۵ء) میں واصل بحق ہو گئے کشمیر میں دفن ہیں۔ (۱)

## [۱۱] مولانا عبد الحمید خان جلال آبادی (۱۲)

مولانا عبد الحمید خان جلال آباد، ضلع مظفر نگر کے پرانے اور صاحب اقتدار پٹھان گھرانے کے فرد تھے، اس خاندان میں اور بھی کئی اہل علم و فضل اصحاب ہوئے، مولانا عبد الحمید خان کے حالات اور سنین تعلیم و وفات دریافت نہیں، لیکن مولانا کے قلم کی نقل کی ہوئی چند کتابیں، رسائل اور فتوے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت شاہ محمد اسحاق اور حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ میرا سنہ ۱۲۵۹ھ میں تعلیم کے زمانہ میں حضرت مولانا مملوک العلی کے دولت خانہ پر قیام رہا۔ مولانا عبد الحمید کی لکھی ہوئی ایک کتاب کا ترجمہ ملاحظہ ہو، جس میں اس کی صراحت ہے:

”قد وقع الفراغ من تسويد هذه الاوراق في يوم الخميس خمسة عشر من محرم الحرام عام تسعة وخمسين و مائتين بعد الالف من هجرة النبي صلى الله تعالى عليه و سلم اولا و آخراً، و ظاهراً و باطناً، في البلدة ”شاه جهان آباد“ حين استقمت في مكان مولوى مملوك العلى صاحب دام اقباله و افضاله. كاتبه و مالكة عبد الحميد خان ساكن جلال آباد واقع ضلع سہارنپور“ (۲)

(۱) تذکرہ اسلاف، مؤلفہ، بہاء الحق قاسمی، ص: ۹۸، ۹۹ (لاہور: ۱۹۶۲ء)

(۲) یہ کتاب مولانا عبد الحمید فرنگی محلی کا رسالہ طہر متخلل ہے جس کے ساتھ حضرت شاہ محمد اسحاق وغیرہ کے فتوے اور بعض تحریرات بھی شامل ہیں۔

اگرچہ اس تحریر میں مولانا مملوک العلی سے تلمذ کی صراحت نہیں، مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک باذوق طالب علم مولانا کے مکان پر رہے اور مولانا سے نہ پڑھے، اس لئے مولانا عبدالحمید خاں کو بھی مولانا مملوک العلی کے ان شاگردوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جو شاہ محمد اسحاق کے بھی شاگرد تھے۔ مولانا نے اپنی نقل کی ہوئی ایک اور کتاب کے اختتامیہ میں خود کو حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق کا شاگرد لکھا ہے۔

## ﴿قسم سوم﴾

### [۱۲] محدثِ عصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱)

برصغیر ہند کی گذشتہ تقریباً سو سو سال کی دینی علمی تحریک جن اکابر علماء کی ممنون کرم اور خصوصاً تعلیمات ولی اللہی کا گلستاں جن کی خدمات سے سرسبز و شاداب ہے نیز دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارن پور اور ان سے متعلق مدرسے اور علماء جس شجر پر بہار کی شاخیں ہیں، اس میں ایک بہت ہی ممتاز اور برگزیدہ نام محدثِ عصر، فقیہ جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا ہے اور بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور مدارس اسلامیہ کی تاسیس کی جو روایت قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کی تھی اس کی سب سے زیادہ آبیاری اور سرپرستی حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمائی، ان مدارس کے ذریعہ سے علم و کمال اور اتباعِ دین و شریعت کی جو فضائیں اور اس کی جو بادِ بہار چلی اس میں بھی حضرت والا کے رسوخ فی العلم اور دعوت و اتباعِ سنت کے گہرے اثرات صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا کی ذاتِ گرامی اپنے آپ میں ایک بڑا مرکز علم، بڑا ادارہ اور دارالعلوم تھی، جس میں علم و تدریس کا سلسلہ بھی تھا اور تربیتِ باطن کی فکر بھی، قدم

قدم پر اتباع سنت کا ذکر اور رسومات و بدعات کی بیخ کنی کا اہتمام بھی تھا اور خانوادہ ولی اللہی کے بعد حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ محمد اسماعیل کی کوششوں سے جو ایک دنیائے علم و عمل آباد ہوئی تھی جب اس کی آبادیوں میں شکست و ریخت کے کچھ آثار ظاہر ہوئے تو حضرت مولانا گنگوہی کی توجہ، محنت اور کوششوں سے اس کی تجدید و تزئین ہوئی تھی اور یوں اس روایت کا تسلسل جاری رہا۔

**وطن** حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اس خانوادہ کے ایک فرد ہیں جس کا آبائی وطن رام پور ضلع سہارنپور تھا، اس خاندان کا ایک گھرانہ رام پور سے گنگوہ منتقل ہو گیا تھا، اسی میں حضرت گنگوہی تولد ہوئے۔ (۱)

**خاندان** چھٹی صدی ہجری میں پیر ہرات حضرت شیخ عبداللہ انصاری کے پوتے شیخ جلال الدین بن شیخ سلیم بن محمد اسماعیل بن شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہندوستان آئے اور میرٹھ کے نواح میں واقع ایک پر رونق اور آباد بستی سِر سِل (۲) میں آباد ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد و اخلاف میں بہت برکت عطا فرمائی اور اس وقت یوپی میں قدیم انصاری خاندان اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی اولاد کی جس قدر بھی شاخیں ہیں وہ تقریباً سب ہی انہی کی اولاد میں ہیں۔ پانی پت اور نواح کے انصاری خاندان بھی اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے نصابِ تعلیم کے لئے شہرہ آفاق شخصیت، علامہ نظام الدین سہالوی اور فرنگی محل کے علماء بھی اس شجر کی پر بہار شاخیں ہیں۔ (۳)

(۱) تذکرۃ الرشید، جلد اول ص: ۱۵ تالیف مولانا عاشق الہی میرٹھی (طبع اول میرٹھ)

(۲) سِر سِل بڑوت اور میرٹھ کے درمیان، بنولی سے پہلے اور جوہڑی کے بعد واقع مگر راستے سے ہٹ کر ایک چھوٹا سا اور گنام گاؤں ہے، کسی زمانے میں یہ گاؤں ایک بڑی اور نہایت پر رونق آبادی تھی۔ بعد میں یہ خانوادہ سرسل سے برناوہ آ گیا تھا جو اسی نواح کا ایک اور قصبہ ہے، یہاں اس کو بہت عروج ہوا، بڑے بڑے نامور مشائخ اہل اللہ اور علماء اس میں پیدا ہوئے جن میں شیخ بدر الدین برناوی حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلیفہ ہیں اسی طرح اور بھی متعدد اصحاب ہیں۔

(۳) علمائے فرنگی محل کے احوال پر تمام معتبر کتابوں میں اس کا ذکر بلکہ خاصی تفصیل درج ہے مثلاً ملاحظہ ہوں: الف: اغصان اربعہ۔ ب: احوال علمائے فرنگی محل، شیخ الطاف الرحمان بارہ بنکوی۔ ج: تذکرہ علمائے فرنگی محل، مفتی عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی۔

اجداد | اسی خاندان کے چند افراد موضع برناوہ سے رام پور منہیاران ضلع سہارنپور چلے گئے تھے بعد میں اسی گھرانہ کی ایک شاخ رام پور سے نواحی بستی گنگوہ منتقل ہوئی، اسی سے حضرت مولانا گنگوہی وابستہ ہیں، مولانا کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:

حضرت مولانا رشید احمد بن مولانا ہدایت احمد بن قاضی پیر بخش بن قاضی غلام حسن بن قاضی غلام علی بن قاضی علی اکبر بن قاضی محمد اسلم انصاری (۱)

مولانا کے خاندان میں علم کی روایت اور اس کے اثرات قدیم تھے، حضرت مولانا کے والد مولانا ہدایت احمد کی تقریباً سنہ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۰ء) میں ولادت ہوئی، عالم اور صاحب کمال تھے، خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء (غالباً حضرت شاہ محمد اسحاق؟) سے تعلیم حاصل کی اور اس عہد کے جلیل القدر شیخ، شاہ غلام علی (وفات سنہ ۱۲۴۰ھ) سے بیعت ہوئے اور خلافت و اجازت سے نوازے گئے۔ علم اور کتابوں کے شائق تھے، کثرت سے کتابیں نقل کیا کرتے تھے مگر عمر بہت کم ملی، ساڑھے پینتیس سال کی عمر میں جمادی الاخریٰ ۱۲۵۲ھ (ستمبر اکتوبر ۱۸۳۵ء) میں وفات ہو گئی تھی۔

مولانا ہدایت احمد کے تین بیٹے اور دو لڑکیاں تھیں، مولوی عنایت احمد، حضرت مولانا رشید احمد اور سعید احمد، مؤخر الذکر کم سنی میں نو سال کی عمر میں فوت ہو گئے تھے، مولوی عنایت احمد حضرت مولانا سے بڑے تھے اور مولانا نے ان سے ابتدائی چند کتابیں بھی پڑھی تھیں۔

حضرت مولانا ۶ رزی قعدہ سنہ ۱۲۴۴ھ (مئی ۱۸۲۹ء) کو دوشنبہ کے دن گنگوہ میں پیدا ہوئے، سات سال کی عمر تھی کہ والد صاحب رحلت کر گئے، دادا اور ماموں نے پرورش اور ہر طرح کی سرپرستی فرمائی اور تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کیا۔

تعلیم استاد | دینی گھرانوں اور شرفاء کے معمول کے مطابق سب سے پہلے قرآن شریف کی تعلیم پر توجہ کی گئی، ایک مقامی معلم حافظ قطب بخش گنگوہی سے تعلیم کا آغاز ہوا، چوں کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اسلئے والدہ کے ساتھ اپنے

(۱) تذکرۃ الرشید جلد اول ص: ۱۱

چھوٹے ماموں مولوی محمد تقی صاحب گنگوہی سے کرنال میں رہ کر فارسی پڑھی، فارسی کی چند کتابیں مولوی محمد غوث گنگوہی سے پڑھیں (۱) فارسی کے بعد عربی کی ابتدائی کتابیں شروع ہوئیں، عربی کی تعلیم اپنے آبائی وطن رام پور کے ایک برگزیدہ شخص اور فاضل مولانا محمد حسن (عرف محمد بخش) رام پوری سے حاصل کی (۲) مولانا محمد حسن نے ہدایۃ النحو پڑھانے کے بعد ہدایت کی کہ اور کتابوں کے لئے دہلی جانا چاہئے۔ مولانا محمد بخش (حسن) صاحب بھی دہلی میں تعلیم پائے ہوئے تھے اس لئے مولانا کے ساتھ دہلی آنا ہوا اس وقت حضرت مولانا مملوک العلی دہلی کالج میں استاد اور مرجع العلماء تھے، اطراف سہارن پور کے علاوہ دہلی کے بھی ممتاز علماء اور نامور اصحاب درس میں سے شمار ہوتے تھے، مگر مولانا گنگوہی کو غالباً حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کی بے پناہ مصروفیت اور وقت کے فقدان کی وجہ سے انکے حلقہ درس میں جلد داخلہ نہیں ملا، اس میں خاصا وقت غالباً کئی مہینے لگے، مولانا گنگوہی نے اس درمیان اور علماء سے پڑھا، حضرت مولانا کے حوالہ سے مولانا عاشق الہی میرٹھی نے نقل کیا ہے کہ:

”ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی، کہیں سبق تھوڑا ہوتا تھا کہیں شبہات کا جواب نہ ملتا تھا، مگر جب مولانا مملوک العلی صاحب کی خدمت میں

(۱) مولانا شاہ محمد غوث گنگوہی کی ایک معروف شخصیت اور شیخ طریقت تھے، جو شاہ محمد رمضان ہادی ہریانہ شہید سنہ ۱۲۴۰ھ کے خلیفہ مجاز تھے۔ ہادی ہریانہ، تالیف پرنسپل منظور الحق صدیقی، ص: ۱۳۸ (لاہور: ۱۹۶۳ء) مولانا محمد غوث کی چند تحریریں اور متوسلین کے لئے تعلیم و ہدایات ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہیں۔

(۲) مولانا عاشق الہی نے یہ نام محمد بخش لکھا ہے (تذکرۃ الرشید، ص: ۲۷ جلد ۱) صحیح نام محمد حسن ہے، جو مقامی طور پر محمد بخش کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ مولانا محمد حسن حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگرد، صاحب فضل و کمال اور صاحب ارشاد و معرفت بزرگ تھے۔ مولانا محمد حسن نے مدینہ منورہ جا کر حدیث شریف پڑھی تھی۔

مولانا گنگوہی کو مولانا محمد حسن صاحب سے ابتدائی درسیات میں تلمذ کے علاوہ دلائل الخیرات اور حزب البحر کی اجازت بھی حاصل تھی۔ مولانا محمد حسن شاہ امام علی کے خلیفہ اور بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے، مولانا کی ۱۷/۱۷ ذی قعدہ سنہ ۱۲۵۹ھ (دسمبر ۱۸۴۳ء) میں وفات ہوئی۔ مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ العابدین، ص: ۵۳ تا ۵۷ (دہلی: ۱۳۳۳ھ) اور انوار العاشقین مولانا مشتاق احمد صاحب انبھوی، ص: ۱۳۴-۱۳۵ (لاہور: ۱۳۹۸ھ)

پہنچے تو ہمیں اطمینان ہو گیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کر لیں۔“ (۱)  
 دہلی کے استادوں کی فہرست میں سب سے پہلا نام اس وقت کے ایک مدرس  
 مولانا احمد الدین پنجابی کا ہے، (۲) مولانا احمد الدین سے غالباً ہدایۃ النحو سے متوسطات  
 تک پڑھنے کا موقع ملا۔ دہلی کے ایک جلیل القدر اور سلسلہ مجددیہ کے شیخ شاہ احمد سعید  
 مجددی سے بھی تلمذ تھا، ایک اور استاد مولانا کریم بخش پنجابی تھے (۳) حضرت مولانا کے  
 اساتذہ میں ایک اور اہم نام مولانا مفتی صدر الدین آزرہ کا ہے جو دہلی کی بزم علم کے  
 گویا صدر نشین اور مرجع کل تھے، تاہم مذکورہ بزرگوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ حضرت  
 مولانا گنگوہی کی علمی ترقیات اور تعلیم و تربیت میں سب سے بڑا حصہ استاد العلماء حضرت  
 مولانا مملوک العلی نانوتوی کا ہے، اگرچہ مولانا گنگوہی کو مولانا نانوتوی کی خدمت میں  
 حاضری کا دیر سے موقع ملا مگر مولانا کے اسباق میں پہنچ کر اندازہ بلکہ یہ تجربہ ہوا کہ مولانا  
 مملوک العلی کی درس گاہ بعض حیثیتوں سے علمائے دہلی کے حلقوں سے مختلف ہے، مولانا  
 اس طرح پڑھاتے ہیں جیسے گھول کر پلا دیا ہو۔ حضرت مولانا گنگوہی فرماتے تھے:

”مگر جب مولانا مملوک العلی صاحب کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہو گیا اور بہت  
 تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کر لیں، گویا استاد نے گھول کر پلا دیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ  
 میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو  
 اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں، ہمارے استاد مولانا مملوک العلی  
 صاحب، دوسرے ہمارے استاد مفتی صدر الدین آزرہ تھے۔“ (۴)

حضرت مولانا مملوک العلی سے کیا کیا کتابیں پڑھیں اور دوسرے اساتذہ کی خدمت  
 میں کن کتابوں کا درس لیا اس کی تفصیل دریافت نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ مولانا

(۱) تذکرۃ الرشید مولانا عاشق الہی میرٹھی، ص: ۳۰ جلد اول (عکس طبع اول، سہارنپور: ۱۹۷۷ء)

(۲) مولانا احمد الدین کو مولانا میرٹھی نے جہلمی لکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سفیر اختر صاحب (اختر راہی) نے ان کو کرسالی ضلع  
 چکوال کا باشندہ بتایا ہے، اور بظاہر یہی صحیح ہے۔ تذکرہ علمائے پنجاب ص: ۸۰ جلد اول (لاہور: ۱۹۹۸ء)

(۳) تذکرۃ الرشید ص: ۱۸۰ جلد دوم

(۴) تذکرۃ الرشید ص: ۳۱، ۳۰ جلد اول

گنگوہی کی تعلیم کے علاوہ مولانا کے فکر و مزاج کی تشکیل میں بھی حضرت مولانا مملوک العلی کا بہت بڑا اور اہم حصہ ہے۔

حضرت مولانا مملوک العلی کی خدمت میں درسیات اور معقولات و ادب کی تکمیل کے بعد درسِ حدیث کیلئے دہلی کے نامور محدث، حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے، صحاح ستہ کا درس لیا اور اجازتِ حدیث حاصل کی، دہلی میں حضرت مولانا گنگوہی کا تعلیمی سفر بہت تیزی سے طے ہوا، ذہلی پہنچ کر نصاب کی عام ترتیب کے مطابق غالباً کافیہ وغیرہ متوسطات سے پڑھنا شروع کیا تھا اور چار سال کی قلیل مدت میں دورہ حدیث شریف تک جملہ درسیات کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر فارغ ہو گئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ | کہا جاتا ہے کہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا گنگوہی (رحمہما اللہ تعالیٰ) دونوں ساتھی اور ہم

سبق تھے، ساتھ ہی پڑھا، ساتھ ہی فارغ ہوئے، یہ روایت زبانوں پر بھی ہے اور کئی مضامین و تحریرات میں بھی نقل ہو گئی ہے مگر یہ صحیح نہیں، اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کا زمانہ تعلیم تقریباً ایک ہے اور دونوں کو حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی سے شرفِ تلمذ بھی حاصل ہے، اسی وجہ سے یا غالباً وطنی نسبت اور قربت کی وجہ سے دونوں میں دوستی اور موانست و ملاقات کے گہرے مراسم تھے، اور یہ بھی ہے کہ دونوں چند کتابوں میں ہم سبق اور ساتھ رہے مگر اکثر کتابوں اور تعلیم کی ترتیب میں ایک دوسرے سے مختلف اور علیحدہ علیحدہ تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم سنہ ۱۲۶۱ھ میں مولانا مملوک العلی کے ساتھ نانوتہ سے دہلی آئے تھے اور اسی وقت سے حضرت مولانا کی نگرانی، تربیت اور سلسلہ تلمذ میں داخل تھے، مولانا محمد قاسم نے اپنی تعلیم کا اکثر وقت حضرت مولانا مملوک العلی کی صحبت و شاگردی میں گزارا اور دہلی کالج میں بھی داخل رہے، حضرت مولانا گنگوہی کس وقت دہلی آئے اس کا تعین مشکل ہے، بہر حال جب بھی آئے دہلی کے مختلف استادوں اور علماء سے پڑھتے رہے، حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگردوں کی صف میں دیر سے شامل ہوئے نیز



حضرت مولانا سے تعلیم کے زمانہ میں بھی اور علماء، مولانا احمد سعید مجددی اور مولانا مفتی صدر الدین آزرہ کے درس کے حلقوں میں حاضر ہوتے رہے، نیز حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کی زیر تعلیم و تدریس کتابوں کی ترتیب میں بھی یکسانیت نہیں تھی اور اس کی بھی صراحت ملتی ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی تعلیم سے فارغ ہو کر وطن واپس آگئے تھے مگر حضرت مولانا نانوتوی غالباً آخری درجات یا حدیث شریف کے اسباق کی تکمیل فرما رہے تھے، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں بھی دونوں میں نہایت دوستی تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں تمام کتابوں میں ساتھ اور سب اساتذہ کی مجلسوں میں ہم سبق ہوں اور یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم تعلیم کے زمانہ میں حضرت مولانا مملوک العلی کے دولت کدہ پر قیام فرما رہے مگر مولانا گنگوہی کہاں رہے اسکی صراحت نہیں ملتی۔

تعلیم کے بعد | مولانا گنگوہی تعلیم سے فراغت کے بعد وطن آگئے تھے، اگر مولانا چاہتے یا پسند کرتے تو بڑی سے بڑی سرکاری ملازمت یا ریاستوں میں عہدہ و منصب مل جاتا، مگر مولانا نے غالباً طالب علمی کے وقت ہی اللہ دینی خدمت اور بلا کسی معاوضہ کے درس و افادہ کا ارادہ فرمایا تھا اور دہلی میں طالب علمی کے ساتھ ہی طلبہ کو اسباق شروع کرادیئے تھے، دہلی میں حضرت مولانا سے جو طلبہ وابستہ ہوئے اور مولانا سے تلمذ و استفادہ کیا، ان میں مولانا ملا محمود یو بندی بھی تھے (جو دیوبند میں پہلے مدرس مقرر کئے گئے) اسی دور کے شاگردوں میں مولانا ابوالنصر گنگوہی اور مولانا ابوالقاسم گنگوہی بھی شامل ہیں، (۱) دہلی میں اور طلبہ نے بھی پڑھا ہوگا مگر اسکی تفصیل دستیاب نہیں۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد گنگوہی آئے تو یہاں بھی تدریس کا سامان ہو گیا، سب سے پہلے نکوڑ سے مولوی سید مؤمن علی صاحب تعلیم کیلئے حاضر ہوئے (۲) اور پھر یہ سلسلہ ایسا جاری اور دراز ہوا کہ حیات کے آخری زمانہ تک کم و بیش چلتا رہا، آخری دور میں اس نے ایسی شہرت حاصل کی اور حضرت کے حلقہ درس میں ایسے ایسے منتخب طالب علم اور شائقین حدیث آئے کہ جن کے دم سے ہندوستان میں حدیث کا گلستاں لہلہا اٹھا اور برصغیر کے دور

دراز کونوں تک حضرت کے شاگرد پہنچ گئے، اور ان میں سے اکثر نے اپنی اپنی جگہوں پر خدمت دین اور احیائے سنت کی بے نظیر خدمات انجام دیں، مولانا کے تلامذہ کا سلسلہ کس قدر وسیع ہو گیا تھا اور اس کے کیسے کیسے منافع و اثرات تھے اس کا خود حضرت مولانا نے سنہ ۱۳۰۶ھ میں حضرت حاجی صاحب کے نام اپنے ایک خط میں یوں ذکر فرمایا:

”حضرت مرشد من! علم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے دور ہوئے غالباً عرصہ سات سال سے کچھ زیادہ ہوا ہے (۱) ان سال تک دو سو سے چند عدد زیادہ آدمی سند حدیث حاصل کر کے گئے اور اکثر ان میں وہ ہیں کہ انہوں نے درس جاری کیا اور سنت کے احیاء میں سرگرم ہوئے، اور اشاعت دین ان سے ہوئی اور اس شرف سے زیادہ کوئی شرف نہیں اگر قبول ہو جاوے۔ مکتوب محررہ سنہ ۱۳۰۶ھ“ (۲)

**بیعت و اجازت** | حضرت مولانا کی طالب علمی کے وقت حضرت حاجی امداد اللہ حضرت مولانا مملوک العلی کے یہاں تشریف لاتے تھے اور حضرت مولانا نانوتوی حاجی صاحب کا بہت اکرام کرتے تھے، (حالاں کہ مولانا ملک کے نامور علماء میں سے تھے اور حاجی صاحب سے عمر میں بھی بہت بڑے تھے) مولانا کے حضرت حاجی صاحب کے ساتھ خاص معاملہ کی وجہ سے حضرت مولانا گنگوہی کو بھی حضرت حاجی صاحب سے محبت و عقیدت ہو گئی تھی، اس طرح حضرت شاہ عبدالغنی کے علو مرتبت اور اتباع سنت کا بھی گہرا اثر تھا، مگر تعلیم کے اختتام تک اس کا فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ کس سے بیعت ہونا چاہئے، زمانہ طالب علمی تک حضرت شاہ عبدالغنی سے بیعت ہونے کا خیال تھا، مگر گنگوہ آنے کے کچھ ہی دنوں بعد ایک ضرورت سے تھانہ بھون آنا ہوا جہاں حاجی صاحب قیام فرماتے تھے، اللہ کا کرنا کہ اس مقصد کے پورا ہونے سے پہلے حضرت حاجی صاحب کی توجہ سے مالا مال ہو گئے اور اسی سفر میں حضرت حاجی صاحب نے بیعت سے مشرف فرمایا۔

(۱) حضرت مولانا گنگوہی اپنے تیسرے سفر حج سے سنہ ۱۳۰۰ھ میں گنگوہ واپس پہنچے تھے۔

(۲) مکاتیب رشیدیہ، مولانا عاشق الہی میرٹھی ص: ۱۰ (طبع اول میرٹھ ۱۳۲۲ھ)

طبیعت کا جوہر پہلے سے صیقل شدہ اور تیار تھا اس لئے بیعت کے بعد اس کی آب و تاب میں روز افزوں اضافہ ہوا اور حضرت پیر و مرشد پر بھی غالباً یہ منکشف ہو گیا تھا کہ وہ وقت دور نہیں کہ یہ نوعمر مستر شد اور تازہ دم فارغ طالب علم، دین اور علم کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے گا اور اس کا وجود ملت کیلئے متاع بے بہا ثابت ہوگا اور اس کے دم سے ہزاروں خادمانِ حدیث تیار اور پچاسوں خانقاہیں آباد ہوں گی، یہی اس قافلہ کا قافلہ سالار اور دین و علم کے شائقین کا مرجع ہوگا۔ اس لئے حضرت حاجی صاحب نے دو ملاقاتوں کے بعد، مولانا کے تیسری مرتبہ تھانہ بھون آنے کے وقت اجازت و خلافت عنایت فرمادی تھی اور اس کے بعد جب حضرت حاجی صاحب گنگوہ گئے تو اپنی موجودگی میں ایک خاتون کو حضرت گنگوہی سے اپنے سامنے بیعت کرا کر گویا اس کا اعلان کر دیا کہ اب مولانا گنگوہی میرے قائم مقام ہیں۔

**خدمات و اثرات** | مولانا عاشق الہی میرٹھی کی اطلاع کے مطابق حضرت مولانا گنگوہی اپنی عمر کے اکیسویں سال (یعنی سنہ ۱۲۶۵ھ) میں تعلیم

سے فارغ ہو کر گنگوہ واپس آ گئے تھے، اس وقت سے زندگی کے آخری لمحات تک وہیں قیام کیا اور اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ دین کی خدمت، تعلیم و تدریس، اصلاح و ارشاد اور معاشرہ کی برائیوں کو ختم کرنے میں گزارا، عقائد و معاملات کے بگاڑ کو دور کرنے کی کوشش کی، فقہی مسائل و مباحث میں عوام و خواص کے سوالات کے جوابات لکھنا ان کے علمی و قلبی سوالات و مشکلات کے حل کی جستجو اور بھٹکے ہوئے آہو کو بہتر سے بہتر طریقہ اور عمدہ سے عمدہ تدبیر کے ذریعہ سے صحیح راستہ پر لانے کی دن رات، بلکہ تمام عمر متواتر جدوجہد حضرت مولانا کا طغرائے امتیاز ہے۔

یہ بات بلا تردد کہی جاسکتی ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان میں حضرت شاہ محمد اسماعیل کے بعد اتباع سنت اور رسوم و بدعات کی تردید میں کوئی اور اس قدر طاقتور بلند بانگ اور متواتر آواز نہیں اٹھی جیسی حضرت مولانا گنگوہی کی آواز اور تحریک تھی، حضرت مولانا اس سلسلہ کے وہ پہلے اور غالباً سب سے بڑے عالم مرشد اور مصلح ہیں جنہوں نے اسی انداز و

آہنگ میں اس پیام کی تجدید کی اور اس پیغام کو جس پر زمانہ گزرنے کے ساتھ کچھ میل سا آنے لگا تھا اس طرح دور کیا اور اس پیام و دعوت کی اس قوت سے تجدید فرمائی کہ وہ پھر اک نئی قوت، نئی طاقت اور مسلسل تحریک بن کر عام ہوگئی۔

حضرت مولانا گنگوہی کے حلقہ تربیت سے جو افراد اٹھے ان کی ایک بڑی تعداد وہ تھی جس نے اپنی زندگیاں اس دعوت و پیام کی جدوجہد اور اس کی تبلیغ و ترویج کے لئے وقف کر دی تھیں اور انہوں نے اپنی سادگی، بے نفسی اور بے غرض کوشش سے اس کی جڑیں بہت دور تک اور اس قدر گہرائی تک پہنچادی تھیں کہ ان سے خود بخود نئی نئی کونپلیں اور نئے نئے پودے پھوٹتے اور پروان چڑھتے رہتے ہیں، جو اس تحریک کے ایسے ہی پر جوش خادم بنتے ہیں اور راہ شریعت و سنت پر اس طرح قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح ان کے بزرگوں اور اس خانوادہ کے اکابر علماء نے چلنے کی کوشش کی تھی۔

یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہئے کہ خانوادہ ولی اللہی کی وارثت اور نیابت و نمائندگی کا سب سے بہتر نمونہ اور جامع ترین ترجمانی وہ ہے جو علمائے دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور وغیرہ کے ذریعہ سے ہوئی اور ہو رہی ہے، مگر ان دونوں کو فکر ولی اللہی کا ایسا وقع اور شاندار ترجمان بنانے، نیز اتباع سنت، شریعت و تصوف کی جامعیت اور حدیث شریف کے اعلیٰ ترین مدارج کے حصول کے ساتھ حنفیت کی پاسداری اور دین و شریعت اور اسلام پر اندورنی و بیرونی جماعتوں، طبقات اور گروہوں کی طرف سے اعتراضات اور رخنہ اندازی کی کوششوں کے دفاع کا سبق کس سے ملا، اس میں صرف دو ہی حضرات کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔

مگر یہ بات قابل غور ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم کا دیوبند میں کم وقت گذرا اور ابھی مدرسہ دیوبند کو قائم ہوئے چودہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے اور اس کے قیام کے جو مقاصد تھے وہ تمام پوری طرح بروئے کار نہ آنے پائے تھے کہ حضرت مولانا نانوتوی رحلت فرما گئے، حضرت مولانا گنگوہی کو وقت بھی حضرت نانوتوی کی نسبت زیادہ میسر آیا،

حضرت گنگوہی مظاہر علوم کے تو گویا شروع سے سرپرست تھے اگرچہ مدرسہ کے ارکان میں مولانا کا نام بعد میں شامل ہوا مگر مدرسہ کے ذمہ داران خصوصاً مولانا مظہر نانوتوی وغیرہ حضرت مولانا کے خاص نیاز مند اور حضرت مولانا کی خدمت کے حاضر باش تھے، یوں مدرسہ کا عموماً کوئی بھی اہم کام حضرت مولانا کی ایما کے بغیر نہ ہوتا تھا۔ حضرت مولانا نانوتوی کی وفات کے بعد یہی کیفیت دیوبند کی بھی ہو گئی تھی کہ اب مدرسہ دیوبند کے بھی تقریباً تمام اختیارات حضرت مولانا گنگوہی کے پاس آ گئے تھے اور مدرسہ دیوبند کے اکثر ذمہ دار اور استاد حضرت مولانا کے دامن تربیت سے جڑ گئے تھے، وہاں بھی حضرت مولانا کا حکم نافذ تھا اور یہ دونوں مدرسے اسی طرح پچیس سال یا زائد عرصہ تک حضرت مولانا گنگوہی کی نگرانی اور سرپرستی میں رہے، اور حضرت مولانا کے حسن تربیت اور عنایت و محبت کے سبب حضرت مولانا کے اخلاق و کردار کے تمام محاسن، فکر و خیال کے اثرات، اتباع سنت کی رعنائی اور دین خالص پر عمل کا جذبہ مولانا کے شاگردوں اور متوسلین میں پوری طرح اثر انداز تھے۔ اس کے ساتھ ہی تدبر و دانائی، علم و عمل، فقہ و حدیث کی جامعیت اور اصلاح و تربیت کے ساتھ معاشرتی خرابیوں کے خلاف جدوجہد اور ہر اک غیر دینی غیر اسلامی آواز اور فتنہ کے خلاف سینہ سپر ہونے کی بنیادی صفات دونوں مدرسوں اور استادوں میں بہت گہرائی تک منتقل ہو گئی تھیں، جو ان دونوں مدرسوں کے لئے متاع بے بہا اور در شہوار ثابت ہوئیں۔ ان مدرسوں کے اکثر طالب علموں نے یہی نہیں کہ ان محاسن کی قدر کی، ان کو سینہ سے لگایا بلکہ ان کو اپنی زندگی کے سفر اور دینی خدمات کیلئے رہنمائے راہ بنا لیا، یعنی حضرت مولانا گنگوہی کے فکر و مزاج کی خصوصیات و امتیازات حضرت کی تربیت و صحبت کی برکت سے ان مدرسوں کے متعلقین کے فکر و مزاج میں اس طرح رچ بس گئی ہیں کہ ان کے وجود کا گویا ایک ضروری حصہ بن گئی ہیں، اسی فکر و مزاج کو دیوبندیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا کا یہ نہ صرف ان مدرسوں اور ان کے متوسلین اور ان کے نام لیواؤں پر بلکہ پوری ملت اسلامیہ پر اک بہت بڑا احسان ہے، اور دارالعلوم دیوبند نیز مظاہر علوم

سہارنپور کے تربیت یافتہ اور ان سے وابستہ علمائے کرام کے ذریعہ سے جو دینی خدمات اب تک انجام پائی ہیں ان کی بنیاد اور اساس میں حضرت مولانا گنگوہی کے گہرے اثرات شامل و پیوست رہے۔ جو انشاء اللہ آئندہ بھی اسی طرح شامل رہیں گے۔

حضرت مولانا کی شخصیت مختلف حیثیتوں اور پہلوؤں کی جامع تھی،  
**فقہی خدمات** حضرت مولانا ایک طرف اگر بڑے محدث بلکہ اپنے عہد میں

پیشوائے محدثین تھے تو دوسری جانب فقہ و فتاویٰ میں بھی فخر اقران تھے، حضرت مولانا کے فتوے کی حیثیت سکہ راج الوقت کی سی تھی، برصغیر میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اپنے معاملات اور مسائل کے حل کے لئے حضرت مولانا کی طرف دیکھتا تھا، حضرت مولانا کا جو فتویٰ ہوتا وہ ان سب کے لئے دینی دستاویز اور راہ ہدایت کی سند ثابت ہوتا تھا۔ عقائد و عبادت، معاملات و معاشرت، سلوک و معرفت، اور رسوم و بدعات کی تحقیق میں سب اس فتویٰ کے محتاج رہتے تھے، جب مولانا کا فتویٰ صادر ہو جاتا تھا تو ضبط و احتیاط کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا تھا اور اکثر مسلمان اس کو اپنے لئے اسوہ سمجھتے تھے۔

مولانا کی خدمت میں ہندوستان کے کونہ کونہ سے بڑی تعداد میں روزانہ مختلف سوالات آتے تھے جن میں ایک خاصا حصہ ممتاز اہل علم اور رہنوردانِ راہ سلوک کے خطوط اور سوالات کا ہوتا تھا، جو اپنی علمی مشکلات اور مراتب سلوک کے نکات حل کرنے کے لئے حضرت مولانا کی خدمت میں بھیجتے تھے اور حضرت مولانا کے قلم برداشتہ جوابات سے ان کے دل کی کلی کھل جاتی اور مقصود حاصل ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ عام مسلمانوں کے سوالات و فتاویٰ کی بھی بہت بڑی تعداد ہوتی تھی، حضرت کے بعض متوسلین ایک ایک وقت میں جو سوالات بھیجتے تھے وہ دو چار نہیں بلکہ کبھی کبھی سو دو سو سے بھی زائد ہوتے تھے، حضرت مولانا اپنی روایتی خندہ پیشانی اور کشادہ قلبی سے ان کے فوراً جواب تحریر فرماتے، اور اکثر قلم برداشتہ لکھتے، جس کیلئے نہ کسی قیمت کا مطالبہ تھا نہ کسی کی خوشی ناخوشی کی پروا، جو کلمہ حق ہوتا بلا تامل تحریر فرمادیتے۔ اگرچہ حضرت کے چند فتاویٰ پر مخالفین نے بڑا ہنگامہ برپا کیا، مدتوں مخالفت اور جوابی تحریرات اور رسائل و اشتہارات کا شور رہا، لیکن مولانا نے

اگر کسی مسئلہ کی تحقیق فرما کر اور اس کو حق جان کر لکھا تھا تو اس سے رجوع کر لینا ناممکن تھا، لاکھ مخالفت ہو۔ لیکن اسی کا ایک اور پہلو یہ بھی تھا کہ اگر کسی فتویٰ کی غلطی پر یا کسی مسئلہ کے سہو پر کسی عامی نے بھی توجہ دلادی اور واقعہ وہ جواب غلط لکھا گیا تھا تو حضرت مولانا اس سے برملا اور صاف لفظوں میں رجوع فرما لیتے تھے، ایک دو مرتبہ اس کی تشہیر ہوتی اور اس کا اعلان بھی کرایا جاتا تھا۔

حضرت مولانا کا ایک اہم معمول یہ تھا کہ اگر کوئی

### حضرت کا ایک خاص معمول

اہم بات پیش آگئی یا کسی دینی شرعی مسئلہ میں عوام میں اختلاف ہو یا کسی نئے طور طریقہ کا آغاز ہوا، کوئی بدعت یا رسم عام ہوئی تو حضرت مولانا خود ایک سوال مرتب کرا کر، یا آئے ہوئے سوالات میں سے بہتر اور جامع سوال کا انتخاب کر کے اس کا مفصل جواب تحریر فرماتے تھے اور اس جواب کو اشتہار کی صورت میں بڑی تعداد میں چھپوا کر ملک کے کونہ کونہ میں پہنچا دیا جاتا تھا، اس طرح حضرت مولانا کی رائے بھی سامنے آجاتی تھی اور صورت مسئلہ بھی واضح ہو جاتی تھی۔ حضرت مولانا کے اس طرح چھپوائے ہوئے اشتہارات کی خاصی بڑی تعداد تھی، غالباً سو سو اشتہار چھپے ہوں گے، مگر افسوس وہ کہیں یکجا دریافت نہیں، تاہم اس قسم کے دو اشتہار ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

مولانا کے فتاویٰ کے مجموعے

حضرت مولانا کی زندگی میں مرتب ہو گئے تھے مگر تعجب ہے کہ ان میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا، حضرت کے فتاویٰ کا صرف ایک مجموعہ جو حافظ عزیز الدین صاحب مراد آبادی (وفات سنہ ۱۳۶۷ھ، ۱۹۴۸ء) نے مرتب کیا تھا چھپا ہے، ایک اور مجموعہ جو حضرت مولانا کے غیر مطبوعہ فتاویٰ کے مجموعوں اور حضرت کے خودنوشت جوابات پر مشتمل ہے، راقم سطور نے مرتب کیا ہے، جو تقریباً نو سو سوالات کے مفصل و مختصر جوابات اور تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ (۱)

(۱) اس مجموعہ کی کمپوزنگ اور ابتدائی تصحیح ہو چکی ہے، تصحیح مزید اور نظر ثانی وغیرہ کا کام جاری ہے۔

رسائل اور تصنیفات

حضرت مولانا کی اردو اور فارسی میں متعدد تصنیفات ہیں  
بلا ترتیب چند نام درج ہیں، مگر یہ حضرت کی تالیفات و

رسائل کی مکمل فہرست نہیں ہے:

﴿۱﴾ ہدایت الشیعہ مؤلفہ ۱۲۸۸ھ

﴿۲﴾ زبدۃ المناسک، مؤلفہ: ۱۲۹۹ھ

﴿۳﴾ الرائی الخج فی عدد رکعات التراویح مؤلفہ: ۱۳۱۵ھ

﴿۴﴾ رد الطغیان فی اوقاف القرآن مؤلفہ: ۱۳۱۷ھ

﴿۵﴾ اوثق العری فی تحقیق الجمعیۃ فی القرئی مؤلفہ: ۱۳۱۷ھ

﴿۶﴾ قطوف دانیہ در کراہت جماعت ثانیہ

﴿۷﴾ سبیل الرشاد

﴿۸﴾ ہدایۃ المعتدی فی قرأۃ المقتدی

﴿۹﴾ الشمس اللامعہ فی کراہت جماعت الثانیہ

﴿۱۰﴾ اردو ترجمہ امداد السلوک

﴿۱۱﴾ فتاویٰ میلاد

﴿۱۲﴾ فتویٰ احتیاط النظر وغیرہ

یہ تالیفات اگرچہ چھوٹے چھوٹے رسائل ہیں بڑی اور مفصل کتابیں نہیں، لیکن یہ مختصر رسائل بھی علوم کی کلید اور بڑے فنی مباحث کا گویا عطر اور جوہر ہیں، ان کا ایک ایک لفظ حل مباحث میں مددگار اور ہر اک فقرہ مخزن معانی ہے۔

ان کے علاوہ حضرت کے متعدد وابستگان اور شاگردوں نے حضرت مولانا کے مکتوبات اور افادات یا علمی سوالات کے جوابات مرتب و یکجا کر کے شائع کئے ہیں، جن میں سے کئی حضرت کی تالیف کی حیثیت سے مشہور ہیں مگر وہ درحقیقت حضرت مولانا کی تالیفات نہیں بلکہ افادات ہیں۔



## صحیح بخاری ترمذی وغیرہ کی درسی تقریریں

مذکورہ بالا تحریرات و رسائل سے کہیں زیادہ قیمتی اور گراں قدر

یادگار حضرت مولانا کے درس حدیث شریف کی تقریریں ہیں، حضرت مولانا کے متعدد شاگردوں نے اپنے اپنے زمانہ تدریس و تعلیم میں حضرت کے وہ ارشادات جو حضرت درس کے موقع پر بیان فرماتے تھے، محفوظ اور قلم بند کر لئے تھے، جن میں سب سے بڑا سرمایہ اور اہم ترین خدمت وہ ہے جو مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی نے انجام دی تھی، یہ افادات محفوظ تھے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے ان افادات پر مفصل حاشیوں کا اضافہ کر کے ان کو اس شان سے شائع کیا کہ ان میں سے ہر اک مجموعہ بڑی شروعات کے قائم مقام اور علم حدیث کے علماء کیلئے بیش قیمت تحفہ ثابت ہوا۔ صحیح بخاری کے افادات لامع الدراری کے نام سے اور سنن ترمذی کے الکو کب الدراری کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں اور پوری علمی دنیا میں علمائے کرام اور حدیث شریف کے شائقین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور اپنی بڑی جلدوں اور ضخامت کے باوجود کثرت سے چھپتے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا کے عرفانِ مراتب، کمالاتِ علمی اور دینی اصلاحی، تدریسی خدمات کا کم سے کم تعارف بھی زیر نظر سطور میں آسان نہیں، اہل نظر اور اکابر علماء کی رائے بلکہ فیصلہ یہ ہے کہ حضرت مولانا حدیث و فقہ، سلوک و معرفت اور ارشاد و تربیت میں اپنے عہد کے امام اور اپنے معاصرین میں متعدد حیثیتوں سے ممتاز تھے، جس کا مختصر سے مختصر تعارف بھی خاصی تفصیل چاہتا ہے، جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

حدیث شریف کی شرح، اسکی تفہیم، مذاہب فقہاء سے اسکی صحیح تطبیق، متعارض احادیث میں وجہ ترجیح اور مطالب کی وضاحت میں مولانا کی دقت نظر اور غیر معمولی دسترس کا تو حضرت کی درسی تقریروں کے مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، خصوصاً حضرت مولانا جو توجیہات کرتے ہیں اور بعض مطالب بیان فرماتے ہیں وہ مولانا کا امتیاز اور منفرد حصہ ہے۔ ان توجیہات و شروحات کی وجہ سے بلاشبہ حضرت مولانا کو امت کے اہم ترین محدثین اور شارحین حدیث میں شمار کیا جاسکتا ہے، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری فرماتے تھے کہ:

”ہمارے اکابر دیوبند تو جیہات کے باب میں بہت آگے ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے بعد حضرت گنگوہی نے بہترین تو جیہات پیش کی ہیں، جب کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے بعد حضرت گنگوہی وہ شخص ہیں جنہوں نے محض اپنے نورِ قلب سے حدیث کی مشکلات حل کی ہیں اور کچھ تھوڑا سا حصہ حضرت شیخ الہند کو بھی اس سے ملا ہے۔“ (۱)

مولانا کو حدیث شریف کے معانی و مطالب اور تو جیہات پر جو غیر معمولی دسترس تھی اس کا ایک اجمالی اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت مولانا کے عہد کے جلیل القدر علماء اور محدثین اپنے سوالات کے جوابات اور حل مشکلات کیلئے حضرت مولانا سے رجوع کرتے تھے، جن میں فخر المتأخرین، حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور اہل حدیث کے نامور عالم مولانا محمد حسین بٹالوی کے نام بھی شامل ہیں۔ فخر المتأخرین، حضرت مولانا کو احادیث کی شرح اور تحقیق کے لئے خطوط لکھتے رہتے تھے، اسی طرح مولانا محمد حسین بٹالوی بھی فقہی اختلاف کے باوجود بعض احادیث کے مطالب و رموز کی شرح و تفہیم کے لئے رجوع کرتے رہتے تھے، حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے خطوط اور ان کے جوابات راقم کو نہیں ملے، لیکن مولانا محمد حسین کے چند خطوط کے جوابات محفوظ ہیں۔

اور فقہی موضوعات تو مولانا کی اس طرح دسترس میں تھے جیسے وہ مولانا کے لئے خاص طور سے مسخر کئے گئے ہوں، فقہ حنفی میں مولانا کے علوم مرتبت کا کچھ اندازہ کرنے کے لئے محدث جلیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی ایک اہم رائے کا تذکرہ ضروری ہے۔ علامہ کشمیری حضرت مولانا کو مرجع فقہ حنفیہ، علامہ (محمد بن عابد بن) شامی پر ترجیح دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ:

”حضرت مولانا گنگوہی فقیہ النفس تھے، شامی فقیہ النفس نہیں تھے۔“ (۲)

(۱) ماہنامہ بینات، مولانا محمد یوسف بنوری نمبر ص: ۱۲۲ (کراچی ۱۳۹۸ھ ۱۹۷۶ء)

(۲) حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے لکھا ہے کہ فقیہ النفس فقہاء کی ایک خاص اصطلاح ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فقہ میں کثرت ممارست کے بعد ایک ایسا ذوق سلیم عطا فرمایا ہو جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر بھی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا ہو۔..... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر.....

حضرت شاہ صاحب نے بھاول پور میں قادیانیوں کے خلاف مقدمہ میں بیان دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

”روافض کے اکفار میں اختلاف ہے، علامہ شامی ابن عابدین عدم تکفیر کی طرف ہیں اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اکفار کرتے ہیں، ہمارے نزدیک بھی یہی صحیح ہے۔ اصل میں جو ابتلاء حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو پیش آیا وہ علامہ شامی کو پیش نہیں آیا، مسئلہ کا اختلاف نہیں ابتلاء کا ہے۔ ویسے ہمارے نزدیک حضرت شاہ صاحب علامہ شامی سے زیادہ فقیہ ہیں اور حضرت گنگوہی کو بھی ہم نے شامی سے زیادہ فقیہ النفس پایا“ (۱)

حضرت علامہ نے حضرت مولانا گنگوہی کی شان میں جو قصیدہ لکھا تھا اس میں بھی اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں:

الیہ المنتہی حفظاً و فقہاً  
ففی التحذیر رحلۃ کل راو  
فقیہ النفس، مجتہد، مطاع  
واضحی فی الروایۃ کالمدار  
وفی الاخبار عمدۃ کل قاری  
و کوثر علمہ بالخیر جاری (۲)

اور جب سنہ ۱۳۳۳ھ میں علامہ رشید رضا مصری دارالعلوم دیوبند آئے تھے اس وقت حضرت شاہ صاحب نے مجلس استقبالیہ میں ایک بے نظیر تقریر کی تھی، اس میں بھی یہ

گذشتہ صفحہ کا بقیہ..... میرے والد میرے شیخ، تالیف مولانا محمد تقی صاحب، ص: ۵۸ (دہلی: ۱۹۹۵ء)

مولانا محمد تقی عثمانی جیسے بڑے فقیہ اور جلیل القدر عالم نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:

”مجھ جیسے بے علم و عمل شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ کسی کے بارے میں فقیہ النفس ہونے کا فیصلہ کرے کیوں کہ فقیہ النفس کی پہچان بھی انہی لوگوں کا حصہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تبحر علمی سے نوازا ہو، چنانچہ اس پہچان کیلئے بھی حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری جیسے انسان کی ضرورت ہے۔“ (ص: ۵۸ میرے والد میرے شیخ)

مگر آج کل اور اسلامی اصطلاحات و خطابات کی طرح اس لفظ فقیہ النفس کی حرمت بھی پامال ہو رہی ہے، ہندو پاکستان میں متعدد عالی معتقدین جن میں شاید بعض کو اس کے معنی بھی معلوم نہ ہوں، اپنے مدد و حین کے لئے اس کا بار بار اور کثرت سے استعمال کرتے رہتے ہیں..... ان اللہ وانا الیہ راجعون۔

(۱) انوار انوری (مجموعہ افادات ملفوظات علامہ انور شاہ کشمیری) تالیف مولانا محمد انوری، ص: ۵۰ (لاہل پور: ۱۳۸۷ھ)

(۲) نفحة العنبر فی حیات امام العصر الشیخ انور، تالیف مولانا محمد یوسف بنوری، ص: ۱۸۳ (کراچی: ۱۳۸۹ھ)

فرمایا تھا کہ:

و کثرت الفتيا و ازدحمت المسائل علی الشیخ رشید احمد حین التبس الحق بالباطل فاجاب فیها بالصلواب کان فقیها مجتهداً فاخذنا ذلک اماما فی الاصول و هذا اماما فی الفروع“ (۱)

ترجمہ: جب اختلافی مباحث اور رسائل کی کثرت ہوئی اور حق کو باطل سے ملایا جانے لگا تو مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں کثرت سے سوالات آنے لگے، حضرت مولانا نے صحیح (اور واضح) جوابات سے امت کی رہنمائی کی وہ فقیہ مجتہد تھے۔ تو ہم نے ان (حضرت شاہ ولی اللہ) کو اصول میں امام قرار دیا ہے اور حضرت مولانا گنگوہی کو فروع میں۔

حضرت مولانا، خانوادہ ولی اللہی کے اکابر اور طریقہ سلوک و تصوف کے امام کے مطابق علمی کمالات، محدثانہ شان اور فقیہانہ ژرف

نگاہی کے علاوہ سلوک و معرفت میں بھی کامل اور بلاشبہ فرد فرید تھے، حضرت مولانا کو پیرو مرشد اور برصغیر ہند میں سلوک و معرفت کے امام، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی سے اجازت و خلافت حاصل تھی، حضرت حاجی صاحب، حضرت مولانا کو اپنے خلفاء اور وابستگان میں سب سے بہتر اور صفات و کمالات میں اس عہد کے مشائخ و اہل معرفت کا پیشوا سمجھتے تھے۔ حاجی صاحب نے اپنی کتاب ضیاء القلوب میں حضرت مولانا اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تذکرہ فرما کر یہاں تک لکھ دیا تھا کہ ”حق تو یہ تھا کہ میں ان کی جگہ ہوتا وہ میری جگہ“ یعنی وہ اس مرتبہ کے بزرگ ہیں کہ مجھے ان سے بیعت کرنی چاہئے تھی اور ان کا نیاز مند ہونا چاہئے تھا، جبکہ معاملہ الٹا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

”و نیز ہر کس کہ ازیں فقیر محبت و عقیدت و ارادت دارد مولوی رشید احمد سلمہ و مولوی محمد قاسم سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من فقیر راقم اوراق بلکہ بہدارج فوق از من شمارند، اگر چه بظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشاں بجائے من و من بمقام اوشاں شدم، و صحبت اوشاں را غنیمت دانند کہ ایں چنینی کساں دریں زمان نایاب اند، و از خدمت با برکت ایشاں

(۱) نفحة العنبر ص: ۷۷ نیز ماہنامہ بینات کراچی، مولانا محمد یوسف بنوری نمبر ص: ۱۲۰

فیضیاب بودہ باشند“ (۱)

حاجی صاحب اپنی کئی تحریروں اور گرامی ناموں میں اسی رائے کا اظہار و تذکرہ فرمایا ہے، ایک زمانہ میں بدعات و رسوم کی تردید کی وجہ سے حضرت مولانا کے خلاف شورش برپا کرنے کی بہت کوشش کی گئی، حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں بھی قسم قسم کی اطلاعات اور روایتیں پہنچائی گئیں اور ادھر ہندوستان میں بھی اس کا چرچا شروع کیا کہ حضرت حاجی صاحب حضرت مولانا گنگوہی سے ناخوش ہیں اور حضرت مولانا کی پیرومرشد کی نگاہ میں ویسی منزلت نہیں رہی جیسی پہلے تھی، جب حضرت حاجی صاحب کو اس تمام قصہ کی خبر ہوئی تو حضرت حاجی صاحب نے اس کی صاف صاف تردید کی اور متوسلین کو لکھ دیا کہ:

اور مولانا رشید احمد صاحب کے مقدمہ میں بالہام غیبی ضیاء القلوب میں جو کچھ لکھ چکا ہوں وہی ہے، جو فقیر سے عقیدت و محبت رکھتا ہے وہ ان سے بھی محبت رکھتا ہے، اور جو ان کا مخالف اور دشمن ہے فقیر کا بھی ہے۔ اب فقیر کے اخوان میں مولوی صاحب موصوف پر کسی کو فضیلت نہیں اور جو کوئی کہے کہ فقیر نے مولانا کو علیحدہ کر دیا ہے وہ کذاب ہے، مولانا کی محبت کو فقیر وسیلہ نجات سمجھتا ہے، فقط۔“ (۲)

ایک معاصر مورخ کی گواہی | نزہۃ الخواطر کے مصنف اور نامور مورخ مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی جو ایک بڑے دینی علمی گھرانے کے فرد، ذہین عالم نیز حضرت سید احمد شہید کی نسبتوں کے امین تھے، حضرت مولانا گنگوہی کی وفات سے تقریباً گیارہ سال پہلے سنہ ۱۳۱۲ھ میں گنگوہ حاضر ہوئے تھے، وہ اپنا مشاہدہ اور رائے یوں درج کرتے ہیں:

”اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب بقیۃ السلف ہیں، ان کا وجود مغتلمات میں سے ہے۔ اس تورع و استقامت کا دوسرا شیخ ان کے سوا اس زمانہ عالم آشوب میں نظر نہیں آتا، علم الہی میں جو کوئی ہو اس کی خبر نہیں، مولوی صاحب کے اوصاف میں سب سے بڑا تورع ہے۔“ (۳)

(۱) ضیاء القلوب ص: ۶۰ طبع اول (جیبائی ۱۲۸۳ھ)

(۲) مکتوب مکتوبہ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ، مکتوبات اکابر دیوبند، ص: ۲۷-۲۸ (دیوبند ۱۹۸۰ء)

(۳) دہلی اور اس کے اطراف، مولانا عبدالحی حسنی ص: ۱۳۷ (طبع اول دہلی ۱۹۵۸ء)

**لطافتِ مزاج** | حضرت مولانا نہایت نفیس مزاج اور لطیف طبیعت تھے، حضرت مولانا کا لباس، قیام گاہ اور استعمال کی ایک ایک چیز خانقاہ اور کتابیں

بھی انتہائی صاف ستھری رہتی تھیں، ہر اک کام میں نفاست اور سلیقہ کو پسند فرماتے تھے۔ معمولی سی بے ترتیبی یا بد سلیقگی کا بھی طبیعت پر اثر ہوتا تھا، سادگی کے ساتھ تجل کا بھی اہتمام تھا، کوئی بات نفاست کے خلاف ہوئی حضرت مولانا نے اس کا احساس فرمایا۔

حضرت مولانا مسجد میں ماچس جلانے سے منع فرماتے تھے کیوں کہ اس میں گندھک کی خفیف سی بو ہوتی ہے، حضرت مولانا کو اس کا بھی بہت احساس ہوتا تھا، ذوق کی لطافت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ مغرب کی نماز کے بعد جب حضرت مولانا مسجد سے جا چکے تھے، کسی خادم نے مسجد کا چراغ ماچس سے جلا کر روشن کر دیا لیکن تقریباً ڈیڑھ، دو گھنٹہ کے بعد حضرت مولانا عشاء کی نماز کیلئے مسجد میں آئے لیکن اس وقت بھی حضرت مولانا نے اُس گندھک کی بو محسوس کر لی اور فرمایا کہ فضا میں اس کا اثر ہے اور مکرر ہدایت کی کہ مسجد میں ماچس نہ جلائی جائے۔

اسی طرح ایک مرتبہ مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی دیوبندی نے (جو حضرت کے ہر وقت کے حاضر باش خادم تھے اور بعد میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ہوئے) چائے بنا کر پیش کی، تو فرمایا کہ چائے میں کچے پانی کی بو آرہی ہے، مولانا نے بہت غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا، دوسرے دن اور احتیاط کی مگر حضرت کا پھر بھی یہی فرمانا تھا کہ کچے پانی کی بو آرہی ہے، کئی دن کے بعد مولانا حبیب الرحمن کا ذہن ادھر متوجہ ہوا کہ چائے کی پیالی کو ٹھنڈے پانی سے دھو کر صاف کیا گیا ہے اس سے ٹھنڈے پانی کا اثر حضرت محسوس فرماتے ہیں، اس لئے اُس وقت سے اس میں احتیاط کی گئی اور پیالی کو گرم پانی سے دھو کر پیش کیا تو یہ شکایت ختم ہوئی۔

**آخری علالت اور وفات** | حضرت مولانا لمبی اور سخت بیماریوں کے باوجود اپنے معمولات اور دینی خدمات میں مصروف رہتے تھے

کہ اسی درمیان ایک رات جب تہجد کی نماز میں مشغول تھے تو کسی جانور نے پاؤں کی

انگلیوں میں کاٹا، جس سے بہت خون نکلا، مگر حضرت مولانا ایسی محویت اور حضور کے عالم میں تھے کہ نہ اُس کا ٹٹنے کا احساس ہوا نہ خون نکلنے کی خبر ہوئی، جب نماز کیلئے حجرہ سے باہر نکلے تو ایک خادم نے خون کے اثرات دیکھے، اس وقت لباس وغیرہ بدل کر نماز پڑھائی اس کے بعد طبیعت میں کمزوری آنے لگی، چند دن کے بعد پیر پرورم بھی آنا شروع ہوا جو بڑھتا بڑھتا زانو تک پہنچ گیا تھا، اسی مرض نے شدت اختیار کر لی اسی میں تقریباً بیس دن بیمار رہ کر ۸ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست سنہ ۱۹۰۵ء جمعہ کو اٹھتر سال سات مہینہ کی عمر میں وفات پائی، اسی دن شام کو مغرب کے بعد گنگوہ میں دفن کیا گیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

### [۱۳] قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (۲)

نانوتہ کے صدیقی خاندان کا اسی کتاب کے پہلے باب میں تعارف و تذکرہ آچکا ہے، حضرت مولانا مملوک العلی اسی خاندان والا شان کے آفتاب تھے اور اسی خاندان بلکہ اسی شاخ اور گھرانہ کے ایک اور گل سرسبدا اور فخر خاندان شخصیت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔  
حضرت مولانا محمد قاسم حضرت مولانا مملوک العلی کے ہم جد تھے، سلسلہ نسب اس طرح ہے:

”حضرت مولانا محمد قاسم بن شیخ اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن شیخ علاء الدین بن شیخ ابوالفتح“ (۱)

شیخ ابوالفتح پر حضرت مولانا مملوک العلی اور اس خاندان کے متاخر کے نامور علماء (قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم، مولانا محمد مظہر، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی) کا سلسلہ نسب مل جاتا ہے، یہ سب اکابر و علماء اسی خزانہ کے لعل و گہر اور اسی آسمان منزل درخت کی شاخیں ہیں۔

(۱) تذکرہ یا حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی مع حواشی و تصحیح نور الحسن راشد کاندھلوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۱۷۲، ۱۷۳ (کاندھلہ ۱۳۲۱ھ)

حضرت مولانا کے والد ماجد شیخ اسد علی، مولانا مملوک العلی کے ہم عصر تھے، دونوں تعلیم حاصل

کرنے کے لئے ساتھ دہلی گئے تھے، شیخ اسد علی نے فارسی درسیات مکمل کر لی تھیں اور ان میں مہارت حاصل تھی، مولانا محمد یعقوب کا قول ہے کہ:

”جناب والد مرحوم (حضرت مولانا مملوک العلی) کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ اور شاہ نامہ

تک کتابیں پڑھیں تھیں“ (۱)

لیکن شاید اسی قدر تعلیم کے بعد وطن واپس آ گئے تھے، تعلیم مکمل کر لینا موقع نہیں ہوا، بہت سادہ مزاج، نہایت محبت و اخلاق والے، مہمان نواز، کنبہ پرور اور پرہیزگار شخص تھے۔

اسہال کے مرض میں مبتلا ہو کر ۷ ربیع الثانی سنہ ۱۲۹۱ھ (۲۱ مارچ ۱۸۷۵ء) کو

دیوبند میں وفات ہوئی، تکیہ (قبرستان، خاندان) دیوان لطف اللہ میں دفن کئے گئے (۲)

دارالعلوم دیوبند کی نئی مسجد رشید کے صدر دروازہ کے سامنے دفن ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی، مولانا محمد یعقوب کی تحریر کے ولادت اور ابتدائی تعلیم

مطابق شوال سنہ ۱۲۲۸ھ (مارچ ۱۸۳۳ء) میں تولد

ہوئے، تاریخی نام ”خورشید حسین“ ہے۔

ایک خاندانی قضیہ کی وجہ سے والدین نے بچپن میں ہی دیوبند (جو مولانا کی نہیال

بھی تھی) بھیج دیا تھا، دیوبند میں مولوی مہتاب علی (شیخ الہند مولانا محمود حسن کے چچا) کے

مکتب میں پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب کے ایک شاگرد شیخ نہیال احمد دیوبندی سے عربی

شروع کی، پھر سہارنپور جانا ہوا، حضرت مولانا کے نانا مولوی وجیہ الدین صاحب سہارنپور

میں وکالت کرتے تھے، سہارنپور رہتے ہوئے مولوی محمد نواز سہارنپوری سے عربی کی ابتدائی

درسیات اور کچھ فارسی پڑھی، اواخر سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۲۴ء) میں نانا صاحب کی وفات ہو گئی

جسکی وجہ سے غالباً تعلیم کا سلسلہ متاثر ہوا، اس زمانہ میں حضرت مولانا مملوک العلی بسفر حج

(۱) و (۲) تذکرہ یا حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی مرتبہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی مع حواشی و تصحیح نور الحسن راشد

کاندھلوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۱۷۲، ۱۷۳ (کاندھلہ ۱۳۲۱ھ)



کیلئے گئے ہوئے تھے، حج سے واپسی کے بعد جب گھر آئے تو فرمایا میں تمہیں اپنے ساتھ  
دہلی لے چلوں گا ذی الحجہ سنہ ۱۲۶۰ھ (دسمبر جنوری ۱۸۴۴ء) واپسی میں جب  
حضرت مولانا مملوک العلی نانوتہ سے دہلی واپس گئے تو (حضرت مولانا) محمد قاسم بھی مولانا  
کے ساتھ تھے، ۲ محرم الحرام سنہ ۱۲۶۱ھ (۲۹ جنوری ۱۸۴۵ء) کو دہلی پہنچے تھے۔

دہلی میں تعلیم | دہلی آنے سے پہلے فارسی کی تعلیم مکمل کر کے ہدایۃ النحو وغیرہ پڑھ  
چکے تھے۔ دہلی میں کافیہ سے تعلیم شروع ہوئی۔ اپنے ہم مدرسہ طلبہ  
بلکہ دہلی کے طالب علموں میں ممتاز تھے، ہر اک امتحان میں سب سے اول رہتے تھے۔  
معقولات کی اعلیٰ درجہ کی منتہیانہ کتابیں زواہد ثلاثہ، صدر، شمس بازغہ وغیرہ اس طرح  
پڑھتے تھے جیسے حافظ قرآن شریف کی منزل سناتا ہے، ترجمہ بھی نہ کرتے تھے۔ اس تیز  
رفتار تعلیم یا پڑھنے پر بعض طلبہ نے اعتراض کیا تو حضرت مولانا مملوک العلی نے فرمایا:

”میرے سامنے طالب علم بے سمجھے نہیں چل سکتا“ (۱)

اکثر کتابیں اور درسیات حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی سے اخذ کیں دہلی کالج  
میں بھی رہے، وہاں کے چند استادوں سے بھی فائدہ اٹھایا۔

زمانہ تعلیم میں اقلیدس کے مشکل اور پیچیدہ مباحث کو اس آسانی سے حل فرمادیتے  
تھے جیسے گنتی کے ابتدائی اعداد ہر ارہے ہوں، مولانا کی اس غیر معمولی لیاقت اور ذہانت و  
فطانت کی وجہ سے دہلی کالج کے ہیڈ ماسٹر (اور پرنسپل) چاہتے تھے کہ مولانا کالج کے  
سالانہ امتحانات میں شریک ہوں اور کالج کے طلبہ میں ان کا نام شامل رہے، اگر ایسا اعلیٰ  
درجہ کا طالب علم امتحان میں بیٹھتا تو اس کی کامیابی سے کالج کی شہرت و نیک نامی میں کس  
قدر اضافہ ہوتا محتاج بیان نہیں، لیکن مولانا اور ان کے استاد محترم، حضرت مولانا مملوک  
العلی نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔

حضرت مولانا کا طالب علمی کے ابتدائی دور میں یہ حال تھا کہ اچھے اچھے تیز طالب  
علم سبق یاد رکھنے سمجھنے اور اس کا تکرار کرانے میں مولانا کی گرد بھی نہیں پاسکتے تھے، معاصر

(۱) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۱۸۰

طلبہ سے سوال و جواب اور بحث و مقابلہ میں ہمیشہ مولانا غالب رہتے تھے، رہوارِ علم جس قدر آگے بڑھتا رہا، ذہن دماغ کی صلاحیتوں میں جلا آتی گئی، اس کی دڑا کی اور براتی اس غضب کی تھی کہ اہل نظر نے اسی وقت محسوس کر لیا ہوگا کہ یہ نیا ستارہ جب طلوع ہوگا تو اس کی روشنی اور تابناکی نگاہوں کو خیرہ کرے گی، یہی ہوا۔ حضرت مولانا جب تعلیم کے اعلیٰ درجوں میں پہنچے تو درسِ کتاب اور علوم کے مباحث پانی نظر آتے تھے، دقیق اور نازک مباحث پر مشتمل بڑی بڑی کتابوں کو مولانا اس طرح پڑھتے تھے جیسے ابتدائی کتابوں کا آموختہ دہرا رہے ہوں کہ اس میں کہیں جھجک ہے نہ تکلف۔

نو عمری سے حضرت مولانا کے فطری جوہر چمکنے لگے تھے، اعلیٰ درجہ کی ذہانت و ذکاوت تعلیم میں اپنی جماعت کے ساتھیوں اور ہم عمر طلبہ پر نمایاں سبقت رکھتے تھے، اکثر یہ ہوتا ہے کہ جو طالب علم بہت ذہین ہوتے ہیں اور ان کی قدرتی صلاحیتیں عام بچوں سے بڑھ کر ہوتی ہیں وہ نو عمری میں بے فکر اور آزاد خیال ہوتے ہیں، دینی کاموں سے بہت زیادہ مانوس نہیں ہوتے، ان کی رہوارِ فکر دینی پابندیوں کی اسیر نہیں ہوتی، کم سے کم نو جوانی کے ایک حصہ تک خاصی آزاد اور کبھی کبھی بالکل بے لگام رہتی ہے، مگر حضرت مولانا محمد قاسم پر منجملہ انعاماتِ الہیہ کے یہ بہت بڑا کرم رہا کہ حضرت مولانا بچپن سے فضول کاموں سے دور، دین سے پوری طرح وابستہ اور خرافات سے یکسور ہے، مگر اس ذہن اور خالص اسلامی افتاد طبع نے مولانا کو اپنے ہم عمروں سے دور نہیں کیا بلکہ وہ ان کے مشغلوں میں بھی پوری دلچسپی رکھتے تھے اور جس ہنر یا کھیل میں اپنے ساتھیوں اور ہم عمروں کو لگا ہوا دیکھتے اس کو پوری طرح سمجھ لیتے تھے، اور جب اس کو آخری حد تک سمجھ لیتے تھے، اور اس میں ماہر مشاق ہو جاتے، تو اس کو چھوڑ دیتے تھے، کوئی کھیل یا بچپن کا معمول مولانا کی طبیعت و مزاج نہیں بنا۔

جرات و بہادری میں بھی اسی دور سے منفرد تھے، ایسی جگہوں پر جہاں روزانہ آنے جانے والوں کو بھی ڈر محسوس ہوتا، حضرت مولانا رات دیر گئے بھی تنہا بے تکلف چلے جاتے اور ذرا خوف نہ کرتے تھے۔

اسی جرأت و ہمت کا اثر تھا کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے ہولناک دنوں میں بھی جب حالات و واقعات دیکھ دیکھ کر اچھے اچھے سوراؤں کا پتہ پانی ہوتا تھا، حضرت مولانا بے تکلف اور نڈر رہے خوف و ہراس کا کچھ اثر نہیں تھا، جب محاذ پر پہنچے معرکہ آرائی ہوئی، گولیاں چلیں اور مقابلہ ہوا، اس وقت بھی سکینت کی کیفیت تھی، گولیاں چل رہی تھیں اور مولانا مقابل کی صفوں میں گھسے جاتے تھے، زخم کھائے مگر حواس اور جرأت و حوصلہ جوں کا توں قائم رہا، نہ قدم پیچھے ہٹے نہ صلابت و استقامت میں فرق آیا۔

حضرت مولانا سے معقولات و ادب وغیرہ کی تکمیل کیلئے حدیث شریف پڑھنے کا ارادہ کیا، علمائے سلف کا معمول چلا آ رہا ہے کہ کسی

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری  
سے تعلیم و اجازت حدیث

بڑے عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث پڑھتے ہیں اور اس کی سند لیتے ہیں حضرت مولانا محمد قاسم حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے، حضرت مولانا سہارنپوری حضرت شاہ محمد اسحاق کے تازہ دم مگر اہم شاگرد تھے۔ مولانا محمد قاسم نے حضرت مولانا سہارنپوری سے سنن نسائی مکمل، سنن ابوداؤد کا اکثر حصہ کسی قدر ابن ماجہ اور مؤطا امام مالک پڑھی۔ اور کتابیں بھی پڑھی ہوں گی مگر انکی صراحت نہیں ملی۔ حضرت مولانا سے مذکورہ بالا پہلی تین کتابوں کے پڑھنے کا حضرت مولانا محمد قاسم کی تحریرات و مکتوبات میں مختلف موقعوں پر ذکر ہے اور اس تلمذ اور روایت و اجازت کی حضرت مولانا محمد قاسم کے خاص شاگرد مولانا عبدالعلی میرٹھی نے مدرسہ عبدالرب دہلی میں (جہاں وہ شیخ الحدیث تھے) ایک مرتبہ یوں وضاحت فرمائی تھی:

”وقال لی استاذی، قرأت النسائی کاملا و اکثر سنن ابی داؤد و اول ابن

ماجة عن المحدث العلامة احمد علی السہارنپوری“ (۱)

(۱) مجموعۃ الاسانید العالیہ والشہادات السامیہ، مولانا زید ابوالحسن فاروقی ص: ۱۳۶ (عکس نسخہ مؤلف مملوکہ راقم سطور)

مولانا زید، مولانا عبدالعلی کے براہ راست شاگرد تھے، ایک سال تک مولانا سے پڑھا تھا۔

مولانا عبدالعلی صاحب حضرت مولانا محمد قاسم کو حضرت مولانا احمد علی کا سب سے اہم اور ممتاز ترین شاگرد کہا کرتے تھے، فرمایا:

”قرأت اکثر من كتب الحدیث وغیره عن الفاضل الاجل الشیخ محمد قاسم، وهو من اکبر تلامیذ مولانا احمد علی المحدث السہارنپوری ومع ذلك فله اجازة عن الشیخ عبد الغنی“ (۱)

حضرت مولانا نانوتوی کی حضرت مولانا احمد علی کے حوالہ سے مؤطا امام مالک کی اجازت و سند سنہ ۱۳۵۰ھ تک دارالعلوم دیوبند میں معروف تھی، مولانا عبدالباسط بلیاوی نے اپنے مجموعہ اجازات میں لکھا ہے:

”اخبرنا المتقن الفقیہ المفتی مولانا عزیز الرحمان عن العلامة مولانا محمد یعقوب عن الشیخ العلامة الجلیل مولانا محمد قاسم عن الشیخ الفقیہ المتقن المحدث الولی مولانا احمد علی“ (۲)

مولانا نے صحیح مسلم اور جامع ترمذی کا اکثر حصہ شاہ عبدالغنی کی مجلس درس میں پڑھا اور دونوں کا کسی قدر حصہ دوسروں کی قراءت سے سنا، صحیح بخاری کے آخری ایک تہائی حصہ کی قراءت و سماعت میں شریک رہے، مؤطا امام مالک کا کچھ حصہ مولانا محمد مظہر نانوتوی کی قراءت میں سنا اور تفسیر جلالین پڑھی، حضرت شاہ عبدالغنی نے حضرت مولانا نانوتوی کو عنایت کی ہوئی سند میں تحریر فرمایا ہے کہ:

بسم الله الرحمن الرحيم

”الحمد لله اولاً و آخراً والصلوة والسلام علی نبیہ و صفیہ دائماً و سرمداً و علیٰ آلہ و صحبہ ابدأً ابدأً.

اما بعد: فاقول و بعون الله اصول و احوال و انا اضعف عباد الله القوی عبد الغنی بن ابی سعید المجددی الدهلوی، ان الاخ الصالح الكاظم محمد قاسم

(۱) مجموعۃ الاسانید العالیہ والشہادات السامیہ، مولانا زید ابوالحسن فاروقی ص: ۱۵۸

(۲) مجموعۃ الاسانید الحدیث۔ مؤلفہ مولانا محمد ناصر بن عبدالباسط صدیقی شیخوپوری بلیاوی۔ (فاضل دیوبند)

(مؤلفہ سنہ ۱۲۳۳ھ، مکتوبہ بخط مؤلف سنہ ۱۳۵۰ھ) مملوک نور الحسن راشد

اصح الله شأنه واکمل ایمانه، قد قرأ علی الصحیح لابی الحسین مسلم بن حجاج القشیری النیسابوری وجامع ابی عیسیٰ الترمذی الا القلیل من کتابین، فانه سماع غیره۔ والثالث الآخر من صحیح البخاری با لقراءة والسماع و مؤطا مالک بن انس سمع بعضه بقراءة ابن اخی المولوی مظهر وتفسیر الجلالین قرأ علی۔

فلما رأیت تاهله لدراسة الحدیث لکمال فطانتہ و تمام ذہانتہ: مع صلاحیة الحال فی الاعمال والاقوال والافعال، اجزت له ما تیسر لی من حصول الاجازة من والدی و مرشدی عن الشیخ عبد العزیز المحدث رحمة الله علیهما۔

وکذلک حصل لی الاجازة من محدث دار الهجرة الشیخ عابد السندی فانی قرأت علیہ البخاری وسمعت منه الی کتاب الغسل واجازنی ببقیة الکتب، وقراءة وسمعت علی الناسک المهاجر الشیخ محمد اسحق رحمه الله البخاری والترمذی وغیرهما۔ (۱)

﴿والله الغنی وانتم الفقراء﴾

حضرت شاہ عبدالغنی کے الفاظ سے جھلکتا ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نے شاہ صاحب سے اس وقت پڑھا، یا اجازت لی تھی جب حضرت مولانا کا علماء میں ممتاز مقام اور تعارف تھا اور حضرت مولانا کے علمی کمالات سامنے آگئے تھے۔

یہ تو مولانا کی اس لیاقت ظاہری اور علمی استعداد کا تذکرہ تھا **علم و فضل کی وسعت** جس پر دنیا کا نظام چلتا ہے، کالج و مدارس، علماء اور اہل تصنیف کے یہاں اس کی قدر و منزلت ہوتی ہے لیکن حضرت مولانا کا معاملہ اس سے فزوں تر تھا، ان کا طائر علم ایسا بلند پرواز اور لاہوت آشیاں تھا کہ اچھے اچھے اہل علم کی وہاں

(۱) یہ سند مولانا محمد یعقوب نے بیاض یعقوبی میں نقل کی ہے۔ ص: ۱۶۳ کلاں (طبع اول تھانہ بھون ۱۳۲۹ھ) اصل سند کا عکس سوانح قاسمی تالیف مولانا مناظر حسن گیلانی ص: ۲۶۰ جلد اول (طبع اول دیوبند) میں چھپا ہے۔ بیاض یعقوبی والی نقل میں ایک دو غلطیاں ہیں جس کا اصل سے مقابلہ کر کے تصحیح کر دی گئی ہے۔ نور

رسائی دشوار تھی۔ علم ظاہری کا رسوخ، علم باطن کا خداداد سرمایہ، القائے ربانی کے سانچے میں ڈھل گیا تھا، جس کی روانی اور گہرائی میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا رہتا تھا، جب بھی تحریر و گفتگو فرماتے معلوم ہوتا کہ دریا کا ایک دہانہ کھل گیا ہے، ذرا چھیڑیے اور علم ملکوتی کی سیر کیجئے، اس علم کی نہ ابتداء کی نہایت تھی نہ اختتام کی انتہا، ہمیشہ ایک سرشاری کی کیفیت رہتی اور علوم کا ایک آبشار جاری رہتا تھا، عقلی و نقلی علوم کے سب پہلو ہمہ وقت حاضر اور جملہ مباحث نوکِ زباں تھے۔

بڑے بڑے اہل علم جن کو اپنے علم اور ذہانت پر ناز تھا حضرت مولانا کے علمی افادات سن کر حیران و ششدر رہ جاتے تھے، یہ علم علم لدنی تھا، کسی نہیں دھی تھا، اس کی جلوہ گری کا یہ عالم تھا کہ علوم دین و شریعت ہوں یا فکری عقلی عنوانات، ہر اک میں ذہن کی جولانی کی ایک سی کیفیت رہتی تھی، غالباً کوئی موضوع بھی مولانا کی دسترس سے دور اور رسائی فکر سے باہر نہیں تھا، ہر اک موضوع مولانا کی توجہ کی جولان گاہ اور تحقیق و بصیرت کا محور تھا۔

حضرت مولانا کے علوم کی کیفیت کچھ ایسی ہے سو علوم پر ایک تصنیف کا آغاز

کہ چند سطور بلکہ صفحات میں بھی اس کا تعارف مشکل ہے۔ اس کی وسعت اور ہمہ گیری کا کیا حال تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت مولانا کے ایک خاص دوست اور مکتوب الیہ (مولانا جمال الدین سہنسپوری) نے حضرت مولانا سے گزارش کی کہ ایک ایسی کتاب لکھ دیجئے جو سو علوم پر مشتمل ہو، جس میں علوم عقلیہ پر خصوصاً بحث کی گئی ہو، مولانا جمال الدین نے علوم عقلیہ میں سے ہندسہ ہیئت، فلاح طبعی، جبر و مقابلہ، جراثیم و غیرہا کا بطور خاص ذکر کیا تھا، یعنی ان علوم کے جملہ مبادی، اصول اور کلیدی بحثیں اس میں سمیٹ لی گئی ہوں اور اس کتاب کے ذریعہ سے ان علوم کی تفہیم آسان ہو جائے، حضرت مولانا کو ان کی خاطر عزیز تھی اسلئے بے تکلف وعدہ فرمایا۔ جب مولانا جمال الدین نے اصرار کیا تو غالباً حضرت مولانا نے اپنی عادت اور معمول کے مطابق ایک موضوع پر قلم برداشتہ لکھنا شروع کر دیا۔

یہ صفحات مولانا جمال الدین کو ملے تو انہوں نے حضرت مولانا کو لکھا کہ ہر اک موضوع پر

صرف ایک صفحہ لکھئے، حضرت مولانا نے جواب میں فرمایا کہ میرا قلم مت روکو، اسکو چلنے دو! امت اور دنیا کے علوم کے لئے حسرت اور افسوس کا مقام ہے کہ فرمائش کرنے والوں نے صرف اس موہوم خیال کی وجہ سے کہ حضرت مولانا نے اگر ایک ایک فن یا علم پر اپنے معمول کے مطابق لکھا تو اس کی ضخامت بے پناہ ہو جائیگی اور ان کیلئے اس کی اشاعت ناممکن ہوگی، حضرت مولانا کو اس بڑے کام سے روک دیا (۱) جس کی وجہ سے علم لدنی کا ایک بڑا دروازہ بند ہو گیا اور امت ایک بڑے فیض سے محروم رہ گئی، جس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔ اگر حضرت مولانا نے یہ کتاب مکمل فرمادی ہوتی تو اس میں یقیناً ایسے ایسے مباحث آتے اور علوم کی وہ عقدہ کشائی ہوتی کہ جس سے علم و کمال کی دنیا میں زلزلہ بپا ہو جاتا، اور اس سے پوری دنیا قیامت تک فائدہ اٹھاتی مگر:

و کم حسرات فی بطون المقابر

**تر بیت و اصلاح** حضرت مولانا کو بچپن سے اولیاء اللہ اور بزرگوں سے انسیت تھی، خصوصاً حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر کی سے نوعمری سے وابستگی تھی، حضرت حاجی صاحب کی نانوتہ میں قرابت تھی، حاجی صاحب کا نانوتہ جانا ہوتا تو حضرت مولانا حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے، وہ وقت ابتدائی نگرانی و تربیت کا اور چھوٹی موٹی باتیں سیکھنے کا تھا، حضرت حاجی صاحب اس پر توجہ فرماتے تھے، حاجی صاحب نے حضرت مولانا اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کو کتابوں کی جز بندی سکھائی تھی۔ پھر جب دہلی جانا ہوا اور حضرت مولانا مملوک العلی کے مکان پر قیام اور تعلیم کا انتظام ہوا وہاں بھی حضرت حاجی صاحب کا آنا جانا رہتا تھا، جس کی وجہ سے محبت و عقیدت کا وہ بیج جو وطن کی سر زمین پر اگا تھا، پرورش پاتا رہا، حضرت حاجی صاحب کا حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے ذکر آتا، اسی موضوع پر دونوں اپنی اپنی بات کہتے، اس طرح حضرت حاجی صاحب سے ایک نسبت قائم ہو گئی تھی۔

(۱) تمہید جمال قاسمی۔ مولانا جمال الدین ص: ۱ (مجتبائی دہلی ۱۸۹۵ء)

مولانا کو حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے بھی اس وقت سے محبت و عقیدت تھی جب حضرت مولانا محمد قاسم حضرت مولانا مملوک العلی کے ساتھ دہلی سے نانوتہ یا نانوتہ سے دہلی جاتے تھے، راستہ میں کاندھلہ پڑتا تھا، حضرت مولانا مملوک العلی نے حضرت مولانا مظفر حسین سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ اس راستہ سے گزریں گے تو حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے ملاقات کئے بغیر آگے نہیں بڑھیں گے، اس وعدہ کو حضرت مولانا مملوک العلی نے ہمیشہ اہتمام سے نبھایا، جب نانوتہ یا دہلی جاتے کاندھلہ اترتے اور مولانا مظفر حسین سے ملاقات کرتے، حضرت مولانا مملوک العلی کا ایسا ہی رابطہ حضرت حاجی امداد اللہ سے بھی تھا۔

دونوں بزرگوں میں یہ روابط اور قربت و انسیت ایسی نہیں تھی کہ مولانا کے شاگرد اور وہ عزیز جو ہمہ وقت حضرت مولانا کی تربیت و صحبت میں رہتے تھے (جن میں حضرت مولانا محمد قاسم بھی شامل تھے) متاثر نہ ہوتے، جیسے جیسے وقت گذرتا رہا، حضرت مولانا محمد قاسم کے دل میں دونوں کی محبت و عقیدت کا اثر گہرا ہوتا رہا، خصوصاً حضرت مولانا مظفر حسین کی خدمت میں اکثر وقت گزارتے اور حضرت مولانا کے صفات و کمالات کی نقل کرتے اور انکو اپنے اندر سمونے کی پوری کوشش کرتے، حضرت مولانا مظفر حسین کے فیض صحبت سے مولانا محمد قاسم کی طبیعت پر اتباع سنت کا نہایت گہرا اور پر اثر نقش قائم ہو گیا تھا۔

سر سید احمد نے جو حضرت مولانا محمد قاسم سے اس وقت سے واقف تھے جب حضرت مولانا تعلیم کے لئے دہلی گئے (سر سید احمد کو حضرت مولانا مظفر حسین سے بھی ارادت و محبت تھی، سر سید مولانا مظفر حسین کو چچا صاحب لکھا اور کہا کرتے تھے) اس طویل واقفیت اور تعارف کے پس منظر میں سر سید احمد نے لکھا ہے کہ:

”ان کو جناب مولانا مظفر حسین کاندھلوی کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت راغب کر دیا تھا“ (۱)  
حضرت مولانا نانوتوی نے حضرت مولانا مظفر حسین کی صحبت بابرکت سے اتباع سنت کے علاوہ اور کیا کیا کمالات حاصل کئے اور کونسے انسانی جوہر اور فضائل عالیہ تھے جو

(۱) حضرت مولانا کی وفات پر سر سید احمد کا تعزیتی مضمون۔ مشمولہ سر سید احمد کی تعزیتی تحریریں، مرتبہ اطہر عباس (علی گڑھ)



حضرت مولانا مظفر حسین کی بدولت ترقی پذیر ہوئے اور پروان چڑھے اس کی تفصیل معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ میری دسترس میں نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کاندھلوی کی صحبت سے حضرت مولانا نانوتوی نے بہت کچھ حاصل کیا اور شریعت و سنت کے راستہ پر آگے بڑھتے چلے گئے۔

حضرت مولانا میں فطری صلاحیت اعلیٰ درجہ کی تھی جس کو باکمال بزرگوں کی صحبت و معیت نے صیقل کر کے گوہر آب دار بنا دیا تھا۔ سادگی، تواضع، بے نفسی، اخلاق عالیہ، تعلق مع اللہ، رغبت سنت، استقامت، تورع، زہد، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کی فکر، اور کمالات انسانی کا کون سا جوہر ایسا تھا جو حضرت مولانا کی طبیعت میں نہیں تھا اور حضرت مولانا نے اس کو عمدہ سے عمدہ کرنے کی کوشش نہیں فرمائی، مگر ابھی اس جوہر کو پرکھ کر اس پر اجازت و معرفت کی مہر لگانے کا موقع نہیں آیا تھا، جب حضرت مولانا حاجی صاحب سے بیعت ہوئے تو حاجی صاحب نے غالباً قلیل وقفہ کے بعد حضرت مولانا کو اجازت و خلافت سے نوازا دیا تھا۔

**بیعت و اجازت** | حضرت حاجی صاحب سے کب بیعت ہوئے اور اس کے محرکات کیا تھے اس کا صحیح علم نہیں، تعلیم کے زمانہ میں حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا گنگوہی دونوں کا حضرت شاہ عبدالغنی سے بیعت ہونے کا خیال تھا اس ارادہ پر عمل نہیں ہوا تھا کہ حضرت مولانا گنگوہی تعلیم سے فارغ ہو گئے اور چند روز بعد جب ایک علمی ضرورت سے تھانہ بھون جانا ہوا تو حضرت حاجی امداد اللہ کے زمرہ خدام و مستفیدین میں داخل ہو گئے اور تھانہ بھون کے دوسرے تیسرے سفر میں حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا گنگوہی کو اجازت و خلافت عطا فرمائی۔

حضرت مولانا گنگوہی کے حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہونے کی خبر ملی تو حضرت مولانا نانوتوی نے بھی حضرت حاجی صاحب کے دامن فیض سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کر لیا، حضرت گنگوہی فرماتے تھے کہ:

”مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کرایا اور بعد میں اعلیٰ

حضرت سے اصرار و کوشش کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا“ (۱)  
 حضرت حاجی صاحب کے دامن فیض سے حضرت مولانا کب وابستہ ہوئے تھے  
 اسکی تاریخ نہیں ملی لیکن جناب انوار الحسن شیرکوٹی صاحب کی یہ رائے قطعاً غلط اور بے بنیاد  
 ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت نانوتوی سنہ ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹-۵۰ء) میں حاجی  
 صاحب سے بیعت ہو گئے تھے۔ (۲) قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت گنگوہی و  
 نانوتوی سنہ ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۱-۵۲ء) کے قریب تک حضرت شاہ عبدالغنی کے حلقہ درس میں  
 سے تھے اور حضرت گنگوہی کی روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس وقت تک دونوں کا شاہ  
 عبدالغنی سے بیعت ہونے کا خیال تھا (۳) مگر اس پر عمل نہیں ہوا تھا، اسلئے شیرکوٹی صاحب  
 کی اطلاع درست نہیں، حضرت گنگوہی کے حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہونے کا  
 واقعہ تقریباً سنہ ۱۲۷۰-۷۱ھ (۱۸۵۴-۵۵ء) میں پیش آیا ہوگا، اسکے بعد بظاہر چند ہفتوں  
 یا ایک ڈیڑھ مہینہ میں حضرت مولانا محمد قاسم بھی اس خانقاہ کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔

اجازت نامہ بیعت، مکتوبہ حضرت امداد<sup>رح</sup> آئیں اور حضرت حاجی صاحب

نے کس طریقہ سے سفر سلوک طے کرایا کس طریقہ کی تعلیمات اسوہ راہ تھیں، اس میں ذکر  
 و شغل مجاہدات کی بنیادی اہمیت تھی یا اخلاقی تربیت اور نگرانی کی، اس درمیان حضرت  
 مولانا کی حضرت حاجی صاحب سے خط و کتابت بھی ہوئی یا نہیں اور درمیان کے جو احوال  
 و کیفیات تھیں ان میں سے کسی کا بھی علم نہیں، خیال یہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے  
 حضرت مولانا نانوتوی کو بھی جلد ہی بیعت و اجازت سے نواز دیا ہوگا، کیوں کہ وہاں بھی  
 حضرت مولانا گنگوہی کے معاملہ کی طرح کسی چیز کی کمی نہیں تھی، تمام صلاحیتیں ہر پہلو سے  
 مکمل تھیں، جو کسی مرد خدا کی نگاہ خاص اور توجہ کی منتظر تھیں اور ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ لمحوں میں  
 طے ہو گیا ہوگا۔ لہذا کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا نانوتوی کو بھی بہت جلد اجازت بیعت

(۱) تذکرۃ الرشید، مولانا عاشق الہی میرٹھی۔ حاشیہ ص: ۴۶ (سہارنپور ۱۹۷۷ء)

(۲) انوار قاسمی، ص: ۱۳۲ جلد اول

(۳) تذکرہ الرشید ص: ۴۲ جلد اول

ہوگئی ہوگی، کم از کم یہ بات یقینی ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک (۱۲۷۳ھ) کے بعد حضرت مولانا نانوتوی کو خلافت و اجازت سے سرفراز فرمادیا تھا۔ حضرت حاجی صاحب نے جو اجازت نامہ تحریر فرمایا تھا وہ درج ذیل ہے، ملاحظہ ہو:

”بخدمت مولوی خورشید حسین صاحب واضح باد۔

اگرچہ ایں روسیہ گمراہ ہم سزاوار ایں امر عظیم نیست مگر امتثال امر بزرگان نمودہ اخذ بیعت تبرکاً میکند، لہذا آں برگزیدہ کونین رانیز بطوریکہ ایں مدبر را از بزرگان خود اجازت اخذ بیعت است اجازت دادہ می آید، مناسب کہ ہر کد ام کس طالب کہ رجوع نماید اخذ بیعت نمودہ تعلیم نام خدا نمایند، ہرگز انکار نکند۔ ہدایت کنندہ ہادی مطلق است آنرا کہ فرستاد ہدایت ہم خواند کرد“ (۱) ترجمہ: بخدمت مولوی خورشید حسین صاحب واضح ہو کہ اگرچہ یہ گمراہ سیاہ رو اس بڑی خدمت کا اہل نہیں ہے مگر بزرگوں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تبرکاً لوگوں کو بیعت کر لیتا ہے، اس لئے آں برگزیدہ کونین کو بھی اسی طریقہ کے مطابق جس طرح کے اس نااہل کو اپنے بزرگوں سے بیعت لینے کی اجازت ہے، اجازت (بیعت) دی جا رہی ہے۔

مناسب یہ ہے کہ جو شخص آپ سے رجوع کرے اس کو بیعت کر کے اللہ کے نام کی تعلیم دیں، ہرگز انکار نہ کریں۔ ہدایت دینے والا ہادی مطلق ہے، جس کو چاہتا ہے کہ بھیجے اس کو ہدایت بھی خود ہی کرتا ہے۔

اس خط سے یہ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا کو سنہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے غالباً دو تین سال کے بعد اس وقت خلافت و اجازت عطا فرمائی تھی، جب مولانا روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے اور حاجی صاحب مکہ معظمہ چلے گئے تھے، حاجی صاحب کے مکتوبات میں مولانا سے خورشید حسین کے نام سے انہی خطوط میں خطاب کیا گیا ہے جو ملکہ و کٹوریہ کے معافی کے عام اعلان سے پہلے کے لکھے ہوئے ہیں، اور یہ خط بھی غالباً اسی دوران کا ہے۔

(۱) مرقومات امدادیہ مع مقدمہ ڈاکٹر شہار احمد فاروقی، ص: ۹ (دہلی) ترجمہ نور الحسن راشد کاندھلوی

**ارشاد و تلقین** | حضرت مولانا کا فنائیت، بے نفسی اور گم نامی کا جو مزاج تھا اس میں اس کی تو امید ہی نہیں کہ حضرت مولانا نے حاجی صاحب کی اجازت کا کسی سے ذکر بھی کیا ہو، بہ ظاہر حضرت مولانا گنگوہی یا خود حضرت حاجی صاحب کے ذریعہ سے دوسروں کو اس کا پتہ چلا ہوگا، مگر یہ اطلاع بھی حضرت مولانا کی بے نفس طبیعت پر اثر انداز نہ ہو سکی، حضرت مولانا نے اپنا وہی معمول وہی طریقہ آخر تک باقی رکھا، بہت کم اور مشکل ہی سے کسی کو بیعت فرماتے تھے، جو شاگرد یا متوسلین بیعت ہوئے ان میں کئی عالی ہمت اور صاحب استعداد اصحاب تھے، ان کا سفر طریقت تیزی سے طے ہوا، اور وہ بہت جلد صاحب نسبت ہو گئے تھے، ایسے شاگرد یا اصحاب میں سے جو بھی حضرت مولانا کی نظر میں اجازت و ارشاد کے اہل ہوتے مولانا ان کو مکہ معظمہ بھیج دیتے کہ حضرت حاجی صاحب سے استفادہ کریں، یہ حضرت مولانا کی ایک خاص ادا تھی جس کو حضرت حاجی صاحب خوب جانتے تھے۔ اس لئے حضرت مولانا کے جو مرید و مستفید اس خیال سے مکہ معظمہ حاضر ہوتے، حضرت حاجی صاحب ان کو اجازت و خلافت سے مالا مال فرما دیتے تھے، حضرت مولانا کے جو خلفائے کرام ہیں یا حضرت حاجی صاحب کے خلفاء میں حضرت مولانا کے جو شاگرد ہیں ان کی یہی نوعیت ہے کہ انہوں نے حضرت مولانا نانوتوی کی نگرانی میں سیر سلوک مکمل فرمائی اور حضرت مولانا کے اشارہ پر حضرت حاجی صاحب نے ان کو اجازت بیعت سے نوازا ہے۔

**وعظ و تذکیر** | حضرت مولانا کی صحبت اہل معرفت اور صاحب ذوق اصحاب کیلئے ایک نعمت اور اکیسیر تھی، حضرت مولانا کے متوسلین نیز اور اہل تعلق کا حضرت مولانا سے وعظ و نصیحت کیلئے اصرار ہوتا جس کو حضرت مولانا بہت کم منظور فرماتے تھے، شروع میں وعظ نہ کہتے تھے مگر حضرت مولانا کے مربی حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی نے ایک مرتبہ اصرار کر کے وعظ کہلوا یا، خود بیٹھ کر سنا اور دعاؤں سے نوازا (۱)

(۱) حالات طیب یا تذکرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی مرتبہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم

نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۱۹۰

اس کے بعد وعظ نہ کہنے کا معمول ختم ہو گیا کبھی کبھی وعظ کہتے جو عجیب و غریب ہوتا تھا، اس کے مضامین، طریقہ استدلال اور تاثیر عوام و اعظین کی تقریروں سے بہت مختلف اور نرالی ہوتی تھی۔

سادگی، بے نفسی اور استغناء | حضرت مولانا ہزار کمالات کے باوجود خود کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتے، سادہ معمولی لباس پہنتے، سادگی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ اکثر لوگوں کو شبہ ہو جاتا، وہ مولانا کو معمولی پارچہ باف یا مزدوری پیشہ سمجھ لیتے تھے، بعد میں پتہ چلتا کہ یہی فخر العلماء حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ سے بیعت ہونے کے بعد اکثر مسجد میں رہتے، وہیں ہم مشرب ساتھیوں کے ساتھ کھانا کھاتے وہیں سو جاتے، دنیاوی معاملات و مسائل پر اگرچہ گہری نظر رکھتے تھے مگر اپنا دامن ہر آلودگی سے پاک اور مال و دولت کے خیال سے بھی دور رکھتے تھے، پوری زندگی اسی طرح گذاری کہ جیسے اس دنیا کے رہنے والے ہی نہیں، نہ مال و دولت کی محبت، نہ اس کی طرف توجہ نہ اس کے جمع کرنے کا خیال اور نہ اہل دولت کی کچھ قدر و منزلت، یعنی کن فی الدنيا کانک غریب او عابری سبیل کی حقیقی مثال تھے۔

مطالع میں ملازمت اور تصحیح کتب کی خدمت | اگرچہ حضرت مولانا کی پوری زندگی خدمت دین سے

عبارت تھی، ہمیشہ درس و افادہ، تعلیم و تلقین، اصلاح و ارشاد وغیرہ میں مشغول رہتے تھے، مگر ان میں کسی ذریعہ سے آمدنی کے تصور کو بھی برا سمجھتے تھے، حالاں کہ حضرت مولانا کی علمی لیاقت و صلاحیت اس مرتبہ کی تھی کہ اگر چاہتے تو اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمتیں اور بلند سے بلند سرکاری منصب پیشوائی کے لئے موجود تھے، کون سا بڑا عہدہ ایسا تھا کہ اگر حضرت مولانا اس کو قبول فرما لیتے تو اس کی قدر و منزلت میں اضافہ نہ ہوتا، اور کون سا علمی ادارہ اور منصب ایسا تھا کہ مولانا وہاں بیٹھتے اور اس کو چار چاند نہ لگ جاتے، مگر حضرت مولانا کو کسی

اور بڑے کام کے لئے پیدا فرمایا گیا تھا، جب کبھی حضرت کو عہدہ و منصب کی پیش کش کی گئی، بڑی تنخواہ کی راہ دکھائی گئی تو حضرت مولانا نے اسکو قبول کرنے سے انکار کر دیا، حضرت مولانا نے ان فرمائشوں پر زبانِ حال سے کہا ہوگا، شاید یہی قال سے بھی دہراتے ہوں گے کہ:

برو این دام بر مرغ دگرہ کہ عنقا را بلند است آشیانہ

حضرت مولانا معاش کے لئے مطابع میں تصحیح کتب کی معمولی اور کم تنخواہ کی ملازمت کو پسند کرتے تھے۔

حضرت مولانا نے سب سے پہلے مطبع احمدی دہلی میں ملازمت کی، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی رفاقت میں بخاری شریف کے آخری (غالباً تین) پاروں کے حواشی کی ترتیب و تکمیل میں مشغول رہے، اس کے بعد مطبع مجتبائی (دہلی و میرٹھ) سے وابستہ ہوئے، منشی جی مطبع فروخت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اس زمانہ میں کسی اور مطبع میں ملازمت کی، کچھ دنوں کے بعد منشی جی نے ہندوستان واپس آ کر ایک اور مطبع قائم کیا، جس کا نام مطبع مصطفائی رکھا تھا، اس میں ملازم رہے، صراحت تو نہیں ملی مگر قرآن اور تحریرات سے جھلکتا ہے کہ آخری ملازمت مطبع ہاشمی میرٹھ کی تھی۔

اس دور کے مطابع اور ان کی خدمات

اس زمانہ میں عمدہ پریس قائم تھے، جو اسلامی علوم اور فنی موضوعات پر اہم فاضلانہ کتابیں مقابلہ و تحقیق، حواشی اور ضروری لوازم کے ساتھ شائع کیا کرتے تھے، یہ مطابع بظاہر اشاعتی تجارتی کتب خانے تھے، مگر ان میں سے کئی پریس بڑی علمی اکیڈمیوں کی حیثیت رکھتے تھے، یہاں سے جو کتابیں چھپ کر آتی تھیں، وہ صحت متن، جامع حواشی اور فہم مطالب کے لحاظ سے بے نظیر ہوتی تھیں، ان مطابع میں ایسے ایسے اہل نظر جید علماء اور فضلاء ملازم رکھے جاتے تھے، جو ان میں سے ہر ایک کتاب کے متن کے قلمی نسخوں سے مقابلے اور تصحیح میں ماہر ہوتے اور ان کے مضامین پر اعلیٰ درجہ کی فنی دسترس رکھتے تھے،

اور ان کتابوں کے جلیل القدر مصنفین کی علمی فروگزاشتوں اور مطالب کی درستگی میں طاق ہوتے تھے، اس لئے جو علماء یکسوئی اور خاموشی سے دینی علمی خدمت انجام دینا چاہتے تھے، ان کے لئے درس و تعلیم کے بعد سب سے اہم موقع ان مطابع کی ملازمت کا تھا، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بھی جو زاہدانہ متوکلانہ مزاج اور شہرت و تعارف سے بیزار طبیعت رکھتے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد اسی شعبہ سے وابستہ ہو گئے تھے، اگرچہ تصحیح متون و حواشی کا کام اکثر اوقات درس و تعلیم سے زیادہ اہمیت و نزاکت کا ہوتا ہے اس میں جو جانکاہی ہوتی ہے اس کا اکثر پڑھنے والوں کو اندازہ بھی نہیں ہوتا، پھر اس میں ایسی ناموری اور شہرت بھی نصیب نہیں ہوتی جو درس و تعلیم کے ذریعہ سے ہو جاتی ہے، مگر حضرت مولانا کی قانع طبیعت نے اس کو اور خدمات پر ترجیح دی، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تصحیح کرنے اور حواشی لکھنے والوں کی زیادہ شہرت بھی نہیں ہوتی، ممکن ہے اسی خیال سے مطابع میں حضرت مولانا نے اس خدمت کو ذریعہ معاش بنایا ہو، مگر اس کوشش اور گم نامی کی دلی تمنا کے باوجود حضرت مولانا کو اپنی زندگی میں جو شہرت اور ناموری اور عزت و مرتبہ حاصل ہوا، وہ حضرت کے معاصرین میں سے کم ہی لوگوں کو ملا ہوگا۔

مطابع کی ملازمت سے حضرت مولانا کی وابستگی کی تفصیل تو نہیں ملی، مگر مطبع احمدی سے وابستگی اس سلسلہ کی پہلی وابستگی معلوم ہوتی ہے، اس وقت سے تقریباً تیس چوبیس سال تک مطابع کی ملازمت کی مگر قرآن شریف کی چند اشاعتوں کے علاوہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس لمبے عرصہ میں حضرت مولانا نے کس کس کتاب کی صحت و درستگی فرمائی اور کس کتاب کا حاشیہ اور بین السطور لکھے، اگر کسی ذریعہ سے اس کا پتہ چل جائے تو ان کتابوں بلکہ اور علوم میں حضرت مولانا کی نظر، علمی گہرائی اور گرفت کا کسی قدر تعارف ہو سکتا ہے۔

مطبع کی ملازمت ہو یا کوئی اور مصروفیت سفر و حضر میں طلبہ ساتھ ہوتے اور سبق جاری رہتے تھے، مطابع کی ملازمت اور تصحیح کتب کے زمانہ میں بھی طلبہ کی جماعت استفادہ کے لئے حاضر خدمت رہتی تھی جب ملازمت کے کام سے فرصت پاتے اسباق

شروع ہو جاتے، مطبع احمدی کے دورِ ملازمت کی مصروفیات کا زیادہ سراغ نہیں ملتا، لیکن مطبع مجتبائی کی ملازمت کے زمانہ میں بیشتر وقت درس و تعلیم میں گزرتا تھا۔

حضرت مولانا نے اگرچہ اپنی زندگی خدمت دین اور تعلیم و افادہ کے لئے گویا وقف کر دی تھی، مگر تعلیم کے لئے ملازمت کرنا اور اس کی اجرت لینا گوارا نہیں تھا، جس کسی کو حضرت مولانا سے استفادہ کی تمنا ہوتی وہ خود خدمت میں حاضر رہتا اور بقدرِ ظرف و صلاحیت فائدہ اٹھاتا تھا۔

حضرت مولانا کے غالباً صرف ایک طالب علم یا شاگرد ایسے ہیں کہ ان کو پڑھانے کے لئے حضرت مولانا نے ان کے وطن میں قیام کیا اور اس کے لئے تنخواہ یعنی منظور کی، یہ طالب علم مولانا اسماعیل علی گڈھی ہیں، روایت ہے کہ ان کے والد صاحب کے اصرار پر حضرت مولانا نے علی گڑھ کا سفر کیا تھا، اور وہاں رہ کر مولانا اسماعیل کو صحیحین پڑھائی تھیں، اس خدمت کے لئے صرف پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ لینا طے فرمایا تھا، اس میں سے بھی بعد میں پانچ روپے کم کر دیئے تھے، صرف دس روپے رہ گئے تھے:

”جب تک میں تمہارے یہاں رہوں ماہوار پندرہ روپے مجھے دے دیا کرنا تا کہ گھر بھیج دوں، اس قلیل رقم کو سنکر مولوی اسماعیل شرمندہ تھے، لیکن بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ یہ مسئلہ بجائے تمہارے فیصلہ کے میری رائے کا تابع رہے گا اسی لئے خاموش ہو گئے، کئی ماہ حسب وعدہ پندرہ روپے کی رقم پیش کرتے رہے اسی عرصہ میں ایک دن مولوی اسماعیل جب پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے تو مولانا نے فرمایا کہ میاں اسماعیل جو رقم اب تک تم دیتے تھے اس پر نظر ثانی کی ضرورت پیش آگئی ہے، وہ خوش ہوئے کہ شاید کچھ اضافہ کی منظوری عطا فرمائی جائے گی، لیکن جب ان سے مولانا یہ فرمانے لگے کہ بھائی، پندرہ جو تم دیتے تھے ان میں سے دس تو میں اپنے گھر کے لوگوں کو دیا کرتا تھا اور پانچ روپے (غالباً) والدہ کی خدمت میں پیش کرتا تھا، کل خط آیا کہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا ہے اسلئے اس پانچ کی ضرورت اب باقی نہ رہی“ (۱)

حضرت مولانا کے بعض خطوط سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اپنے اکثر طالب علموں کے

(۱) سوانح قاسمی مولانا مناظر احسن گیلانی ص: ۴۲۹ جلد ۱



کھانے پینے اور ضروری خرچہ کی حضرت مولانا اپنی جیب خاص سے کفالت فرماتے تھے جب سفر ہوتا اس وقت بھی منتخب شاگرد ہمرکاب ہوتے، سفر کے دوران اور قیام گاہ ہر جگہ اسباق اور تعلیم و افادہ کے لئے موقع نکال لیتے تھے۔

تعلیم کے بعد سنہ ۱۸۵۷ء تک دہلی میں قیام کیا، سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد زیادہ وقت روپوشی میں گذرا، اس میں بھی درس اور اسباق کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا اس دور میں بھی حدیث شریف کی اعلیٰ ترین کتابوں خصوصاً صحیحین صحیح بخاری صحیح مسلم کے سبق ہوتے تھے، جس میں شاگرد کی حیثیت سے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی بھی حاضر رہتے تھے (۱) دوسرے سفر حج (شوال سنہ ۱۲۸۶ھ جنوری ۱۸۷۰ء سے سنہ ۱۲۸۷ھ سنہ ۱۸۷۰-۷۱ء تک) کے بعد زیادہ وقت درس حدیث اور تعلیم میں گذرتا تھا، جس میں عجیب و غریب علوم بیان فرماتے تھے۔

حضرت مولانا کے معلوم شاگردوں کی فہرست میں مشکل سے چودہ پندرہ نام ہیں، اگرچہ ان میں سے ہر ایک حضرت مولانا کا فیض یافتہ ہے اور حضرت مولانا کی محبت اور تلمذ سے مالا مال رہا ہے لیکن جن تلامذہ کو حضرت مولانا سے نسبت خاص حاصل ہے اور حضرت مولانا بھی ان کے تلمذ اور صلاحیت و سعادت کا اعتراف فرماتے تھے، ان کے نام ذکر کئے جاتے ہیں:

- |                                    |                                    |
|------------------------------------|------------------------------------|
| ۱- مولانا سید احمد حسن امر وہوی    | ۲- مولانا محمد یعقوب نانوتوی       |
| ۳- مولانا فخر الحسن گنگوہی         | ۴- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن |
| ۵- مولانا عبد العلی میرٹھی         | ۶- مولانا محی الدین مراد آبادی     |
| ۷- مولانا عبد الحق پور قاضوی       | ۸- مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری    |
| ۹- مولانا منصور علی خاں مراد آبادی | ۱۰- مولانا عبد العدل پھلتی         |
| ۱۱- مولانا محمد فاضل پھلتی         |                                    |

(۱) تذکرہ یا حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۲۰۵

حضرت مولانا کے یہی شاگرد نہیں، ان کے علاوہ بھی متعدد شاگرد تھے جن کا عموماً تذکرہ نہیں ملتا، تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

پادریوں اور پنڈتوں سے مناظرے اور دین و شریعت پر

اعتراضات کے جوابات

حضرت مولانا کو اپنی ذات کی نفی، گم نامی کی کوشش اور شہرت سے سخت نفرت تھی مگر جب سنتے کہ کسی دشمن اسلام نے اسلام یا دین شریعت کے کسی گوشہ یا عنوان پر اعتراضات کئے ہیں اور انکے جوابات کا دعویٰ ہے تو بے قرار ہو جاتے تھے اور چاہتے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس کے جوابات دیئے جائیں، یہ جوابات بھی ایسے عالمانہ اور باوقار ہوں کہ اعتراض کرنے والا بھی ان کے وزن کو جانچ لے، سننے والے اور پڑھنے والے سمجھ لیں کہ ان اعتراضات میں کچھ وزن اور حقیقت نہیں، چونکہ ممتاز علماء اور مناظرین جانتے تھے کہ حضرت مولانا کو مبداء فیاض سے وہی علوم کا ایک خزانہ ملا ہے مولانا بعض باتوں کو جس طرح واضح فرماتے ہیں اس کی اس خطہ میں بلکہ دور دور تک کوئی نظیر نہیں، اس لئے ایسے موقعوں پر حضرت مولانا سے گزارش کی جاتی اور حضرت مولانا ان مجلسوں میں تشریف لاتے تو اہل علم و نظر علم و کمال کی ایسی منزلوں سے آشنا ہو جاتے جہاں ان کا طائر خیال بھی پرواز نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت مولانا نے کئی مناظروں اور تقابلی مذاہب ( RELEGIOUS COMPARISION ) کی مجلسوں یا مناظرہ کی مجلسوں میں شرکت فرمائی، ہر ایک میں حضرت مولانا کی تقریر ایک سوغات اور بیش بہا تحفہ ہوتی، جس کے دامن میں اسلامی تعلیمات کے بے نظیر تعارف کے علاوہ غیر مسلموں کے اعتراضات کے ایسے جوابات ہوتے کہ جنکی جامعیت اور قوت کا مخالفین بھی بھری مجلسوں میں اعتراف کر لیتے تھے، ان محفلوں کی جو تقریریں یا جوابات قلم بند ہو کر محفوظ ہو گئے وہ برصغیر کے علمی خزانہ کا ایک نادر حصہ ہیں۔

دہلی میں عیسائیوں کے اعتراضات کے جوابات اور ایک مناظرہ حضرت مولانا طالب علمی کے بعد جب دہلی میں مقیم تھے اس وقت دہلی میں عیسائی مناظرین اور پادریوں کا بہت زور اور چرچا تھا، عیسائی مذہب کے تنخواہ دار مبلغ اور مناظر ہر جگہ کوچہ و بازار میں کھڑے ہو کر عیسائیت کی تبلیغ اور منادی کرتے اور مختلف موضوعات پر علمائے اسلام کو مقابلہ اور مناظرہ کی دعوت دیتے تھے، ان کے مقابلہ کے لئے منجانب اللہ علماء کی ایک طاقتور جماعت سامنے آئی جس نے پادریوں کے شبہات و اعتراضات کے جوابات دیئے اور خود آگے بڑھ کر موجودہ انجیل اور عیسائیت کے موجودہ نظریات و اختلافات کو اس کے جوابات اور اس کی کم زوریوں کو بیان کرنا اور ان کی علمی استدلالی حیثیت کو بے بنیاد ثابت کرنا شروع کر دیا تھا، جس سے عیسائی مبلغوں کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اور وہ خود کو اس بلائے بے درماں یا مدلل تقریروں اور اعتراضات کے سامنے بے بس اور لا جواب محسوس کر رہے تھے۔ اس زمانہ میں جن حضرات نے عیسائیت کے اعتراضات کے جوابات دیئے اور ان کا گلی کوچوں میں تعاقب کر کے ہر جگہ کلمہ حق پہنچایا، ان میں سے ایک اہم ممتاز اور خاص نام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا بھی ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر پادری تارا چند نے مسلمانوں کو مناظرہ کا چیلنج کیا تو حضرت مولانا نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ:

”تم بھی کھڑے ہو کر بازاروں میں کچھ بیان کیا کرو اور جہاں وہ لوگ مقابلہ نصاریٰ بیان کرتے ہیں، ان کی امداد کیا کرو“ (۱)

جب تارا چند سے مناظرہ طے ہو گیا تو حضرت مولانا معمولی آدمیوں کا لباس پہنے بیکسوں کی سی صورت بنائے وہاں تشریف لے گئے، وہاں تارا چند سے گفتگو کی وہ لا جواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ اور میدانِ مناظرہ سے فرار ہو گیا، یہی کیفیت اور مقابلوں اور مباحثوں میں بھی ہوئی۔ ان مناظروں میں دہلی بلکہ ہندوستان کے نامور عالم و مناظر،

(۱) تذکرہ یا حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی مشمولہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم

نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۲۰۹

مولانا سید ابوالمنصور حضرت مولانا کے رفیق و معاون رہتے تھے، حضرت مولانا کی گرفت عقلی کلامی ہوتی تھی، جس کو مولانا ابوالمنصور بائبل کے حوالوں، اختلافات اور بائبل کے مفسرین کے اقوال سے مدلل فرمادیتے تھے، اور حریف کے لئے جواب کا کوئی موقع اور تاویل کی گنجائش نہیں چھوڑتے تھے۔

حضرت مولانا کے ان مناظروں اور ان میں مقابل میلہ خدا شناسی چانداپور | مناظرین اور پادریوں کے خاموش اور نادم و شرمسار ہونے کی اطلاعات یقیناً عام ہو گئی ہوں گی اور حضرت مولانا کے تعارف میں اور کمالات کے علاوہ عیسائیوں سے مناظروں اور اسلام کی بے نظیر تفہیم و تشریح کا بھی اضافہ ہو گیا تھا، اس لئے جب عیسائیوں نے روشن خیال ہندوؤں کے تعاون سے جگہ جگہ تحقیق مذاہب کیلئے جلسوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جن میں ہندوستان میں موجود بڑے مذاہب کے اعلیٰ علمی نمائندے آکر اپنے مذہب کی خصوصیات و امتیازات اور اس کا اس عہد اور آئندہ نسلوں کے لئے ضروری اور مفید ہونا ثابت کرتے تھے۔ ایک جلسہ کار بیچ الثانی ۱۲۹۲ھ (مئی ۱۸۷۶ء) میں ضلع شاہ جہاں پور کے ایک قصبہ چانداپور کے قریب انتظام کیا گیا تھا، حضرت مولانا کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی، حضرت مولانا تشریف لے گئے، حضرت مولانا نے اس جلسہ میں اسلام کے مقاصد، نظریات و عقائد اور اس پر جو چند اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کے اس شان اور دھوم دھام سے جوابات دیئے کہ مخالفین کو بھی تسلیم کئے بغیر گنجائش نہ رہی۔ حضرت مولانا کی اس تقریر یا خطبہ کی بہت شہرت ہوئی اور اس کا علمی استدلالی وزن محسوس کیا گیا، اسلئے جب یہی تقریب دوبارہ منعقد کی گئی تو اس وقت بھی حضرت مولانا کو تقریر کے لئے بلایا گیا۔

خدا شناسی کے دوسرے میلہ میں شرکت | خدا شناسی کا دوسرا میلہ یا جلسہ بیچ الاول سنہ ۱۲۹۳ھ (مارچ ۱۸۷۷ء)

میں برپا ہوا، اس جلسہ میں دوسرے مذاہب کے متعدد رہنماؤں کے علاوہ سوامی دیانند سرسوتی بھی آئے، اگرچہ جلسہ مناظرہ اور سوال و جواب کا نہیں تھا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی

مقررین اور مضامین کی ایسی ترتیب بن گئی تھی کہ اس میں علمائے اسلام کو اس موقع پر کئے گئے اعتراضات کے جوابات پیش کرنے کا بہت اچھا موقع ملا، سوامی دیانند سرسوتی نے جو کچھ کہا اس کے جواب میں مولانا محمد علی پچھرا یونی نے وضاحت کی اور حضرت مولانا نانوتوی نے وجودِ الہی اور توحید کے موضوع پر ایسا واضح مدلل اور دلکش بیان کیا کہ سننے والے عیش عیش کراٹھے، اور جو پادری حضرت مولانا کے حریف اور مقابل تھے ان میں سے بھی ایک کو کہنا پڑا کہ:

”اگر تقریر پر ایمان لایا جاتا تو یہ تقریر خوش ایسی لطیف اور دل میں اثر کرنے والی ہے کہ اس پر ایمان لائیے“ (۱)

اس جلسہ میں حضرت مولانا نے سوامی دیانند سرسوتی کے اعتراضات و سوالات اور پادریوں کے مباحث و موضوعات کے ایسے برجستہ اور غیر معمولی جوابات عنایت فرمائے کہ پادریوں کو جلسہ گاہ سے فرار ہونے کے علاوہ کوئی راستہ نظر نہ آیا، یہاں تک کہ جلدی اور خفت کی وجہ سے اپنی بعض کتابیں بھی وہیں چھوڑ گئے۔

حضرت مولانا اس جلسہ سے نہایت کامیاب واپس ہوئے، حضرت مولانا کی ذات بابرکات سے اس وقت جو تائید دین ہوئی وہ غیر معمولی بات تھی، ایسی جو بعد کے دور اور تاریخ کے لئے ایک سند، نمونہ اور مثال بن گئی۔

رڑکی میں سوامی دیانند سے مراسلت | اسی سال کے (اواخر شوال سنہ ۱۲۹۴ھ اکتوبر ۱۸۷۷ء) میں سفر حج پر گئے،

حج سے واپسی پر سخت بیمار ہوئے یہاں تک کہ زندگی کی امید ختم ہو گئی، مگر پھر اللہ تعالیٰ نے صحت بخشی، مرض سے صحت ہو گئی تھی مگر اس کے بعض حصے اور نہایت کمزوری باقی رہی، اسی میں شعبان سنہ ۱۲۹۴ھ (اگست ۱۸۷۷ء) آ گیا، رجب کی آخری تاریخوں میں آریہ سماج کے بانی اور ہندوستان کے مشہور سوامی اور مبلغ سوامی دیانند سرسوتی رڑکی پہنچے اور وہاں پہنچ کر اپنے معمول کے مطابق اور مذہبوں کی تردید شروع کی اور ایک تقریر میں اسلام پر سخت

(۱) قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ص: ۲۱۴

اعتراضات کئے، اس زمانہ میں حضرت مولانا کی صحت خراب تھی، بخار آتا تھا چند قدم چلنے سے سانس اکھڑ جاتا تھا، اور خشک کھانسی اس قدر تھی کہ بات کرنی مشکل تھی۔

سوامی جی کے اعتراضات کے مقامی مسلمانوں نے جوابات دیئے مگر سوامی جی کہتے تھے میں عام آدمیوں سے بات نہیں کرتا مسلمانوں کا کوئی بڑا عالم مجھ سے بات کرے تو میں بحث اور تبادلہ خیال کے لئے تیار ہوں، رڑکی کے مسلمانوں نے حضرت مولانا سے درخواست کی، حضرت مولانا نے فرمایا کہ میرے یہ شاگرد اس کے جوابات اور اس سے مباحثہ کے لئے بہت ہیں مگر سوامی جی کہتے تھے ”مولیٰ کا سم آئیں تو ان سے بات ہو“ ہر چند کوشش کی گئی کہ اس بیماری میں حضرت مولانا کو تکلیف نہ دی جائے مگر سوامی جی جب کسی طرح تیار نہ ہوئے تو حضرت مولانا نے سفر کا ارادہ فرمایا اور رڑکی پہنچ گئے، سوامی جی کو شاید خیال بھی نہیں ہوگا کہ حضرت مولانا کے رڑکی تشریف لانے کا میرا مطالبہ پورا ہو سکتا ہے، جانتے تھے کہ حضرت مولانا سخت بیمار ہیں ادھر رمضان سر پر ہیں اس لئے سفر ناممکن ہے مگر حضرت مولانا کی دین کے لئے تڑپ اور درد مندی نے اس کیفیت میں بھی سفر کرا دیا، جب حضرت مولانا آگئے تو سوامی جی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، اب کیا کریں، سامنا کریں تو کس منہ سے، ایک سوال کا جواب دینا مشکل، نہ کریں تو چیلے چانٹوں پر سے اثر ختم ہوتا ہے، اس لئے چیلے بہانے شروع کئے، حضرت مولانا نے سوامی جی کو خط لکھ کر ملاقات کر کے اور ہر طرح سے کوشش کی کہ سوامی جی سے انکے اعتراضات اور سوالات پر گفتگو ہو جائے، حضرت مولانا سے ایک ہفتہ خط و کتابت ہوئی مگر سوامی نے چیلے بہانے کر کے اس کا موقع ہی نہیں آنے دیا کہ حضرت مولانا سے گفتگو ہوتی، حضرت مولانا سے خط و کتابت چل رہی تھی کہ سوامی جی بلا کسی اطلاع کے رڑکی سے اچانک چلے گئے، اب بحث و مناظرہ کا موقع ہی باقی نہیں رہا تھا، مگر حضرت مولانا نے اپنی بات پہنچانے کا اہتمام کیا کہ رڑکی کے بازاروں میں سوامی کے اعتراضات و سوالات کے جوابات کے وعظ کہے اور سوامی کی خرافات کی صاف تردید کی۔

سوامی دیانند کے مباحثہ کے چیلنج اور حضرت مولانا کے سفر رڑکی کے نتیجہ میں حضرت

مولانا کے متعدد مکتوبات اور دو تصانیف وجود پذیر ہوئیں، حضرت مولانا ۸ اگست سنہ ۱۸۷۸ء (۱۲۹۵ھ) کو رڑکی پہنچے تھے، اسی دن سوامی جی کو خط لکھا تھا، یہ خط و کتابت دس دن (۱۸ اگست) تک جاری رہی، اسی دوران حضرت مولانا نے سوامی جی کو جو خط لکھے ان میں سے آٹھ خط دستیاب ہیں، مگر جب سوامی صاحب کسی طور بھی مباحثہ و گفتگو پر تیار نہ ہوئے تو حضرت مولانا نے اپنے شاگردوں خصوصاً مولانا فخر الحسن گنگوہی کو ہدایت فرمائی کہ بازاروں اور عوامی مجموعوں میں سوامی کے اعتراضات کے جوابات دو، اس ہدایت پر عمل ہوا، اور خود حضرت مولانا نے بھی سوامی دیانند کے اعتراضات کے جوابات قلم بند فرمائے حضرت مولانا نے سوامی جی کے اعتراضات کے جوابات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان کے علیحدہ علیحدہ جوابات لکھے، سوامی جی کے اسلام پر عام اعتراضات کے جواب میں انتصار الاسلام تالیف کی اور اس اعتراض کے جواب میں کہ مسلمان کعبہ کی پوجا (عبادت) کرتے ہیں قبلہ نما تحریر فرمائی۔ یہ حضرت مولانا کی آخری تالیفی کوشش تھی، اس کے بعد صحت کی خرابی نے اس کا موقع ہی نہیں دیا کہ حضرت مولانا کچھ اور لکھ سکتے، اس تالیف پر وہ باب علم گویا بند ہو گیا جو اس عہد میں خصوصاً اور برصغیر ہند کی اسلامی تاریخ میں عموماً ایک نئی آواز اور نیا علم کلام تھا۔ وکان امر اللہ قدراً مقدوراً۔

حضرت مولانا کی زندگی کا بڑا حصہ بڑی دینی علمی اسلامی خدمات میں بسر ہوا، اور ان خدمات کا ہر ایک پہلو امت مسلمہ خصوصاً ہندو پاک کے

سب سے بڑا اور زندہ جاوید کارنامہ  
مدارس اسلامیہ کا قیام

مسلمانوں کے لئے ہدایت و ترقی کا سامان، بے نظیر تحفہ اور قابل فخر ورثہ ہے مگر حضرت مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ اور غیر معمولی خدمت، جس نے برصغیر ہند میں احیائے اسلام اور ترویج دین و شریعت کے علاوہ امت کی ہدایت و فلاح کا ایک بہت بڑا اور دائمی نفع کا ذریعہ بنا دیا، دینی مدارس کا قیام ہے، سنہ ۱۸۵۷ء میں جنگی اقدام کی ناکامی اور اس کے نتیجے میں پہنچے نقصان سے یہ سبق ملا تھا کہ اب اس ملک میں اسلام اور اسلامی تعلیمات

کو سخت خطرہ درپیش ہے، اگر ابھی سے اس کی تلافی اور انتظام نہ کیا گیا تو آئندہ نسلوں کا دین و ایمان محفوظ رہنا سخت مشکل ہوگا، اس سے حفاظت کی یہی ایک تدبیر ہے کہ جگہ جگہ دینی ادارے اور ایسے مدرسے قائم کئے جائیں جو خود کفیل ہوں، ان کے چلانے کے لئے مسلمانوں کے اپنے تعاون کے علاوہ کسی دوسری امداد اور توجہ کی ضرورت نہ ہو، حکومت کوئی بھی ہو، سرکاری نظام کسی طرح بھی کام کرے، یہ مدرسے اور ادارے اپنے مقررہ راستے پر سفر طے کرتے رہیں، ان مدرسوں میں اس کی کوشش اور محنت کی جائے کہ یہاں سے ایسے افراد تیار ہو کر نکلیں جو امت کی کشتی کے کھیون ہار اور ملت کے درد کا درماں ثابت ہوں، دین و شریعت کے تمام معاملات میں پوری پوری اور صحیح صحیح رہنمائی فرمائیں اور جب امت پر کوئی وقت آ پڑے یا کوئی دشواری پیش آئے تو یہ علماء دینی علوم و شریعت کی مدد سے اس کا بروقت ادراک کر کے اپنی فہم و بصیرت سے اس کا کوئی حل نکال سکیں۔

حضرت مولانا کی یہی فراست اور دور بینی تھی جس کی اساس پر دیوبند میں ایک چھوٹے سے مدرسے (دارالعلوم دیوبند) کی شروعات ہوئی۔ جو بڑھ کر نہ صرف ایک تناور اور گھنیرا درخت بلکہ بجائے خود ایک بڑا گلستاں اور علم و عقل کا ایسا دبستاں بن گیا جس میں تنوع اور رنگارنگی بھی تھی اور ملت کی تمام ضرورتوں، دکھوں اور مسائل کا دانش مندانہ اسلامی حل بھی۔

مدرسہ دیوبند کے بعد حضرت مولانا نے اسی طریقہ پر اور کئی مدرسوں کی بنیاد رکھی جس میں گلاؤٹھی کا منبع العلوم، مظفرنگر کا مدرسہ مرادیہ، مراد آباد کا مدرسہ شاہی ممتاز ہیں، ان کے علاوہ نگینہ میں اور دوسرے مقامات پر بھی مدرسے قائم فرمائے، یہ سلسلہ کچھ ایسا بابرکت ثابت ہوا کہ چراغ سے چراغ جلتے گئے اور سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر ہند میں مسلمانوں کے وجود اور دینی تشخص اور معاملات و مسائل کے لئے جو ایک بڑا خطرہ سامنے آ گیا تھا اس کی بڑی حد تک تلافی ہو گئی، حضرت مولانا کا برصغیر کے مسلمانوں پر یہ اس قدر بڑا احسان ہے کہ اس کی وسعت و گہرائی اور اس کی معنویت کے اظہار کے لئے زبان و بیان کی صلاحیتیں نا کافی اور تشکر و امتنان کے الفاظ بونے معلوم ہوتے ہیں، بس یہی کہا



جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ حضرت مولانا اور ان کے رفقاء کرام اور اس راستے پر چلنے والوں کو پوری امت کی طرف سے اپنے شایان شان اجر و جزا عطا فرمائے اور ان کے مدارج و مراتب بلند کرے اور ان سب پر اپنے فضل و رحمت کی متواتر بارش فرمائے: وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

حضرت مولانا کی تصانیف کی تعداد اور مقدار بہت زیادہ نہیں  
مکتوبات و تصانیف

ہے، مولانا کے سلسلہ تصانیف کی ابتداء صحیح بخاری کے آخری پاروں کے حاشیوں کی تالیف سے ہوئی تھی، اس کے بعد حضرت مولانا نے برسوں تک کوئی کتاب نہیں لکھی (اگر لکھی تو وہ محفوظ نہیں رہی اس کا علم نہیں) راقم سطور کی معلومات میں حاشیہ صحیح بخاری کے بعد حضرت مولانا کی پہلی تحریر جو کتابی صورت میں شائع ہوئی وہ انتباہ المؤمنین ہے، مولانا کی پہلی معروف تالیف ہدیۃ الشیعہ ہے جو شیعوں کے سوالات کے جواب میں ۱۲۹۱ھ میں لکھی تھی، اس کتاب کی ایک ضمنی بحث کو علیحدہ لکھا جو آب حیات کے نام سے شائع ہوئی، یہ حضرت مولانا کی کل باقاعدہ تصانیف ہیں۔

حضرت مولانا کے فکر و خیالات کی اصل ترجمانی اور اس کے تنوع کا اظہار حضرت مولانا کے مکتوبات میں ہوا ہے، جن میں حضرت مولانا کی تقریریں، مناظروں کے برجستہ کہے گئے مباحث، اور وہ مکتوبات اور خطوط کے جوابات ہیں۔ حضرت مولانا کے متوسلین اور ملک کے بڑے علماء مختلف موضوعات اور اختلافی بحثوں اور نظریات کے متعلق سوالات پیش کیا کرتے تھے، حضرت مولانا ان کے جواب میں کبھی کبھی کوئی مفصل تحریر رقم فرمادیتے تو وہ علم کا ایک شعلہ جو الہ محسوس ہوتی تھی، جس میں اس موضوع کے تمام گوشوں پر سیر حاصل گفتگو کے علاوہ اس کے نکات اور نامعلوم پہلوؤں کو بھی حل کرنے کی ایسی کوشش ہوتی جو اس وقت بھی بے مثال تھی اور آج تک بھی اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

حضرت مولانا کے مکتوبات کے موضوع کا دامن اگرچہ بہت وسیع ہے، جس میں قرآن و سنت، فقہ و شریعت، عقائد و کلام کے بے شمار پہلوؤں کی گرہیں کھولی گئی ہیں اور ان مسائل و مباحث کی خاص طور سے تنقید و تحقیق ہے جن کا حضرت مولانا کے دور میں علمی

دینی محفلوں میں چرچا اور تذکرہ تھا، اور یہ ایک بڑا المیہ اور خسارہ ہے جس کا ہماری دینی عملی تاریخ میں بارہا اعادہ ہوا ہے کہ اس عہد کی بڑی اور نادر روزگار شخصیتوں کو وقتی بحثوں اور غیر ضروری اختلافی موضوعات میں الجھا کر ان کے ذہن اور وقت کا ایک خاص حصہ اس میں ضائع کر دیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ شخصیتیں اس مرتبہ کی ہوتی ہیں کہ اگر وہ علوم عالیہ، تفسیر و حدیث اور اسرار شریعت و سلوک پر توجہ فرمائیں تو ان علوم کے بہت سے گوشوں سے پردے اٹھتے، نئے نئے عنوانات اور ایسی تحقیقات سامنے آتیں کہ ایک دنیا ان سے استفادہ کرتی، مگر کیا کیا جائے اس غیر ضروری مصروفیت کی وجہ سے ان کے علوم کا ایک خزانہ قلم بند ہونے سے محروم رہ جاتا ہے، جسکے نتیجے میں امت ایسے بڑے علمی نقصانات سے گذرتی ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

بہر حال حضرت مولانا کے تقریباً ایک سو پندرہ مکتوبات معلوم ہیں، جو پچاس کے قریب مضامین و سوالات کی گرہ کشائی کر رہے ہیں، ان مکتوبات میں سے کئی مکتوب یا کسی ایک موضوع پر دو تین مکتوبات کا مجموعہ ہیں جو حضرت مولانا کی تصنیف کی حیثیت سے چھپ گئے ہیں اور تصانیف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ایسے مکتوبات میں جو تصانیف کے زمرہ میں شامل اور عموماً مطبوعہ دستیاب ہیں، مصابیح التراویح، اجوبہ اربعین، الاجوبۃ الكاملة فی الاسولۃ الخاملۃ، الدلیل المحکم علی قراءۃ الفاتحۃ للمؤتم، توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام، اسرار قرآنی، انتباہ المؤمنین، انتصار الاسلام، تحذیر الناس، تحفہ لحمیہ، تصفیۃ العقائد، ابطال جزء لا تجزی، حق الصریح فی اثبات التراویح، احکام الجمعہ وغیرہ ہیں ان میں سے اکثر کتابوں کے نام بھی ناشرین کے تجویز کئے ہوئے ہیں، نہ حضرت مولانا نے ان کو کتابی صورت میں مرتب کیا نہ ان کے نام طے فرمائے۔

ان کے علاوہ بھی حضرت مولانا کے مکتوبات کا ایک بڑا اور وسیع ذخیرہ ہے، جو علیحدہ علیحدہ مختلف اصحاب نے مرتب کئے تھے جن میں سب سے اہم مجموعہ، قاسم العلوم ہے جو منشی ممتاز علی نے مرتب کیا تھا، یہ مجموعہ چار حصوں میں میرٹھ سے چھپا تھا، لطائف قاسمیہ،

مکتوباتِ قاسمیہ، مکتوباتِ قاسمیہ (دیگر) مرتبہ مولانا عبدالغنی پھلاودی، فراند قاسمیہ، فیوض قاسمیہ، جمال قاسمی حضرت مولانا کے مکتوبات کے معروف مجموعے ہیں لیکن حضرت مولانا کے اور بھی مکتوبات ہیں جو مختلف کتابوں یا خطوط کے مجموعوں میں شامل ہیں۔

ضرورت ہے کہ حضرت مولانا کے تمام مکتوبات کو مضامین کی ترتیب سے مرتب کیا جائے ان کا عمدہ اردو ترجمہ ہو اور ان کو ضروری حواشی کے ساتھ شائع کیا جائے۔

**سفر حج** حضرت مولانا کو تین مرتبہ زیارتِ حرمین کی سعادت میسر آئی، پہلا سفر حج سنہ ۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) کے بعد اس وقت ہوا جب مولانا تحریک سنہ ۱۸۵۷ء میں شرکت کی وجہ سے روپوشی میں وقت گزار رہے تھے۔

اس سفر کی ابتداء ۵ جمادی الاول سنہ ۱۲۷۷ھ (۲ نومبر سنہ ۱۸۶۰ء) کو ہوئی، نانوتہ سے چل کر چھ مہینہ میں ۲۱ رزی قعدہ (یکم جون سنہ ۱۸۶۱ء) کو مکہ معظمہ پہنچے، ایک سال بعد غالباً رمضان المبارک سنہ ۱۲۷۸ھ میں واپسی ہوئی۔

دوسرے سفر حج کا ارادہ اچانک ہوا، مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے الفاظ میں ”چند رفقاء کو ساتھ لے کر حج کر آئے“ اس سفر کیلئے آٹھ شوال سنہ ۱۲۸۶ھ (جنوری ۱۸۷۰ء) کو وطن سے روانہ ہوئے تھے، تقریباً بیس دن تک جہاز کے انتظار میں بمبئی ٹھہرنا ہوا، اسی فرصت اور قیام کے زمانہ میں آبِ حیات کا اکثر حصہ لکھا تھا، مکہ معظمہ پہنچنے کی تاریخ دستیاب نہیں، حج کے بعد ۲۳ رزی الحجہ سنہ ۱۲۸۶ھ ۲۶ مارچ سنہ ۱۸۷۰ء کو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کیلئے روانہ ہوئے، اس سفر میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا، جلد ہی واپس آگئے تھے۔

تیسرا اور آخری سفر حج سنہ ۱۲۹۴ھ میں ہوا، اس سفر میں حضرت مولانا گنگوہی مولانا محمد یعقوب اور احباب و رفقاء کی ایک خاصی بڑی جماعت ساتھ تھی، ۱۰ شوال سنہ ۱۲۹۴ھ (۱۸ اکتوبر سنہ ۱۸۷۷ء) میں وطن سے نکلے اٹاواہ ہوتے ہوئے بمبئی پہنچے، بمبئی سے ذی قعدہ کی پہلی تاریخ (سات نومبر) کو چلے ۱۴ رزی قعدہ کو جدہ کے ساحل پر اترے، حج کے بعد غالباً ۲۵ رزی الحجہ کو مدینہ طیبہ حاضری کے قصد سے روانہ ہوئے پچیس دن مدینہ طیبہ کی مبارک فضاؤں میں گزار کر مکہ معظمہ واپس ہو گئے، اور چند دنوں کے بعد ہندوستان کے

لئے واپس چل دیئے۔

## آخری بیماری اور وفات

آخری حج سے واپسی کے سفر میں جہاز میں بیمار ہو گئے تھے، یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوئی کسی وقت بھی اس

سے پورا افاقہ نہیں ہوا، کبھی آرام کی صورت ہو جاتی پھر بیماری حملہ کرتی جس کی وجہ سے بے انتہا کمزوری ہو گئی تھی مگر اس درمیان بھی معمولات اور درس کا سلسلہ جاری رہا، اسی میں رڑ کی پھر میرٹھ کا سفر ہوا۔

بیماری نے شدت اختیار کر لی تھی اسی حالت میں اپنے استاد حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی مزاج پرسی کیلئے سہارنپور گئے، وہاں جا کر صحت اور خراب ہو گئی بالآخر دیوبند واپس ہوئے، یہ حضرت مولانا کا آخری سفر تھا، سہارنپور سے واپسی سفر آخرت کا آغاز تھی، اسی وقت سے صحت نازک ہوتی چلی گئی، آخری دو دن بے ہوشی اور غفلت کے گزرے، کوئی دوا علاج کارگر ثابت نہ ہوئی، ہر لمحہ مرض بڑھتا رہا، منگل کے دن مکمل غفلت اور بے ہوشی طاری ہو گئی، ۴ جمادی الاول سنہ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ اپریل سنہ ۱۸۸۰ء پنجشنبہ کی صبح کو آخری سانس لیا اور روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔ سخت بیماری کی خبر دور دور تک پہنچ گئی تھی، اسلئے ہر طرف سے آنے والوں کا بڑا ہجوم رہتا تھا، وفات کی خبر بھی بجلی کی طرح پھیلی اور چند گھنٹوں میں ایسا مجمع ہو گیا کہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے مشاہدے اور معلومات کے مطابق ”اتنا مجمع ان بستیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا“ حضرت مولانا کے ایک نیاز مند حکیم مشتاق احمد دیوبندی نے اپنی ایک زمین حضرت مولانا کے دفن اور قبرستان کیلئے اسی وقت وقف کی، اسی میں مغرب کے بعد حضرت مولانا کو دفن کیا گیا، وفات پر ایسا رنج و غم ہوا جسکی مثال دیکھنے میں نہیں آئی تھی، مگر اس وقت بھی سب نے خود پر قابو رکھا اور رونا پیٹنایا کوئی اور کام خلاف شریعت نہیں ہوا۔ کئی لوگوں نے مرثیے لکھے، قطعات تاریخ وفات کہے گئے اور مہینوں غم تازہ رہا۔

رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ.

## [۱۴] حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۳)

حضرت مولانا مملوک العلی کے فرزند ارجمند، ۱۳ صفر ۱۳۲۹ھ / ۲ جولائی ۱۸۳۳ء کو تولد ہوئے، منظور احمد معروف تاریخی نام ہے، وطن کے مکتب میں قرآن شریف پڑھا تقریباً گیارہ سال کی عمر میں والد ماجد کے ہمراہ نانوتہ سے دہلی آئے، والد کے ظن عافیت اور شہرہ آفاق علمی حلقہ میں شریک اور دہلی کالج کے طالب علم رہے، حدیث شریف حضرت مولانا محمد قاسم، حضرت مولانا احمد علی محدث اور حضرت شاہ عبدالغنی سے پڑھی۔

۱۸۵۷ء سے پہلے تک اجمیر بنارس، رڑکی میں سرکاری مدرسوں میں اعلیٰ مدرس رہے ۱۸۵۷ء کے بعد مطبع مجتبائی میرٹھ، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ اور بریلی میں مولانا محمد احسن کے مطبع صدیقی سے وابستہ رہے۔

مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) قائم ہونے کے بعد بریلی سے دیوبند آ گئے تھے، مدرسہ کے مدرس اول مقرر کئے گئے اور آخری لمحات تک اسی عہدہ پر فائز اور مدرسہ کی علمی تعلیمی ترقی میں مشغول رہے۔

۲ ربیع الاول ۱۳۰۳ھ (۱۰ دسمبر ۱۸۸۵ء) شب دوشنبہ کو نانوتہ میں وفات ہوئی وہیں دفن کئے گئے مفصل حالات باب نمبر (۲۰) میں حضرت مولانا مملوک العلی کی اولاد واحفاد کے تعارف میں گذر گئے ہیں۔

## [۱۵] مولانا محمد احسن نانوتوی (۴)

مولانا محمد احسن کا مولانا مملوک العلی کے خانوادہ بلکہ گھرانہ سے قریبی رشتہ تھا، مولانا محمد احسن کے والد شیخ لطف علی نانوتوی حضرت مولانا مملوک العلی کے چچا شیخ محمد حسن کے بیٹے اور مولانا محمد مظہر نانوتوی کے چھوٹے بھائی تھے، یعنی مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد احسن

مولانا مملوک العلی کے بھتیجے تھے۔

مولانا محمد احسن کا صحیح سنہ ولادت معلوم نہیں، تقریباً سنہ ۱۲۲۱ھ (۱۸۲۵-۲۶ء) میں ولادت ہوئی، بچپن کے حالات اور ابتدائی تعلیم درسیات کی کیفیت بھی معلوم نہیں، متوسط سے اعلیٰ درجوں تک مولانا مملوک العلی سے پڑھا، مولانا احسن کے دل میں حضرت مولانا مملوک العلی کا کس قدر احترام تھا اس کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت مولانا کو جناب اعلیٰ حضرت یا حضرت مولانا صاحب کے تعظیسی الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ (۱)

مولانا محمد احسن نے مولانا سبحان بخش شکار پوری کو بھی اپنا استاد لکھا ہے، مولانا شکار پوری دہلی کالج میں مدرس دوم تھے اس لئے قرین قیاس ہے کہ مولانا محمد احسن نے دہلی کالج میں بھی پڑھا ہو۔ اپنے معاصرین اور ہم وطن علماء اور عزیزوں کی طرح حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددی اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے پڑھی۔ حصین کی سند و اجازت حضرت شاہ عبدالغنی کے علاوہ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا سبحان بخش شکار پوری سے تھی۔

مولانا محمد احسن کے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر بنارس کالج میں ملازمت بنارس | عربی کے مدرس اول تھے، جب مولانا محمد مظہر سنہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں حج کیلئے جانے لگے تو مولانا نے اس ملازمت پر مولانا محمد احسن کو عارضی طور پر اپنے قائم مقام کی حیثیت سے مقرر کر دیا تھا، مگر مولانا محمد مظہر کو اس سفر میں توقع سے زیادہ وقت لگا، مولانا ایک سال کی رخصت لے کر گئے تھے مگر وقت مقررہ پر واپس نہ آسکے، سفر میں دو سال نکل گئے تھے اور رخصت کے وقت پر ایک سال زائد گذر گیا تھا، اس لئے مولانا اس کام پر واپس نہیں گئے، مولانا محمد احسن کا تقرر جو عارضی تھا اس کو مستقل کرا کر خود اس فکر سے یکسو ہو گئے۔

مولانا محمد احسن شوال ذی قعدہ ۱۲۶۸ھ (اگست ۱۸۵۲ء) تک بنارس کے مدرسہ میں کام کرتے رہے، غالباً اسی سال کے آخر میں بنارس سے بریلی کالج میں آگئے تھے۔ (۲)

(۱) ملاحظہ ہو مولانا محمد احسن نانوتوی، ایوب قادری ص: ۲۲، ۲۳، ۲۴ (کراچی ۱۹۶۶ء) (۲) ایضاً ص: ۳۳۵، ۳۳۸

بریلی میں ملازمت و تقرر مولانا کی زندگی کا ایک بڑا اور اہم سنگ میل ہے، اگرچہ بنارس کی ملازمت کے دور میں بھی مولانا علمی کاموں سے دور نہیں تھے لیکن بریلی پہنچ کر ان میں جو تیزی، سرگرمی اور رنگارنگی آئی بنارس میں اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا، بریلی پہنچ کر مولانا کی مخفی صلاحیتیں بیدار ہو گئیں، اور ان کے ایسے جوہر کھلے کہ اہل نظر علماء اور مولانا کے معاصرین بھی دنگ رہ گئے ہوں گے۔

بریلی کا دور ملازمت مولانا کی خدمات، ترقیات، علمی تصنیفی کارناموں اور عملی جدوجہد کے شباب کا دور تھا۔ جس میں میدانی جدوجہد بھی تھی، تعلیم و افادہ بھی تھا، تصنیف و تالیف بھی اور اصلاح و تبلیغ بھی، اس وقت مولانا متنوع بلکہ متضاد کاموں کو اس خوبی سے انجام دے رہے تھے کہ حیرت ہوتی ہے۔ مولانا اس وقت ایک مدرس، سرکاری مدرسہ یا کالج کے استاد ہی نہیں تھے بلکہ بڑے عالم اور علاقہ کے نامور مرجع اور مقتدا تھے، بریلی شہر کے امام عید گاہ اور مفتی تھے، اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے، پایہ کے مصنف و مترجم تھے، اہم ترین علمی کتابوں کے مرتب و محقق اور ناشر تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے پارکھ، قلمی نسخوں کے رمز آشنا اور اُنکے صحیح و غلط کے رازداں تھے۔ ایک مدرسہ کے بانی و نگران اور ایک ہفت روزہ اخبار کے مدیر و سرپرست بھی تھے۔

مولانا کو بریلی کالج میں فارسی کا مدرس بنایا گیا تھا بعد میں جب عربی کا شعبہ قائم ہوا تو اس کے بھی سربراہ بنا دیئے گئے، غالباً آخر تک دونوں شعبے مولانا کی سرپرستی میں کام کرتے رہے۔

بریلی میں مولانا نے بھرپور اور نہایت مصروف وقت گزارا۔ مولانا اپنے علمی اشاعتی، تصنیفی کام میں مشغول تھے کہ سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳-۷۴ء) میں، مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے والد مولوی علی نقی خاں (۱) نے مولانا کے خلاف ایک عوامی محاذ کھول دیا، عوام میں سخت شورش بھڑکائی، جس نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی مگر مولانا محمد احسن نامساعد حالات کے باوجود بریلی میں رہتے رہے، لیکن جب سنہ ۱۸۷۷ء

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے مولانا محمد احسن نانوتوی، ایوب قادری ص: ۸۳، ۹۱۳

(۱۲۹۴ھ) میں بریلی کالج ناقابل برداشت مصارف کی وجہ سے بند کر دیا گیا تو مولانا محمد احسن اور ان کے بھائی مولانا محمد منیر جن کے دم سے بریلی میں علمی دینی حرکت اور علمی کارواں میں حرارت و قوت تھی، سب کام ختم کر کے اپنے وطن نانوتہ واپس آ گئے تھے، اس کے بعد اکثر وقت نانوتہ میں قیام رہا۔

مولانا کی علمی تصنیفی خدمات | مولانا محمد احسن کو زمانہ تعلیم سے تحریر و تالیف سے مناسبت اور دلچسپی تھی، جب مولانا دہلی میں

پڑھتے تھے اس زمانہ میں نیچرل فلاسفی پر اردو میں ایک کتاب لکھی تھی جو ایک سو تیس صفحات پر مشتمل تھی، اس کے دوائڈیشن دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی دلچسپی سے چھپے تھے (۱) دوسری تالیف تحفة المحصنین ہے جس میں ان عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح منع ہے، یا ان میں سے دو کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے، یہ کتاب بنارس میں تقرر کے دو سال بعد سنہ ۱۲۶۳ھ میں عیدین کے درمیان (اکتوبر، دسمبر ۱۸۴۷ء) میں لکھی تھی، جو پہلی مرتبہ مصطفائی لکھنؤ سے شائع ہوئی (۲) اس وقت سے مولانا کے قلم کا سفر ہمیشہ جاری رہا اور ہمیشہ بہتر سے بہتر کی جانب دوڑتا اور ترقی کرتا رہا۔

مولانا نے دس گیارہ کتابیں لکھیں، تقریباً اسی قدر کتابوں کے ترجمے کئے اور اتنی ہی کتابوں کی تصحیح و تحقیق کی اور ان پر حاشیے لکھے۔ مولانا کی اردو تصانیف نافعہ خریداران (جس میں خرید و فروخت کے مسائل آسان زبان میں لکھے ہیں) رسالہ عروض، قواعد اردو (حصہ چہارم) اور نیچرل فلاسفی ہیں۔ حضرت نانوتوی کی مشہور کتاب تحذیر الناس بھی مولانا محمد احسن کی مرتبہ ہے، عربی میں مولانا کی تالیف مفید الطالبین بہت مشہور ہے جو مدارس اسلامیہ کے ابتدائی درجوں کے نصاب میں آج بھی شامل ہے، فقہ الیمن پر مفصل حاشیہ، اسی طرح کنز پر نہایت عمدہ مفصل حاشیہ مولانا کی علمی تصنیفی یادگار ہے۔

(۱) مولانا محمد احسن نانوتوی، ایوب قادری، ص: ۲۵۔ ایک نادر مجموعہ مکاتیب (مکتوبات مشاہیر علمائے عصر بنام

اسپرنگر پرنسپل دہلی کالج مرتبہ ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی) ص: ۹۹۔ ماہی اردو کراچی شمارہ دوم ۱۹۸۵ء

(۲) تحفة المحصنین اور نافع خریداران کی پہلی طباعتوں کا ایک ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے۔



**اردو ترجمے** | مولانا نے تقریباً دس کتابوں کا عربی یا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا، جن میں چند بہت بڑی بڑی اور غیر معمولی علمی کتابوں کے ترجمے بھی ہیں اور چھوٹی کتابوں کے بھی۔ بڑی کتابوں میں حضرت امام غزالی کی احیاء العلوم کا مکمل اور بہترین عمدہ ترجمہ مذاق العارفین کے نام سے بڑی چار جلدوں میں چھپا۔ علامہ ابن قیم کی تبعد الشیطان بہ تقریب اغثة اللہفان کا ترجمہ تہذیب الایمان کے نام سے شائع کیا، حصن حصین کا خیر متین کے نام سے سلیس اردو ترجمہ کیا، حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات عقد الجید فی الاجتہاد و التقلید اور الانصاف کے سلیس مروارید اور کشف کے نام سے عمدہ اردو ترجمے کئے، حضرت مجدد الف ثانی کی تالیف اسرار الصلوٰۃ کا نکات نماز کے نام سے ترجمہ کیا، انگریزی کی ایک کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ جس کا نام حمایت الاسلام ہے۔ ترجمہ کے سلسلہ میں مولانا کی ایک بڑی دینی علمی یادگار بلکہ کارنامہ حضرت مولانا خرم علی کے درمختار کے اردو ترجمہ کی تکمیل اور اشاعت ہے، مولانا خرم علی بلہوری نے درمختار کا اردو ترجمہ کیا تھا جو نامکمل تھا، اور ناقص ہونے کی وجہ سے اس کے چھپنے کی بھی اُمید نہیں تھی، مولانا محمد احسن کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے مولانا خرم علی کے وارثوں سے حق تصنیف ادا کر کے یہ ترجمہ خریدا، پھر اس کے نام تمام حصہ کو اسی نہج پر مکمل کیا، مختصر حاشیے لکھے اور اس کو غایۃ الاوطار ترجمہ اردو درمختار کے نام سے چار بڑی جلدوں میں شائع کر دیا۔

مولانا خرم علی بلہوری نے جو ترجمہ کیا تھا اس میں باب الاذان سے کتاب الصلوٰۃ تک کا ترجمہ شامل نہیں تھا، مولانا محمد احسن نے اس باب کا مکمل ترجمہ کیا اور مولانا خرم علی کے ترجمہ پر نظر ثانی کی۔ اس بڑے کام میں مولانا محمد احسن کے بڑے بھائی، مولانا محمد مظہر شروع سے آخر تک شریک اور مولانا احسن کے معاون و مددگار رہے۔

**تصحیح و حواشی اور تدوین متن** | ترجموں کے علاوہ مولانا احسن کی ایک اور قابل ذکر دینی خدمت چند بڑی کتابوں کی وقت نظر سے تصحیح کے بعد اشاعت اور ان کے ضروری حاشیے لکھنے کی ہے، مولانا نے قاضی عیاض کی شہرہ

آفاق تصنیف شفاء کو مرتب کیا، اس کے متن کی تصحیح کی اور مختصر حاشیے کے ساتھ اپنے مطبع صدیقی سے شائع کر دیا۔ کنز الدقائق پر بھی بہت مبسوط اور جامع حاشیہ لکھا، کنز پر ہندوستانی علماء کے جو حاشیے چھپے ہیں ان میں مولانا محمد احسن کا حاشیہ سب سے جامع اور بہتر معلوم ہوتا ہے۔ انکے علاوہ بھی متعدد کتابوں کو اپنے افادات و تصحیحات سے گراں بہا بنایا۔

مولانا نے حضرت شاہ ولی اللہ کی اہم کتابوں کی تصحیح و اشاعت کا بڑا کارنامہ نہایت عمدہ طریقہ سے انجام دیا۔ حضرت شاہ صاحب کی دو کتابوں کے ترجمہ کا ذکر آچکا ہے، ان

## حضرت شاہ ولی اللہ کی کتابوں کی تصحیح و اشاعت

کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کی اہم اور ممتاز ترین تصانیف میں سے تین کتابیں حجة اللہ البالغہ، ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء اور قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین بہت محنت توجہ اور تبحر و تحقیق کے بعد شائع کیں۔

حجة اللہ البالغہ اور ازالة الخفاء کی طباعت مولانا منشی جمال الدین کتانوی مدارالمہام ریاست بھوپال کی ہدایت پر منشی جی کے صرفہ سے عمل میں آئی تھی۔ منشی جی نے ان کتابوں کی طباعت کے اخراجات کے علاوہ ان کے قلمی نسخوں کی فراہمی کی بھی کوشش کی، مولانا نے دونوں کتابوں کے قلمی نسخوں (حجة اللہ البالغہ کے چار اور ازالة الخفاء کے تین) کو سامنے رکھ کر ان کا متن مرتب کیا، ضروری جامع اور مختصر حاشیہ لکھا، نہایت عمدہ کتابت کرائی، ایسی کہ اس زمانہ میں اس کی نقل بھی آسان نہیں۔ مشکل مقامات پر اعراب لگائے اور دونوں کتابوں کو جملہ خوبیوں سے مرصع کر کے چھاپا، یہ بات دلچسپ اور قابل ذکر ہے کہ ان دونوں اہم ترین نہایت دقیق علمی کتابوں کا کاتب ایک غیر مسلم (مٹھولال) تھا۔

اس کے علاوہ شاہ صاحب کی ایک اور کتاب قرۃ العینین ہے۔ مولانا بریلی سے نانوتہ واپسی کے بعد بھی ہمیشہ علمی کاموں میں لگے رہتے تھے، اس زمانہ میں مولانا نے جو کتابیں مدون و مرتب کیں یا انکے ترجمے کئے وہ مطبع مجتہائی سے چھپے۔ قرۃ العینین کو تین

قلمی نسخوں کی مدد سے جن میں سے ایک سنہ ۱۲۲۹ھ کا لکھا ہوا تھا مرتب کیا، اپنے قدیم علمی معمول کے مطابق اسکی مشکلات کو حل کیا اور اس پر مختصر حاشیہ بھی لکھا، قرۃ العینین کا یہ نسخہ مطبع مجتبائی سے سنہ ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲-۹۳ء) میں چھپا تھا چند سال پہلے اسکا عکس پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ حسن حصین کا اردو میں ترجمہ کیا جو خیر متین کے نام سے شائع ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے سلسلہ تصانیف و طباعت کی خدمت میں مولانا کا ایک اور کام بھی قابل ذکر ہے، مولانا نے مطبع مجتبائی کی فرمائش پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے مجموعہ فتاویٰ کی قلمی نسخوں سے مطابقت و تصحیح کی اور اس کو لائق اشاعت بنایا۔ یہ نسخہ پہلی مرتبہ سنہ ۱۳۱۴-۱۵ھ میں مطبع مجتبائی سے چھپا تھا (۱) اس کے بعد بھی کئی بار شائع ہوا ہے۔

برصغیر ہند میں اعلیٰ درجہ کے جو چند اشاعتی دینی علمی ادارے قائم ہوئے جن کی مطبوعات و خدمات سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور ہمیشہ آنکھوں سے لگائی جاتی ہیں اور جو حسن طباعت

مولانا کا مطبع صدیقی بریلی  
اور اس کی مطبوعات

کے علاوہ صحت، حسن کتابت اور اپنی دوسری خوبیوں میں بھی ممتاز ہیں انھیں میں مطبع صدیقی بریلی بھی شامل بلکہ سرفہرست ہے۔ مطبع صدیقی مولانا محمد احسن نے قائم کیا تھا مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا محمد منیر حسن اس کے مہتمم تھے، کتابوں کی تصحیح و تحقیق اور حاشیہ وغیرہ کا کام مولانا محمد احسن انجام دیتے تھے۔ مطبع صدیقی نے مولانا احسن کی کتابوں کے علاوہ دینی، علمی، اصلاحی، درسی، تاریخی ادبی موضوعات پر بیسیوں کتابیں شائع کیں، جن میں صحت کا اہتمام اور طباعت و کتابت کی عمدگی ایک مشترک وصف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا محمد احسن نے یہ پریس قائم کرنے سے پہلے ہی کتابوں کی تجارت و اشاعت شروع کر دی تھی بعد میں مطبع قائم کیا، اس مطبع کی ابتداء کب ہوئی اس کا صحیح علم نہیں، قیاس ہے کہ محرم سنہ ۱۲۷۹ھ (جولائی ۱۸۶۳ء) میں آغاز ہوا ہوگا، مولانا کی

(۱) نادائی عزیزی کی سب سے پہلی طباعت کا راقم کو علم نہیں لیکن پہلا اردو ترجمہ غالباً وہ ہے جو مولانا ملا نواب رامپور مہاجر کی اور عبد الجلیل نعمانی نے ۱۳۱۱ھ میں کیا تھا جو پہلی مرتبہ رمضان ۱۳۱۳ھ میں مطبع کنز العلوم حیدرآباد سے چھپا تھا۔

بیاض میں اس پریس کا پہلا تذکرہ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۹ھ (ستمبر ۱۸۶۲ء) کی ایک تحریر میں ہے۔ مطبع صدیقی کو صرف اشاعتی ادارہ کہنا اچھا معلوم نہیں ہوتا، جس کو بلا تامل ولی اللہی اکیڈمی اور برصغیر ہند کے مایہ ناز علمی اشاعتی تحریری اداروں میں ذکر کیا جاسکتا ہے۔ مطبع صدیقی نے سنہ ۱۲۷۹ھ سے سنہ ۱۲۹۵ء تک تقریباً سولہ برس کام کیا، جب بریلی میں مولانا کے خلاف شورش بھڑکانی گئی اور پھر بریلی کالج بھی ختم ہو گیا جس سے مولانا وابستہ تھے، تو مولانا مطبع کا کام ختم کر کے نانوتہ واپس آگئے تھے۔ (۱)

مولانا کا ہفت روزہ احسن الاخبار، بریلی | مولانا محمد احسن نے بریلی سے ایک ہفت روزہ اخبار بھی جاری

کیا تھا جس کا نام مولانا کے نام پر احسن الاخبار تھا، احسن الاخبار محمد اشرف کی اطلاع کے مطابق ۲۲ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۹ھ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۲ء سے چھپنا شروع ہوا تھا عموماً جمعہ کو چھپتا تھا اس کی سالانہ قیمت سات روپے دس آنے تھی (۲) افسوس اس اخبار کے شمارے اور اس کے متعلق مفصل معلومات دستیاب نہیں۔

بریلی میں متعدد بڑے علماء موجود تھے جو اپنی اپنی جگہ درس و تعلیم میں مشغول رہتے تھے، مولانا محمد احسن

مولانا کے قائم کئے ہوئے مدرسے  
مصباح التہذیب اور مصباح العلوم، بریلی

کی صلاحیتوں کا بھی اسی میدان میں آغاز ہوا تھا، مولانا نے بریلی پہنچ کر اپنی اور مصروفیات کے ساتھ ایک دینی مدرسہ کی بھی بنیاد ڈالی، جس کا سنہ ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں آغاز ہوا اس کا نام مصباح التہذیب رکھا گیا، مدرسہ کے پہلے مہتمم مرزا غلام قادر بیگ تھے مگر مولوی احمد رضا کے والد مولوی نقی علی خاں کی مخالفت کی وجہ سے مدرسہ پر بھی اثر پڑا، بعد میں مولانا محمد احسن نے اس کا نام بدل کر مصباح العلوم کر دیا، جو کسی نہ کسی صورت میں

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے مولانا محمد احسن نانوتوی، ص: ۱۴ (لکھنؤ ۱۸۸۸ء) نیز مولانا محمد احسن نانوتوی، ص: ۷۹

(۲) اختر شہنشاہی۔ محمد اشرف ص: ۱۴ (لکھنؤ ۱۸۸۸ء) نیز مولانا محمد احسن نانوتوی ص: ۷۹

اب تک موجود ہے اور چل رہا ہے۔

جب مولانا بریلی سے نانوتہ آگئے تو نانوتہ میں مدرسہ احسن المدارس، نانوتہ

احسن المدارس کے نام سے ایک مدرسہ شروع کر دیا، جس کو مولانا منشی جمال الدین کی بدولت بھوپال سے امداد ملتی تھی، یہ مدرسہ سنہ ۱۹۳۷ء تک قائم رہا، جب سنہ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی وزارت قائم ہوئی تو کانگریس کے بعض کارکنوں نے مدرسہ کو ختم کر کے یہاں پر انگری اسکول قائم کر دیا۔ انا لله وانا الیہ راجعون۔

مولانا کو بنیاد اور نشانہ بنا کر چند لوگوں کی علمائے دیوبند کے خلاف الزام تراشی اور مخالفت، جو بریلی اور دیوبند کے قضیہ کی

### بنیاد اور اصل وجہ ہے

اوپر گذر گیا ہے کہ مولانا احسن بریلی میں علم و عمل کے ہر اک دائرہ میں سرگرم تھے، مولانا بریلی آئے اور وہاں کی دینی علمی فضاؤں پر چھا گئے، مولانا کے حسن عمل، کوشش اور اخلاص کی وجہ سے اہل شہر بھی مولانا کے نیاز مندوں میں شامل ہو گئے تھے، یہاں تک کہ مولانا بریلی کے مرجع اور مقتدا ہو گئے، شہر کی عیدین کے امام بن گئے، رویت ہلال کا فیصلہ بھی مولانا کے فتوے پر ہوتا اور دینی مسائل میں بھی مولانا کا فتویٰ معتمد تھا، مولانا کی اس پذیرائی کی وجہ سے مولانا کے خانوادہ کے کئی اہل علم و فضل اصحاب مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا فضل الرحمان دیوبندی اور شیخ الہند کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ایک ایک کز کے سب بریلی میں جمع ہو گئے تھے اور وہاں علم و عمل کی تابناکی میں اضافہ کر رہے تھے، شہر کے جو پرانے علماء تھے یا اور اہل درس و افادہ جو شہر میں پہلے سے دینی خدمتوں میں مشغول تھے وہ بھی ان حضرات کے مدارج تھے، یہ سب صاحبان آپس میں روابط رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے مددگار و دم ساز تھے، کوئی اختلاف

وانتشار نہ تھا، معاشرت اور کشاکشی سے محفوظ تھے۔ بریلی کے علماء میں احمد رضا فاضل بریلوی کے والد، مولوی علی نقی خاں بھی شامل تھے، وہ عیدین کی نمازیں مولانا کی امامت میں پڑھتے تھے، مولانا کے بریلی کے قیام کے زمانہ میں مولوی علی نقی خاں کی دو کتابیں چھپیں، دونوں میں حضرت مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم کی تحسین کی تھی مگر شاید موصوف کو مولانا کے عروج و اقتدار سے ناگواری تھی، بریلی کی عیدین کی امامت اور مذہبی قیادت اپنے لئے چاہتے تھے، مگر مولانا جیسی بڑی علمی شخصیت کے ہوتے ہوئے ان کو کون پوچھتا، انکی یہ حسرت دل کی دل میں رہی جا رہی تھی اور وہ مولانا کے خلاف آواز اٹھانے اور شورش برپا کرنے کیلئے کسی موقع کی تلاش میں تھے لیکن کوئی ایسی بات نہیں ملی تو انہوں نے لکیر کو سانپ بنا کر دکھانے کا ارادہ کر لیا اور بد قسمتی سے اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔

اس وقت تک نہ اہل بریلی کو نہ بریلی کے عمائد و علماء کو دیوبند کے بزرگوں اور علماء سے کچھ پر خاش تھی نہ اختلاف و منازعت، تاہم بدایوں کے چند علماء مولوی فضل رسول بدایونی اور ان کے چند ماننے والے شاہ ولی اللہ اور اس خانوادہ کے علماء خصوصاً حضرت شاہ محمد اسماعیل کے نظریات و عقائد کی تردید میں برسوں سے مسلسل لکھ رہے تھے، لیکن یہ بھی اک واقعہ ہے کہ بدایوں اور نواح کے اکثر علماء اور مشائخ اس قضیہ میں غیر جانبدار رہے اور جس طرح بدایوں میں مولوی فضل رسول کے ہم نواؤں کا ایک حلقہ تھا اسی طرح خاندان ولی اللہی کے منتسبین کی بھی ایک جماعت تھی جو اپنی اپنی جگہ دینی خدمت انجام دے رہی تھی اور خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ سے دین و اعتقاد صحیح کی جو دولت ملی تھی اس کو عام کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ مولوی علی نقی شاید تنہا شخص تھے جو اس ماحول کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں اختلاف عام ہو، رواداری اور یگانگت کا یہ ماحول ختم ہو۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لئے ایک بہانہ تلاش کر لیا جس کے ذریعہ سے یہی نہیں کہ مولوی محمد احسن کے خلاف سخت ہنگامہ کیا، بلکہ علمائے دیوبند کے خلاف بھی ایک مستقل مجاہد قائم کر لیا جو اب بھی جاری اور سرگرم ہے۔

## وجہ اختلاف و منافرت

ہوا یہ کہ بدایوں کا وہ گھرانہ جو مولوی فضل رسول بدایونی کے متوسلین میں تھا اس کے ایک فرد مولوی عبد القادر

بدایونی کا مولانا امیر احمد سہوانی سے امکان و امتناع نظیر کے موضوع پر سنہ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں بدایوں کے قصبہ شیخوپور میں مناظرہ ہوا تھا، فریقین کی تحریروں کو مولانا محمد نذیر سہوانی نے مرتب کر کے مناظرہ احمدیہ کے نام سے شائع کر دیا تھا، اس مناظرہ میں اثر ابن عباس ان اللہ خلق بسبع ارضین فی کل ارض آدم کا دمکم بھی زیر بحث آیا تھا، مرتب رواد مولانا نذیر صاحب نے اس کتاب کے آخر میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ:

”مولوی محمد احسن صدیقی نانوتوی بھی اس (صحت اثر ابن عباس) کے معتقد ہیں اور اسی

مضمون پر ان کی مہر ثبت ہے اور اسی کے اور علمائے دین قائل و معتقد ہیں“

اس تصدیق کی وجہ سے مولانا محمد احسن کی تکفیر کی گئی، اس کوشش اور تحریک میں

مولوی علی نقی آگے آگے تھے، یہاں تک کہ عید الفطر سنہ ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) کے موقع پر مولوی نقی علی نے مولانا کی امامت کے خلاف بھی آواز بلند کی اور چاہا کہ مولانا نماز نہ پڑھا سکیں، ہنگامہ ہوا تو مولانا احسن نے خود پیش کش کی کہ فلاں صاحب نماز پڑھائیں مگر مولوی نقی علی کسی طرح بھی مصالحت پر تیار نہیں ہوئے، مقامی علماء اور عوام کی اکثریت مولانا کے ساتھ تھی، اس لئے عوام نے معمول کے مطابق مولانا محمد احسن کی امامت میں عید کی نماز ادا کی، مگر مولوی نقی علی خاں نے عید گاہ میں عام مسلمانوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی، حسین باغ میں نماز عید کا الگ اہتمام کیا اور خود نماز پڑھائی۔

یہ اس اختلاف اور کشاکش کی ابتداء تھی جو آج تک جاری ہے اور جس نے بڑھتے

بڑھتے ایک مستقل فرقہ یا گروہ بریلویت کی صورت اختیار کر لی ہے، دیوبندیت نہ کوئی

مستقل جماعت ہے نہ فرقہ اور نہ مناظرہ بازوں کا گروہ، یہ نام تو ان کو بریلوی علماء نے دیا

ہے۔ علمائے دیوبند سلف کے عقیدہ، طریقہ اور علم و عمل کی جامعیت کے قائل و پیروکار ہیں۔

وہ خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ کے اکابر علماء کے طریقہ تعلیم و تدریس، خدمت حدیث و فقہ،

حدیث و فقہ کی گہرائی اور اصول و تفسیر پر نظر، نیز اخلاق و کردار میں سنت نبوی کو اسوہ اور

رہنمائے طریق بنانا اور دل و جان سے اس کی تبلیغ و اشاعت انکا معمول و مزاج ہے۔ اس فکر کا نام دیوبندیت رکھ دیا گیا ہے حالانکہ اس جماعت کیلئے اگر کسی علیحدہ نام کی ضرورت ہو یا اس کے ذریعہ سے ان کا تعارف کرایا جائے تو ان کو ولی اللہی کہنا زیادہ بہتر اور مناسب ہے کیوں کہ یہ سب اسی شجر پر بہار کے ثمر اور اسی گلستاں کے گل بوٹے ہیں۔ مذکورہ تفصیلات سے اس اختلاف کی روداد معلوم ہوگئی اور یہ بات بالکل صاف ہوگئی ہے کہ اس اختلاف و نزاع کی وجہ صرف یہ تھی کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے والد مولوی نقی علی خاں، مولانا محمد احسن کے علمی مراتب، شہر میں مرجعیت و مقبولیت اور عیدین کی امامت کی وجہ سے اپنے دل میں مولانا سے سخت نفرت رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں خود عیدین کی امامت کروں، اسی برے خیال نے نقی علی خاں صاحب کو اس حرکت پر آمادہ کیا جو برصغیر کے مسلمانوں میں ایک نہ ختم ہونے والی خلیج بن گئی ہے۔ (۱)

مولانا بریلی سے نانوتہ واپسی کے بعد بھی اپنے  
**بریلی سے واپسی اور وفات** | معمول کے مطابق علمی دینی کاموں میں لگے

ہوئے تھے۔ سنہ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۳ء) میں جب مولانا کی عمر تقریباً ستر سال تھی بیمار ہوئے، اس بیماری سے شفا نہ ہوئی، یہی مرض الموت ثابت ہوا۔ علاج کے لئے دہلی لے جائے گئے مگر وہاں کے علاج سے بھی فائدہ نہ ہوا تو رمضان المبارک سنہ ۱۳۱۲ھ میں وطن واپسی کے ارادہ سے دہلی سے دیوبند آگئے، مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا محمد منیر نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، ان کے مکان پر قیام کیا، ابھی وطن جانے کا موقع نہیں ہوا تھا کہ اسی میں رمضان المبارک سنہ ۱۳۱۲ھ (مارچ ۱۸۹۵ء) کے آخری ہفتہ میں دیوبند میں وفات ہوگئی، حضرت مولانا محمد قاسم کے برابر میں دفن کئے گئے۔ (۲)

(۱) اس قضیہ کا اور اس سے متعلقہ تفصیلات کا ڈاکٹر ایوب قادری نے اپنی کتاب مولانا محمد احسن نانوتوی میں خاصی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ص: ۸۳ تا ۹۴، بعض معلومات کا راقم سطور نے اضافہ کیا ہے۔

(۲) مولانا محمد احسن نانوتوی ص: ۹۹ تا ۱۰۲



## [۱۶] مولانا قاضی محمد ایوب پھلتی (۵)

مولانا قاضی مفتی محمد ایوب بن مولوی حکیم قمر الدین بن حکیم محمد انور صدیقی حنفی پھلتی۔  
 ۱۲۴۱ھ تا ۱۲۴۲ھ کے درمیان پھلت ضلع مظفرنگر میں تولد ہوئے، ابتدائی درسیات مولانا  
 نصر اللہ خویشگی سے مظفرنگر میں پڑھیں، پھر دہلی آئے یہاں متعدد علماء کے حلقہ درس میں  
 حاضر رہے۔ حضرت شاہ محمد اسحاق کی مجالس و عظ میں حاضر رہتے تھے صرف کی چند کتابوں  
 کی ابتداء حضرت شاہ صاحب نے کرائی۔

دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی کے علاوہ حضرت شاہ ابوسعید مجددی، مولانا شاہ  
 عبدالغنی مجددی، مولانا شاہ محمد عمر خلف شاہ محمد اسماعیل شہید، مولانا سدید الدین دہلوی،  
 مولانا ملانواب رام پوری نیز مولانا سید محمد دہلوی وغیرہ سے پڑھا، خیال ہوتا ہے کہ دہلی  
 کالج میں بھی داخلہ ہوا ہے، وہاں بھی پڑھا ہوگا، اس خیال کی اس سے تائید ہوتی ہے کہ  
 مولانا محمد ایوب کے استادوں میں علی اکبر اور علی اصغر سونی پتی کے نام بھی آئے ہیں، یہ اس  
 زمانہ میں دہلی کالج کے طالب علم تھے، غالباً کسی بڑے استاد بظاہر مولانا مملوک العلی نے  
 مولانا محمد ایوب کا سبق ان دونوں کے حوالہ کیا ہوگا۔؟

اپنے خالہ زاد بھائی مولانا مفتی عبدالقیوم بڈھانوی سے بھی پڑھا، دو مرتبہ حرمین  
 شریفین کی زیارت اور حج کے لئے گئے حجاز میں شیخ محمد بن ناصر حازمی سے اجازت و سند  
 حاصل کی، شاہ محمد یعقوب (برادر حضرت شاہ محمد اسحاق) سے بیعت کی اور سلسلہ نقشبندیہ کا  
 سلوک حاصل کیا۔

حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی سے ارادت و عقیدت تھی۔ مولانا کا ایک سلسلہ

اجازت مولانا مظفر حسین عن الشاہ محمد یعقوب بھی ہے۔ (۱)

۱۲۶۶ھ میں بھوپال گئے، ایک مدرسہ میں مدرس ہوئے، پھر نواب سلطان جہاں

(۱) التمهید لتعريف ائمة التجديد، مولانا عبید اللہ سندھی ص ۱۷۵ (جام شور و سندھ، ۱۳۹۶ھ، ۱۹۷۶ء)

کے اتالیق مقرر کئے گئے، ترقی کرتے ہوئے بھوپال کے نائب قاضی، پھر قاضی بنائے گئے، قضا کی سخت مصروفیت کے باوجود درس حدیث کا بہت اہتمام تھا جو وقت تھا وہ اسی خدمت میں گزرتا تھا، یہاں تک کہ مسلسل اسباق اور کڑی محنت کی تاب نہ لا کر طلبہ اور جگہ چلے جاتے تھے مگر مولانا کا معمول بدستور چلتا رہتا تھا۔

ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی بحث پر ایک رسالہ مولانا کی تحریری یادگار ہے۔ (۱)

مولانا مفتی محمد ایوب کی ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ / ۲۵ نومبر ۱۸۹۷ء کو وفات ہوئی۔ (۲)

## [۱۷] مولانا محمد منیر نانوتوی (۶)

شیخ لطف علی نانوتوی کے تیسرے بیٹے، مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد احسن کے چھوٹے بھائی تھے۔ (۳۲-۱۸۳۱ء) میں تولد ہوئے، ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی، پھر دہلی گئے دہلی میں حضرت مولانا مملوک العلی، مولانا مفتی صدر الدین آزرہ سے پڑھا۔ قرین قیاس ہے کہ دہلی کالج میں بھی داخل ہوئے ہوں گے اور کالج کے دیگر استادوں سے بھی استفادہ کا موقع ملا ہوگا۔

حدیث اپنے عزیزوں اور اس دور کے علماء کی طرح حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت میں حاضر رہ کر پڑھی، سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں سرگرم رہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد مئی سنہ ۱۸۶۱ء (شوال ذی قعدہ ۱۲۷۷ھ) میں بریلی کالج میں

(۱) اس کے ایک قلمی نسخہ کا عکس ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

(۲) مزید معلومات کیلئے تذکرہ علمائے حال (تطیب الاخوان بذکر علماء الزمان) تالیف مولانا محمد ادریس

نگرامی۔ ص ۷۴ (نول کشور، لکھنؤ: ۱۸۹۷ء) یہ حالات غالباً خود مولانا محمد ایوب نے لکھ کر بھیجے تھے۔ نزہۃ الخواطر ص

۸۵-۸۶ ج ۷، کا اندراج بھی اسی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ دور ملازمت کی چند معلومات جو اگرچہ بہت معتبر معلوم نہیں ہوتیں

تاریخ قضاة و مفتیان بھوپال، تالیف قاضی وجدی الحسینی ص ۱۶۵-۱۶۷ (بھوپال: ۱۹۸۶ء) میں درج ہیں۔

مدرس مقرر ہوئے، اسی وجہ سے بریلی میں قیام رہا اور وہاں تمام علمی کاموں میں اپنے بھائیوں خصوصاً مولانا محمد احسن کے رفیق و شریک بلکہ دست و بازو بنے رہے، مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم تھے، طباعت و اشاعت کے کام کی نگرانی کرتے تھے، چند کتابوں کی تصحیح کی خدمت میں بھی معاون رہے۔

حضرت امام غزالی کی مشہور کتاب منہاج العابدین کا اردو ترجمہ کیا، جو سراج السالکین کے نام سے مطبع صدیقی سے سنہ ۱۲۸۱ھ میں چھپا تھا، ایک چھوٹی سی کتاب فوائد عجیبہ کے نام سے مرتب فرمائی جو مطبع صدیقی سے چھپی بعد میں بھی شائع ہوئی۔ (۱)

سنہ ۱۳۱۱-۱۲ھ (۱۸۹۳-۹۵ء) تقریباً دو سال تک مدرسہ اسلامی (دارالعلوم) دیوبند کے مہتمم رہے، نہایت محتاط دیانتدار، متقی اور بے نفس بزرگ تھے، صحیح سنہ وفات معلوم نہیں۔ ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۴ء) تک حیات تھے۔

## [۱۸] مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (۷)

مولانا ذوالفقار علی خلف شیخ فتح علی عثمانی دیوبندی، دیوبند کے معزز عثمانی خاندان سے نسبت ہے۔ تقریباً سنہ ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱-۲۲ء) میں ولادت ہوئی، وطن اور دہلی میں تعلیم پائی، دہلی کالج کے فیض یافتہ اور مولانا مملوک العلی کے خاص شاگرد ہیں۔

مولانا ذوالفقار علی نے غالباً سنہ ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) میں کالج میں داخلہ لیا، ۱۸۴۷ء میں کالج کی چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے، دہلی کالج کے ایک رجسٹر کے حوالہ سے جو سنہ ۱۸۴۷ء میں چھپا تھا (جس میں اس سال کے کالج میں موجود طلبہ کے کوائف ہیں) ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی نے لکھا ہے کہ اس میں مولانا ذوالفقار علی کی جنوری سنہ ۱۸۴۷ء سے اکتوبر تک ایک سواٹھتر (۱۷۸) حاضریاں درج ہیں، بیماری کی وجہ سے تیس (۲۳) دن غیر حاضر رہے، اس سال مولانا نے کالج میں جو کتابیں پڑھیں اور ان کا امتحان دیا، اس کی

(۱) ان دونوں کتابوں کا ایک ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

تفصیل اس طرح ہے:

۴۲	ادب ۱۲۳ صفحات	۴۰	تاریخ ہند
۲۴	حساب	صفر	صرف و نحو انگریزی
صفر (۱)	جغرافیہ	۵۰	تحریر اقلیدس

مولانا ذوالفقار علی کالج کے ممتاز طالب علموں میں گنے جاتے تھے۔ گارساں دتاسی نے دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کے حوالہ سے مولانا ذوالفقار علی کی ذہانت و ذکاوت کا ذکر کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا فارسی اور مغربی علوم کے پڑھنے اور سیکھنے میں گہری دلچسپی لیتے تھے، مولانا ذوالفقار علی نے اس زمانہ میں الجبراء پر انگریزی کتاب کا اردو میں تسہیل

الحساب کے نام سے اردو ترجمہ کیا تھا، جو سنہ ۱۸۵۲ء میں بریلی سے چھپا تھا۔ (۲)

دہلی میں تعلیم کے زمانہ میں مولانا مفتی صدر الدین آزرہ کے حلقہ تلمذ میں بھی شامل رہے، مفتی صاحب سے طویل استفادہ کیا، مولانا سے کیا کیا کتابیں پڑھیں اس کی تفصیل معلوم نہیں، تعلیم مکمل کرنیکے بعد سنہ ۵۰-۱۸۴۹ء میں بریلی کالج میں استاد مقرر ہوئے، کئی سال تک اسی ملازمت پر کام کرتے رہے، اس منصب سے ترقی ہوئی تو ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع میرٹھ بنائے گئے، غالباً اسی ملازمت سے پینشن ہوئی۔ ملازمت کے بعد تمام وقت دیوبند میں گزارا، آخر میں حکومت نے مولانا کو دیوبند کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا تھا۔

مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) کے شروع سے سرگرم معاون اور بانیان مدرسہ کے ہم قدم اور پر جوش رفیق رہے، مدرسہ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون فرمایا، چالیس سال تک مدرسہ کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔

مولانا کی پہلی تالیف تسہیل الحساب کا ذکر آچکا ہے، اس کے علاوہ جو کتابیں عام طور سے مل جاتی ہیں، ان میں دیوان حماسہ کی شرح تسہیل الدر اسہ فی شرح دیوان الحماسہ، دیوان متنبتی کی شرح تسہیل البیان فی شرح ال دیوان، جو اوخر سنہ ۱۸۹۳ء

(۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، محمد اکرام چغتائی ص ۱۲۶، ۱۲۷

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۱۲۹

(۱۳۱۱ھ) میں مکمل ہوئی۔ التعليقات علی السبع المعلقات سنہ ۱۸۹۵ء میں اختتام کو پہنچی، یہ تینوں کتابیں اپنے دوست اور عزیز مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتہائی دہلی کی فرمائش پر لکھی تھیں، ان کا حق طباعت بھی انہیں کو دے دیا تھا۔ ان کے علاوہ قصیدہ بانٹ سعاد کی شرح الارشاد الی بانٹ سعاد کے نام سے اور قصیدہ بردہ کی شرح عطر الوردہ کے نام سے لکھیں، معانی و بلاغت پر ایک کتاب معیار البلاغت اور مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) کے حالات اور تاریخ پر عربی میں مختصر مگر عمدہ تالیف ”الهدیة السنیة فی ذکر المدرسة الادیوبندیة“ مرتب فرمائی، ان کے علاوہ بھی بعض تالیفات ہیں جو اگرچہ اردو میں ہیں مگر اپنے موضوع کی بے نظیر کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

مولانا کی سب سے بڑی یادگار اور ہندوستان کی دینی علمی تاریخ اور برصغیر ہند میں اسلامی ورثہ اور خدمت کے لئے عظیم ترین تحفہ، مولانا کے فرزند والا شان شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے، کہ جن کی دینی علمی اصلاحی تربیتی اور سیاسی خدمات اور کارناموں سے ہندوستان کی فضائیں مشک بار اور سدا بہار ہیں۔ رحمہما اللہ تعالیٰ رحمة الابرار الصالحین۔

مولانا ذوالفقار علی کی سنہ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں تقریباً پچاسی سال کی عمر میں دیوبند میں وفات ہوئی، قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد احسن کے برابر میں دفن کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ (۱)

## [۱۹] مولانا فصیح الدین عثمانی دیوبندی (۸)

مولانا فصیح الدین بن شیخ صابر علی بن شیخ محمود بخش بن اہل اللہ عثمانی دیوبندی۔ مولانا فصیح الدین، دارالعلوم کے سب سے پہلے مہتمم مولانا رفیع الدین کے چچا زاد بھائی تھے۔ مولانا رفیع الدین کے والد مولانا فرید الدین جید عالم تھے، مولانا فرید اور شیخ صابر علی کے

(۱) مزید معلومات کے لئے دیکھئے تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی نیز تاریخ دیوبند ص ۷۸، ۷۹۔

سب سے بڑے بھائی شیخ بلند بخت دیوبندی حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے رکن اعظم اور بڑے سپہ سالار تھے، مفصل حالات دستیاب نہیں۔

حضرت مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی، حدیث غالباً حضرت شاہ عبدالغنی مجددی سے پڑھی، شاہ صاحب سے ہی بیعت ہوئے، تعلیم کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے، مدرسہ (دارالعلوم) دیوبند قائم ہونے سے ایک سال پہلے سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ء) میں محکمہ تعلیم کی فرمائش پر جغرافیہ ضلع سہارنپور لکھا تھا، دارالعلوم دیوبند کے معاون رہے سنہ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) میں وفات ہوئی (۱)

## [۲۰] مولانا فضل الرحمن عثمانی دیوبندی (۹)

مولانا فضل الرحمن خلف شیخ عبدالرحیم عثمانی دیوبندی، دہلی کالج میں اور مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی، فارسی زبان و ادب میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اس عہد کے اور متعدد علماء کی طرح سرکاری محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے، ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر مدارس کے عہدہ تک پہنچے اور اسی سے سبکدوش ہوئے۔

دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور سب سے سرگرم معاونین میں سے تھے۔ تقریباً پینتالیس سال دارالعلوم کی خدمات انجام دیں اور مدرسہ دیوبند کی ننھی کونپیل سے تناور درخت بننے تک بے لوث آبیاری فرماتے رہے۔ فارسی اردو کے اچھے شاعر تھے، شاعری کے متعدد نمونے دستیاب ہیں، جن میں وہ قطعہ تاریخ خاصا معروف ہے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی وفات پر کہا تھا، جس سے حضرت مولانا کاسن وفات بھی نکلتا ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے:

سن وفات کہی فضل نے زروئے الم  
وفات سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے

(۱) مزید معلومات کے لئے دیکھئے تاریخ دارالعلوم دیوبند، سید محبوب رضوی نیز تاریخ دیوبند ص ۷۸، ۷۹

۱۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۲۵ھ (۱۵ جون ۱۹۰۷ء) کو دیوبند میں وفات ہوئی (۱)

## [۲۱] مولانا انصار علی انبہٹوی (۱۰)

مولوی انصار علی خلف احمد علی بن قطب علی انصاری انبہٹوی، تفصیلی حالات مفقود ہیں، مختصر اور منتشر اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کے تعلیم یافتہ شخص تھے، دہلی میں مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی تھی، حدیث شریف مدینہ منورہ جا کر پڑھی، ریاست گوالیار میں صدر الصدور مقرر ہوئے، اسی ملازمت پر زندگی گزری۔ مولانا مملوک العلی کی دختر سے نکاح ہوا، مولانا عبد اللہ انصاری جو مدرسۃ العلوم (M.A.O. COLLEGE) علی گڑھ کے پہلے ناظم دینیات مقرر ہوئے مولانا انصار علی کے فرزند تھے۔ مولانا کے مزید حالات اور سن وفات دریافت نہیں۔ (۲)

## [۲۲] مولانا محمد حسن رام پوری (۱۱)

رام پور انصاری خاندان کے فرد تھے سنہ ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں ولادت ہوئی سترہ سال کی عمر تک قرآن شریف پڑھا، اسی وقت شاہ امام علی سے بیعت ہوئے اور دو سال تک پیرومرشد کی خدمت میں حاضر رہے، پیرومرشد نے دہلی جا کر تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت کی تو دہلی پہنچے اور حضرت مولانا مملوک العلی سے عربی پڑھی، تعلیم کے زمانہ میں

(۱) حیات شیخ الہند، مولانا اصغر حسین میاں صاحب ص ۲۷-۲۶ (لاہور ۱۹۷۰ء)

تاریخ دیوبند ص: ۸۰ نیز تعارفی کتابچہ بر احوال مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی، مولانا فضیل الرحمن ہلال عثمانی ص ۸-۹ (مالیر کوئٹہ ۱۹۹۱ء)

(۲) ملاحظہ ہوں تذکرۃ الخلیل، مولانا عاشق الہی میرٹھی، ص: ۳۹-۳۸ (سہارنپور: ۱۳۹۵ھ، ۱۹۷۵ء) انوار العاشقین، مولانا مشتاق انبہٹوی، ص: ۱۳۶ (لاہور: ۱۳۹۸ھ)

سلوک و معرفت میں قدم رکھ دیا تھا، اور اس میں بڑا مرتبہ پایا تھا۔ مولانا کے حالات دیکھ کر مولانا مملوک العلی بھی ان کا ادب کرتے تھے۔

ایک دن مولانا محمد حسن نے حضرت مولانا مملوک العلی سے عرض کیا کہ میں نے دعاء کی ہے کہ اے اللہ! میرے استاد کو ایک لڑکا دے جو حافظ قرآن، عالم اور ولی ہو، میری دعاء قبول ہوگئی، مولانا مملوک العلی سن کر ہنسے، اس کے بعد ہی مولانا محمد یعقوب تولد ہوئے، جو اسی دعاء کی وجہ سے کبھی کبھی (مذاق میں) فرمایا کرتے تھے کہ میں ازلی ولی ہوں۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے نحو و صرف کی ابتدائی کتابیں مولانا محمد حسن سے پڑھی تھیں، حضرت مولانا گنگوہی کو مولانا محمد حسن سے حزب البحر کی اجازت بھی حاصل تھی، مولانا محمد حسن سے شاہ کریم بخش رام پوری کو اجازت تھی، حاجی عابد حسین دیوبندی میاں جی کریم بخش کے خلیفہ اور مجاز تھے، یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

مولانا محمد حسن کا چالیس سال کی عمر میں ۱۷۱۹ھ (۲۲ ستمبر ۱۸۵۳ء) کو رام پور میں انتقال ہوا، وہیں دفن کئے گئے۔ (۱)

## [۲۳] مولوی حکیم امین الدین دیوبندی (۱۳)

حکیم مولوی امین الدین خلف دیوان بخشش علی، بن شیخ علیم الدین عثمانی دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان سے تعلق ہے۔ تقریباً سنہ ۱۲۵۰ھ میں ولادت ہوئی، مولانا مملوک العلی نانوتوی سے تعلیم پائی، مزید احوال دریافت نہیں۔ چون (۵۴) سال کی عمر میں ۶ رزی الحجہ سنہ ۱۳۰۳ھ (۵ ستمبر ۱۸۸۶ء) کو وفات ہوئی، ایک فرزند یادگار تھے، مولوی بشیر احمد دیوبندی۔ (۲)

(۱) ملاحظہ ہو تذکرۃ العابدین، حافظ نذیر حسین دیوبندی، ص: ۵۳، ۵۷ (دہلی: ۱۳۳۳ھ)

نیز انوار العاشقین مولانا مشتاق احمد انبھوی (دہلی: ۱۳۳۳ھ) ص: ۱۳۵-۱۳۶ (لاہور: ۱۳۹۸ھ)

(۲) تذکرۃ الحافظ (تذکرہ حافظ لطافت علی شیخ پوری) مرتبہ مولانا نعیم دیوبندی، ص: ۲۵-۲۷ (دیوبند: ۱۳۹۰ھ)



## ﴿قسم چہارم﴾

### [۲۴] مولانا محمد یوسف خلف مولانا عبدالقیوم بڈھانوی (۱)

مولانا عبدالقیوم خلف مولانا عبدالحی بڈھانوی، ضلع مظفرنگر کے باشندہ اور خاندان ولی اللہی کے کمالات معنوی کے وارث اور حضرت شاہ محمد اسحاق کے شاگرد اور داماد تھے۔ مولانا عبدالقیوم کے دو صاحبزادے تھے، مولانا محمد یوسف اور مولانا محمد ابراہیم، مولانا محمد یوسف بڑے تھے۔

مولانا محمد یوسف کا سنہ ولادت معلوم نہیں، والد ماجد اور والدہ محترمہ سے ابتدائی درسیات کی تکمیل کی، مولانا مفتی محمد ایوب پھلتی سے بھی پڑھنے کا موقع ملا، اعلیٰ تعلیم کے لئے دہلی گئے، دہلی میں مولانا مفتی صدر الدین آزرودہ اور مولانا مملوک العلی کے علمی کمالات اور حلقہ درس کا پورے ملک میں شہرہ تھا، مولانا دونوں علماء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علوم و فنون کی تکمیل کی، یہ صراحت نہیں ملی کہ مولانا مملوک العلی سے کیا کیا پڑھا مگر خیال ہے کہ اعلیٰ درسیات میں تلمذ کی سعادت ملی ہوگی۔

مکہ معظمہ حضرت شاہ محمد یعقوب کی خدمت میں حاضر ہوئے بیعت کی اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے، حج سے واپسی پر بھوپال میں قیام کیا اور اپنے بزرگوں کی تابندہ روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے علمی دینی خدمات میں مصروف ہو گئے۔

مولانا کے علمی مرتبہ اور بھوپال میں وقعت و منزلت کا اس سے علم ہوتا ہے کہ جب ریاست میں دفتر قضاء و افتاء میں بعض فیصلوں میں اختلاف ہوا تو دونوں کے درمیان رابطہ اور معاملات کی شرح و تحقیق کے لئے ایک ادارہ مجلس العلماء کے نام سے علیحدہ قائم کیا گیا جو دونوں محکموں کا سرپرست اور مشیر تھا، اس کا صدر مولانا محمد یوسف کو بنایا گیا۔

مولانا محمد یوسف کی ۱۳۲۵ھ (۸-۱۹۰۷ء) میں وفات ہوئی (۱) تفصیلی حالات دریافت نہیں۔

## [۲۵] مولانا سدید الدین دہلوی (۲)

حضرت مولانا مملوک العلی کے استاد مولانا رشید الدین خاں دہلوی کے فرزند تھے والد ماجد مولانا مملوک العلی سے اور دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم پوری ہوتے ہی ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۸۳۰ء (۴ شعبان ۱۲۴۵ھ) کو دہلی کالج کے شعبہ عربی میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہو گیا تھا، کئی برس دہلی کالج میں تعلیم کی خدمت انجام دی۔ مولوی عبدالحق کی اطلاع ہے کہ سنہ ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) میں مولوی سدید الدین کی جماعت میں دس طالب علم تھے (۲) غالباً سنہ ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) سے پہلے دہلی کالج کی ملازمت ترک کر دی تھی، سنہ ۱۸۴۹ء میں آگرہ کالج میں عربی کے مدرس ہو گئے تھے۔ کالج کیلئے ایک دو کتابوں کے اردو ترجمے بھی کئے، آگرہ ملازمت کی ابتدا تھی کہ مولوی صاحب کو یہ اطلاع ملی کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں امین کی جگہ خالی ہے اور اس کے لئے مناسب شخص کی تلاش ہے، مولوی صاحب نے اس کیلئے کوشش کی، جنوری سنہ ۱۸۵۱ء (محرم ۱۲۶۷ھ) میں اس عہدہ پر مولوی صاحب کا تقرر ہو گیا اور وہ آگرہ سے کلکتہ کیلئے روانہ ہو گئے مگر یہ اہم ملازمت بھی مولوی صاحب کو اس نہیں آئی، کالج میں پرنسپل کی ناقدری ہوئی بعض تبدیلیوں کی وجہ سے ہنگامہ ہو گیا اور مولوی صاحب بھی اپنے عہدے سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہوئے، یہ

(۱) درج بالا اطلاعات تاریخ قضات و مفتیان بھوپال، تالیف مولانا واجدی الحسینی ص: ۱۵۸، ۱۵۳ (بھوپال ۱۹۸۶ء) سے اخذ کی گئی ہیں، ان کی کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ یہ کتاب میرے خیال میں بہت لائق اعتماد نہیں ہے۔ اس میں کتابت کی بے شمار غلطیوں کے علاوہ تاریخی فرد گذشتیں بھی کثرت سے ہیں، اسلئے صرف اس پر اعتماد درست معلوم نہیں ہوتا، مگر اس وقت کسی اور ذریعہ سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔

(۲) مرحوم دہلی کالج ص: ۷۶ (دہلی ۱۹۴۵ء)

واقعہ غالباً سنہ ۱۸۵۳ء کا ہے، اس وقت اسپرنگر نے مولانا کا ہنگلی کے ایک مدرسہ میں تقرر کرادیا، سنہ ۱۸۵۶ء (۱۲۷۲-۱۲۷۳ھ) تک اسی مدرسہ میں پڑھاتے رہے۔

سنہ ۱۸۶۳ء (۸۰-۱۲۷۹ھ) میں مولوی سمیع اللہ دہلوی نے دہلی میں ایک مدرسہ شروع کیا تھا، مولوی سدید الدین جن کی کلکتہ سے پنشن ہوگئی تھی، اس مدرسہ کے مدرس اول مقرر ہوئے۔ اس کے بعد رامپور آگئے۔ (۱)

نواب کلب علی خاں نے مولانا کی قدر افزائی کی، مولانا کو تعلیم کے علاوہ اور عہدوں سے بھی نوازا، مولانا کارامپور کے ممتاز علماء میں شمار تھا۔ (۲)

مولانا سدید الدین نے اسپرنگر کی فرمائش پر علامہ سیوطی کی ”الاتقان فی علوم القرآن“ مرتب کی جو کلکتہ سے شائع ہوئی۔ دہلی کالج کی ملازمت کے زمانہ میں الف لیلیٰ کے بعض حصوں کا اردو ترجمہ کیا تھا اور آگرہ کی ملازمت کے دوران ”تاریخ آگرہ“ لکھی تھی، یہ دونوں کتابیں بھی چھپ گئی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی مولانا کی متعدد تالیفات و تحریرات مطبوعہ دریافت ہیں۔ مولانا سدید الدین کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔

## [۲۶] مولوی ڈپٹی نذیر احمد بجنوری دہلوی (۳)

بڈھانہ ضلع مظفرنگر یوپی میں ایک صدیقی خاندان صدیوں سے رہتا ہے، اس خانوادہ کی ایک بہت بڑی اور معروف شخصیت شیخ عبدالغفور اعظم پوری تھے جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ممتاز خلفاء میں سے تھے۔ اجازت کے بعد شیخ عبدالغفور بڈھانہ سے اعظم پور چلے گئے تھے اس لئے اعظم پوری مشہور ہوئے، شیخ عبدالغفور کی اولاد بجنور میں رہی وہیں پھلی پھولی، اس خاندان کے بعض افراد یا شاخیں بجنور کے اطراف میں آباد ہو گئیں مگر ان میں باہمی روابط اور رشتہ داریاں قائم رہیں، اسی شاخ کے ایک فرد موضع

(۱) سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں دہلوی، مولوی ذکاء اللہ، ص: ۵۶ حصہ اول (لکھنؤ: ۱۹۹۷ء)

(۲) تذکرہ کمالان رامپور مرتبہ احمد علی شوق، ص: ۳۷ (پٹنہ: ) نیز نزہۃ الخواطر، ص: ۱۹۷ جلد ۷

ریہڑنگینہ ضلع بجنور چلے گئے تھے، اسی گاؤں میں ڈپٹی نذیر احمد تولد ہوئے۔ (۱)  
 ڈپٹی نذیر احمد کی تاریخ پیدائش کی روایت میں خاصا اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے، ڈاکٹر  
 افتخار صدیقی کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۸۳۰ء (۳۶-۱۲۲۵ھ) صحیح معلوم ہوتا ہے۔ (۲)  
 ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی، متوسط درسیات تک مولانا نصر اللہ خاں خویہ شنگی سے  
 پڑھیں جب مولانا خویہ شنگی کا بجنور سے مظفر نگر تبادلہ ہو گیا تو نذیر احمد اور ان کے بھائی  
 مولانا کے پاس مظفر نگر آ گئے، مولانا خویہ شنگی مظفر نگر سے اعظم گڑھ چلے گئے تھے، اس لئے  
 مولانا کی ہدایت کے مطابق نذیر احمد کے والد ان کو لے کر دہلی پہنچے، یہ سنہ ۱۸۴۲ء کا واقعہ  
 ہے، تین سال تک پنجابی کڑھ کی مسجد میں دہلی کے ممتاز عالم اور مدرس مولانا عبدالخالق  
 دہلوی سے پڑھتے رہے۔

جنوری سنہ ۱۸۴۶ء (محرم ۱۲۶۲ھ) میں دہلی کالج میں داخلہ ملا، تعلیم حاصل کی مگر  
 شوق علم فراواں تھا، کالج کے اسباق سے سیری نہیں ہوئی تھی اس لئے مولانا مملوک العلی  
 سے کالج سے فارغ اوقات میں پڑھانے کی درخواست کی مگر مولانا کے اوقات نہایت  
 مصروف تھے، کوئی لمحہ فارغ نہیں تھا مولانا نے مصروفیت کا عذر کیا، ادھر سے اصرار بڑھا تو  
 فرمایا اچھا! جس وقت ہم مدرسہ جایا کرتے ہیں آجایا کرو، ڈپٹی صاحب نے اس کو منظور کر  
 لیا، اس کی تفصیل ڈپٹی صاحب کے الفاظ میں پڑھئے:

”حضرت مولانا نے وقت نہ ہونے کا عذر کیا اور فرمایا کہ راستے میں چلتے چلتے جو پڑھ  
 سکو گے پڑھا دیا کریں گے، اس زمانے کی طالب علمی ایسی کٹھن تھی مرحوم نے اسکو غنیمت جانا۔  
 مملوک العلی پنس میں سوار ہو کر کالج کو چلتے یہ کتاب لے کر ساتھ ہو لیتے، پنس کے ساتھ  
 دوڑتے بٹھو کریں کھاتے، گرتے مگر واہ رے شوق اس پر بھی سبق ہو جانے کو دولت سمجھتے۔“ (۳)  
 دسمبر سنہ ۱۸۵۳ء میں دہلی کالج سے عربی کی اعلیٰ جماعت کا آخری امتحان پاس

(۱) مولوی نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص: ۳۲ (لاہور ۱۹۷۱ء)

(۲) مولوی نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص: ۲۱ (لاہور ۱۹۷۱ء)

(۳) حیات اللہ یرتالیف سید افتخار عالم ص: ۶۲۵ (دلی ۱۹۱۹ء) ڈپٹی نذیر احمد کے حوالہ سے یہ واقعہ مولوی عبدالرزاق

کانپوری (مؤلف البرامکہ) نے بھی نقل کیا ہے۔ یادایام ص: ۳۰۶ (حیدرآباد ۱۹۳۶ء)

کرنے کے بعد (اگست ستمبر ۱۸۵۴ء) تک دہلی میں رہے، جلد ہی ضلع گجرات (موجودہ مغربی پنجاب پاکستان) میں استاد کی حیثیت سے سرکاری ملازمت پر تقرر ہو گیا تھا مگر وہاں کے خشک ماحول میں طبیعت نہیں لگی، دوسری ملازمت کی تلاش ہوئی، دو جگہ سے ملازمت کی دعوت ملی، اجمیر کالج میں سو روپے ماہوار پر مدرس عربی یا اسی روپے ماہوار پر ڈپٹی انسپکٹر تعلیم کانپور، ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنی ضرورت اور آئندہ ترقی کے خیال سے ڈپٹی انسپکٹر کے عہدہ کو پسند کیا، سنہ ۱۸۵۶ء میں کانپور میں انسپکٹر شعبہ تعلیم مقرر ہوئے، اس ملازمت کو ایک ہی سال گزرا تھا کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے واقعات پیش آگئے تو مولوی صاحب ملازمت چھوڑ کر دہلی آگئے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک سے مولوی نذیر احمد الگ رہے، جب دہلی میں تحریک شباب پر تھی تو ایک انگریز خاتون کی جان بچائی اور اس کو گھر میں حفاظت سے رکھا، اس کی وجہ سے خاندان کے افراد کی بھی جان بخشی ہوئی اور مولوی نذیر احمد کو الہ آباد کی ڈپٹی انسپکٹری مل گئی، الہ آباد میں انگریزی پڑھی اور اس میں اچھی مشق بہم پہنچائی۔ سنہ ۶۱-۱۸۶۰ء میں تعزیرات ہند (INDIA PANEL CODE) کے اردو ترجمہ کی تین رکنی کمیٹی میں شریک کئے گئے اور سب سے بہتر ترجمہ نگار تسلیم کئے گئے، ترجمہ مکمل ہونے کے بعد گورنر نے خصوصی انعام سے نوازا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر ترقی دی، ڈپٹی کلکٹر بننے سے پہلے چند مہینے تک کانپور میں تحصیل دار رہے۔

سنہ ۱۸۶۳ء (۸۰-۱۲۷۹ھ) سے سنہ ۱۸۷۷ء (۱۲۹۴ھ) تک کانپور، گورکھپور اور اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر اور زمین کے بندوبست کے نگران رہے، یکم اپریل ۱۸۷۷ء میں صوبہ شمال کے صوبہ دار مقرر کئے گئے سنہ ۱۸۸۲ء (۱۳۰۰-۱۲۹۹ھ) میں سترہ سو روپے ماہوار کی تنخواہ پر مجلس مال (REVENUE COMMITTEE) کا ممبر نامزد کیا گیا۔

سر سالار جنگ کی وفات (۸ فروری ۱۸۸۳ء) کے بعد ریاست حیدرآباد کی ملازمت سے دل برداشتہ ہو کر مستعفی ہو گئے تھے۔

تصانیف و تراجم | دہلی واپسی کے بعد تصنیف و تالیف کا سلسلہ پھر تازہ ہوا کئی کتابیں لکھیں قرآن شریف کا ترجمہ کیا اور طلبہ کو اپنے گھر پر درس دیتے

رہے۔ ڈپٹی صاحب کے شاگردوں اور تصانیف دونوں کی خاصی تعداد ہے، جس کا تذکرہ تفصیل چاہتا ہے مگر دینی تصانیف کے تذکرہ کو نظر انداز کرنا درست نہ ہوگا۔

(۱) ترجمہ قرآن شریف | قرآن شریف کا کسی بھی زبان میں ترجمہ، دنیا بھر کے علمی کاموں میں سب سے زیادہ ذمہ دارانہ کام

نہایت نازک اور غیر معمولی صلاحیت کا عمل ہے، ڈپٹی نذیر احمد کے علم و فضل اور عربی اردو دونوں زبانوں پر بے مثال دسترس اور ترجمہ کی فقید المثال صلاحیت کا ایک زمانہ معترف تھا اور ہے، اسی لیاقت اور کمال کی وجہ سے ڈپٹی صاحب سے کئی مرتبہ قرآن شریف کے اردو ترجمہ کی فرمائش ظاہر کی گئی مگر ڈپٹی صاحب نے اس خدمت کی عظمت و وسعت اور نزاکت کی وجہ سے اس کا ارادہ نہیں کیا، مگر جو کام ہونا ہوتا ہے اسکی کوئی نہ کوئی تدبیر ہو جاتی ہے، ڈپٹی صاحب نے حدیث شریف کے اہم مجموعہ یا تالیف 'تیسیر الاصول الی جامع الاصول' کے اردو ترجمہ کا ارادہ کیا جب ترجمہ کتاب التفسیر تک پہنچا تو آیات قرآنی کے ترجمہ کی بات آئی، اردو کے جو پرانے ترجمے تھے وہ ڈپٹی صاحب کے معیار پر پورے نہ اترے، اسلئے ڈپٹی صاحب نے متعلقہ آیتوں کا خود ہی ترجمہ کرنے کا ارادہ کر لیا، یہ کام چل رہا تھا کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا جو اصرار اور تقاضہ ہو رہا تھا اس کی تکمیل و تعمیل کا ارادہ ہو گیا، دو عالم مقابلہ اور تعاون کیلئے ملازم رکھے اور اس کام کا آغاز ہو گیا، ڈھائی سال کی شبانہ روز مسلسل مصروفیت و محنت کے بعد سنہ ۱۳۱۳ھ (۱۸۹۵ء) میں یہ ترجمہ پورا ہوا اور پہلی مرتبہ مطبع انصاری دہلی سے سنہ ۱۳۱۳-۱۴ھ (۱۸۹۶ء) کے آغاز پر چھپا۔

اس ترجمہ پر شبہات و اعتراضات | یہ ترجمہ اگرچہ بہت مشہور و مقبول ہوا اور مصنف کی زندگی تک کثرت سے چھپتا

رہا، لیکن علمائے کرام کو اس کی استنادی حیثیت، بعض آیتوں کے ترجمہ کی مطابقت اور شوخ اندازِ بیاں پر اعتراض تھا، چونکہ معاملہ قرآن شریف کا تھا اس لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ علماء

اس کی غلطی سے صرف نظر کر لیتے اور اس کی فروگذاشتوں پر توجہ نہ فرماتے، اس لئے اس ترجمہ پر بھی کئی طرح سے تنقید ہوئی اور اس کی غلطیوں کو واضح کیا گیا، مولانا ابو محمد عبد اللہ (مدرسہ و منتظم مدرسہ صولتیہ کلکتہ) نے اس پر مفصل تنقید لکھی جو ”رفع الغواشی عن وجوه الترجمة و الحواشی“ کے نام سے سنہ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۱ء) میں کلکتہ سے شائع ہوئی، جس میں ڈپٹی صاحب کے ترجمہ کا مفصل علمی تجزیہ ہے۔

اس تالیف کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں قرآن شریف کے اس ترجمہ کی غلطیوں، ان کی وجوہات یا اصلاح کے متعلق وہ مفصل خط و کتابت بھی شامل ہے جو گل محمد خاں منگلوری (منگلور ضلع سہارنپور یو پی) کی ڈپٹی صاحب سے ہوئی تھی، خان صاحب کے شبہات و اعتراضات کے ڈپٹی صاحب نے جو جوابات دیئے تھے وہ بھی درج کئے گئے ہیں۔ اسی سلسلہ کی دوسری کاوش حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تالیف اصلاح ترجمہ دہلویہ ہے، اس کا سنہ تالیف معلوم نہیں، لیکن یہ سنہ ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲-۳) کے قریب چھپی تھی۔ (۱)

اس میں سنجیدہ عالمانہ زبان میں ڈپٹی صاحب کی فروگذاشتوں پر گرفت کی گئی ہے اس کی زبان ایسی متین اور باوقار تھی کہ اس کا ڈپٹی صاحب کے سوانح نگاروں نے بطور خاص ذکر اور اعتراف کیا ہے اور حضرت مولانا تھانوی کے شبہات و اعتراضات کے وزن کو بھی تسلیم کیا ہے۔ (۲)

تاہم متعدد فروگذاشتوں کے باوجود ڈپٹی صاحب کا ترجمہ قرآن کریم ایک بڑی خدمت ہے جس کا ایک ضمنی مگر بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے بعد قلیل عرصہ میں قرآن شریف کے کئی اور ترجمے کئے گئے جو چھپتے بھی رہے جس سے امت کو بہت نفع ہوا۔

(۱) دونوں تالیفات اور تنقیدات کا ایک ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

(۲) ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ترجمہ کے معترضوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور معقول اعتراضات مولانا اشرف علی تھانوی نے کئے تھے۔ (ڈپٹی نذیر احمد ص: ۲۷۷)

## ڈپٹی صاحب کی اور تالیفات

(۱) **الحقوق والفرائض** | دینی موضوعات پر ترجمہ قرآن کے بعد ڈپٹی صاحب کی تمام تالیفات میں مفید ترین تالیف ”الحقوق

والفرائض“ ہے جس میں ایک مسلمان پر قرآن مجید اور دین و شریعت کی طرف سے نافذ حقوق کی تفصیل اور ان کے متعلق آیات شریفہ حسن ترتیب اردو ترجمہ اور ضروری وضاحت کے ساتھ درج ہیں، یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔

(۲) **ادعیۃ القرآن** | قرآن کریم میں جو دعائیں آئی ہیں، وہ تمام دعائیں شان نزول، ترجمہ اور ضروری فوائد کے ساتھ اس کتاب میں یکجا

کی گئی ہیں۔

(۳) **الاجتہاد** | ایک مسلمان خاص طور سے سوچنے، غور و فکر کرنے والے مسلمان کو دین و مذہب کے متعلق جو سوالات عموماً پیش آتے ہیں، ان کے

متکلمانہ جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۴) **امہات الامہ** | یہ کتاب گڑگانوہ کے ایک عیسائی کے اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی تھی، جس کا مقصد اگرچہ نیک تھا، مگر غیر

محتاط زبان نازیبا کلمات نیز اپنی کئی اور کمزوریوں کی وجہ سے سخت ناپسند کی گئی بلکہ اختلاف و انتشار کا سبب ہوئی، اس کے خلاف بار بار شدید رد عمل ہوا، اس کے نسخے جلانے گئے، یہ کتاب تین مرتبہ چھپی تینوں مرتبہ اس کے نسخے جلا کر خاک کئے گئے، اس کی وجہ سے ڈپٹی صاحب کا علمی مقام اور قرآن کے ترجمہ کی اشاعت اس طرح متاثر ہوئی کہ بعد میں پہلی والی بات کبھی حاصل نہ ہو سکی، اگر ڈپٹی صاحب اپنی غلطی کا صاف اعتراف کر لیتے اور اس کتاب کی اشاعت ختم کرنے کا اعلان کر دیتے تو شاید ایسا سخت رد عمل نہ ہوتا، مگر ڈپٹی صاحب نے نہ معلوم کس وجہ سے اس سے رجوع نہیں کیا، جس کے اثرات دینی حلقوں



میں اب تک محسوس کئے جاتے ہیں۔

**ادبی تالیفات** | ڈپٹی صاحب کی کتابوں میں سب سے اہم اور مشہور ترین تالیفات وہ ہیں جو عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی اصلاح کے لئے لکھی گئیں تھیں اور جو اپنی خوبیوں کی وجہ سے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی تھیں، جن میں مرآة العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، محسنات، ابن الوقت ایامی، مبتلا، رویائے صادقہ، شامل ہیں۔ یہ کتابیں پچاس برس پہلے گھر گھر پڑھی جاتی تھیں، ان کے علاوہ منتخب الحکایات، چند پند سو مند، مبادی الحکمت، ما یغنیک فی الصرف، نصاب خسرو، رسم الخط، اور صرف صغیر وغیرہ بھی علمی یادگار ہیں۔ نیز دو جلدوں میں لکچروں کا مجموعہ، کئی انگریزی کتابوں کے اعلیٰ درجہ کے ترجمے، خصوصاً تعزیرات ہند، قانون شہادت، مصائب غدر اور تاریخ دربار تاج پوشی کے تراجم، ڈپٹی صاحب کی ترجمہ پر ماہرانہ گرفت اور اعلیٰ صلاحیت و کمال کے گواہ ہیں، اس کے علاوہ بھی کئی تحریریں علمی یادگار ہیں۔ (۱)

## [۲۷] مولوی ضیاء الدین دہلوی (ایل ایل ڈی) (۴)

شیخ ضیاء الدین، بن محمد بخش، بن غلام حسین دہلوی بسی داراپور کے رہنے والے تھے، ان کے والد داروغہ تھے۔ حضرت مولانا مملوک العلی اور مفتی صدر الدین آزرہ سے اور دہلی کالج میں پڑھا، تعلیم کے بعد نارمل اسکول میں مدرس مقرر کئے گئے، بعد میں دہلی کالج میں عربی کے پروفیسر ہوئے، دہلی کالج بند ہو گیا تو مولانا ضیاء الدین کو اسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا تھا، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے اور مولوی فاضل، منشی فاضل کے (اعلیٰ درجہ کے معیاری علمی امتحانات تھے) ممتحن بھی رہے، علمی خدمات کی وجہ سے متعدد اعزازات ملے۔ آخر میں پنشن لے کر دہلی آ گئے تھے جامع مسجد کے پاس گوشہ نشین رہے، بہت مسنی

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے حیات النذیر مرتبہ مولوی افتخار عالم مارہروی، اور ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

پرہیزگار متواضع اور خلیق تھے، عبادات اور اپنے معمولات و اوراد کے سختی سے پابند تھے، دہلی میں ہوتے تو جامع مسجد میں نماز ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

سنہ ۱۳۲۶ھ (غالباً جنوری ۱۹۰۹ء) میں حج کیلئے گئے اور مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے راستہ میں ہیضہ سے فوت ہو کر اپنی مراد کو پہنچ گئے:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را“

انشاء اردو، منتخبات اردو، مقررہ العملہ، مفتاح الارض وغیرہ تالیفات اور طبیعیات پر

ایک رسالہ اور رسوم دہلی کا ایک حصہ تحریری یادگار ہیں۔ (۱)

## [۲۸] مولوی منشی ذکاء اللہ خاں دہلوی (۵)

بہادر شاہ کے بیٹے مرزا کوچک سلطان کے اتالیق حافظ ثناء اللہ کے فرزند تھے، سنہ ۱۸۳۳ء (۱۲۴۷ھ) میں دہلی میں پیدا ہوئے، تقریباً بارہ سال کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے، مولانا مملوک العلی مولانا صدر الدین آزرہ سے تعلیم حاصل کی، دہلی کالج کے ممتاز طالب علموں میں سے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی دہلی کالج میں ریاضی کے استاد مقرر کر دیئے گئے تھے، وہاں سے ترقی ہو کر آگرہ کالج کے پروفیسر ہوئے، سات آٹھ سال اسی ملازمت پر گزار کر سنہ ۱۸۵۵ء ڈپٹی انسپکٹر مدارس بلند شہر مراد آباد بنائے گئے۔ سنہ ۱۸۶۹ء (۱۲۸۵ھ) میں نارمل اسکول دہلی کے مدرس اعلیٰ بنائے گئے تھے مگر اس ملازمت پر جانے سے پہلے ہی میمور سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی فارسی کے پروفیسر ہو گئے، چھبیس سال اسی عہدہ پر کام کیا، وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے، اس کے بعد دہلی میں قیام کیا اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔

ڈپٹی ذکاء اللہ کا ہندوستان کے کثیر التصانیف مصنفین میں شمار ہے، مختلف موضوعات

(۱) وصال الجلیل تالیف امان الرحمن چشتی دہلوی (مؤلفہ و مطبوعہ دہلی: ۱۳۲۳ھ) نیز دیکھئے:

نزہۃ الخواطر میں بھی مولانا ضیاء الدین کا مختصر تعارف درج ہے۔ نزہہ میں جو سنہ وفات لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

پر جن میں تاریخ، ریاضی اور ادب خاص عنوان تھے، تصانیف کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ تین سو سے زائد تصانیف مؤلفات اور ترجموں کا سراغ ملتا ہے، جن میں تاریخ ہندوستان (جو ہندوستان کی تاریخ پر اہم کتابوں کا خلاصہ ہے) اس کے علاوہ تاریخ عروج عہد انگلیشیہ، آئین قیصری، سوانح عمری مولوی سمیع اللہ دہلوی مشہور ہیں۔ کثیر تصانیف کے علاوہ جو بہت تیزی سے چھپتی رہتی تھیں مضامین کا بھی بہت بڑا ذخیرہ یادگار ہے، کئی رسائل میں پابندی سے ہر ہفتہ یا ماہانہ مضامین لکھتے تھے۔ (۱)

مولانا کے کثرت تحریر و تصنیف کا یہ عالم تھا کہ خود اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ میں اپنے قلم سے باون ہزار (۵۲۰۰۰) صفحات لکھ چکا ہوں۔ (۲)

تقریباً اکیاسی سال کی عمر میں ۱۲/۱۲ ذی قعدہ سنہ ۱۳۲۸ھ (۷ نومبر ۱۹۱۰ء) کو دوشنبہ کے دن دہلی میں انتقال ہوا۔ (۳)

## [۲۹] مولوی سمیع اللہ دہلوی (۶)

مولوی سمیع اللہ خاں، بن عزیز اللہ خاں، بن محمد احمد خاں ایک پرانے علوی خاندان سے تعلق تھا جو شیخ جلال الدین سرخ (مخدوم جہانیاں جہاں گشت) کی اولاد میں ہے، مولوی صاحب کے والد منشی عزیز اللہ خاں، آکٹر لونی کے میر منشی تھے۔

مولوی سمیع اللہ جن کا گھریلو نام محمود خان تھا۔ سنہ ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۳ء) میں پیدا ہوئے، آغا مرزا تاریخی نام ہے، والد کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا بے حد خیال تھا، ناظرہ قرآن شریف پڑھنے کے بعد فارسی شروع ہوتے ہی عربی کی کتابوں کی ابتداء ہوئی، دہلی کالج کے مدرس اول و دوم مولانا مملوک العلی اور مولانا سید محمد دہلوی سے دونوں کے گھروں

(۱) تاریخ ادب اردو، سکینہ ترجمہ مرزا محمد عسکری ص: ۶۱-۶۰ (نول کشور لکھنؤ طبع اول)

(۲) نزہۃ الخواطر ص: ۱۳۹ جلد ۷ (حیدرآباد: ۱۳۰۲ھ)

(۳) واقعات دار الحکومت ص: ۱۷۱ جلد دوم (آگرہ ۱۹۱۹ء) ہجری تاریخ کتبہ وصال پر درج ہے، یہی وصال الجلیل میں بھی درج ہے جس کے مصنف دہلی کے رہنے والے تھے اور دہلی کی مقتدر شخصیتوں سے ذاتی طور سے واقف تھے۔

پر پڑھنا شروع کیا۔ مولوی ذکاء اللہ کی اطلاع کے مطابق:

”مولوی سید محمد سے انہوں نے کافیہ اور شرح ملا اور مختصر المعانی کا درس لیا اور مولوی مملوک العلی صاحب سے منطق اور اصول فقہ کی کتابیں پڑھیں، دونوں علماء سے تلمذ اور استفادہ کے بعد معقولات کی اعلیٰ درسیات مولانا مفتی صدر الدین آزر دہ کی خدمت میں حاصل کیں۔“ (۱)

مولوی سمیع اللہ کے خاندان کے اصحاب اپنے زمانہ کے مشہور وکیل اور قانون دان تھے، اس لئے مولوی سمیع اللہ کو بھی قانون پڑھنے کا شوق ہوا، اسی زمانہ میں کچھ دنوں کے لئے دہلی سے بجنور گئے، بجنور میں سرسید احمد منصف تھے، یہ وقت سرسید احمد کے ساتھ گذرا اور اس میں قانون سے واقفیت حاصل کی اور اسی وقت عدالت کے کتب خانہ اور سرکاری کاغذات کی مدد سے ایک مجموعہ قوانین تیار کر لیا، نومبر سنہ ۱۸۵۶ء میں منصفی اور وکالت کا امتحان دیا، سمیع اللہ امتحان میں اول آئے، اور تمام طلبہ سے ممتاز رہے، مفتی صاحب اپنے شاگرد کی اس کامیابی سے خوش ہوئے، ان کو مبارک باد دی مگر آبدیدہ ہو کر فرمایا:

”افسوس اب تم قانونی مشاغل میں مصروف ہونے کے باعث علوم قدیمہ کی شمع کو روشن نہ رکھ سکو گے اور تمہارے استادوں کا نام زندہ نہ رہ سکے گا جنہوں نے اس غرض سے جہاں تک ان سے ممکن تھا حلیہ علم و ادب سے مزین کیا تھا۔“ (۲)

مولوی صاحب نے کتابوں کی اشاعت کیلئے اپنے گھر پر ایک ادارہ قائم کیا تھا جس میں علمی کتابوں کے حاشیہ وغیرہ کی تالیف اور ان کے چھاپنے کا انتظام تھا، مولوی صاحب کی ایک تالیف حاشیہ مختصر المعانی اس پریس میں چھپی تھی، اور کتابیں تیار رکھی تھیں جو سنہ ۱۸۵۷ء میں ضائع ہو گئیں۔

سنہ ۱۸۵۷ء میں دہلی والوں پر جو آفت آئی تھی وہ محتاج بیان نہیں، مولوی سمیع اللہ صاحب نے اس مصیبت کے وقت اپنے متعلقین مفتی صدر الدین آزر دہ وغیرہ کی جس قدر بھی اور جس طرح کی مدد ممکن تھی بہم پہنچائی، جس سے مولوی صاحب کی انسانیت دوستی

(۱) سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں، مولوی ذکاء اللہ ص: ۱۷-۱۸ (لکھنؤ ۱۹۹۷ء)

(۲) سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں، مولوی ذکاء اللہ ص: ۲۳ (لکھنؤ ۱۹۹۷ء)

اعلیٰ خاندانی شرافتوں کا خوب اظہار اور تجربہ ہوا۔

۷ اگست سنہ ۱۸۵۸ء (۲۶ رزی الحجہ ۱۲۷۴ھ) کو کانپور کے منصف کے عہدہ پر تقرر ہوا، اس وقت سے سرکاری ملازمت میں آگئے تھے، اور منصف صدر سے حج کے عہدہ تک تبادلے اور ترقیات ہوتی رہیں، ۱۵ نومبر سنہ ۱۸۹۲ء کو سرکاری خدمات سے پنشن لے کر علیحدہ ہو گئے اور بقیہ زندگی یاد خدا اور قومی خدمات میں بسر کرنے کا ارادہ کر لیا۔

مولانا سمیع اللہ صاحب کو ابتدا سے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور علمی ادارے قائم کرنے کا خیال تھا، پہلے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا آغاز بہت اچھا ہوا تھا مولانا رشید الدین دہلوی کے فرزند مولانا سدید الدین دہلوی اس کے صدر مدرس تھے، جو بعد میں رامپور چلے گئے تھے، اور مولوی سمیع اللہ سرکاری ملازمت کی وجہ سے دہلی سے باہر رہتے تھے اسلئے کالج کی خاطر خواہ ترقی نہ ہو سکی اور یہ مدرسہ یا اسکول جلد ہی بند ہو گیا تھا۔ اپنے اسی ذوق کی وجہ سے سرسید کے تعلیمی کارواں میں شامل ہوئے، سرسید احمد کے ساتھ پر جوش تعاون کیا اور سرسید کے علمی تعلیمی منصوبہ کی ترقی اور آبیاری کے لئے سرگرم رہے، کالج کی ابتداء کی تاریخ بھی مولوی صاحب کے مشورہ سے طے ہوئی تھی، اس وقت مولوی سمیع اللہ علی گڑھ میں سب حج تھے، انہوں نے اپنے معمول کے مطابق اس کیلئے جدوجہد کی اور افتتاحی مجلس کو کامیاب بنایا، کالج کی ترقی میں بھی مولوی صاحب کا خاص حصہ ہے۔ مالی امداد کرتے اور اپنے مشوروں سے بھی تعاون کیا کرتے تھے مگر آخر میں سنہ ۱۸۸۹ء میں ٹرٹی بل کی وجہ سے سرسید سے سخت اختلاف ہو گیا تھا جس سے بدل ہو کر مولوی صاحب کالج اور اس کی کمیٹیوں سے مستعفی ہو کر یکسو ہو گئے۔

مولوی سمیع اللہ صاحب کا ۵ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۶ھ ۷ اپریل ۱۹۰۸ء شنبہ کو علی گڑھ میں انتقال ہوا، میت دہلی لا کر مہندیان کی مسجد سے متصل شیخ عبدالعزیز شکر بار اور مولانا مملوک العلی کے مزارات کے قریب دفن کی گئی۔ (۱)

(۱) تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں، مولوی ذکاء اللہ (لکھنؤ ۱۹۹۷ء)

## [۳۰] مولانا انوار الحق حقی دہلوی (۷)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں سے تھے، مولانا انوار الحق کے والد شاہ احسان الحق اور دادا مفتی اکرام الدین خان صاحب دہلی کی معروف شخصیتوں میں سے تھے۔ مولانا مملوک العلی اور مفتی صدر الدین آزرہ سے تعلیم حاصل کی، تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا، راجپوتانہ کے گورنر جنرل کے میرمنشی تھے، آخر میں پنشن لے کر گھر آگئے تھے۔ نہایت خلیق، منکسر المزاج، پاکیزہ صورت شخص تھے تفصیلی حالات نہیں ملے۔

۲۰ رمضان المبارک سنہ ۱۳۲۰ھ (دسمبر ۱۹۰۲ء) پنجشنبہ کو وفات ہوئی، دوسرے دن جو جمعۃ الوداع تھا، جامع مسجد دہلی میں نماز جنازہ ہوئی۔ (۱)

## [۳۱] مولانا سید عبداللہ دہلوی (۸)

دہلی کالج کے مدرس دوم مولانا سید محمد دہلوی کے فرزند، عالم اور درویش صورت بزرگ تھے۔ مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کی حافظ موسیٰ مانک پوری کے خلیفہ خواجہ عبداللہ دہلوی سے اجازت و خلافت حاصل کی۔

نوے سال کی عمر میں ۲۴ رزی قعدہ سنہ ۱۳۳۰ھ (نومبر ۱۹۱۲ء) کو دہلی میں وفات ہوئی۔ (۲)

(۱) حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی حاشیہ ص: ۲۶۳ (دہلی ۱۳۷۳ھ)  
 (۲) وصال الجلیل (در احوال شاہ جمیل الرحمن راشد دہلوی) تالیف امان الرحمن دہلوی ص: ۱۷ (دہلی ۱۳۳۳ھ)

## [۳۲] مولانا سید ہاشم علی دہلوی (۹)

مولانا کے عہد کی متعدد تحریروں اور فتاویٰ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اپنے عہد میں دہلی کے ممتاز عالم اور اہل فتویٰ میں شمار کئے جاتے تھے، اکثر درسیات مولانا مملوک العلی سے پڑھی تھیں، فرماتے تھے کہ:

”حسامی اور تلوح یہ کتابیں اپنے استاد مولوی مملوک العلی سے پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا

تھا۔“ (۱)

سنہ ۱۸۵۷ء میں آزادی کی تحریک کے وقت دہلی کے علماء نے جہاد کا جو فتویٰ مرتب کیا تھا اس پر دہلی کے جید ترین علماء کے دستخط تھے، منجملہ ان علماء کے مولانا کی مہر بھی اس فتوے پر ثبت ہے: (محمد ہاشم) (۲)

مولانا کا دہلی کے اس دور کے علماء کی تحریروں اور فتاویٰ وغیرہ میں ذکر آتا ہے اور مولانا شیخ محمد تھانوی کی تالیف دلائل الاذکار کے آخر میں جو چند تقریظات درج ہیں ان میں ایک تقریظ مولانا ہاشم کی بھی ہے۔ (۳) عبدالرحیم ضیاء نے مقالات طریقت میں مولانا کے حوالہ سے شاہ عبدالعزیز کے کئی واقعات نقل کئے ہیں۔

افسوس ہے راقم کو مولانا کے حالات بلکہ سن وفات بھی نہیں ملا۔

## [۳۳] مولوی علی احمد (برادر ڈپٹی نذیر احمد) بجنوری دہلوی (۱۰)

مولوی علی احمد خلف سعادت احمد نسب اور وطن وغیرہ کا ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے

(۱) مقالات طریقت و فضائل عزیز، عبدالرحیم ضیاء ص: ۲۸ (حیدرآباد دکن ۱۲۹۲ھ)

(۲) نوائے آزادی، عبدالرزاق قریشی ص: ۸-۹ (بمبئی ۱۹۵۷ء)

(۳) دلائل الاذکار ص: ۱۰۲ (فخر المطابع دہلی ۱۲۷۱ھ)

تعارف میں ذکر آچکا ہے۔ تقریباً سنہ ۱۸۲۷ء (۱۲۴۲-۴۳ھ) میں تولد ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد سے ڈھائی تین سال بڑے تھے، ابتدائی تعلیم سے آخر تک ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ رہے، مولانا نصر اللہ خاں خوشگئی سے پڑھا، مولانا کے مشورہ پر دہلی آئے، دہلی کے علماء سے کچھ کتابیں پڑھیں، پھر دہلی کالج میں داخلہ ہوا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ انہوں نے بھی مولانا مملوک العلی سے پڑھا۔ سنہ ۱۸۵۴ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے اور اسی سال بریلی کے مدرسہ میں عربی کے استاد مقرر کئے گئے، لمبے عرصہ تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے، آخر میں ضلع بجنور کے انسپکٹر مدارس ہو گئے تھے، اسی منصب سے سبکدوش ہوئے، پوری عمر تعلیم کے شعبہ سے وابستہ رہے، عربی میں بڑی دستگاہ حاصل تھی ادیب تھے، اعلیٰ استعداد عربی سے گہری واقفیت اور فنی نظر میں ڈپٹی نذیر احمد سے کم نہیں تھے مگر ان کی شہرت نہیں ہوئی اور کوئی بڑا تصنیفی کارنامہ بھی یادگار نہیں۔ مؤلف حیات النذیر نے لکھا ہے کہ:

”مولوی علی احمد مذہبی پابندی اور تقویٰ میں (مولوی نذیر احمد سے) بدرجہا بڑھے ہوئے

تھے، عالم گم نامی میں رہے۔“ (۱)

مولوی صاحب نے ڈپٹی نذیر احمد کی فرمائش پر عربی صرف و نحو کے بنیادی اصول و قواعد پر توضیح المرام کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی تھی، جو چھپ گئی تھی۔ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۹۰۰ء (۲۴ شعبان ۱۳۱۸ھ) کو بجنور میں وفات ہوئی۔

## [۳۴] کریم الدین پانی پتی دہلوی (۱۱)

کریم الدین کے اجداد پہلی بھیت کے رہنے والے تھے، ان کے دادا پانی پت آگے تھے، وہیں کریم الدین کے والد سراج الدین پیدا ہوئے۔ سراج الدین کے چار بیٹوں میں سے ایک کریم الدین بھی تھے، کریم الدین یکم شوال سنہ ۱۲۳۷ھ (۲۲ جون ۱۸۲۲ء) کو

(۱) حیات النذیر، مولوی افتخار عالم، ص: ۷ (دہلی ۱۹۱۹ء)



پانی پت میں پیدا ہوئے، والد اور دادا دونوں متوکل اور مسجد نشین تھے، گھر میں سخت تنگی اور مالی پریشانی تھی۔

کریم الدین نے پانی پت میں فارسی کی ابتدائی کتابیں اور عربی صرف و نحو پڑھی، پھر دہلی آگئے، تعلیم میں مشغول رہے، اس زمانہ میں دہلی کالج کا غلغلہ بلند تھا، کریم الدین کا اٹھارہ سال کی عمر میں سنہ ۱۲۵۵ھ (۱۸۴۰ء) میں دہلی کالج میں داخلہ ہوا، کالج میں منطق فلسفہ، ہندسہ، حساب، ہیئت، پیمائش، علم الہرایا والمناظر، تاریخ، عربی زبان و ادب اور فقہ پڑھی، پھر کالج کے پرنسپل کی ہدایت پر سیاست مدنی قوانین دیوانی و فوجداری، ریاضی وغیرہ حاصل کیں اور بہت کم وقت میں انگریزی میں ایسی مہارت حاصل کر لی کہ انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے کئے۔

کالج میں مولانا مملوک العلی، کریم الدین کے محبوب اور اہم ترین استاد تھے۔ کریم الدین نے اپنی کتابوں تذکرہ فرائد الدہر اور طبقات شعرائے ہند میں مولانا کا نہایت احترام اور محبت سے ذکر کیا ہے، وہ مولانا کو استاذنا و ہادینا اور میرے استاد کہہ کر یاد کرتا ہے، مگر تعجب ہے کہ محمد اکرام چغتائی صاحب کو کریم الدین کے مولانا مملوک العلی کا شاگرد ہونے میں شبہ ہے، چغتائی صاحب نے لکھا ہے کہ:

”کریم الدین کے اساتذہ میں مولانا مملوک العلی نانوتوی کا نام بھی لیا جاتا ہے ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ علوم مولانا سے پڑھے ہوں۔“ (۱)

جس سے تاثر ملتا ہے کہ چغتائی صاحب کریم الدین کو مولانا کا شاگرد نہیں سمجھتے مگر چغتائی صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں۔ چغتائی صاحب نے اسی صفحہ پر کریم الدین کی تالیف تاریخ شعرائے عرب میں مولانا مفتی صدر الدین کے تذکرہ میں کریم الدین کے الفاظ ”شیخنا و استاذنا و ہادینا“ سے مفتی صاحب کے کریم الدین کے استاد ہونے پر استدلال کیا ہے، اسی کتاب میں مفتی صاحب کے تذکرہ کے چھ صفحہ بعد مولانا مملوک العلی کا ذکر ہے، وہاں کریم الدین نے یہی الفاظ مولانا مملوک العلی کے لئے لکھے ہیں، اگر یہ

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۱۳۲

الفاظ مفتی صاحب کے کریم الدین کے استاد ہونے کی دلیل بن سکتے ہیں تو مولانا مملوک العلی کے متعلق الفاظ سے یہی استدلال کیوں نہیں کیا جاسکتا؟ اور کریم الدین نے صرف اسی موقع پر حضرت مولانا مملوک العلی کو اپنا استاد نہیں لکھا، بلکہ اس نے اپنی اس کتاب میں مولانا سے تلمذ و استفادہ کا کئی جگہوں پر صاف اعتراف کیا ہے، کریم الدین نے مولانا کے کتب خانہ خصوصاً ان کی قلمی کتابوں سے خاصا استفادہ کیا ہے، ان میں سے اور جن کتابوں کے تذکرہ کا تاریخ شعرائے عرب میں موقع آیا وہاں لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا قلمی نسخہ میرے استاد مولانا مملوک العلی کی کتابوں میں ہے، ایک جگہ لکھتا ہے:

”میرے استاد جناب مولوی مملوک العلی مدرس اول مدرسہ دہلی کے“..... (۱)

ایک اور موقع پر صراحت ہے:

”میرے استاد مولوی مملوک العلی صاحب“ (۲)

اس لئے چغتائی صاحب کی یہ رائے درست نہیں، کریم الدین بلاشک و شبہ مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے۔

کریم الدین نے دہلی کالج کے علمی ماحول میں تعلیم پائی تھی، اس لئے تعلیم سے فارغ ہوتے ہی علمی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ کتابوں کے اردو ترجمے کئے، متعدد تصانیف مرتب کیں، اور علمی ادبی محفلوں سے جڑے رہے۔ کریم الدین کو شعر و ادب سے بھی خاص دلچسپی تھی، اس کے گھر پر ماہانہ طرحی مشاعرہ ہوتا تھا اور وہ دہلی کی سماجی علمی محفلوں کی جان سمجھے جاتے تھے۔

کریم الدین سنہ ۱۸۵۰ء میں آگرہ کالج میں مدرس اول مقرر ہوئے، سنہ ۱۸۵۷ء میں ملازمت جاتی رہی، حالات بہتر ہوئے تو کریم الدین لاہور پہنچے، یہاں بھی محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے، پہلے سرشتہ دار پھر انسپکٹر آف اسکول بنائے گئے، اس عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔ صحیح سنہ اور تاریخ وفات معلوم نہیں، شیخ اسماعیل پانی پتی نے بلا کسی حوالہ کے

(۱) تاریخ شعرائے عرب (ترجمہ تذکرہ فرائد الدہر) ص: ۲۰۵ (دہلی ۱۸۴۷ء)

(۲) تاریخ شعرائے عرب (ترجمہ تذکرہ فرائد الدہر) ص: ۳۱۶، ۳۱۷ (دہلی ۱۸۴۷ء)

لکھا ہے کہ کریم الدین سنہ ۱۸۷۹ء میں فوت ہوئے (۱) مگر اس اطلاع کی کسی اور ذریعہ سے تصدیق نہیں ہوئی۔

کریم الدین بہت فعال اور تیز قلم مصنف و مترجم تھے، کئی کتابوں کے ترجمے کئے اور متعدد موضوعات پر تیس سے زائد تالیفات یادگار چھوڑیں (۲) جن میں اردو شعراء کے تذکرہ طبقات شعرائے ہند کو بہت شہرت ملی اور کتابوں میں تذکرہ فرائد الدہر، اس کا اردو ترجمہ تاریخ شعرائے عرب، نیز تاریخ ابوالفداء کا چار جلدوں میں ترجمہ نہایت اہم ہے۔ (۳)

## [۳۵] مولوی حکیم عبدالرحمن حیرت جھنجھانوی (۱۲)

حکیم عبدالرحمن بن شمس الدین امام بخش عاجز بن صدیقی۔ جھنجھانہ کے پرانے علمی دینی گھرانے سے تعلق تھا، تقریباً سنہ ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں ولادت ہوئی۔ حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی کے نواسہ تھے اس وجہ سے کاندھلہ بھی گھر کی طرح تھا، والد کی جلد ہی وفات ہو گئی تھی، تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کاندھلہ کے رشتہ داروں نے انجام دی۔ کاندھلہ رہ کر تین سال میں قرآن شریف کا حفظ اور دور مکمل کیا، مولانا ابوالحسن کاندھلوی سے ابتدائی فارسی پڑھی، مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی سے فارسی کی درسیات کا سبق لیا۔ دہلی آئے تو شاہ محمد اسحاق کے مدرسہ میں قیام کیا، مولانا امام بخش صہبائی سے فارسی میں کمال حاصل کیا، حکیم احسن اللہ خاں دہلوی سے طب پڑھی، اسی دوران مولانا مملوک العلی کے مکان پر بھی رہے اور پڑھا، حضرت مولانا سے غالباً عربی متوسطات اور فنون کی

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۱۳۷

(۲) کریم الدین کے حالات کے لئے دیکھئے ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص: ۱۳۸-۱۸۲

(۳) کریم الدین کی تاریخ شعرائے عرب (ترجمہ فرائد الدہر) مطبوعہ مطبع العلوم دہلی: ۱۸۴۷ء اور ترجمہ تاریخ ابوالفداء چار جلدیں (مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی ۱۸۴۷ء) مع ضمیمہ، ترجمہ المختصر فی اخبار البشر (یعنی مکمل ۵ جلد) کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

کتابوں میں تلمذ ہوا ہوگا، صحیح معلوم نہیں۔ حکیم عبدالرحمن نے لکھا ہے:

”چندے اقامت ماہر مکان جناب مولوی مملوک العلی صاحب ہم قرار یافت، و

کو کب طالب علمی بمہر توجہ بزرگانہ آں حضرت می یافت“ (۱)

ترجمہ: کچھ دنوں جناب مولوی مملوک العلی صاحب کے مکان پر بھی قیام رہا اور ان

حضرت کی توجہ بزرگانہ سے طالب علمی کا ستارہ چمکتا رہا۔

مولانا امام بخش صہبائی سے شعر و سخن میں بھی استفادہ کیا اور مولانا کے فن شعر کے

شاگردوں میں ممتاز گئے گئے۔

حیرت کی سولہ سال کی عمر تھی کہ مولانا ابوالحسن اور مولانا مظفر حسین صاحبان نے ان

کو سرسید کے سپرد کر دیا تھا، سرسید نے دونوں بزرگوں کی اس عنایت و ہدایت کا زندگی بھر

خاص خیال رکھا۔ سرسید کو حیرت سے اپنے عزیزوں بلکہ سگے چھوٹے بھائیوں کی طرح

انیت تھی، سرسید ان کو ہمیشہ سفر و حضر میں اپنے پاس اور ساتھ رکھتے، ساتھ کھانا کھاتے

اور اسی کمرہ میں سلاتے جہاں خود سوتے، حالی نے مرزا غلام نبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

”حافظ عبدالرحمان جو پینتالیس برس سید صاحب کے رفیق رہے وہ رہتک میں بھی ان

کے ساتھ تھے، اگرچہ وہ سرکاری نوکر تھے مگر سید صاحب قلت تنخواہ کے سبب ان کو اپنے پاس

رکھتے تھے، ان سے اکثر ہنسی چہل کے باتیں ہوتی رہتی تھیں، حافظ جی اپنی ترقی کے لئے اکثر کہا

کرتے مگر چوں کہ ترقی کی گنجائش نہ تھی، سید صاحب ہنسی سے یہ کہہ کر ٹال دیتے تھے کہ تمہارا خط

اچھا نہیں اور نہ کبھی اچھا ہو سکتا ہے کیوں کہ تم بد صورت ہو اور بد صورت کبھی خوش نویس نہیں ہو

سکتا۔ ایک دن حافظ جی نے کہا آپ تو ماشاء اللہ بہت وجیہ ہیں آپ کا خط کیوں اچھا نہیں، سید

صاحب نے کہا میرے گلے کی رسولی نے میری وجاہت کو بگاڑ دیا ہے، اس واسطے میں بھی

بد صورت ہو گیا ہوں پس میرا خط کیوں کراچھا ہو سکتا ہے“۔ (۲)

اس محبت و اپنائیت کا کمال یہ تھا کہ:

شامہ مشام افروز (مجموعہ مکتوبات فارسی) عبدالرحمن حیرت چھنچھنوئی ص: ۳۶ (مراد آباد ۱۳۰۳ھ)

(۲) حیات جاوید، مولانا الطاف حسین حالی ص: ۲۱۳ جلد اول (انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۹ء)

”ان کی نیکی اور خوبی کو ہر کوئی یاد کرتا ہے سنہ ۱۸۴۶ء سے جس کو چالیس برس ہوئے سید احمد خاں کے ساتھ بطور عزیز رشتہ داروں کے رہتے تھے، اس عرصہ دراز میں کبھی ایک دن ایسا امر پیش نہیں آیا جو دونوں میں سے کسی کے ملال کا باعث ہوا ہو، اس سے حافظ صاحب مرحوم کی خوبی اور نیک مزاجی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے“۔ (۱)

حیرت سرسید کے بچوں سید محمود اور حامد کے استاد اور معلم و مربی تھے، عبدالرحمان حیرت شروع سے سائنٹفک سوسائٹی، تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مینیجر اور ناشر تھے، سوسائٹی کے تمام کاموں کے علمی سرپرست اور سوسائٹی کے روح رواں بھی وہی تھے۔ اخبار ان کے اہتمام میں چھپتا تھا، سوسائٹی کی مطبوعات کی تصحیح کی خدمت بھی حیرت انجام دیتے تھے، سترہ اٹھارہ برس تک سوسائٹی کا کام کرتے رہے، آخر میں اگرچہ سوسائٹی کا کام ختم ہو گیا تھا مگر عبدالرحمن حیرت سے سرسید کے قدیم روابط اسی طرح قائم رہے، اس کے بعد بھی سرسید احمد نے حیرت کا ہمیشہ اسی طرح خیال رکھا۔

عبدالرحمان حیرت کی تقریباً انسٹھ سال کی عمر میں، ۵ جمادی الثانی سنہ ۱۳۰۳ھ (مارچ ۱۸۸۲ء) کو علی گڑھ میں سرسید کی کوٹھی پر وفات ہوئی، علی گڑھ میں دفن کئے گئے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے تعزیتی نوٹ میں لکھا ہے کہ:

”سید احمد خاں کو ان کے انتقال کا بہت رنج ہوا کیوں کہ آج ان کا چالیس برس کا دوست دنیا سے اٹھ گیا“۔ (۲)

حیرت اچھے منتظم، فاضل طبیب، فارسی اردو کے ادیب، شاعر اور انشاء پرداز تھے فارسی، اردو دونوں زبانوں میں کئی تالیفات اور ایک دیوان علمی یادگار ہے، تالیف میں سے سفینہ رحمانی، انشائے فیض رحمانی، شامہ مشام افروز، فارسی نثر میں اور مجموعہ کلام کے علاوہ مثنوی جنگ عشق، ساقی نامہ اور محمود نامہ اردو میں ہیں۔ آخر الذکر کے علاوہ سب کتابیں چھپی ہوئی ہیں جو ہمارے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

(۱) و (۲) مضمون تعزیت سرسید کے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا۔ ملاحظہ ہو سرسید کی تعزیتی تحریریں، مرتبہ اصغر عباس، ص: ۵۰ (علی گڑھ ۱۹۸۹ء)

## [۳۶] مولوی کریم بخش دہلوی (۱۳)

مولوی کریم بخش کے خاندان و نسب وغیرہ کی تفصیل مجھے نہیں ملی، مولوی کریم بخش دہلی کالج کے طالب علم تھے، کالج کے طلبہ کے احوال اور تفصیلات پر سنہ ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) کے مطبوعہ رجسٹر کے اندراج کے مطابق سنہ ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳ھ) میں کریم بخش کی عمر تقریباً بیس سال تھی، یعنی ان کی سنہ ۱۸۲۷ء (۱۲۴۳ھ) میں ولادت ہوئی ہوگی۔ مولوی کریم بخش کا سنہ ۱۸۴۳ء میں کالج میں داخلہ ہوا، سنہ ۱۸۴۷ء میں عربی کی اول جماعت کی قسم ثانی میں پڑھتے تھے، جس کے استاد حضرت مولانا مملوک العلی تھے اس سال میں جو کتابیں یا مضامین پڑھے وہ یہ ہیں: ہدایہ، تاریخ سیمینی، دیوان متنبتی، جامع التواریخ، جزئیات و کلیات، رسالہ ہیئت، علم مثلث، جواب مضمون، کریم بخش کا کالج کے اچھے طالب علموں میں شمار تھا، اس سال پوری جماعت میں دوسرے نمبر پر آئے تھے۔

مولوی کریم بخش سنہ ۱۸۵۲ء میں دہلی کالج کے رسالہ قران السعدین کے مدیر تھے، اور کئی کتابوں کے مؤلف و مترجم بھی تھے، چند کتابوں میں شریک تصنیف کی حیثیت سے شامل رہے۔

مولوی صاحب کی تالیفات و ترجموں میں رسالہ جبر و مقابلہ ہٹن (HUTTON) کی تالیف کا اردو ترجمہ جو اصول علم مثلث کے نام سے چھپا شائع ہو چکے ہیں، دونوں کتابوں کی تالیف و ترجمہ میں پنڈت رام چندر بھی شامل رہے۔ عجائبات محنت شعاری ایچ ایس رائڈ (H. S. RIDE) کی کتاب (THE PHENOMENA OF INDUSTRIAL LIFE AND CONDITION OF INDUSTRIAL SUCCESS) کا اردو ترجمہ کیا، ہندوستانی پینل کوڈ کے ترجمہ میں عظمت اللہ کیساتھ رہے دائرہ علم جغرافیہ شیام لال کی تصحیح، رسالہ اصول محصول، انتباہ المدرسین مل (MILL) کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ جغرافیہ جہاں وغیرہ جو

سب شائع ہو چکی ہیں، علمی تحریری یادگار ہیں۔ (۱)

## [۳۷] مولانا یعقوب علی بدایونی (۱۴)

مولانا یعقوب علی کا تذکرہ مولوی سید محمد سید پوری بدایونی نے اپنی اہم تالیف مظہر العلماء والکماء میں کیا ہے، جو ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی اطلاع کے مطابق درج ذیل ہے:

”مولوی یعقوب علی صاحب بدایونی معمولی طور سے کتب درسیہ ابتدائی اساتذہ کرام سے پڑھ کر اپنے نانہال بریلی کو تشریف لے گئے، ملازمت کی حالت میں بھی اساتذہ کرام سے پڑھا۔ استاذ الاساتذہ مولانا مملوک العلی صاحب کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔“

”آخر عمر تک سررشتہ تعلیم کے عہدہ ہائے جلیلہ پر مامور رہے، تحریر فتاویٰ میں معروف و مشہور تھے، آپ کی تحریر مستند کہی جاتی تھی، بریلی میں وفات ہوئی۔ مولوی اسحاق صاحب بریلوی بھی آپ کے شاگردانِ رشید میں سے ہیں۔“ (۲)

## [۳۸] مولانا حکیم مرزا منور علی ہاپوڑی (۱۵)

حکیم مرزا منور علی خلف مرزا شہسوار خاں صاحب، سنہ ولادت وغیرہ اور متعلقات درج نہیں۔ فارسی مولانا امام بخش صہبائی سے، عربی مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا مملوک العلی نانوتوی سے پڑھی، طب میں حکیم احسن اللہ کے شاگرد تھے۔

سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد بے پور گئے فوج میں افسر مقرر ہوئے، مگر مطب کا سلسلہ باقی رکھا۔ تقویٰ و طہارت میں کامل سیر چشم اور نہایت مہمان نواز تھے، سنہ ۱۳۰۷ھ

(۱) مفصل تعارف کے لئے ایک نادر مجموعہ کا تیب، ص: ۳۱۹-۳۲۱

(۲) سہ ماہی العلم کراچی۔ اپریل، مئی، جون ۱۹۸۷ء

(۹۰-۱۸۸۹ء) میں وفات ہوئی۔ (۱)

## [۳۹] قطب الدین دلاور علی طرزی ہاپوڑی (۱۶)

قطب الدین دلاور علی بن امداد علی بن اللہ بخش جعفری، حضرت جعفر صادق کی اولاد میں تھے۔ دلاور علی کے والد امداد علی بلند شہر میں سرکاری وکیل تھے، سنہ ۱۸۵۷ء رئیس باراگرھ (بلند شہر) کے مختار تھے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں کے ساتھ تعاون کی وجہ سے جانداد ضبط ہو کر نیلام ہوئی۔ دلاور علی بلند شہر میں پیدا ہوئے، وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، اعلیٰ درسیات کے لئے دہلی گئے، دہلی میں مولانا سدید الدین سے فارسی اور مولانا مفتی صدر الدین آزرہ اور مولانا مملوک العلی سے عربی ادب، منطق و فلسفہ اور حدیث پڑھی، غالب سے شعر میں استفادہ کیا، فارسی میں شعر کہتے تھے۔ مجموعہ کلام اور چند تالیفات یادگار تھیں۔

سنہ ۱۹۰۳ء (۲۱-۱۳۲۰) میں ملازمت سے پنشن لی، آخر میں ہاپوڑ واپس آ گئے تھے، ہاپوڑ میں چار شوال سنہ ۱۳۲۹ھ (۲۸ ستمبر ۱۹۱۱ء) کو وفات ہوئی۔ (۲)

یہ جناب مالک رام کے ان مندرجات کا خلاصہ ہے جو تلامیذ غالب میں شامل ہیں، یہ ممکن تو ہے کہ طرزی مولانا مملوک العلی کے شاگرد ہوں، بشرطیکہ وفات کے وقت دلاور علی طرزی کی عمر تقریباً اسی (۸۰) سال ہو، کیونکہ مولانا مملوک العلی کی سنہ ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۱ء) میں وفات ہو گئی تھی۔ مولانا سے تلمذ و استفادہ کیلئے اور ان جماعتوں میں شرکت کیلئے جو مولانا سے کالج میں پڑھتی تھیں، تیرہ سال تک کی عمر ہونی چاہئے۔

نیز مالک رام صاحب کی اس اطلاع میں دو فروگذاشتیں اور ہیں، لکھا ہے کہ مولانا مملوک العلی سے حدیث پڑھی، اول تو حدیث شریف پڑھنے کا دور تعلیم کے آخر میں آتا

(۱) رموز الاطباق، حکیم فیروز الدین لاہوری ص: ۴۲۰ (لاہور سنہ ۱۹۲۴ء)

(۲) تلامذہ غالب، مالک رام۔ ص: ۲۰۳ (طبع اول نکودر: بلاسنہ)



ہے، دوسرے مولانا مملوک العلی صاحب کے حدیث پڑھانے کی کوئی روایت و اطلاع اس وقت تک دریافت نہیں ہوئی، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا سے ادب اور معقولات وغیرہ پڑھی ہوں گی، حدیث کے اسباق کی تصدیق میں تامل ہے۔

اس اطلاع میں ایک اور بڑی غلطی یہ ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (ولادت ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۰ھ، ستمبر ۱۸۶۳ء) کو دلاور علی طرزی کا ہم سبق لکھا ہے جو ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ مولانا تھانوی کی ولادت سے تیرہ سال پہلے مولانا مملوک العلی کی وفات ہو گئی تھی، یہ ممکن ہے کہ طرزی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی یا حضرت مولانا گنگوہی وغیرہ میں سے کسی کے ہم سبق ہوں، بہر صورت طرزی کا حضرت مولانا مملوک العلی سے تلمذ مزید معلومات اور صحیح تحقیق کا متقاضی ہے۔

## قسم پنجم

مولانا کے چند شاگرد جن کے حالات نہیں ملے

[۴۰ تا ۴۸] (۸ تا ۱)

حضرت مولانا کے جو شاگرد معلوم ہیں ان میں سے چند ایسے بھی ہیں کہ ان کے صرف نام ملتے ہیں، احوال و تعارف دریافت نہیں، مگر ان کا جو بھی مختصر سے مختصر حوالہ ہے اس میں حضرت مولانا سے تلمذ کی صراحت ہے، اس لئے وہ نام یہاں درج کئے جاتے ہیں، ممکن ہے کسی وقت ان کا تعارف اور علمی خدمات کا تذکرہ مل جائے۔

(۴۰) مولوی مشتاق احمد: دہلی میں خاندان حضرت شاہ عبدالحق محدث کی آخری علمی شاخ میں مولانا انوار الحق حقی قابل ذکر ہیں، مولانا انوار الحق کے استادوں میں ایک

استاد کا نام مولانا مشتاق احمد ہے، جو مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے۔ (۱)  
 (۴۱) مولانا وجیہ اللہ: مولوی وجیہ اللہ کا وطن، نسب، تعلیمی تفصیل کچھ معلوم نہیں۔  
 مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی نے حضرت مولانا مملوک العلی سے تعلیم اور مولانا مفتی صدر  
 الدین آزرہ کے ذریعہ ایک اہم امتحان کے واقعہ میں ضمناً یہ بھی فرمایا ہے کہ:  
 ”مولوی محمد مظہر صاحب سہارنپوری اور مولوی وجیہ اللہ صاحب اور میں تینوں ہم درس  
 تھے۔“ (۲)

اس مختصر اشارہ کے علاوہ مولانا وجیہ اللہ کے متعلق راقم کو کچھ نہیں ملا۔  
 (۴۲) مولانا علیم اللہ بجنوری: حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد مولانا  
 حکیم رحیم اللہ بجنوری کے والد ماجد مولانا علیم اللہ صاحب کے احوال بھی دریافت نہیں مگر  
 مولانا حکیم رحیم اللہ کے تعارف میں ضمناً یہ اطلاع درج ہے کہ ان کے والد مولانا علیم اللہ  
 حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے۔ (۳)  
 (۴۳) حافظ فخر الدین گنگوہی کے والد ماجد: حافظ فخر الدین صاحب گنگوہی  
 حضرت مولانا خلیل احمد انبھٹوی مہاجر مدنی کے خلیفہ اور خاص متوسلین میں تھے۔ حافظ  
 فخر الدین کے والد کے تعارف میں یہ اندراج ہے کہ وہ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی  
 کے شاگرد تھے۔ (۴)

(۴۴) مولوی خدا بخش دہلی: کالج کے طالب علم اور مولانا مملوک العلی کے شاگرد  
 تھے، مولوی خدا بخش نے دہلی کالج کے چند اور سابق طالب علموں کی شرکت میں ایک  
 پریس قلام کیا تھا جس میں برکت علی بھی شامل تھے، خدا بخش کے تفصیلی حالات کا راقم  
 سطور کو علم نہیں۔ (۵)

(۱) تذکرہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی حاشیہ ص: ۲۶۳ (دہلی ۱۹۵۳ء)

(۲) تذکرہ رحمانیہ، مولانا عبدالکلیم انصاری پانی پتی، ص: ۲۷ (لاہور ۱۴۰۰ھ)

(۳) تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ مرتبہ جناب سید محبوب رضوی، ص: ۱۹۰ (مطبوعہ الرشید ساہیوال)

(۴) تذکرۃ الخلیل، ص: ۳۹۶ (سہارنپور ۱۳۹۵ھ)

(۵) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص: ۳۶۰

(۲۵) عبدالرحمان (۱) (۲۶) شمس الدین (۲) (۲۵) ریاض الدین  
یہ تینوں دہلی کالج کے طالب علم تھے اور سنہ ۱۸۴۷ء میں کالج کی عربی کی اعلیٰ  
جماعت کی صف اول و دوم میں شامل تھے، اس جماعت کے طلبہ جس میں ان تینوں کے  
علاوہ علی اکبر اور علی اصغر سونی پتی بھی شامل تھے، فقہ اور ادب کی اعلیٰ کتابیں درمختار، تاریخ  
یمینی دیوان حماسہ وغیرہ پڑھتے تھے، یہ کتابیں عربی کی اعلیٰ جماعت کی تھیں جن کو حضرت  
مولانا مملوک العلی پڑھاتے تھے، اس طرح یہ بھی حضرت مولانا کے شاگرد ہیں، ان تینوں  
کے متعلق راقم کو کچھ اور معلوم نہیں۔ (۳)  
(۲۸) حاجی احمد علی احراری رانم پوری: انکے بھی نام کے علاوہ کچھ اور معلوم نہیں۔

## قسم ششم

### چند شیعہ تلامذہ

کالج کے اساتذہ خصوصاً حضرت مولانا، غیر مسلم اور دوسرے فرقہ کے طالب  
علموں کو بھی اسی محبت اور توجہ سے پڑھاتے تھے جس طرح اور طالب علموں کو، کالج  
کے حضرت مولانا کے شاگردوں میں تین شیعہ صاحبان بھی تھے۔ تینوں ہی ذہین ذی  
لیاقت اور باصلاحیت تھے، تینوں کا یہاں تذکرہ ضروری ہے، جس سے اور باتوں  
کے علاوہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہمارے اکابر علمی معاملات اور تدریس و تعلیم میں فکر  
اور نظریہ کے اختلافات کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ شاید وہ زبانِ حال سے کہتے  
ہوں گے: ”میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے“

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص: ۲۵۶

(۲) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص: ۲۵۶

(۳) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، ص: ۴۴

مولانا کے شیعہ شاگردوں اور دہلی کے ممتاز طلبہ میں سے مولوی برکت علی دہلوی، علی اکبر سونی پتی اور اسکے بھائی علی اصغر سونی پتی کا تعارف ملا ہے جو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔

## [۴۹] مولوی برکت علی تھانیسری (۱)

موضع بونڈری ضلع تھانیسری (موجودہ ہریانہ) کے ایک شیعہ خاندان سے نسبی رشتہ تھا، غالباً سنہ ۱۸۲۵ (۱۲۴۰ھ) کے قریب ولادت ہوئی ہوگی، تقریباً سنہ ۱۸۴۱ء (۱۲۵۶-۵۷) میں دہلی کالج میں تعلیم کے لئے داخل ہوئے، شیعہ جماعت کے طلبہ میں ممتاز تھے۔

اگرچہ چغتائی صاحب نے مولوی برکت علی کے استادوں میں مولانا مملوک العلی کا نام ذکر نہیں کیا، لیکن مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ فقہ اور دینیات کے علاوہ سنی اور شیعہ طلبہ کی درسی کتابیں ایک ہی ہوتی تھیں، ان میں فرق اور اختلاف نہیں تھا۔ کالج کے طلبہ کے رجسٹر سنہ ۱۸۴۷ء کے حوالہ سے چغتائی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سنہ (۱۸۴۷ء) میں شیعہ جماعت کو جو کتابیں پڑھانی جا رہی تھیں ان میں تاریخ یمینی، دیوان حماسہ، ہدایہ بھی شامل تھیں، یہ سب کتابیں حضرت مولانا مملوک العلی پڑھاتے تھے، اس لئے اس میں شک نہیں کہ برکت علی مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے۔

تعلیم کے بعد لکھنؤ کے اسکول میں مدرس ہوئے، اسی زمانہ میں لکھنؤ کے شیعہ علماء خصوصاً سید محمد مجتہد سے استفادہ کیا مگر لکھنؤ کی ملازمت اور قیام سے خوش نہیں تھے، چاہتے تھے کوئی اور جگہ مل جائے، کئی سال کی کوشش کے بعد مدرسہ تعلیم المعلمین لاہور میں مدرس اول مقرر ہو گئے، جو ان کے پسند کے مطابق تھی، یہاں محنت سے کام کیا اور آخر تک لاہور میں رہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء تک زندہ تھے، صحیح تاریخ وفات معلوم نہیں۔ (۱)

(۱) ایک نادر مجموعہ مکاتیب، محمد اکرام چغتائی ص: ۳۲۸-۳۲۴

## [۵۰] علی اکبر سونی پتی (۲)

سونی پت کے خاندان سادات کافر دتھا، تقریباً سنہ ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) میں پیدا ہوا، بچپن سونی پت میں گذرا۔ یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، غالباً سنہ ۱۸۳۸ء کے قریب دہلی آیا، سنہ ۱۸۴۰ء کے وسط (۱۲۵۶ھ) میں علی اکبر کو دہلی کالج میں داخلہ ملا، تقریباً سات سال کالج میں پڑھا، اکثر درسیات مولوی کریم الدین پانی پتی سے اور ہدایہ حماسہ اور حدیث کالج میں پڑھی، وہ سنہ ۱۸۴۷ء میں کالج کی عربی جماعت کے فریق اول کا طالب علم تھا، اسلئے اس سال کالج میں در مختار، تاریخ یمنی، جامع التواریخ، دیوان حماسہ، جزئیات و کلیات، رسالہ ہیئت، علم مثلث اور جواب مضمون پڑھے۔ امتحانات میں اعلیٰ درجہ کے نمبرات سے کامیاب ہوا، اس جماعت کے استاد اول حضرت مولانا مملوک العلی تھے اس طرح علی اکبر بھی مولانا کے شاگردوں میں شامل ہے۔

اسپرنگر نے بھی جو کالج کا پرنسپل تھا اس کی لیاقت و ذہانت کی وجہ سے اس پر خاص نظر رکھی، اور جب اسپرنگر کو نواب اودھ کے کتب خانوں کی قلمی کتابوں کی فہرست بنانے کے لئے لکھنؤ بھیجا گیا تو وہ علی اکبر کو بھی ساتھ لے گیا تھا، اسپرنگر ۳ مارچ سنہ ۱۸۴۸ء (۲۶ ربیع الاول ۱۲۶۲ھ) کو لکھنؤ پہنچا تھا اور فوراً ہی اپنے متعلقہ کام میں لگ گیا تھا، اسپرنگر نے مخطوطات اودھ کی جو فہرستیں مرتب کیں ان میں سے صرف پہلی جلد سنہ ۱۸۵۶ء میں کلکتہ سے چھپی تھی، جس میں علی اکبر کا خاص تعاون شامل تھا۔

علی اکبر فروری سنہ ۱۸۵۰ء (ربیع الاول الثانی ۱۲۶۶ھ) میں لکھنؤ سے دہلی آیا اور اسی مہینہ دہلی کالج میں عارضی مدرس بنا لیا گیا، پھر اس نے یہ ملازمت ترک کر دی، دہلی کچھری میں ناظر ہوا، اسکے بعد اسپرنگر کی کوششوں سے اپریل سنہ ۱۸۵۰ء (۶۷-۱۲۶۶ھ) میں آگرہ کالج کے شعبہ عربی میں مدرس ہو گیا، مگر وہاں پہنچ کر کچھ ہی دنوں کے بعد بیمار ہو گیا، جس کی وجہ سے ملازمت چھوڑ کر دہلی آ گیا۔ دہلی میں ۲۵ جون سنہ ۱۸۵۲ء

(۶۹-۱۲۶۸ھ) کو صرف ستائیس سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔

## [۵۱] علی اصغر سونی پتی (۳)

علی اکبر کا حقیقی چھوٹا بھائی تھا، سنہ ۱۸۲۷ء (۱۲۴۲ھ) میں پیدا ہوا۔ علی اکبر کے ساتھ دہلی کالج میں داخلہ ہوا، کالج کے اور استادوں کے علاوہ مولانا مملوک العلی سے بھی پڑھا۔ اس کا بھی کالج کے اچھے طالب علموں میں شمار تھا، فقہ اور ادب کی وہی اعلیٰ کتابیں جو علی اکبر نے حضرت مولانا مملوک العلی سے پڑھی تھیں اس نے بھی پڑھیں۔

علی اصغر تعلیم کے بعد غالباً سنہ ۱۸۵۱ء میں آگرہ کالج میں اردو کا مدرس دوم ہو گیا تھا، مزید کوائف اور وفات وغیرہ معلوم نہیں۔

یہ حضرت مولانا کے کثیر شاگردوں کی بہت بڑی جماعت میں سے چند اصحاب کا تذکرہ ہے، اگرچہ اس فہرست میں وسیع و کثیر اضافہ ممکن ہے لیکن اگر اضافہ نہ بھی ہو اس وقت بھی یہ فہرست ہزاروں معلوم شخصیات پر بھاری ہے، اسی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا مملوک العلی کے دریائے علم و فیض کی بارش کیسی رحمت فشاں، ہمہ گیر اور حیات آفریں تھی۔ جہاں جہاں وہ برس گئی اُس کے اثر سے صدر رنگ گل بوٹے اُگ آئے، گلستاں کھل اُٹھے اور بہاروں کا سماں ہو گیا مگر یقیناً:

ایں سعادت بہ زور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

## باب (۲۲)

سر سید احمد کے مولانا مملوک العلی نانوتوی سے تلمذ  
اور دہلی کالج میں پڑھنے کی روایت پر ایک نظر

ہمارے حلقوں میں بعض روایتیں سینہ بہ سینہ چلتی ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ان ہی میں سے کچھ روایتیں سینہ سے کاغذ کے سفینہ یعنی تحریرات اور کتابوں میں بھی منتقل ہو جاتی ہیں، مگر ضروری نہیں کہ یہ سب روایتیں پوری طرح درست اور مطابق واقعہ ہوں۔ ان میں سے بعض روایتیں تو بزرگوں سے ہماری عقیدت و محبت کا مظہر ہوتی ہیں، جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا، اور بعض ایسی ہوتی ہیں کہ جو اگرچہ کسی بڑی شخصیت کی اطلاع یا تحریر کی وجہ سے کتابوں میں نقل ہو گئی ہیں اور ان کا کثرت سے اعادہ اور تکرار بھی ہوا ہے مگر تاریخی حقائق ان روایتوں کا ساتھ نہیں دیتے، ایسی ہی مشہور مگر بے اصل روایتوں میں سے ایک روایت یا اطلاع یہ بھی ہے کہ سر سید احمد اور قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی دونوں ایک درس گاہ مدرسہ دہلی (یاد دہلی کالج) کے تعلیم یافتہ اور ایک ہی استاد، استاد العلماء حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کے شاگرد تھے۔ یہ بات یہاں تک پہنچی کہ بعض اصحاب نے حضرت مولانا محمد قاسم اور سر سید کو ہم سبق لکھ دیا ہے اور اس نظریہ کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ سر سید احمد کے حضرت مولانا محمد قاسم کے رفیق درس، ہم مدرسہ وہم استاد ہونے کا سر سید احمد کے حلقوں اور علی گڑھ میں کم تذکرہ آتا ہے مگر حضرت مولانا کے وابستگان فیض ہی اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال ہمارے حلقوں میں خاصی شہرت کے باوجود یہ روایت و اطلاع صحیح نہیں اور معتبر ثبوت کی محتاج ہے۔

راقم سطور کی معلومات میں اس روایت کی بنیاد مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریروں پر ہے، مولانا سندھی نے اپنی تالیفات ”التمہید لتعریف ائمة التجدید“ اور ”شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک“ میں اس کا ذکر کیا ہے کہ سرسید احمد مولانا مملوک العلی نانوتوی کے شاگرد تھے اور دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج مسلم یونیورسٹی ولی اللہی تحریک کے دورخ یا ایک مکتب فکر کی دو شاخیں ہیں۔ التہمید میں لکھا ہے کہ:

”واخذ عنه السيد احمد الدهلوی مؤسس الجامعة الاسلامیة

علی گڑھ“ (۱)

یہی خیال شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے:

”سرسید احمد خان استاد اساتذۃ الہند مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے“ (۲)

اپنے اسی خیال کی وجہ سے مولانا سندھی یہ بھی کہتے ہیں کہ:

”اس (ولی اللہی) جماعت کی مرکزی قوت ایک اختلاف کی بنا پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور دلی کے عوض دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے، جس طرح مولانا محمد قاسم دلی کالج کے عربی حصے کو دیوبند لے گئے، اسی طرح سرسید احمد خان نے دلی کالج کے انگریزی حصے کو علی گڑھ پہنچا دیا۔“ (۳)

مولانا سندھی کی یہ اطلاع مولانا محمد میاں صاحب اور دوسرے اہل قلم نے اپنی کتابوں اور مضامین میں بار بار نقل کی، وہاں سے نئی کتابوں اور تحریرات میں منتقل ہوئی، اس طرح اس کو شہرت عام اور گویا استناد کا درجہ حاصل ہو گیا۔ حالاں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سرسید احمد نے مولانا مملوک العلی سے یادہلی کالج میں پڑھا ہو۔ مولانا سندھی سے پہلے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا، سرسید احمد کی تحریروں، تصانیف، مکتوبات اور سوانحات میں بھی اس کا تذکرہ نہیں آیا، سرسید احمد کے معاصرین، رفقاءے کار، علی گڑھ تحریک کے

(۱) التہمید لتعریف ائمة التجدید۔ ص: ۱۴۷ مرتبہ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی، (جام شورو، سندھ: ۱۳۷۶ھ)

(۲) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، حاشیہ ص: ۱۲۷ (طبع دوم، لاہور: ۱۹۴۵ء)

(۳) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص: ۱۸۵ (طبع اول لاہور: ۱۹۴۲ء) ص: ۱۲۶ (طبع دوم لاہور: ۱۹۴۵ء)



رہنماؤں اور علی گڑھ تحریک سے متعلق معتبر ذخیرہ میں اس کا کہیں اندراج نہیں اور سرسید احمد کی تحریریں بھی اس کی عملاً تردید کر رہی ہیں کہ سرسید احمد نے مولانا مملوک العلی سے یا دہلی کالج میں پڑھا ہے، آئندہ صفحات میں اسی اجمال کی کسی قدر تفصیل ہے۔

سرسید احمد کے حضرت مولانا مملوک العلی سے تلمذ یا دہلی کالج میں تعلیم و استفادہ کی تحقیق و تصدیق کے کئی ذرائع ہو سکتے ہیں، جن میں سرسید احمد کی تالیفات، تحریرات اور مکتوبات، سرسید احمد کے احوال و خدمات پر لکھی گئی معتبر کتابیں، سرسید احمد کے معاصرین و رفقاء کی اطلاعات، دہلی کالج کا ریکارڈ، کالج کی تاریخ، اس کے اساتذہ کے احوال و خدمات پر دریافت مآخذ، اس زمانہ کے دہلی کالج کے استادوں کی روایتیں یا یادداشتیں، مولانا مملوک العلی کے کسی شاگرد کا قول، یا کوئی اور ایسا مستند ذریعہ جس پر بلا تامل اعتماد کیا جاسکے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، مگر اس تذکرہ اور جائزہ سے پہلے سرسید احمد کی تاریخ ولادت اور ان کے علمی تعلیمی سفر کا کچھ تذکرہ ضروری ہے۔

سرسید احمد، ۵/۵/۱۲۳۲ھ، ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ (۱) حضرت شاہ غلام علی دہلوی کی مجلس میں تعلیم کی ابتداء ”بسم اللہ“ ہوئی، قرآن شریف پڑھا مولوی حمید الدین سے (جو سرسید احمد کے نانا مولوی فرید الدین کے یہاں ملازم تھے) فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنی والدہ (عزیز النساء بیگم) سے گلستاں پڑھی، پھر عربی تعلیم کا آغاز ہوا، متوسط عربی درسیات میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے مقامات حریری کے چند مقامے اور عربی ادب کی چند کتابیں پڑھی تھیں کہ سرکاری ملازمت میں آگئے، جس کی وجہ سے درسیات کا نصاب پورا کرنے کا موقع نہیں ملا، مگر ملازمت کی مصروفیات اور دہلی قیام کے زمانہ میں سرسید احمد نے اس کی تلافی یا تکمیل کا سفر جاری رکھا، جو اگرچہ درسیات کے اختتام تک نہیں پہنچا مگر اس میں کچھ پیش رفت اور ترقی ضرور ہوئی۔

یہ سرسید احمد کے تعلیمی سفر کی وہ روداد ہے جو حالی نے حیات جاوید میں کسی قدر

(۱) حیات جاوید الطاف حسین حالی۔ ص: ۱۳ (دہلی: ۱۹۳۹ء) (ترقی اردو بیورو، دہلی کی چھپی ہوئی حیات جاوید جو آج کل عموماً دستیاب اور مستعمل ہے اسی اشاعت کا عکس ہے)۔

وضاحت سے ذکر کی ہے (۱) سرسید پر لکھنے والوں نے عموماً اسی پر اعتماد کیا ہے (مگر ان اطلاعات کے بعض پہلو مشتبہ اور تصحیح طلب ہیں جسکی کسی اور موقع پر وضاحت کی جائے گی)۔ سرسید تعلیم میں مشغول تھے کہ ان کا محکمہ مال میں امین کے عہدہ پر تقرر ہو گیا جو سرسید کی سرکاری ملازمت کا آغاز تھا۔ امین سے صدر امین بنے، اس کے علاوہ مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے، ملازمت کے سلسلہ میں اب تک فتح پور سیکری اور آگرہ میں قیام رہا، ان ملازمتوں کے زمانہ میں سرسید احمد کی تصریح کے مطابق آگرہ اور دہلی میں اور حالی کے بقول روہتک میں بھی تعلیم و استفادہ کا سلسلہ جاری تھا۔

حالی کی معلومات کے بعد اب سرسید احمد کی تصریحات پر ایک نظر مناسب ہے، سرسید نے اپنی تحریرات و مؤلفات میں (اپنے خاندان کے افراد کے علاوہ) صرف تین یا چار علماء سے تعلیم حاصل کرنے اور اپنے علمی استفادہ کا اعتراف کیا ہے، جو یہ ہیں:

۱- مولانا شاہ مخصوص اللہ (خلف حضرت شاہ رفیع الدین صاحب) (۲)

۲- مولانا نور الحسن کاندھلوی (۳)

۳- مولانا فیض الحسن سہارنپوری (ضمناً) (۴)

۴- حکیم غلام حیدر دہلوی (۵)

ان چاروں کے علاوہ کسی اور عالم یا طبیب کا سرسید اپنے استاد کی حیثیت سے ذکر نہیں کرتے۔ نیز اس موضوع پر الطاف حسین حالی اور سرسید احمد کی تصریحات میں کسی قدر فرق اور اختلاف بھی ہے۔ حالی نے سرسید احمد کے اساتذہ کی جو فہرست حیات جاوید میں

(۱) آثار الصنادید، ص: ۱۲۶ باب چہارم (طبع اول دہلی: ۱۸۴۷ء)

(۲) سرسید احمد نے اپنے سفر پنجاب، (فروری: ۱۸۸۴ء) میں کہا تھا کہ میں ان کو اپنا استاد سمجھتا ہوں میں نے ان سے ایک کتاب مسیحی نمنا، اصول فقہ کی اور چند مقامے مقامات حریری کے پڑھے ہیں اور کہا:

”میں ان سبقوں کو بھول نہیں گیا ہوں جو آپ نے مجھے پڑھائے ہیں“

سرسید کا سفر نامہ پنجاب مؤلفہ مولوی سید اقبال علی مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، ص: ۲۰۶ (لاہور: ۱۹۷۳ء)

(۳) حیات جاوید۔ ص: ۴۰

(۴) آثار الصنادید، ص: ۹۵ باب چہارم (طبع اول دہلی: ۱۸۴۷ء) ص: ۵۴ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء)

(۵) آثار الصنادید، ص: ۱۲۶ باب چہارم (طبع اول دہلی: ۱۸۴۷ء)

درج کی ہے وہ سرسید احمد کی خودنوشت اطلاعات سے کسی قدر مختلف ہے اور مذکورہ علماء سے تعلیم و استفادہ کی ترتیب کی وضاحت میں بھی سرسید احمد کی تحریریں حالی کی تصریحات کی تصدیق نہیں کرتیں۔

حالی سرسید کے استادوں میں مولانا نور الحسن کاندھلوی کا جان بوجھ کر تذکرہ نہیں کرتے، حالاں کہ مولانا نور الحسن سرسید کے سب سے بڑے مربی اور استاد ہیں، ان کی صحبت کا سرسید کی زندگی پر گہرا اثر پڑا تھا، جس کا خود سرسید کو بھی اعتراف ہے (۱) مگر حالی اس فہرست میں مولانا نواز شہ دہلوی کا اضافہ کرتے ہیں (۲) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ سرسید احمد نے شاہ مخصوص اللہ صاحب سے مشکوٰۃ شریف وغیرہ پڑھی تھی مگر سرسید احمد کی تحریروں میں اس تعلیم و تلمذ کا کچھ ذکر نہیں۔

سرسید احمد نے یہ تو ذکر کیا ہے کہ انہوں نے شاہ مخصوص اللہ صاحب سے قرآن شریف پڑھا ہے اور شاہ مخصوص اللہ سے قرآن شریف کی جو متواتر سند ملی تھی وہ بھی تبیین الکلام کی تمہید میں درج کی ہے (۳) مگر شاہ صاحب سے مشکوٰۃ شریف وغیرہ پڑھنے کا ذکر نہیں کیا۔ جس وقت حالی سرسید احمد کو شاہ مخصوص اللہ صاحب کے درس میں حاضر دکھا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ روہتک سے دہلی واپسی کے بعد سرسید نے شاہ مخصوص اللہ سے حدیث پڑھی (۴) سرسید احمد اس زمانہ میں شاہ مخصوص اللہ کی گوشہ نشینی کی صراحت کر رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں کہ:

”ایک عرصہ ہوا کہ سرشتہ تدریس کو ہاتھ سے دے کر گوشہ نشین ہیں“ (۵)

اس لئے یہ اطلاع مشتبہ ہے۔

(۱) آثار الصنادید ص: ۶۵ باب چہارم (طبع اول) طبع نول کشور، ص: ۳۷

(۲) حیات جاوید، ص: ۳۶ حصہ اول (دہلی: ۱۹۳۹ء)

(۳) تصانیف احمدیہ (تبیین الکلام فی تفسیر التوراة والانجیل علی ملۃ الاسلام) جلد اول حصہ اول (علی گڑھ: ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء)

(۴) حیات جاوید، ص: ۳۶ حصہ اول

(۵) آثار الصنادید، ص: ۹۵ باب چہارم (طبع اول دہلی: ۱۸۴۷ء) ص: ۵۴ باب چہارم (لکھنؤ)

اگرچہ سرسید احمد کی تعلیم کی روداد اور استادوں کے تعارف میں سرسید احمد کی خود نوشت اطلاعات کو نظر انداز کرنے کی کوشش اور صحیح معلومات سے احتراز و احتیاط اور سرسید کی اطلاعات کو کمی زیادتی کے ساتھ پیش کرنے کے حالی کے طرز عمل پر بحث و گفتگو کی خاصی گنجائش ہے مگر یہ صفحات اس کا محل نہیں، یہاں صرف اس قدر ذکر کرنا ہے کہ حالی اور سرسید کی اطلاعات اور حیات جاوید میں مندرجہ واقعات کی ترتیب میں اختلاف کے باوجود سرسید و حالی دونوں سرسید احمد کے مولانا مملوک العلی سے تلمذ و استفادہ یا دہلی کالج میں تعلیم پانے کا ذکر نہیں کرتے۔

سرسید احمد کا ذوق و مزاج یہ ہے کہ وہ اپنے بزرگوں، استادوں اور محسنین کا بار بار ذکر کرتے ہیں جس میں تشکر و ممنونیت کا احساس صاف جھلکتا ہے، اور سرسید نے جن علماء یا اہل کمال سے تعلیم حاصل کی تھی یا تعلیمی استفادہ کیا تھا ان کے خانوادہ اور متعلقین کے ساتھ سرسید احمد نے ہمیشہ گہرے تعلقات قائم رکھے، ان کے احسانات کا بدلہ دینے اور اس قرض کو چکانے کی مسلسل کوشش کی جو سرسید پر عاید تھا، یہ خوبی سرسید احمد کے اخلاق و کردار کا ایک خاص حصہ ہے۔ سرسید کا یہ بھی معمول ہے کہ وہ جب کسی ایسے عالم کا ذکر کرتے ہیں جن سے انہوں نے پڑھایا استفادہ کیا ہے تو وہ عموماً اس کی صراحت کر دیتے ہیں کہ یہ میرے استاد ہیں، میں نے ان سے استفادہ کیا ہے، ان کی میرے حال پر عنایت کی نظر ہے، مجھ پر کرم فرماتے ہیں، میرے دوست ہیں، آثار الصنادید میں بیس سے زائد مقامات پر اس طرح کی صراحت اور اعتراف درج ہے۔

آثار الصنادید میں سرسید احمد نے اس کا بھی التزام کیا ہے کہ وہ اس کتاب میں ان ہی علماء، بزرگوں یا اہل فضل و کمال کا تذکرہ کریں گے جن کو انہوں نے خود دیکھا ہے (۱) (اگرچہ اس میں خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ کے چند بزرگوں اور رسول شاہی سلسلہ کے چند فقیروں کا استثنیٰ بھی ہے، جس کی وجہ بھی سرسید نے ذکر کر دی ہے) اور اس میں اپنے بزرگوں، استادوں اور محسنین اور دوستوں کا ذکر خاص طور سے شامل کیا ہے، جس میں ان

(۱) آثار الصنادید، ص: ۲۰ (در تذکرہ مولانا شاہ فخر الدین دہلوی) نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء

کے کرم اور عنایت کی صراحت ہے۔

سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی دہلوی (وفات: ۱۲۳۶ھ) کی عنایت و شفقت کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے:

”میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے نہایت اعتقاد تھا اور میرے جناب والد ماجد اور میرے بڑے بھائی جناب احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر مرحوم کو آپ ہی سے بیعت تھی اور آپ کو میرے خاندان پر اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

میرے والد ماجد بھی آپ کی صحبت کی برکت سے آزاد مزاج اور وارستہ طبع تھے، کبھی کبھی بموجب اس مصرع کے ”کر مہائے تو مارا کرد گستاخ“ کوئی بات گستاخانہ عرض کرتے یا کوئی حرکت آپ کے خلاف مرضی سرزد ہوتی تو آپ بار بار ارشاد فرماتے کہ اگرچہ میں اپنے تئیں غم زن و فرزند سے دور رکھا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت اپنے فرزندوں سے سوادے دی، جو چاہو سو کہو اور جو چاہو سو کرو۔ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے، لڑکپن میں کچھ تمیز تو ہوتی نہیں خصوصاً صغرن میں جو چاہتا سو کہتا اور حرکات بے تمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے، میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا، آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا۔“ (۱)

اس کے بعد متعدد اصحاب سے ذاتی روابط، انکی بزرگانہ شفقت و محبت وغیرہ کا موقع بہ موقع اقرار و اعتراف کیا ہے، یعنی آثار الصنادید میں جن علماء اور اہل کمال کا ذکر ہے ان میں سے جس کسی سے سرسید کی ذاتی واقفیت تھی، ان کی سرسید پر عنایت و کرم کی نظر تھی، سرسید احمد سے دوستی تھی، بے تکلف ملاقات تھی، یا کوئی اور وجہ ربط و ملاقات تھی، سرسید نے ہر اک کا صاف ذکر اور اعتراف کیا ہے، مثلاً حکیم غلام حیدر کے تعارف میں لکھا ہے:

”راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے“ (۲)

(۱) آثار الصنادید، ص: ۳۱۰ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء) (۲) ایضاً ص: ۳۷

اور کیونکہ آثار الصنادید کی تصنیف کے وقت بھی سرسید مولانا نور الحسن صاحب کاندھلوی کے زیر تربیت تھے، اس لئے مولانا سے اپنے تلمذ کا یوں اعتراف کیا ہے:

”بہ مقتضائے اس کے کہ: بد ارا بہ نیکاں بہ بخشد کریم... راقم آثم کے حال پر ان حضرات کی نگاہ توجہ کو اب ایسا مصروف کر دیا ہے کہ بدرجہ عنایت نظر تربیت استادانہ منظور فرماویں تا کہ شاید یہی نظر عنایت بارگاہ کریم میں اس احقر کی نجات کا سبب ہو جائے“ (۱)

یہاں ضمنیاً یہ وضاحت بھی مفید ہوگی کہ اگرچہ آثار الصنادید میں صرف ان علماء یا اہل کمال کا ذکر کیا گیا ہے جو اس وقت میں موجود تھے مگر یہ سرسید کی مولانا نور الحسن سے غیر معمولی نیاز مندی اور تلمذ کا اثر ہے کہ اس میں مولانا کا تذکرہ شامل کیا گیا، حالانکہ دہلی نہ مولانا نور الحسن کاندھلوی کا وطن تھا، نہ ہی مولانا وہاں ملازم ہوئے، نہ تعلیم کے علاوہ دہلی میں قیام کیا، اس طرح مولانا نور الحسن وہ واحد شخص ہیں جو دہلی میں نہیں رہتے تھے پھر بھی آثار الصنادید میں ان کا ذکر ہے۔

لیکن سرسید نے مولانا مملوک العلی اور مولوی نوازش علی صاحب کا جو تعارف لکھا ہے اس میں اس طرح کا صاف اعتراف تو دور رہا، ایسا تاثر بھی نہیں ملتا کہ جس کی بنیاد پر یہ بھی کہا جاسکے کہ سرسید احمد کی ان دونوں علماء سے قربت یا خاص واقفیت تھی۔ سرسید احمد نے مولانا مملوک العلی کے تعارف میں جو چند سطر لکھی ہیں، وہ یہاں نقل کی جا رہی ہیں، ملاحظہ ہوں:

”جناب مولوی مملوک العلی سلمہ اللہ تعالیٰ

شاگرد رشید مولوی رشید الدین خاں، صاحب علم معقول و منقول ہیں، استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو ان کتابوں سے گنجینہ عالم خالی ہو جائے تو انکی لوح حافظہ سے پھر نقل انکی ممکن ہے۔ ان سب کمال اور فضیلت پر خلق و حلم احاطہ تقریر سے افزوں ہے، اگرچہ زنی دنیا داروں کی ہے لیکن سیرت اور سریرت میں درویشانہ۔

(۱) آثار الصنادید، باب چہارم ص: ۷۰ (نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء)

اگرچہ چودہ پندرہ برس سے مدرسہ شاہ جہاں آباد میں عہدہ مدرسہ رکھتے تھے لیکن اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں، کہ مدرس اول اس سے عبارت ہے۔ انشاء نظم و نشر کی طرف کم توجہ ہے، اگر ایسا فاضل اس طرف بھی متوجہ ہوتا تو یقین ہے کہ اس فن میں اپنے اقران و امثال سے ممتاز ہوتا۔“ (۱)

کیا اس میں ایک حرف بھی ایسا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ سرسید احمد مولانا کے شاگرد ہیں، یا ان کو حضرت مولانا سے عقیدت و محبت تھی، یا سرسید کے مولانا سے نیاز مندانہ روابط تھے، یہ سطریں اس قسم کے ہر اک تاثر سے خالی ہیں۔

مولانا مملوک العلی کے تعارف کے بعد اسی صفحہ سے مولانا مفتی رحمت علی عرف میر لال کا ذکر شروع ہو گیا ہے، ان کے احوال میں بھی سرسید احمد نے مفتی صاحب سے اپنے ذاتی روابط کی اطلاع دی ہے اور لکھا ہے کہ:

”آباء اور اجداد اور راقم کو ان کے خاندان بلند مکان کے ساتھ رابطہ اتحاد قدیمی چلا آتا ہے اور یہی سبب ہے کہ نظر توجہ آں حضرت کی راقم آثم کے حال پر بکمال مبذول ہے۔“ (۲)

اگر سرسید احمد کو مولانا مملوک العلی سے شاگردی کی نسبت تھی، یا سرسید نے مولانا سے کچھ علمی استفادہ کیا تھا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ سرسید اس کا تذکرہ نہ کرتے۔ وہ مولانا کے تعارف سے پہلے اور تعارف کے بعد جن لوگوں کا ذکر کر رہے ہیں دونوں کے احوال میں دونوں سے اپنی نیاز مندی کا برملا اعتراف کر رہے ہیں، اگر سرسید کا مولانا سے بھی عقیدت و تلمذ کا رشتہ تھا تو مولانا مملوک العلی سے استفادہ کے اعتراف میں کیا رکاوٹ تھی؟ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سرسید احمد مولانا مملوک العلی کو دہلی کے صرف ایک بڑے عالم اور مدرس کی حیثیت سے جانتے پہچانتے تھے، اس کے علاوہ مولانا سے کوئی قربت اور ارادت و نسبت نہیں تھی۔

(۱) آثار الصنادید، ص: ۷۰ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء نیز طبع اول، ص: ۱۲۷ دہلی)

(۲) آثار الصنادید، ص: ۷۰ باب چہارم (نول کشور لکھنؤ: ۱۹۰۰ء)

آثار الصنادید کے اس اندراج کے علاوہ سرسید احمد نے مولانا مملوک العلی کا اپنے مکتوبات و مضامین میں بھی دو تین موقعوں پر (ضمناً) ذکر کیا ہے، مگر وہاں بھی مولانا کے علمی مقام و مرتبہ کی وجہ سے مولانا کا عام ذکر ہے، ان مندرجات میں بھی مولانا سے ذاتی روابط کا ذکر بلکہ اثر و نشان بھی نہیں جھلکتا، مثلاً ایک خط میں ہے:

”مولوی عبداللہ صاحب فرزند ہیں مولوی انصار علی صاحب کے، نواسے ہیں مولوی مملوک العلی صاحب کے، داماد ہیں مولوی محمد قاسم نانوتوی کے اور ان سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی“۔ (۱)

مولانا مملوک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی مدرسہ (دارالعلوم) دیوبند کے صدر مدرس، ممتاز عالم اور سرسید کے ہم عصر تھے، مولانا یعقوب کو سرسید احمد کے مذہبی نظریات سے کھلا اختلاف تھا۔ مولانا نے ان کی تردید و تنقید بھی کی، اس کے علاوہ سرسید احمد کی تحریروں میں مولانا محمد یعقوب صاحب کا مدرسہ دیوبند کے حوالہ سے بھی ذکر آیا ہے مگر یہ تحریریں بھی اس تاثر سے خالی ہیں کہ سرسید احمد کو مولانا مملوک العلی سے تلمذ یا استفادہ کی نسبت تھی۔

سرسید احمد نے مدرسۃ العلوم (M.A.O. COLLEGE) علی گڑھ میں مولانا مملوک العلی کے نواسہ مولانا عبداللہ انصاری انبھٹوی کا ناظم دینیات کی حیثیت سے تقرر کیا تھا، مولانا انصاری اس وقت سے اپنی وفات (۱۳۴۳ھ / ۱۹۲۵) (۲) تک شعبہ دینیات کے ناظم و سربراہ رہے، سرسید احمد کی مولانا سے ملاقاتیں اور خط و کتابت رہتی تھی، سرسید احمد کے خطوط میں بھی مولانا انصاری کا کئی موقعوں پر ذکر آیا ہے، مگر ان میں سے کسی ایک خط سے بھی یہ اطلاع اور تاثر نہیں ملتا کہ چونکہ مولانا انصاری سرسید احمد کے استاد کے

(۱) مکتوبات سرسید، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی (قادیانی) ص: ۲۶۶ جلد اول (لاہور: ۱۹۷۶ء)

(۲) مولانا انصاری کی تاریخ وفات اور مدفن کے متعلق تاریخ دارالعلوم اور نزہۃ الخواطر دونوں کی اطلاعات میں غلطی ہے۔ تاریخ دارالعلوم میں تاریخ وفات صحیح نہیں لکھی، مولانا انصاری کو بسببی میں نہیں (جیسا کہ نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے) بلکہ ان کے آبائی وطن اہیہ ضلع سہارنپور میں دفن کیا گیا تھا، قبر معلوم ہے۔



نواسے ہیں، لہذا اس تعلق کی وجہ سے سرسید احمد مولانا انصاری سے ربط خاص رکھتے ہیں، ان سے دلی قربت اور وابستگی ہے۔

سرسید احمد نے آثار الصنادید میں مولانا مملوک العلی کے علاوہ (مدرسہ دہلی یا دہلی کالج) کا بھی ذکر کیا ہے جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

”اب دو تین برس کے عرصہ سے مدرسہ فارسی و عربی اور جائے مقرر ہوا۔“ (۱)

یہاں بھی اس کا موقع تھا کہ سرسید احمد اس کا تذکرہ کرتے کہ میں نے فلاں سنہ میں اس مدرسہ میں پڑھا ہے، بعض اور عمارتوں کے تذکرہ میں سرسید نے ان سے اپنے رشتہ یا مناسبت کا ذکر کیا ہے، دہلی کالج کے تعارف میں کالج سے اپنی کسی وابستگی اور خاص دلچسپی کا ذکر نہ کرنا بتا رہا ہے کہ سرسید احمد دلی کالج سے بھی وابستہ و منسلک نہیں رہے۔

حیات جاوید کے بعد سرسید کے احوال و سوانح، افکار و نظریات اور اثرات پر درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر ان سب کے سوانحی حصہ خصوصاً سرسید کی تعلیم کے عنوانات میں عموماً وہی اطلاعات دہرائی گئی ہیں جو حیات جاوید میں درج ہیں، سرسید کے بچپن اور تعلیمی سفر کے متعلق حیات جاوید کی اطلاعات پر اب تک کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوا۔

مگر اس ذخیرہ کی چند کتابیں اس عموم سے کسی قدر مستثنیٰ بھی ہیں، جن میں مولوی امین زبیری ماہروی کی تالیف تذکرہ سرسید (۲) اور ڈبلیو ٹرال (CHRISTIAN) کی کتاب ”سرسید احمد خاں فکر اسلامی کی تعبیر نو“ قابل ذکر ہیں (۳) زبیری سرسید احمد کے دیکھنے والوں میں سے تھے اور ان کے علی گڑھ

(۱) آثار الصنادید، باب سوم، ص: ۳۲ (نول کشور لکھنؤ)

(۲) تذکرہ سرسید کا پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ، لاہور کا ایڈیشن پیش نظر ہے، اس پر سنہ طباعت درج نہیں۔ بہ ظاہر کراچی کے سنہ ۱۹۶۳ء کے ایڈیشن کی مکرر اشاعت ہے۔

(۳) سرسید احمد خاں فکر اسلامی کی تعبیر نو (A. REINTERPRETATION OF MUSLIM THEOLOGY) کا اردو ترجمہ ہے، جو قاضی افضل حسین اور اکرام صاحب چغتائی نے کیا ہے، (مطبوعہ القمر انٹر پرائزز، لاہور) مگر اس کتاب کے متعدد تجزیے قطعاً غلط اور ایسے ہیں کہ ہر مسلمان کو ان سے سخت اختلاف ہوگا، افسوس ہے کہ فاضل مترجمین نے نہ ان پر وضاحتی نوٹ لکھے نہ مقدمہ میں اس کا تجزیہ کیا۔

تحریک کے اکثر رہنماؤں سے ذاتی مراسم تھے، سرسید کی تحریک کا ایک ایک گوشہ زبیری کی نظر میں تھا اور ایسے بہت سے ذرائع اور مآخذ و معلومات بھی ان کی دسترس میں تھے جو حالی یا اور تذکرہ نگاروں کو میسر نہیں آئے، ڈبلیو ٹرال نے بھی سرسید کا ایک نئے زاویہ سے تعارف کرانے کی کوشش کی ہے، ٹرال صاحب کے متعدد مآخذ سرسید احمد کے اور سوانح نگاروں سے مختلف اور اہم ہیں، ڈبلیو ٹرال نے چند اصل دستاویزات اور عہد سرسید کے ریکارڈ سے بھی استفادہ کی کوشش کی ہے جس سے سرسید کے متعلق چند معلومات کا اضافہ ہوا ہے، مگر مولوی امین زبیری اور ٹرال صاحب نے بھی سرسید احمد کے استادوں میں مولانا مملوک العلی کا ذکر نہیں کیا ہے۔

سرسید پر لکھی ہوئی کتابوں میں سے پروفیسر خلیق احمد نظامی کی ”سید احمد خاں“ (۱) اور ڈاکٹر ثریا حسین کی ”سرسید احمد اور ان کا عہد“ معروف اور معتبر سمجھی جاتی ہیں، ان مصنفین نے بھی سرسید کے استادوں میں مولانا مملوک العلی کا نام شامل نہیں کیا اور کالج پر نئے پرانے لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ سرسید احمد دہلی کالج کے طالب علم تھے۔

حالیہ دنوں میں سرسید احمد اور ایم او اے کالج کے مذہبی روابط و خدمات پر دو کتابیں یا مضامین کے مجموعے چھپے ہیں (۲) ان دونوں میں بھی اس کا معتبر ذکر نہیں آیا کہ سرسید احمد مولانا مملوک العلی کے شاگرد یا دہلی کالج کے فیض یافتہ تھے، لیکن برصغیر ہندو پاکستان کی اسلامی تاریخ و ثقافت کے دو بڑے مورخین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور شیخ محمد اکرام نے سرسید کے استاد کی حیثیت سے مولانا مملوک العلی کا نام لکھا ہے، مگر یہ بھی اس وجہ سے لائق استدلال نہیں کہ ڈاکٹر قریشی نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ان کی اس اطلاع کا مآخذ مولانا سندھی کی تحریر ہے (۳) اسلئے اس کی استنادی حیثیت مشتبہ ہے، شیخ محمد اکرام نے اگرچہ

(۱) پہلی کیشن ڈویژن دہلی کی جون سنہ ۱۹۷۱ء کی اشاعت پیش نظر ہے۔

(۲) الف: سرسید اور علوم اسلامیہ، مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی۔ (علی گڑھ ۲۰۰۱ء)

ب: سرسید و ایم اے او کالج اور دینی مشرقی علوم، ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، (علی گڑھ ۲۰۰۱ء)

(۳) مؤخر الذکر میں اگرچہ دو جگہ سرسید کو مولانا مملوک العلی کا شاگرد لکھا ہے (ص: ۱۰۳-۱۱۷) مگر دونوں موقعوں پر

حوالہ درج نہیں۔

اپنی اس اطلاع کا ماخذ درج نہیں کیا مگر لکھا ہے کہ:

”اس زمانے میں سرسید احمد نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیز کے جانشین محمد اسحاق اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاد اور محسن، مولانا مملوک العلی نانوتوی کے نام لئے جاتے ہیں۔“ (۱)

شیخ اکرام کی اس عبارت کے فقرے ”کے نام لئے جاتے ہیں“ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اکرام کو اس اطلاع پر اعتماد نہیں تھا اور وہ اس کو مشتبہ سمجھتے تھے، لہذا ان دونوں مقتدر مؤرخین کی اطلاع بھی تصدیق کی محتاج ہے۔

سرسید احمد کی سوانحات اور ان پر لکھنے والے اہل قلم کی تحریرات سے قطع نظر سرسید کی دلی کالج میں یا مولانا مملوک العلی سے پڑھنے کی روایت پر اس پہلو سے بھی نظر ڈالنی چاہئے کہ سرسید احمد کے ہم عصر وہ اہل علم جو دہلی کالج سے وابستہ اور سرسید سے براہ راست واقف تھے اس سلسلہ میں کیا کہتے ہیں، انہوں نے سرسید احمد کا مولانا مملوک العلی سے تلمذ کا ذکر کیا ہے یا نہیں، اگر نہیں کیا تو اس سے یہ بات مزید مؤکد ہو جاتی ہے کہ سرسید احمد نے مولانا مملوک العلی سے یا دلی کالج میں کچھ نہیں پڑھا۔ سرسید احمد کے ایسے ہم عصر اصحاب میں سے کریم الدین پانی پتی اور قادر بخش صابر دہلوی نے اپنی اپنی کتابوں میں سرسید احمد کا تذکرہ لکھا ہے مگر یہ دونوں تذکرے بھی اس وضاحت سے خالی ہیں کہ سرسید احمد دلی کالج یا مولانا مملوک العلی کے فیض یافتگان میں شامل تھے۔

کریم الدین پانی پتی نے طبقات شعرائے ہند میں سرسید کا مختصر تعارف کرایا ہے، اس میں اگرچہ سرسید کے حکم، اخلاق اور نیک طینت کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ:

”سید احمد خاں منصف دہلی باشندہ قدیم شاہ جہاں آباد نیک بنیاد کے ہیں بہت متواضع اور حلیم اور خوش خلق اور نیک اطوار آدمی ہے، ایک کتاب اعمال پر کار متناسبہ میں اور ایک تاریخ دہلی قدیم میں مسی آثار الصنادید درمیان اردو کے تصنیف سے اس کی ہے، وہ چھپ چکی ہے۔ بالفعل سنہ ۱۸۴۷ء میں عہد منصفی شاہ جہاں آباد پر مامور ہیں، استعداد فارسی اچھی حاصل ہے۔“ (۲)

(۲) طبقات شعرائے ہند، ص: ۲۶۳

(۱) موج کوثر، شیخ محمد اکرام، ص: ۸۰ (لاہور: ۱۹۷۵ء)

مگر اس عبارت میں اس کا کچھ اشارہ و تذکرہ نہیں کہ سرسید احمد مولانا مملوک العلی کے شاگرد، دلی کالج کے سابق طالب علم، یا مولف کے ہم مدرسہ ہیں۔ اس دور کی ایک اور شخصیت مرزا قادر بخش صابر دہلوی کی تھی، جو اگرچہ دہلی کالج کے طالب علم نہیں اور ان کو مولانا مملوک العلی سے تلمذ بھی حاصل نہیں، مگر ان کا سرسید احمد کے خاص دوست اور علمی تصنیفی رفیق (خصوصاً آثار الصنادید کی ترتیب و تدوین میں معاون و مددگار) مولانا امام بخش صہبائی سے تلمذ و نیاز مندی کا بہت گہرا رشتہ تھا، قادر بخش صابر نے اپنی کتاب گلستانِ سخن میں سرسید احمد کا ایک شاعر اور معتبر شخص کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے (۱) قرآن کہتے ہیں کہ قادر بخش صابر کا سرسید احمد سے ہر وقت کا رابطہ اور ملاقات تھی، مولانا صہبائی قادر بخش صابر کی اس تالیف سے پوری طرح باخبر اور اس کام میں صابر کے معاون و سرپرست تھے اور اس وقت صہبائی دہلی کالج میں فارسی کے استاد بھی تھے، پھر بھی صابر یہ تذکرہ نہیں کرتے کہ سرسید احمد نے دہلی کالج میں پڑھا ہے، اگر سرسید دہلی کالج کے طالب علم ہوتے تو صابر اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔

میرا خیال ہے کہ مولانا سندھی نے سرسید احمد کے دلی کالج کے طالب علم ہونے کی روایت غالباً فرحت اللہ بیگ سے اخذ کی ہے، مرزا فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد کے تذکرہ میں، ڈپٹی نذیر احمد سے یہ الفاظ منسوب کئے ہیں کہ:

(جب میرا دہلی کالج میں داخلہ ہوا تو) ”اس زمانہ میں سرسید احمد خاں فارسی کی جماعت میں، منشی ذکاء اللہ حساب کی جماعت میں، اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے۔“ (۳)

مگر اس اطلاع میں فرحت اللہ بیگ کو سہو ہوا، اس کا غلط ہونا ایسا واضح ہے کہ ممکن نہیں ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے یہ بات کہی ہو، کیونکہ سرسید احمد (ولادت ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷ء) ڈپٹی نذیر احمد (ولادت ۱۲۴۵-۲۶ھ-۱۸۳۰ء) سے چودہ سال بڑے تھے اور جب نذیر احمد (جنوری سنہ ۱۸۴۶ء میں) دہلی کالج میں تعلیم کے لئے داخل ہوئے تو اس سے آٹھ

(۱) گلستانِ سخن، قادر بخش صابر، مرتبہ خلیل الرحمان داؤدی، ص: ۲۳۸ تا ۲۴۳ جلد اول (لاہور: ۱۹۶۶ء)

(۲) ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی۔ مرتبہ رشید حسن خاں، ص: ۴۵ (دہلی: ۱۹۹۲ء)

سال پہلے (فروری سنہ ۱۸۳۹ء میں) سرسید احمد سرکاری ملازمت میں آگئے تھے۔ سرسید احمد شروع میں آگرہ کمشنری میں نائب منشی مقرر ہوئے، ۲ دسمبر سنہ ۱۸۴۱ء کو مین پوری کے منصف بنائے گئے اور سنہ ۱۸۴۶ء تک کئی اہم سرکاری عہدوں پر کام کر چکے تھے اور جس سال ڈپٹی نذیر احمد کا دہلی کالج میں داخلہ ہوا اس وقت اگرچہ سرسید احمد دہلی واپس آگئے تھے اور دہلی میں مقیم تھے لیکن اس زمانہ میں سرسید احمد دہلی کے ایک متعارف اور باحیثیت شخص تھے، جو اور خدمات کے علاوہ دلی میں منصف کے عہدہ پر بھی مامور تھے اور اسی مشغولیت کے ساتھ آثار الصنادید کی تالیف میں لگے ہوئے تھے اور اس سے پہلے سرسید احمد کی کئی تالیفات اور ترجمے شائع بھی ہو چکے تھے، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد کے طالب علمی کے زمانہ میں سرسید احمد دلی کالج میں پڑھتے ہوں۔

فرحت اللہ بیگ کے اس قول کی ڈپٹی نذیر احمد کے احوال و تصانیف کے معتبر محقق، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے بھی مدلل تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ:

”یہاں انہوں (فرحت اللہ بیگ) نے مولانا محمد حسین آزاد کی جگہ سرسید احمد کا نام لکھ دیا ہے، اگر وہ (فرحت اللہ بیگ) ذرا توجہ اور احتیاط سے کام لیتے تو انہیں یاد آ جاتا کہ سرسید احمد نذیر احمد سے عمر میں اتنے بڑے تھے کہ دہلی کالج میں (نذیر احمد کے سرسید کے) ہم جماعت ہونے کا وہم بھی پیدا نہ ہونا چاہئے۔“ (۱)

اس لئے فرحت اللہ بیگ کی روایت صحیح نہیں اور اس کے علاوہ بھی اب تک کسی معتبر تحریر یا ماخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی کہ سرسید احمد مولانا مملوک العلی کے شاگرد یا دلی کالج کے طالب علم تھے، اور جب تک اس کی معتبر ذریعہ سے تصدیق نہ ہو جائے اس وقت تک مولانا سندھی کی یہ اطلاع اور مولانا سندھی کے اعتماد پر جہاں کہیں بھی یہ بات لکھی گئی ہے بے ثبوت رہے گی، اس پر اعتماد درست نہ ہوگا۔ اس روایت کو حوالہ کے طور پر پیش کرنا صحیح نہیں ہے، صرف مولانا سندھی کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔

(۱) ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے اپنی کتاب (یا تحقیقی مقالہ میں) فرحت اللہ بیگ کی اور بھی کئی اطلاعات کی تردید کی ہے۔

درج بالا اقتباس کے لئے ملاحظہ ہو: مولوی نذیر احمد احوال و آثار، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ص: ۲۸-۲۹ (لاہور: ۱۹۷۱ء)

## باب (۲۳)

حضرت مولانا مملوک العلی اپنے عہد کے  
چند تذکرہ نگاروں اور سرسید احمد کی نظر میں

علم و عمل، تقویٰ، اخلاق و کردار کے اعلیٰ ترین محاسن، درس و تعلیم میں انہماک اور ہر وقت کی دینی علمی خدمات اور وقار اور مرتبہ کی وجہ سے مولانا کا دہلی اور نواح کے علماء کی نظروں میں بڑا وقار اور مرتبہ تھا، جس کا مولانا کے نامور معاصرین اور اس دور کے بڑے بڑے علماء نے بھی بھرپور اعتراف کیا ہے۔ مولانا کے شاگرد اور بعد کے اہل قلم مولانا کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ سرسید احمد نے بھی مولانا کا نہایت بلند الفاظ میں تذکرہ کیا ہے اور مولانا کے چند شاگردوں نے بھی اپنی تالیفات اور تذکروں کے صفحات مولانا کے احوال و تعارف کی نذر کئے ہیں، یہ صفحات اور تذکرے اگرچہ مولانا کی شخصیت اور کمالات کا احاطہ نہیں کرتے مگر اس کے خاص پہلوؤں پر اہم روشنی ڈالتے ہیں اور ان کے اجمال سے بھی خاصی مدد اور رہنمائی مل جاتی ہے۔

یہ تمام مندرجات یا تحریریں مولانا کو جاننے سمجھنے کے لئے بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کتابوں میں یہ تذکرے ہیں ان میں سے تین اہم کتابیں کیا ہیں مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں، اسلئے ان کے یہ اقتباسات یہاں شامل کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پہلی تحریر مولانا کے خاص شاگرد اور تربیت یافتہ (شیخ الہند مولانا محمود حسن کے والد ماجد) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی ہے، جو مدرسہ عربی (دارالعلوم)

دیوبند کے حالات پر مولانا کی تالیف ”الهدیة السنیة فی ذکر المدرسة الديوبندیة“ میں شامل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالرشید صاحب بستوی اور عزیز ابوالحسن ارشد سلمہ نے کیا ہے، جو عربی عبارت کے بعد درج ہے۔

دوسری تیسری تحریر مولانا کے ایک اور شاگرد اور اردو تاریخ و ادب کی خاصی معروف شخصیت مولوی کریم الدین پانی پتی کی یادگار ہے۔ کریم الدین پانی پتی دہلی کالج کا طالب علم اور مولانا کا خاص شاگرد ہے، اس نے مولانا کے فیض صحبت کے علاوہ مولانا کے کتب خانہ سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، وہ اپنی کتابوں اور تحریرات میں مولانا کا بہت محبت و احترام سے تذکرہ کرتا ہے۔ تذکرہ فرائد الدہریا تاریخ شعرائے عرب اور طبقات شعرائے ہند کریم الدین کی دواہم اور معروف ترین تالیفات ہیں، دونوں میں مولانا کا تذکرہ ہے، فرائد الدہر میں کسی قدر مفصل اور طبقات شعرائے ہند میں مختصر۔ پہلے فرائد الدہر (مؤلفہ رجب ۱۲۶۳ھ جون ۱۸۴۷ء) کی عبارت ذکر کی جائے گی بعد میں طبقات شعرائے ہند کے آخر میں سرسید احمد کے تاثرات نقل ہوں گے جو آثار الصنادید میں شامل ہیں۔

آغاز الهدیة السنیة (۱) کی عبارت سے ہو رہا ہے۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب

نے لکھا ہے:

(۱)

[الهدیة السنیة فی ذکر المدرسة الديوبندیة]

الامام الہمام، استاذ الانام، شیخ الاسلام، ثمال الارامل  
عصمة الایتام، مالک ازمة الفضل الخفی و الجلی۔  
مولانا وسیدنا المولوی مملوک العلی الصدیقی، رضی اللہ  
تعالیٰ عنہ وارضاه عنہ۔ نسب کان الشمس القت علیہ ردائہا۔

(۱) الهدیة السنیة پہلی مرتبہ مطبع مجتہائی دہلی سے ۱۳۰۷ (۱۸۹۰ء) میں چھپی تھی، بعد میں تاریخ دارالعلوم پر شائع بعض خاص اشاعتوں اور متعدد رسائل میں اس کا خلاصہ یا ترجمہ بھی چھپا ہے۔ مجتہائی کی پہلی طباعت کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

واعطاه البدر المنیر نورها و ضیائہا، رحیب الصدر، و رفیع الذکر، قطب دائرۃ المحققین، وارث علوم الانبیاء والمرسلین، وکنز الهدایة والیقین۔

وکان قدس سرہ متواضعاً لله کریم، و للطلبة ابا رحیم، صاحب الاخلاق العظيمة المحمدية، والسيرة الكريمة النبوية صلى الله عليه وآله واصحابه و سلم و عظم و کرم۔  
لا یوجد نظیره فی ارباب العمائم الذین ہم لقصر العلوم و اساتین و دعائم، ولله در القائل کانه قال فیہ، شعر:

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت  
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

واستفاض فیضہ فکثرت تلامذتہ مدد نجوم السماء او کقطرات الدماء، فقرء و اعلم و بہروا، و فرغوا من التحصیل و مہروا، و جدّ و ا فی الافادۃ، بعد تکمیل الاستفادۃ، فمن لثم سدته السنیة یوما فاز، و من لاذ بعتبة الکریمۃ ولو ساعة حاز، حتی صارت ریاض العلوم بامطار فیوضہ مخضرة الربی معتلة الصباء قد اینعت ثمارها، و سجت اطیارها، و تدفقت انهارها، و خطبت علی منابر ایکھا الحمائم، و تبسمت عن وجوه ازهارها الكمائم، بعد مانضبت مائها، و ذهب روائها، و خمدت نارها، و جمدت بحارها، و کسد سوقها، و فسد منطوقها، و محت رسمها، و عفت د یارها، فلم یبق فیها انیس ولم یسمر یها سمیرہ و لا ینبک مثل خبیر۔

فابی العلم الا ان یوجد فی منتسبیه و مستفیدیہ و منتحلیہ فلاحامل کتاب الا هو متقلد بقلادة احسانہ و منتہ،



ولا رافع قلم الا وهو واضع جبهته علی سدته، فله دره من شمس ملائت العالم نوراً و ضیاءاً و سناءً و بهاءً، و انارت للعلم اقماراً، ثوابت و سیاراً، و من نجم یهدی به الساری فی ظلمات الجهل و الضلال و السادر فی غلواء الخبال و النکال و من بحر لم یرکمثله عطاءً و حیاً و سخاءً و حباً، و من سحاب اصاب و ابله کل محل و خصیب و صفصف و جدیب و من حدیقتہ عطرت الکون بریآها، و اراحت الارواح من نسیبها و صباها، و من عذب فرات سائغ سقی عطشی العلوم و اردهم، و داوی مرضی الجهل فشفاهم، فجزاه الله تعالی عن تلامذته خیر الجزاء، و اوفی الانصباء ما نرشارق، و للاح بارق، و دجی غاسق، و نهمر و ازق۔

ترجمہ: از مولانا عبدالرشید صاحب بستوی و ابوالحسن ارشد کاندھلوی سلمہ، امام ہمام، استاذ خلاق، شیخ الاسلام، بیواؤں کے حامی، یتیموں کے بلجا، ظاہری و باطنی فضل و کمال کی باگ ڈور کے مالک، ہم سب کے سربراہ، مولانا مولوی مملوک العلی صدیقی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاه) آپ کا نسب ایسا تاب ناک کہ جیسے آفتاب نے اس کے اوپر اپنی نورانی چادر ڈال دی ہو اور ماہ تمام نے اسے اپنی روشنی و تابندگی بخش دی ہو۔ آپ وسیع الظرف، عالی مرتبہ، حلقہ علمائے محققین کے دار و مدار، انبیاء و رسل کے علوم کے وارث و امین، رشد و ہدایت اور ایمان و یقین کے گنجینہ تھے۔

مولانا قدس سرہ خدا تعالیٰ کے حوالے سے متواضع، منکسر المزاج اور شریف، طلبہ کے لئے سراپا رحمت و شفقت والد، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند اخلاق اور پاکیزہ سیرت سے متصف تھے۔ آپ کی نظیر ان اصحاب جبہ و دستار

میں مل نہیں سکتی جو علم و فضل میں کوتاہ دستی کے سبب محض ستون اور کھمبے کی مانند ہیں کسی نے کیا ہی خوب شعر کہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے مولانا موصوف ہی کے حق میں کہا تھا:

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت  
ہم جہاں ہیں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

آپ کا فیض بہت عام ہوا۔ چنانچہ آپ کے سامنے زانوائے تلمذ طے کرنے والوں کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ جتنے آسمان کے ستارے یا خون کے قطرے۔ ان لا تعداد لوگوں نے آپ سے اکتساب فیض کیا اور فاضل و باکمال بن کر نکلے، علوم و معارف کی تحصیل سے فراغت حاصل کی اور ماہر بن گئے۔ اکتساب فیض کی تکمیل کے بعد ان سبھی حضرات نے بھی افادہ عام کے جذبے سے ایک عالم کو فیض یاب کیا۔ جس کسی نے ایک دن بھی آپ کے دروازے پر جبیں سائی کی وہ بامراد ہو گیا اور جس کسی نے ایک ساعت کے لئے بھی آپ کی چوکھٹ کا سہارا پکڑا اس نے فیوض و برکات حاصل کر لئے۔ یہاں تک کہ آپ کے بارانِ فیوض سے علوم و معارف کے چمن مرغ زار و لالہ زار ہو گئے، ان کے پھل پک گئے، پرندے چہچہانے لگے، نہریں بھر گئیں، ان کے منبر پر فاختائیں نغمہ سنج ہو گئیں اور بند کلیوں کا پردہ کھل کر پھول مسکرانے لگے۔ جب کہ پانی خشک ہو چکا تھا، چمک دمک جا چکی تھی، آگ بجھ چکی تھی، اس کا بازار ٹھپ پڑ گیا تھا، اس کی بولیاں خراب ہو گئی تھیں، اس کے نقوش مٹ گئے تھے اور اسکی بستیاں نیست و نابود ہو چکی تھیں، نہ ان میں کوئی غم خوار رہ گیا تھا، اور نہ ہی کوئی داستاں سرا۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری تفصیلات، ایک باخبر کی مانند، دوسرا کون بتا سکتا ہے۔

علم نے یہ قسم کھالی تھی کہ وہ ان کے منسبین، مستفیدین اور اپنے دست گرفتگاں کے سوا کسی کے پاس نہ رہیگا۔ اس لئے فی زمانہ جس کسی کے بھی ہاتھ

کوئی کتاب ہے وہ مولانا محترم کا منت کش احسان اور گراں بارِ کرم ہے، اور جس کسی نے قلم پکڑ رکھا ہے، وہ آپ کے در کی جبہ سائی کر چکا ہے، خدا ہی کی کرشمہ سازی کا مظہر ہے وہ آفتاب عالم تاب جس نے سارے عالم کو بقعہ نور بنا دیا، علم و فضل کے ماہ تاب ثوابت اور سیارے منور کر دیئے، اسی طرح خدا ہی کی صفت قدرت کا آئینہ دار ہے وہ ستارہ ہدایت جس سے جہل و گمراہی کی تاریکیوں کا سفر کرنے والے کو راستہ ملتا ہے اور مصیبت و پریشانی کے باعث حیران و پریشان شخص کو راہ نجات نصیب ہوتی ہے، نیز ایسا سمندر بھی جس کی بخشش، حیا، جود و کرم کی کوئی مثال نہیں، اور ایسا بادل جس کی تیز بارش نے قحط زدہ اور شاداب، ہموار اور غیر مسطح ہر قسم کی زمین کو سیراب کیا، نیز ایسا چمنستان جس کی خوشبو سے کائنات معطر ہو گئی اور اس کی باد نسیم و صبا سے رو حیں شاد کام ہوئیں، نیز ایسے شیریں چشمے جن سے تشنگانِ علوم سیراب ہو گئے، جہالت کے مریض شفا یاب ہو گئے، حق تعالیٰ مولانا کو ان کے تلامذہ کی جانب سے بہترین اور بھرپور صلہ عطا فرمائے، جب تک کہ کوئی ستارہ روشن رہے برق چمکے اور اس کو تاریکی گھیرے رہے اور جب تک بارش کا سلسلہ باقی رہے۔

(۲)

تذکرہ فرائد الدھر یا تاریخ شعرائے عرب (اردو)

تالیف: کریم الدین پانی پتی

مولفہ و مطبوعہ دہلی: ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء

مولانا و اولادنا و استاذنا و ہادینا و شیخنا، جناب مولانا مملوک العلی عالم لکھی  
والجلی، مدرس اول مدرسہ دہلی، رہنے والے نانوتہ کے، قدوہ متاخرین، امام  
تبحرین متقدمین، اس ذات حمیدہ صفات کاشمہ سایہ، حال ہے کہ ایسا فاضل کامل  
وزاہد و عابد پابند شرع شریف مرتضوی بہت کم دیکھنے میں آیا ہے، نظیر اس کا خطہ  
ہند سے مفقود، ہر فن و علم کا سامان اس کے پاس ہر وقت موجود، اس کے فیض عام  
سے عقل فیاض زلہ ربا! جس نے اس کے مشعل تعلیم سے روشنی نہیں پائی وہ عقل  
اور بصیرت سے نابینا۔

گھر اس کا محط رجال طلباء، مدرسہ اس کا مجمع علماء و فضلاء، صد ہاشاگرد  
اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر  
گئے، درمیان اکثر بلاد افغانستان کے اور ہندوستان میں اپنا نام پیدا کر گئے۔

بالفعل عہدہ اول مدرسہ عربی مدرسہ دہلی میں مامور ہیں، سوادرس وہی  
طلباء مدرسہ کے، اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں، تمام  
علوم درسیہ متاخرین و متقدمین پر وہ عبور ہے کہ عقل اول بھی ان کی فیض رسانی  
کے مقابلہ میں مجبور ہے۔ تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلباء میں نصف شب  
تک منقسم ہیں۔

حلیہ ان کا یہ ہے کہ ہنستی پیشانی، خندہ رو، سفید ریش، صورت نورانی مثل

عالم ربانی کے، ہمارے زمانے میں ان کی ذات سے ہندوستان میں علم نے ترقی اور رفعت پائی ہے اس قول کاشفی کا مصداق وہی ہیں:

آں فاضل زمانہ کہ ازین درس اوست  
ہم عقل در ترفع ہم علم در کمال

متواضع اور حلیم اور بردبار اور صاف اور مفکر اور مدبر اور دانشمند ہیں، غرض کہ جتنی تعریف اور جتنے اوصاف اخلاق بتلاشی تمام پیدا کئے جائیں اس میں سب موجود ہیں، معارض کو چاہئے کہ دو چار گھڑی ان کی خدمت میں بیٹھ کر ان اوصاف کو ملاحظہ کرے اس وقت میرے قول کی تصدیق بحلف کریگا اور کہے گا کہ سچ ہے، بے مبالغہ اور قطع نظر تعریف کے امر واقعی اس شخص نے بیان کیا ہے۔ تمام عمر میں باوجود اس کثرت علم اور فضل کے وعظ عام نہیں کیا، اور تصانیف کتب پر مائل نہیں ہوئے، باعث اس کا یہ ہے کہ چوں کہ ان کی خدمت میں صد ہا طالب علم اطراف و جوانب سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں، پھر اس صورت میں فرصت واسطے تصانیف کے ہونی معلوم! لہذا اپنا ہرج گوارہ کیا، دل شکنی کسی کی منظور نہ کی۔

مگر ہاں ایک کتاب تحریر اقلیدس کا جو عربی زبان تھی، بموجب حکم پرنسپل مدرسہ دہلی کے ۱۸۴۴ء میں ترجمہ اردو زبان میں کر کے پانی کر دیا اور بہت اچھی طرح سے ہر اک مشکل کو حل کیا ہے، یہ ترجمہ ۱۸۴۴ء میں دو دفعہ چھپ چکا ہے، یہی باعث مذکورہ بالا نہ منظوم کرنے افکاراتِ شعریہ کا ہے، اور سوائے اس کے یہ ہے کہ شعر گوئی پیشہ علماء کا نہیں ہے بلکہ پایہ تحقیق و تدقیق کو مضرب ہے، مگر ایک مسودہ عربی خط کا جو مسکئی فیروز بادشاہ زادی کو انہوں نے ایام طالب علمی میں بے نقطہ لکھا تھا ڈھونڈ لایا ہوں، تیمنا و تبرکاً اپنی کتاب میں لکھتا ہوں وہ یہ ہے۔

[خط مکتوبات کے عنوان میں گذر چکا اس لئے یہاں درج نہیں کیا گیا]

(۳)

## طبقات شعرائے ہند

تالیف: کریم الدین پانی پتی

مؤلفہ و مطبوعہ دہلی: ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء

مولانا مملوک العلی مدرس اول مدرسہ دہلی، جناب مولوی مدظلہ العالی، عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں۔ عہدہ میر مولوی بمشاہرہ سو روپیہ ماہواری مدرسہ میں مقرر ہیں، حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر چاہئے ویسی نہیں، کیوں کہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں اور واقع میں بناء مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔

فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں، ہر ایک علم اور فن سے جوان زبانوں میں ہیں مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے، گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے اور جس کار پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔

مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے جو کہ شاید کسی زمانہ میں کسی استاذ سے ہوا ہو، بندہ کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا، اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہوں تو بجا ہے، کیوں کہ وہ فاضل ایسا ہی ہے۔ کوئی کتاب کسی فن کی مشکل اس کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھا دیں گے، گویا اس کو حفظ کر رکھی ہے۔ اس لئے رات و دن سوائے مدرسہ کے ان کے گھر پر طلباء پڑے رہتے ہیں، ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں

اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے۔

سب کو پڑھاتے ہیں، تمام شب اور دن میں شاید دو پہر رات کو آرام کرنا ان کو نصیب ہوتا ہوگا، واللہ، رات دن درس وہی طلباء میں گذرتا ہے۔

اور باوجود اس کثرتِ درس اور فیضِ رسانی کے پابندِ شرع شریف ایسے ہیں کہ اس طرح کے آدمی کم دیکھنے میں آئے ہیں، غرضیکہ جتنا ان کی تعریف میں لکھوں بجا ہے، اگر کوئی امر بطور مبالغہ بھی لکھوں وہ بھی امر واقعی ان کی ذات میں پاتا ہوں، بہت بے نظیر فاضل ہیں، ان کے ثانی کوئی فاضل ایسا نہیں جس سے اس طرح کا فیض عام اور تشفی خاص و عام حاصل ہو۔

عمر ان کی ۱۸۴۷ء میں قریب ساٹھ برس ہو گئی، بہت خندہ پیشانی اور عقلمند اور ذکی اور ذہین اور تیز فہم اور محقق اور مدقق ہیں۔

تحریر اقلیدس کا ترجمہ زبان اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارہویں، بارہویں کا کیا ہے، حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے، اصل وطن ان کا نانوتہ ہے، مدت سے شاہجہاں آباد میں رہتے ہیں۔ (۱)

(۱) طبقات شعرائے ہند ص: ۳۶۳، ۳۶۴ (عکس طبع اول لکھنؤ ۱۹۸۴ء)

(۴)

## آثار الصنادید

سر سید احمد خاں

جناب مولوی مملوک العلی سلمہ اللہ تعالیٰ

شاگرد رشید مولوی رشید الدین خاں صاحب۔ علم معقول و منقول میں  
استعداد و کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے  
گنجینہ عالم خالی ہو جاوے تو ان کی لوح حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے۔

ان سب کمال اور فضیلت پر خلق و حلم احاطہ تحریر سے افزوں ہے، اگرچہ  
زنی دنیا داروں کی ہے، لیکن سیرت اور سریرت میں درویشانہ۔

اگرچہ چودہ پندرہ برس سے مدرسہ شاہجہاں آباد میں عہدہ مدرسہ رکھتے  
تھے لیکن اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں کہ مدرسہ اول اس سے عبارت ہے  
، انشاء نظم و نثر کی طرف کم توجہ ہے، اگر ایسا فاضل اس طرف بھی متوجہ ہوتا تو یقین  
ہے کہ اس فن میں اپنے اقران و امثال سے ممتاز ہوتا۔ (۱)

(۱) آثار الصنادید سر سید احمد الف: ص ۱۲۷ باب چہارم (طبع اول سید المطابع دہلی: ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء)

ب: ص ۷۰ باب چہارم، (منشی نول کشور لکھنؤ: ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء)



چند  
بیادگانہ تہذیب و کائنات

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ

کی مکتوبہ چند خاص غیر مطبوعہ تحریریں،

مطبوعہ تصانیف کے چند اوراق

اور

نانوتہ میں مولانا کے ذاتی مکان

نیز دہلی کے قبرستان مہندیان میں مدفن کے عکس



بسم اللہ الرحمن الرحیم  
 الحمد للہ الذی علیہ السلام  
 وادباعہ وادبائہم فیما بینہم  
 ویکرمہم بآلائہ فضلہ  
 ویکرمہم بآلائہ فضلہ  
 ویکرمہم بآلائہ فضلہ

الحمد للہ الذی علیہ السلام  
 رسول اللہ الذی علم اللہ واصحابہ وقائق الشریعہ  
 والصلوات علیہم اجمعین  
 والصلوات علیہم اجمعین  
 والصلوات علیہم اجمعین

تتمتع علی اظہار العباد والذی برار ایما الاصحاب الکرام  
 والذی برار ایما الاصحاب الکرام  
 والذی برار ایما الاصحاب الکرام  
 والذی برار ایما الاصحاب الکرام  
 والذی برار ایما الاصحاب الکرام  
 والذی برار ایما الاصحاب الکرام  
 والذی برار ایما الاصحاب الکرام  
 والذی برار ایما الاصحاب الکرام

حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی کی ایک بیاض میں مولانا مملوک العلی کے قلم سے نقل حضرت مفتی صاحب کی  
 کی تالیف شرح شیخ بہاء الدین عالی کا پہلا صفحہ جس پر مفتی صاحب کی ایک علمی یادداشت بھی درج ہے

وکیمران از معتقدت مع فخرن قادیانی کی لفظ یا کورت و سطر

والجیم بعد ما لبحران الجید من العدمات علی علامات جوده النوران

البحران فی الایام المحرومة و فوج الرضین و غیر ما کادرون و اخره و علی الخیم و علی الخیم

عدد ہائے حساب فوج بعد الامور اللتی کس اعانتای الاستمراعات

علی الطیب رعنا اور رستہ عبدالستغیغ قریب الاضطرار و التوتہ و السراج و اللہ

المدر و التسم و التسن و الفصل و حال ہمارا البید و عاودہ الاستمراعات

و اما لولہ الامور و بو الخیم النانی المتخذ من العاوان السی بقاوان

الی علی العاوان بعد دیر المعتدل من المراجعات فان الامور جودہ المعتمد

و ہمارا لولہ زیدت علی العاوان و علم ان المعتدل الحقیقہ

کتاب اصطلاح الالطبار ثانیہ بعد دہم و الداد لولہ زیدت علی العاوان

او ایامی او ایامی او ایامی او ایامی او ایامی او ایامی

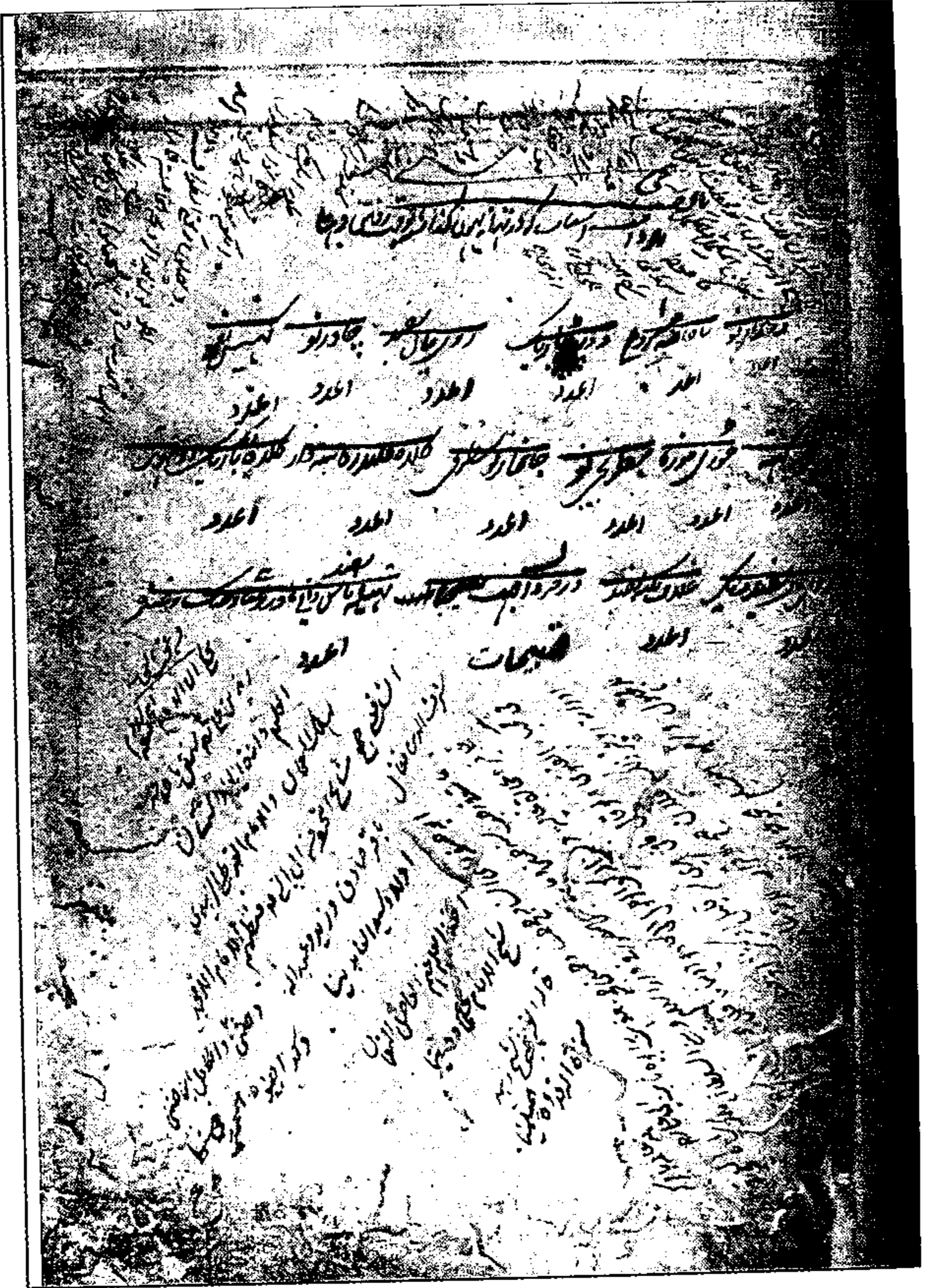
و ایامی او ایامی او ایامی او ایامی او ایامی او ایامی

ار او ہا لولہ ثانیہ انواع الرسوب السی ایامی او ایامی او ایامی

و ایامی او ایامی او ایامی او ایامی او ایامی او ایامی

۱۲

مولانا مملوک العلی کی مکتوبہ شرح شیخ بہاء الدین عالی کا آخری صفحہ۔ یہ نسخہ بھی اصل کی طرح نامکمل ہے۔



مولانا مملوک العالی کی مکتوبہ شرح بہاء الدین عالی کے اوپر کا صفحہ جس پر ایک یادداشت درج ہے جو (بہ ظاہر) مولانا نے تھانہ بھون سے دہلی تعلیم کے لئے جاتے وقت لکھی تھی۔





تمت برسم ابی ماروال سالی  
 نقشبانی کی سفروں کی حالت  
 ولادت ابی توفیق اکبراً  
 کتباً ہم مملوہ و عملاً  
 تم الصلوۃ علی ازکی اور صبا  
 طاووس البرقی اللہ یؤمنا  
 انشاء اولیٰ ابد فی الصبح و العصر  
 والعلب فی شغل یا بیگم شغل  
 ولادہ درست بہا شیان من اعلیٰ  
 نقی السیب عن انفصال ما علی  
 محمد و میر المومنین علی  
 وما علی مدوح العارفی العلی

عام درقم نکتہ فتح الہدی  
 ملک علی  
 و ہا ملا امتحان کتب علی  
 ما علی مدوح العارفی العلی

قال الحج جلال الدین سیوری فی کتاب غیر الوصیات فی طبقات اللغویین و الصحائف کی تقریر  
 صاحب القادوس علی آخر ما یرواہ فی کتابہ فی مجلس من قول العارفی الصوفی زکریا بن علی  
 ما یخبر بہ و قد المریر بشنا ترک و اجعل عندہ و ارتکب الی قسما  
 علی الہ افنی تغیرہ اللہ او دعتہا جانتہ بحیالہ نکتہ باسماء فقال  
 من عرفنا علی بن مرین فہمک بالصلوۃ و قد المیسطر یا فہمک و اجعل  
 فہمک الی اہلبای صحیح الہ انفس غیبہ اللہ او غیبہا فی لفظ  
 یہاں تک فتحی لقاہوں من سرتہ الجواب علیہا جواب سوال و اما اول

حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی کی بیاض میں درج مولانا مملوک العلی کی مکتوبہ لامیہ صلاح  
 الدین صفدی کا آخری صفحہ جس پر مولانا کے دستخط ثبت ہیں: 'تمام شد راقم مملوک علی'







بسم الله الرحمن الرحيم

عقدت الذی یار کلمها مقارنا  
 حقیقاً لا یضربون الا ما یضربون  
 حج خلقون حللها وحسرها  
 ورفق البرواحد جوداً قیرانها  
 وشنش متجاوب ارزانها

وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق

وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق

وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق

وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق

وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق

وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق

وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق

وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق

وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق  
 وینتجی من ذلک فی حقیق

مولانا مملوک العلی کی بیاض کا ایک صفحہ

تھریز اقلیدس کے چار مقالہ اول کا ترجمہ مولوی محمد علی مدرس اول سے  
عربی سے زبان اردو میں کیا گیا

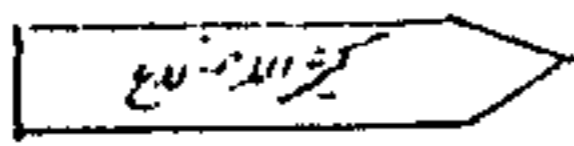
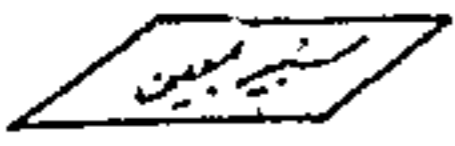
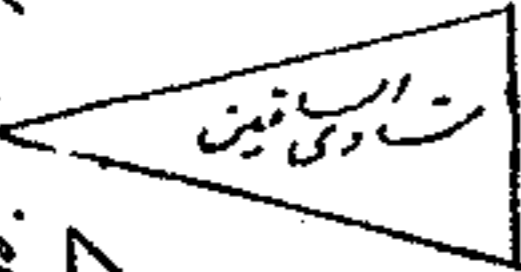
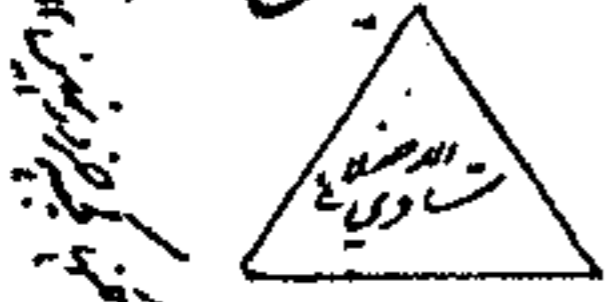
(۷۱)

Elements  
of  
Geometry  
Books I II III & IV  
of Euclid translated  
by  
Maulana Muhammad Ali  
of the Dehlee College  
1844

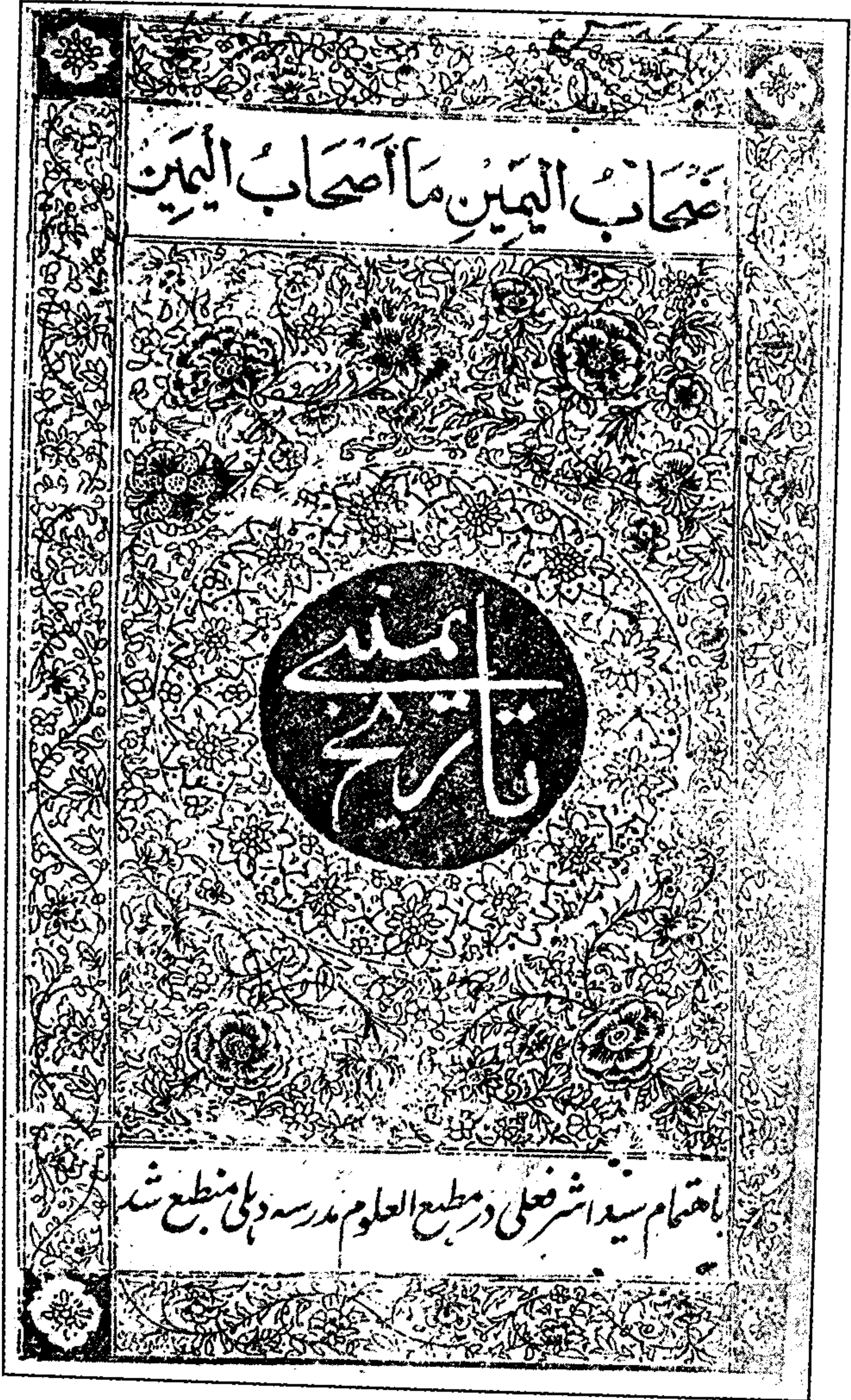
مطبع رفاه عام کے لیتھوگرافک پریس واقعہ خاص دارالعلوم شاہ جہان آباد گز  
ترکمان جواڑ کے مین ایٹمام مولوی کریم الدین نے چھاپا ہے

اقلیدس کے چار مقالہ اول کا عربی سے ترجمہ مولانا مملوک العلی کا سرورق۔ مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء

پہلی مثلث ہی اور مثلث کی چھ قسمیں ہیں ایک متساوی الاضلاع ۳  
 جسکی تینوں کیریں اسپین برابر ہوں دوسری  
 متساوی الساقین جسکی دو کیریں اسپین برابر ہوں  
 تیسری مختلف الاضلاع جسکی تینوں ضلع  
 اسپین مختلف ہوں چوتھی قائمہ الزاویہ  
 جس میں ایک زاویہ قائمہ ہو یا پانچویں منفرج الزاویہ  
 جس میں ایک زاویہ منفرج ہو چوتھی  
 حاد الزوا یا جسکی سب زاویہ حاد ہوں  
 دوا رباعہ الاضلاع وہ شکل ہوتی ہے جسکو  
 چار ضلعوں نے گھیرا ہوا ہو اسکی پانچ قسمیں ہیں  
 اول مربع جسکی چاروں ضلع برابر اور چاروں  
 زاویے قائم ہوں دوسری مستطیل جسکی چاروں  
 زاویے قائم ہوں اور فقط دو دو ضلع مقابل کے  
 اسپین برابر ہوں تیسری معین جسکی چاروں ضلع  
 اسپین برابر ہوں لیکن زاویے قائم نہیں ہوں  
 چوتھی شہ معین جسکی نہ چاروں ضلع برابر ہوں  
 اور نہ زاویے قائم لیکن مقابل کے دو دو زاویے اور دو دو ضلع  
 اسپین برابر ہوں پانچویں منحرف جو ان سب کے  
 خلاف ہو کثیر الاضلاع وہ شکل ہے جسکی ضلع  
 چار سے زیادہ ہوں خطوط متوازیہ



اقلیدس کے چار مقالہ اول کا عربی سے ترجمہ مولانا مملوک العلی کا ایک ورق۔



مولانا مملوک العلی کی مرتبہ تاریخ یعنی کاسرورق، مطبوعہ مطبع العلوم، مدرسہ دہلی کاسرورق

قَالَ ابْنُ كَثِيرٍ لَمَّا رَأَى جُنَادِيًا وَيَعْفُرَانَا لِنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ

الآن ينقسم منهم بسيف الدولة جزءاً عرفوا باسم الفطوح

خطبهم الشيخ وسعهم المذموم عند الجميع فصبا عليهم

عزله الغيث بنوء المرزبان غيرانه غيث قطره غيث وغله

حشوه منهم وسخا حله عراب وكذا لك أجد بك إذا أخذت

وهي ظالمات إن أخذت المرشيد وبرز فاقه وبكفرون

ملوا حرمها عبد الملك بن نوح وسائر أهل العسكر إلى ظاهر

مقابلها عسكر الأمير سيف الدولة يعلمان جلادة ويسران بلاد

ويقرها ظاهر العيون ويجاز خيفت إلى الزبوق رشتا بيم

الارض عازجت بحبوا إلى قطار عليهم من ذبورة وذيول الحاد

عليهم مجودة وبارح الأدار وجوارح الدمار من كل

أوب صوب اليهم محتودة وظل القوم على علم بانهم من دون

على الدمار يتهاقن تهافت الفراش في النار ويقتول الأضا

سيف الأضا كما قال الله تعالى نحن يومئذ بأيدهم وأيدي

الأمم منيذون غير وأيا أول الأضا وتردد الغراء بينهم وبين الأمير

سيف الدولة في مواضعه على سلم يلو زمعها في السبل

مولانا مملوك العلى کی مرتبہ تاریخ یعنی ایک صفحہ



دہلی کالج (مدرسہ دہلی) کی ایک ناوریادگار۔ یہ سند تو صیف جنوری ۱۸۳۰ء میں حضرت مفتی الہی بخش کے پوتے، سر سید احمد خاں کے استاد اور اس کتاب کے مؤلف کے پانچویں پشت میں دادا مولانا نور الحسن کو عطا کی گئی تھی۔

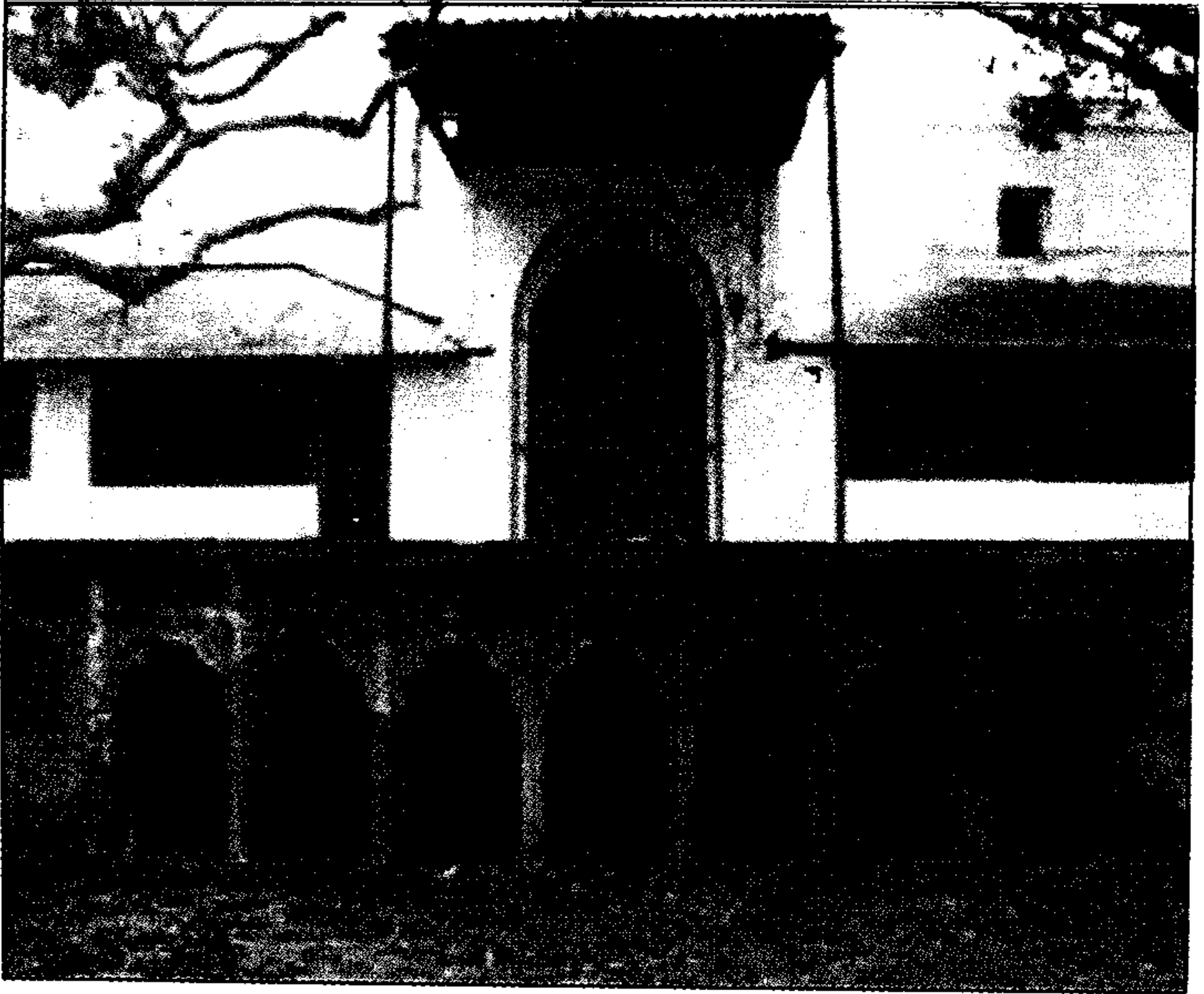


میدخلتار و سید عید گاہ حدیث  
 قصبہ کاندھلہ کا نام طرز تحریر و تفسیر مولانا محمد یعقوب نانوتوی لکھنؤ علی کا  
 مورخہ یوم شعبان ۱۲۸۹ھ کو شنبہ ۷ رجب ۱۲۸۹ھ  
 تحریر کیا گیا ہے۔ کتبہ احقر العباد محمد یعقوب نانوتوی لکھنؤ  
 اندھلی سے تالیف کیا گیا ہے۔

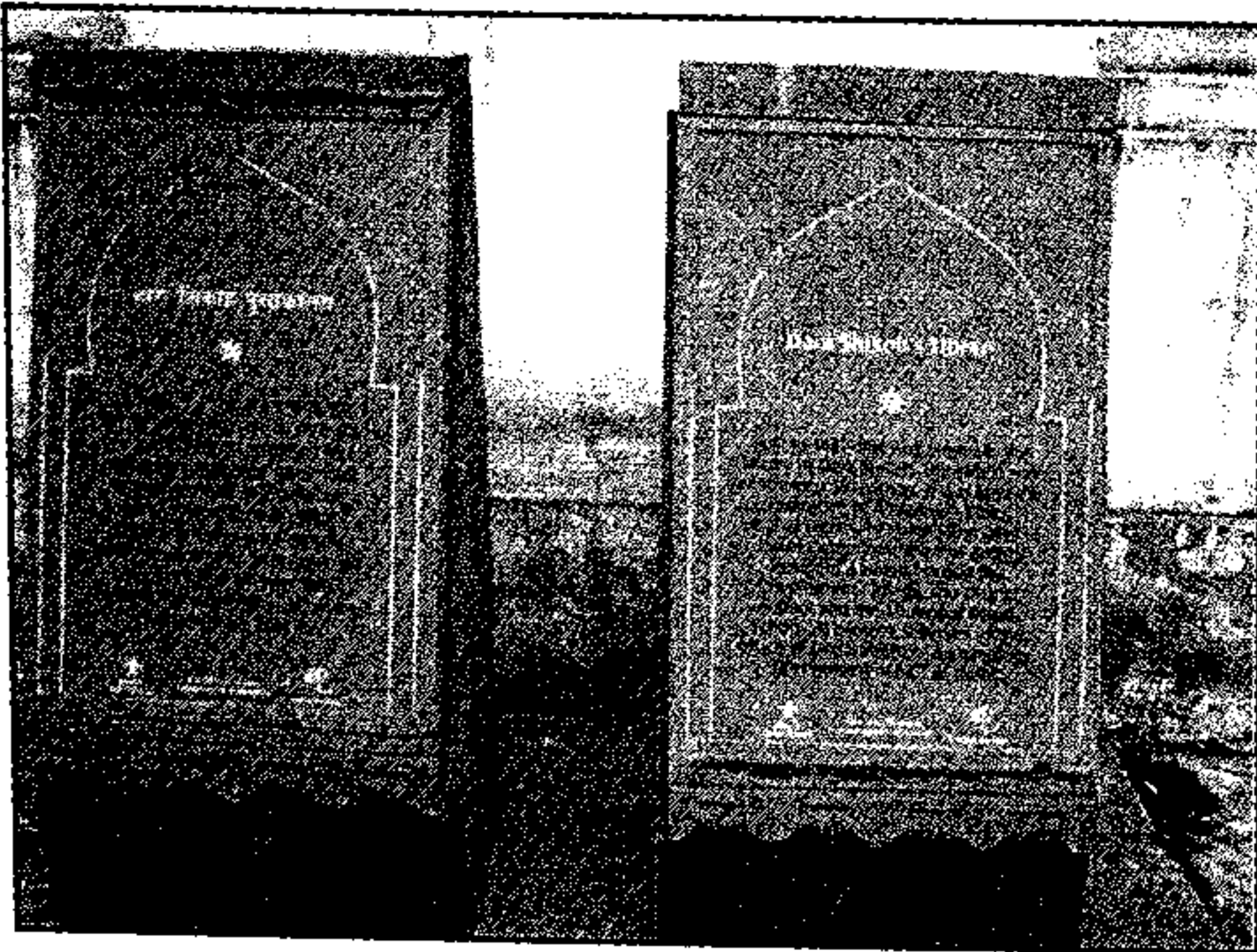
احقر العباد محمد یعقوب نانوتوی لکھنؤ کا نام طرز تحریر و تفسیر مولانا محمد یعقوب نانوتوی لکھنؤ  
 مورخہ یوم شعبان ۱۲۸۹ھ کو شنبہ ۷ رجب ۱۲۸۹ھ  
 تحریر کیا گیا ہے۔ کتبہ احقر العباد محمد یعقوب نانوتوی لکھنؤ  
 اندھلی سے تالیف کیا گیا ہے۔

سید محمد یعقوب نانوتوی

قصبہ کاندھلہ کی جدید و قدیم عید گاہ کے تنازعہ میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی بن مولانا مملوک العلی کا  
 تحریر کردہ تصفیہ نامہ۔ تحریر کا آخر میں تاریخ تحریر و دستخط درج ہیں: مکتوبہ ۳ شعبان ۱۲۸۹ھ دوشنبہ،  
 کتبہ احقر العباد محمد یعقوب نانوتوی عفی عنہ



دہلی میں کشمیری گیٹ پر واقع 'گورو گو بند سنگھ اندر پرستھ یونیورسٹی' کے احاطہ میں 'لابریری داراشکوہ' کی عمارت کا ایک عکس۔ اسی عمارت میں مدرسہ دہلی (دہلی کالج) قائم ہوا تھا۔ مدرسہ دہلی کی نسبت سے ہی اس کے سامنے کی سڑک 'مدرسہ روڈ' کہلاتی ہے، ہر چند کہ اب اس کا نام 'شام ناتھ روڈ' کر دیا گیا ہے۔ اس عمارت میں اب 'محکمہ آثار قدیمہ' کی لابریری اور عجائب گھر ہے اور وہ کمرہ محفوظ ہے جو مولانا مملوک العلی کے زیر استعمال تھا۔



'لابریری داراشکوہ' کے  
باہر نصب ہندی اور  
انگریزی کتبے، جس میں  
اس کی تاریخ بیان کی گئی  
ہے۔



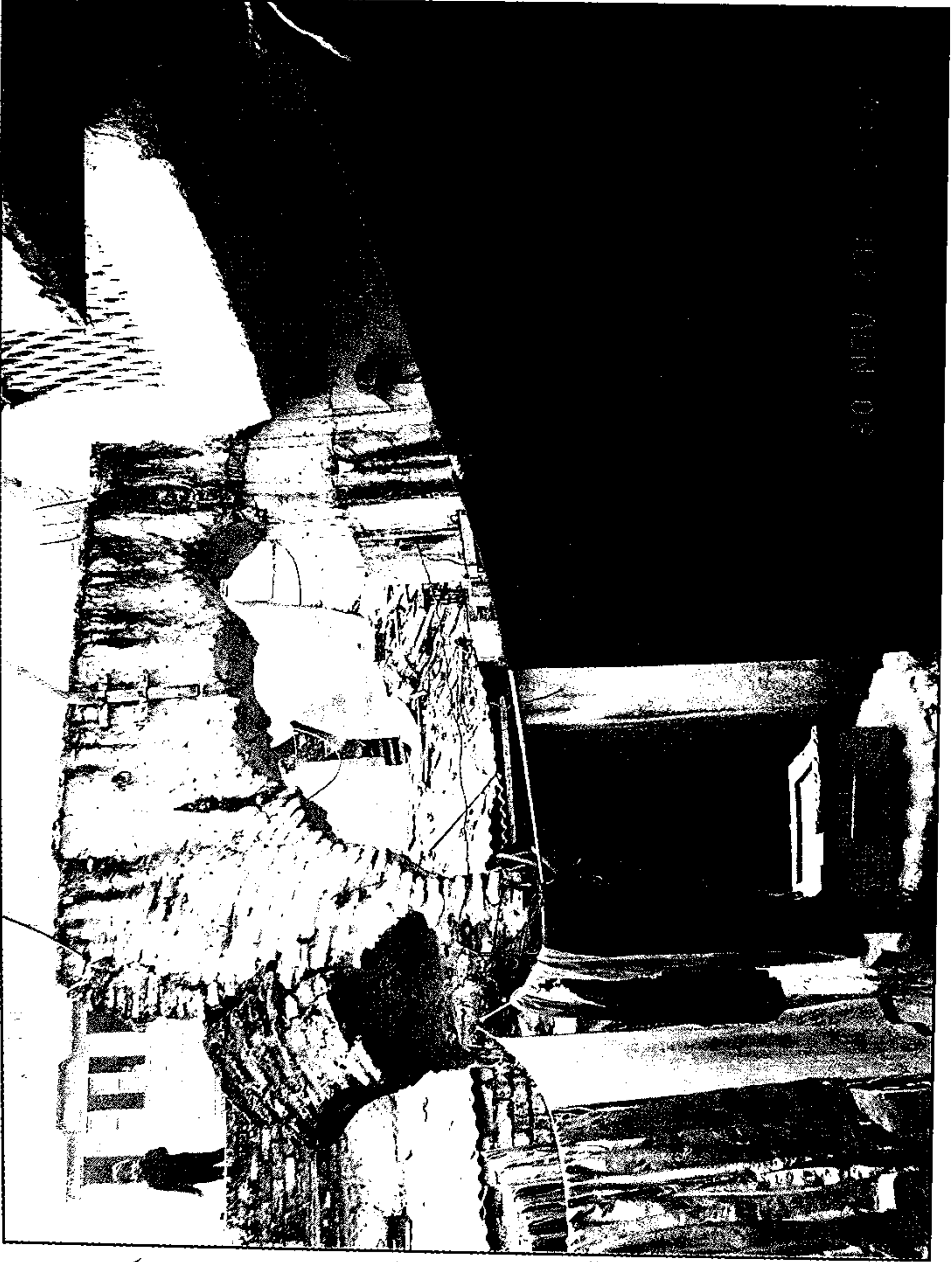
نانوتہ میں مولانا مملوک العلی کی رہائش گاہ کے دور انحطاط کا ایک عکس۔ افسوس کہ اب اس مکان کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔



کل من علیہا فان؛ شاہ جہان آباد، دہلی کے تاریخی قبرستان مہندیان میں مولانا مملوک العلیٰ کی آخری آرام گاہ۔  
 دہلی گیٹ سے متصل یہ قبرستان اب مولانا آزاد میڈیکل کالج اور جے پی اسپتال کے احاطہ میں گھر چکا ہے۔ اسی  
 احاطہ میں، مولانا کے سرہانے کی طرف شیخ عبدالعزیز شکر بار (ولادت: ۱۹۰۷ء جوینپور، وفات: ۱۹۷۵ء) کا مدفن  
 ہے۔ اسی قبرستان سے تقریباً دو سو قدم کے فاصلے پر جانب جنوب مسجد سے متصل احاطہ میں حضرت شاہ عبدالرحیم،  
 حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ عبدالقادر اور ان کے خانوادے کے متعدد جلیل القدر اکابر  
 علماء و مشائخ مدفون ہیں۔ انا للہ انا الیہ راجعون۔ 'دفن ہو گا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز'



اندرون قبرستان مہندیان کا وہ احاطہ جس میں شیخ عبدالعزیز شکر بار اور ان کے قدموں میں تقریباً ۳ میٹر جانب مغرب حضرت مولانا مملوک العلی مدفون ہیں۔ گیٹ پر نصب پتھر پر درگاہ شیخ عبدالعزیز شکر بار کندہ ہے۔ یہ قبرگاہ اصلاً 'مسجد مہندیان' المعروف بہ 'مسجد عبدالعزیز شکر بار' کے صحن میں واقع ہے۔ بعد میں اس کو جنوں والی 'مسجد' یا 'مکی مسجد' بھی کہا جانے لگا۔ پس منظر میں اس مسجد کے درمیانی اور جنوبی در نظر آرہے ہیں۔ یہ مسجد فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) کے دور حکومت میں (غالباً ۱۳۵۵ء تا ۱۳۵۲ء کی) تعمیر ہے۔ تقسیم کے بعد بھی عرصہ تک اس میں نماز پڑھنا نہ ادا کی جاتی رہی ہے۔



آثار کہہ رہے ہیں عمارت عظیم تھی: حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے مشہور و معروف مدرسہ کی ایک محراب، جو زمانے کے ہزار تھپیڑوں کے باوجود اب بھی پورے وقار اور متانت سے سر اٹھائے کھڑی ہے اور تغیرات زمانہ کی گواہ بنی ہوئی ہے۔ یہ مدرسہ اندرون کھیر والا پھاٹک بازار چتلی قبر میں واقع تھا، جس کو دہلی پر قبضہ کے بعد برطانی حکمرانوں نے اجاڑ دیا تھا۔

# اشاریہ (INDEX)

- شخصیات
- مقامات
- کتابیات
- فہرست مراجع

## ہدایات

□ اشاریہ (شخصیات) میں اسماء کی حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب شروع کرنے سے قبل جناب آقائے دو جہاں نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اسمائے مبارکہ کو درج کیا گیا ہے۔

□ اشاریہ (کتابیات) میں صحیفہ ہدایت، اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید کو ترتیب شروع ہونے سے قبل درج کیا گیا ہے۔

□ حضرت مولانا مملوک العلی صاحب کے کتب خانہ کی جو فہرست ہے وہ اس سے علیحدہ ہے، اشاریہ (کتابیات) میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔



## اشاریہ شخصیات

<p>(مولانا) ابوالنصر گنگوہی ص ۴۳۷          (امام) ابوحنیفہ ص ۸۱          (شیخ) ابوسعید شیخ جوہر ص ۴۰۷          (شاہ) ابوسعید مجددی ص ۴۹۳          (شیخ) ابوشیخ اصفہانی ص ۳۸۲، ۳۸۱، ۳۷۸          ابوطالب ص ۳۶۹          ابوطالب خراسانی ص ۳۸۸          ابو محمد عبداللہ ص ۵۰۷</p>	<p>نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم          ص ۳۸۰، ۲۶۸، ۲۵۹، ۱۱۳          حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ          ص ۲۶۳، ۱۰۹، ۷۲          حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ          ص ۲۶۸، ۹۰          حضرت ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ          ص ۴۳۲، ۴۰۷</p>
<p>ابونصر محمد بن عبدالجبار ص ۲۴۳          ابی اسماعیل حسن بن علی الطغرانی ص ۹۰          (حکیم) اجمل خاں ص ۲۳۸          (مولانا) احتشام الحسن کاندھلوی ص ۴۰۰، ۲۸۸          (شاہ) احسان الحق ص ۵۱۴          (شاہ) احسان علی پٹنی ص ۸۷، ۸۲، ۸۱          احسن اللہ خاں ثاقب ص ۱۱۷          (حکیم) احسن اللہ دہلوی ص ۵۱۹          احمد الخازندار ص ۳۹۰          (مولانا) احمد اللہ تھانوی ص ۴۰۱، ۱۹۶          (مولانا) احمد اللہ کیرانوی ص ۱۱۵، ۹۴          (مولانا) احمد الدین پنجابی ص ۴۳۵          احمد بن محمد یمنی ص ۲۴۳، ۱۳۰، ۱۲۹، ۱۲۵، ۹۰          (مولانا) احمد حسن امر وہوی ص ۴۶۹، ۴۱۵، ۳۳۲          احمد حسین ص ۳۰۵          (نواب) احمد خاں ص ۸۶          (مولوی) احمد رضا خاں (فاضل بریلوی)          ص ۴۹۲، ۴۹۰، ۴۸۳</p>	<p>(الف)</p> <p>(مولانا) ابراہیم انصاری کیرانوی ص ۳۹۹          ابن القطفی ص ۳۹۰          ابن حجر عسقلانی ص ۳۸۳، ۳۷۸          ابن خلکان ص ۳۹۱، ۳۹۰          (علامہ) ابن قیم ص ۴۸۵          ابوالحسن ارشد ص ۵۴۹، ۵۴۷، ۲۵۶          (مولانا) ابوالحسن علی ندوی ص ۸۱، ۸۰          ابوالحسن علی بن حسین ص ۲۹۴، ۲۴۵          (مولانا) ابوالحسن کاندھلوی ص ۲۹۰، ۲۸۰، ۱۱۳          ۵۲۰، ۳۹۸، ۳۹۶، ۲۹۱          (شیخ) ابوالفتح ص ۴۵۱، ۷۱          ابوالفضل ص ۵۳          ابوالفضل ابراہیم ص ۹۶          (مولانا) ابوالقاسم ص ۳۶          (مولانا) ابوالقاسم گنگوہی ص ۴۳۷          (سید) ابوالمنصور ص ۴۷۲</p>

(مولانا) اشرف علی تھانوی ص ۸۲، ۹۳، ۹۴، ۱۵۶، ۱۵۷، ۲۲۵، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۵۱، ۳۵۰، ۵۰۷	(مولانا) احمد سعید بن ابوسعید دہلوی ص ۱۲۶، ۱۶۹، ۲۸۰، ۳۳۵، ۳۳۷
۵۲۵	(مولوی) احمد علی ص ۷۱
(سید) اشرف علی ص ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۲۸۸، ۳۱۳، ۳۹۵، ۳۹۴، ۲۷۳، ۲۳۹، ۲۴۴	احمد علی انبہٹوی ص ۳۰۵، ۳۸۹
(مولانا) اصغر حسین ص ۳۹۹	(حاجی) احمد علی احراری رامپوری ص ۳۵۸، ۵۲۷
(حکیم) اصغر حسین فرخ آبادی ص ۱۱۷	(مولانا) احمد علی سہارنپوری ص ۷۹، ۱۸۶، ۲۰۵
اصغر علی ص ۱۸۴، ۵۲۱	۲۶۷، ۲۶۶، ۲۳۱، ۲۳۰، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۳
اطہر عباس رضوی ص ۳۶۰	۳۳۵، ۳۳۴، ۳۱۲، ۳۱۰، ۳۰۹، ۲۸۰، ۲۶۸
اعتماد الدولہ لکھنوی ص ۱۴۴	۳۱۰، ۳۰۹، ۳۰۸، ۳۰۷، ۳۷۸، ۳۷۱، ۳۵۶
(ڈاکٹر) افتخار احمد صدیقی ص ۳۰۸، ۳۱۲، ۵۰۴	۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۷، ۳۱۶، ۳۲۶، ۳۲۹
۵۳۵، ۵۰۹، ۵۰۷	۳۸۲، ۳۸۱، ۳۸۰، ۳۶۶، ۳۵۶، ۳۵۵
قاضی افضل حسین ص ۵۳۱	احمد علی شوق رام پوری ص ۴۲۱
اکبر بادشاہ ص ۱۹۸، ۲۵۴	احمد علی (کتاب فروش) ص ۲۷۰
اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ص ۳۶۳، ۳۶۸	(مولوی) احمد علی نانوتوی ص ۷۷، ۷۶، ۷۷
(مولوی) اکبر علی ص ۱۵۱	(مولوی) احمد کبیر ص ۱۴۹، ۴۲۳
(شیخ) اکبر ہادی کشمیری ص ۴۳۰	(شیخ) احمد مدنی ص ۵۷، ۵۹
(مفتی) اکرام الدین ص ۵۱۴	اسپرنگر ص ۴۶، ۴۷، ۴۷، ۴۷، ۱۳۹، ۱۵۰، ۱۵۱
(بی بی) اکرامن ص ۳۵۰	۱۵۲، ۱۵۳، ۱۶۰، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶، ۲۳۴، ۲۳۵
(مولانا) آل حسن موہانی ص ۲۹۰، ۴۰۰	۲۶۵، ۲۶۴، ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱، ۲۵۱، ۲۳۶، ۲۳۵
التمش ص ۵۲	۲۶۹، ۲۶۸، ۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۵، ۲۶۴، ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱، ۲۵۱، ۲۳۶، ۲۳۵
الطاف الرحمن بارہ بنکوی ص ۴۳۲	۲۸۲، ۳۲۵، ۳۹۵، ۳۹۴، ۳۸۵، ۳۷۷، ۳۰۰
(مولانا) الطاف حسین حالی ص ۴۲۰، ۵۲۰	۵۲۹، ۵۰۳
۵۳۵، ۵۳۴	(شیخ) اسد علی ص ۷۱، ۸۵، ۹۷، ۲۵۲، ۳۵۱
(حافظ) اللہ دیا کاندھلوی ص ۲۶۶	(مولانا سید) اسعد مدنی ص ۳۶
(مرزا) الہی بخش ص ۲۰۸	(شیخ) اسماعیل پانی پتی ص ۵۳۴
(حضرت مفتی) الہی بخش کاندھلوی ص ۷۷، ۷۸	(مولانا شاہ محمد) اسماعیل شہید نانوتوی ص ۷۲، ۱۲۱
	(مولوی) اسماعیل علی گڑھی ص ۳۶۸
	(ڈاکٹر) اشتیاق حسین قریشی ص ۵۴۲

۳۱۵، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵	۷۹، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹
۳۲۹، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹	۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳
۳۱۵، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵	۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹
۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵	(شیخ) الہی بخش لال کرتی ص ۳۰۹
امداد صابری ص ۲۷۳	امام الدین ص ۱۹۶
امداد علی بن اللہ بخش ص ۵۲۳	(مولانا) امام الدین کاندھلوی ص ۱۱۳
(مولانا) امیر احمد سہوانی ص ۳۹۱	(مولوی) امام بخش بن شمس الدین
(حکیم) امیر احمد عشرتی ص ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۵۹	ص ۸۲، ۸۷
۶۸، ۶۹، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴	امام بخاری ص ۸۰
امیر باز خاں سہارنپوری ص ۳۳۳	(مولانا) امام بخش صہبائی ص ۹۹، ۱۳۶، ۱۸۱
امیر پنچہ کش دہلوی ص ۸۲	۲۲۸، ۲۶۳، ۳۸۷، ۳۸۹، ۳۹۵، ۵۱۹، ۵۲۰
امیر تیمور گرگانوی ص ۳۸۸	۵۲۳، ۵۲۴
امیر خسرو ص ۳۰۵	امام شافعی ص ۳۸۲
امیر شاہ خاں خورجوی ص ۱۱۷، ۱۱۵	(شاہ) امام علی ص ۳۳۳، ۳۹۹
امیر کاتب چلبی ص ۳۹۱	امام غزالی ص ۳۱۷، ۳۳۳، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹
(حکیم) امین الدین دیوبندی ص ۳۵۷، ۵۰۰	۳۸۵، ۳۹۵
امین الدین کشمیری ص ۱۱۸، ۱۲۷	امام مالک ص ۳۲۶
امین زبیری مارہری ص ۵۴۱	امام نووی ص ۲۹۷
(مولانا) انصار علی ابن احمد علی ص ۳۰۵، ۳۵۷	(شاہ) امان الرحمن ص ۲۲۷
۳۹۹، ۵۳۰	امان الرحمن چشتی ص ۵۱۰، ۵۱۳
(مولانا) انوار الحسن شیرکوٹی ص ۷۶	(قاضی) امان اللہ ص ۶۹، ۷۲
(مولانا) انوار الحق دہلوی ص ۳۵۸، ۵۱۳، ۵۲۵	امانت علی ص ۷۱، ۲۰۳
(علامہ) انور شاہ کشمیری ص ۱۰۳، ۳۳۶، ۳۳۷	(حکیم) امانت علی ص ۳۰۳
اورنگ زیب ص ۵۳، ۶۷، ۶۸	امان علی ص ۱۹۵، ۱۹۸
(شیخ) اہل اللہ ص ۲۹۷	امتیاز علی عرشی ص ۱۱۸، ۱۲۰
ایک ص ۵۲	حافظ (امداد اللہ) ص ۳۰۵
ایچ، ایس، رائڈ ص ۵۲۲	(حضرت حاجی) امداد اللہ تھانوی ص ۳۹، ۸۰
	۸۱، ۸۲، ۹۳، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۹۷، ۲۲۳، ۳۰۴، ۳۰۵

(ب)

(منشی) باقر علی ص ۳۸۹، ۳۳۶

بتروس (ایف) ص ۳۸۵، ۱۴۶

بخشش علی بن علیم الدین عثمانی ص ۵۰۰

(مولانا) بدرالدین اجمل القاسمی ص ۳۷، ۳۶

(شیخ) بدرالدین برناوی ص ۳۳۲

(شیخ) بدرالدین سہارنپوری ص ۴۰۷

(مولانا) بدر عالم میرٹھی ص ۱۰۳

(نواب) بڈھے ص ۲۷۰

(مولانا) برکت علی تھانیسری ص ۳۷۳، ۳۵۹

۵۲۸، ۵۲۶، ۳۷۴

بروکلیمان (کارل) ص ۲۲۶، ۲۲۴

(مولوی) بشیر الدین احمد دہلوی ص ۲۳۳

(مولوی) بشیر الدین دیوبندی ص ۵۰۰

(شیخ) بلند بخت دیوبندی ص ۴۹۸

بہادر شاہ ظفر ص ۵۱۰، ۳۷۹، ۲۰۸

بہادر علی (تھانوی برادر حاجی امداد اللہ) ص ۷۱

بہاؤ الحق قاسمی ص ۴۳۰

بہاؤ الدین ص ۷۲

بہلول ص ۶۴

بہلول لودھی ص ۳۶۹

بی بی حسینی ص ۷۱

بی بی خیرا (زوجہ حضرت حاجی امداد اللہ) ص ۸۲

بیگم شہر و ص ۳۶۳

(پ)

پادری فنڈر ص ۲۸۶

پرویز مشرف (صدر پاکستان) ص ۳۶۳

پیارے لال ص ۱۸۱

(قاضی) پیر بخش ص ۴۳۳

(مولانا) پیر جماعت علی شاہ ص ۴۲۰

پیر محمد ماہ پانی پتی ص ۴۱۶

(ت)

تارہ چند ص ۴۷۱

تفضل حسین ص ۷۱

(ڈاکٹر) تنویر احمد علوی ص ۳۹۰، ۳۷۷

توفیق احمد علوی ص ۹۴

تھارن ٹن ص ۲۷۴، ۲۶۴، ۲۶۳

تیور ص ۳۶۹، ۵۲

(ٹ)

ٹیلر ص ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۷

۱۲۸، ۱۲۹، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۷۷، ۲۶۷

۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۸۵

(ث)

(مولانا) ثابت علی ص ۴۲۸

ثناء الحق صدیقی ص ۱۹۷

(حافظ) ثناء اللہ ص ۵۱۰

(ج)

(مولوی) جعفر علی خاں ص ۱۴۳، ۱۴۴

(حضرت امام) جعفر صادق ص ۵۲۴

(مولوی) جلال الدین ص ۷۱

(شیخ) جلال الدین بن سلیم

بن محمد اسماعیل ص ۴۳۲

(شیخ) جلال الدین سرخ

(مولوی) حسن علی خاں ص ۳۷۳، ۳۸۹، ۴۱۹

(مرزا) حسن علی محدث ص ۴۱۹

حبیب الدین بن مسعود ص ۷۲

(مولانا) حسین احمد مدنی ص ۲۱۹، ۲۲۰

حسین بن احمد بن حسین زوزنی ص ۹۵

(حکیم) حسین شریف ص ۳۳۲

(مولانا) حمید اللہ تھانوی

(والد محمد شیخ محمد) ص ۴۰۱

(مولانا) حیدر علی ٹونگی ص ۲۰۸

(مولانا) حیدر علی فیض آبادی ص ۱۲۶

(خ)

خادم حسین ص ۷۱

(مولوی) خدا بخش ص ۳۵۸، ۵۲۶

(مولانا) خرم علی بلہوری ص ۲۸۵

(سلطان) خضر خاں ص ۵۲

(پروفیسر) خلیق احمد نظامی ص ۶۵، ۳۸۴، ۵۴۲

(مولانا) خلیل احمد انبہوی ص ۱۰۳، ۳۰۵

۵۲۶، ۳۳۲

خلیل الرحمن داؤدی ص ۱۱۷، ۱۱۸، ۳۷۹

خواجہ حسن اللہ ص ۲۳۳، ۲۳۴

خواجہ احمد فاروقی ص ۹۸، ۱۳۲، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۰

خواجہ باقی باللہ ص ۵۷

خواجہ حسن ص ۱۹۸

خواجہ خدا بخش ص ۴۱۶

خواجہ یوسف ص ۷۲

خورشید حسین ص ۴۶۳

خیر الدین الزرکی ص ۹۶

(مخدوم جہانیاں گشت) ص ۳۶۹، ۵۱۱

(علامہ) جلال الدین سیوطی ص ۹۶، ۳۹۰، ۳۹۱

(شیخ) جلیل ص ۷۲

(قاضی) جمال الدین ص ۷۲، ۶۹

(مولانا) جمال الدین ص ۳۳۳، ۳۵۸، ۳۵۹

(میر سرسید) جمال الدین اندرابی ص ۴۲۹

(فتی) جمال الدین کتانوی ص ۳۵۶، ۳۶۰

۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷

۳۶۸، ۴۸۴، ۴۸۹

(مفتی) جمیل احمد ص ۳۴۴

(حکیم) جمیل الدین ص ۳۴۴

جہانگیر اشرف جھنجھانوی ص ۳۴۸

(چ)

(حکیم) چندرائے بہادر ص ۱۸۱، ۱۸۶

(ح)

(سید) حامد ص ۵۲۱

(ڈاکٹر مرزا) حامد ص ۳۹۲

(مولانا) حامد الانصاری ص ۷۱

(نواب) حامد علی خاں ص ۱۴۳

(مولانا) حبیب الرحمن اعظمی ص ۴۸، ۴۹

(نواب) حبیب الرحمن شیروانی ص ۴۱۹، ۴۲۰

(مولانا) حبیب الرحمن عثمانی دیوبندی ص

۴۵۰، ۴۵۰

(مولانا) حبیب احمد کیرانوی ص ۹۹

(قاضی) حبیب اللہ ص ۶۷

حسام الدین بن محی الدین

بن حسام الدین ص ۷۲، ۳۶۳

د

دھرم نارائن ص ۱۸۴  
(سوامی) دیانندرسوتی ص ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵

ڈ

ڈبلیوٹرال ص ۵۴۲، ۵۴۱

ذ

(ماشر) ذاکر بیگ نانوتوی ص ۶۰، ۵۴، ۶۰، ۶۱  
(منشی) ذکاء اللہ ص ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۲۵۱  
۵۱۳، ۵۱۲، ۵۱۰، ۳۹۰، ۳۷۷، ۲۵۷  
(مولوی) ذکاء اللہ (دیکھئے منشی ذکاء اللہ)  
ذکیہ بیگم ص ۳۶۸

(نواب) ذوالفقار علی خاں ص ۴۱۹

(مولانا) ذوالفقار علی دیوبندی ص ۱۷۷، ۳۲۷

۵۴۶، ۴۹۷، ۴۹۶، ۴۹۵، ۴۸۹، ۳۵۷، ۳۳۱

ذوق (شیخ محمد ابراہیم) ص ۳۶۴، ۲۹۴

ر

راجہ رام موہن ص ۱۲۵، ۱۲۴

(مولانا) راغب اللہ پانی پتی ص ۲۲۰

رام چندر ص ۱۸۸، ۲۸۷، ۲۸۹

رتن لال بنسل ص ۲۱۵

(مولوی) رجب علی ص ۲۰۸

رجبی بیگم ص ۳۶۸

(مولانا) رحمت اللہ خاں دہلوی ص ۲۸۰، ۳۷۰

(مولانا) رحمت اللہ کیرانوی ص ۲۸۰، ۲۸۵

۲۸۸، ۲۸۷، ۲۸۶

(مولانا) رحیم اللہ بجنوری ص ۴۶۹، ۵۲۶

(مولانا) رحیم اللہ کاندھلوی ص ۱۹۶

(حاجی) رستم علی ص ۲۷۴

(خلیفہ) رسول بخش ص ۱۹۷

(مولانا) رشید احمد گنگوہی ص ۳۶، ۳۸، ۹۸

۲۸۲، ۲۳۸، ۲۳۶، ۲۲۲، ۱۷۰، ۱۵۸، ۱۰۲، ۹۹

۳۳۱، ۳۱۲، ۳۵۷، ۳۵۰، ۳۲۳، ۳۱۹، ۳۰۵

۴۳۸، ۴۳۷، ۴۳۶، ۴۳۵، ۴۳۳، ۴۳۲

۴۲۵، ۴۲۴، ۴۲۳، ۴۲۲، ۴۲۱، ۴۲۰، ۴۳۹

۴۶۲، ۴۶۱، ۴۵۹، ۴۵۰، ۴۳۸، ۴۳۷، ۴۳۶

۵۲۵، ۵۰۰، ۴۹۰، ۴۷۹، ۴۶۴

رشید احمد سالم انصاری ص ۳۰۵، ۳۳۷

رشید احمد میرٹھی ص ۵۸

(مولانا) رشید الدین خاں ص ۸۴، ۸۵، ۹۶

۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۸، ۹۷

۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۹، ۱۳۰

۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۹۶، ۲۲۳

۲۵۳، ۲۵۴، ۲۸۴، ۲۱۷، ۵۰۲، ۵۱۳، ۵۳۸

رشید حسن خاں ص ۲۲۷

(علامہ) رشید رضا مصری ص ۴۴۷

(مولوی) رضی الدین خاں ص ۱۲۸

رفیع الدین ص ۷۲

(شاہ) رفیع الدین ص ۷۸، ۷۹، ۱۱۰، ۱۱۹، ۱۲۱

۱۹۱، ۲۰۵، ۲۸۰، ۳۶۰، ۳۶۲، ۳۶۳، ۴۹۷، ۵۳۷

(شیخ) رکن الدین ص ۷۲

رکن الدین سمرقندی ص ۷۲

روشن علی ص ۱۰۵

(مولانا) روم ص ۱۱۲

سعادت احمد بجنوری ص ۵۱۵  
 (مولانا) سعادت علی فقیہ سہارنپوری ص ۲۸۰،  
 ۲۲۶، ۲۱۴، ۲۰۸  
 سعید احمد ص ۲۳۳  
 (مفتی) سعید احمد پالنپوری ص ۵۰، ۴۰، ۳۸  
 (ڈاکٹر) سفیر اختر ص ۲۳۵  
 (نواب) سکندر جہاں ص ۳۶۵  
 سکندر لودھی ص ۳۶۹، ۶۵، ۶۴  
 (ناظر جی) سلطان احمد ص ۲۲۹  
 (نواب) سلطان جہاں ص ۲۹۳  
 (مولانا) سلطان حسن خاں ص ۱۲۰  
 سلیمان بن عفان مانڈوی ص ۵۹، ۵۸، ۵۷  
 (مولانا) سلیم الدین ص ۱۲۸، ۱۲۷  
 (مولوی) سمیع اللہ دہلوی ص ۵۰۳، ۳۵۸، ۱۷۷  
 ۵۱۳، ۵۱۲، ۵۱۱  
 (مرزا) سنگین بیگ ص ۲۳۷، ۹۷  
 سید احمد شہید ص ۱۱۰، ۹۹، ۸۱، ۸۰، ۷۶، ۷۳  
 ۱۹۸، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۳، ۱۹۲، ۱۹۱، ۱۹۰  
 ۲۲۹، ۲۳۲، ۲۸۰، ۲۱۷، ۲۰۸، ۲۰۴، ۲۰۳، ۱۹۹  
 سید احمد نانوتوی ص ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶  
 سید محمد خاں ص ۲۷۳، ۲۶۷، ۱۳۷، ۱۳۴  
 سید محمد سید پوری ص ۵۲۳  
 سید محمود دہلوی ص ۲۵۳، ۱۸۷، ۱۸۲، ۱۵۳  
 ۲۸۹، ۲۸۶، ۲۷۳، ۲۷۲، ۳۱۲، ۳۰۸، ۲۸۰، ۲۷۷  
 ۵۱۷، ۵۱۴، ۵۱۲، ۵۱۱، ۴۹۳، ۴۱۷، ۴۱۱، ۳۹۵  
 (علامہ) شامی ابن عابدین ص ۲۴۷  
 شاہ علی ص ۴۱۵

ش

ریاض الدین ص ۵۲۷، ۳۵۸  
 (مولانا) ریاض الحسن محمد سلیمان کاندھلوی  
 ص ۲۰۷، ۲۸۸  
 (مفتی) ریاض الدین کاکوری ص ۳۹۹  
 ز  
 زوجہ شاہ مجید علی انبھوی ص ۷۱  
 زوجہ مولوی انصار علی انبھوی ص ۷۱  
 (مولانا) زید ابوالحسن فاروقی ص ۲۵۶، ۲۵۵  
 س  
 (شیخ) سادھن صدیقی ص ۷۲  
 (مولانا) سبحان بخش شکار پوری ص ۱۸۲، ۱۷۹  
 ۳۳۵، ۳۱۶، ۳۱۲، ۳۰۸، ۲۸۰، ۲۷۳، ۲۴۲، ۱۸۷  
 ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۲، ۳۷۱، ۳۷۰، ۳۶۹، ۳۵۶  
 ۳۸۱، ۳۸۰، ۳۷۹، ۳۷۸، ۳۷۷، ۳۷۶، ۳۷۵  
 ۳۸۸، ۳۸۷، ۳۸۶، ۳۸۵، ۳۸۴، ۳۸۳، ۳۸۲  
 ۳۹۳، ۳۹۲، ۳۹۱، ۳۹۰، ۳۸۹  
 سجاد مرزا دہلوی ص ۳۹۵، ۳۹۴، ۳۹۳، ۳۹۲  
 ۲۸۲، ۴۰۳، ۴۰۲  
 (مولانا) سدید الدین دہلوی ص ۳۵۷، ۱۲۷  
 ۵۲۴، ۵۱۳، ۵۰۳، ۵۰۲، ۴۹۳  
 سراج الدین ص ۵۱۶، ۷۲  
 سر سالار جنگ ص ۵۰۵  
 سر سید احمد خاں ص ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۲۸، ۱۲۶، ۱۱۹  
 ۳۲۹، ۲۶۷، ۲۳۲، ۱۶۹، ۱۵۵، ۱۳۷، ۱۳۷  
 ۵۳۲، ۵۲۱، ۵۲۰، ۵۱۲، ۴۶۰، ۴۰۰، ۳۹۸، ۳۳۱  
 ۵۲۸، ۵۲۷، ۵۲۶، ۵۲۵، ۵۲۴، ۵۲۳  
 ۵۲۵، ۵۲۴، ۵۲۳، ۵۲۲، ۵۲۱، ۵۲۰، ۵۱۹  
 ۵۵۶، ۵۴۷، ۵۴۶

<p>(شیخ) صدرالدین ص ۴۰۷          (مفتی) صدرالدین آزرده ص ۱۲۵، ۱۲۳، ۱۵۴،          ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۲،          ۱۷۵، ۱۹۸، ۱۹۷، ۲۲۷، ۲۳۲، ۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۸،          ۳۱۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۹۷، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۳۰،          ۴۳۵، ۴۳۷، ۴۹۴، ۴۹۶، ۵۰۱، ۵۰۹، ۵۱۰،          ۵۱۴، ۵۱۳، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۲۳، ۵۲۶</p> <p>صدرالدین حاجی ص ۷۲          (ڈاکٹر) صدیق الرحمن قدوائی ص ۹۷، ۱۳۵،          ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۷۹</p> <p>(نواب) صدیق حسن خاں ص ۳۶۸          صلاح الدین صفدی ص ۹۰</p>	<p>(حاجی) شاہ کمال ص ۲۲۹          شاہ محمد ص ۷۲، ۶۹          (قاری) شاہ محمد ص ۴۱۶          شاہ ایامی مجذوب ص ۸۲          (علامہ) شبلی نعمانی اعظمی ص: ۲۱۵          (ڈاکٹر) شریف احمد قاسمی ص ۱۳۵          (حکیم) شریف خاں ص ۴۲۱          شمس الدین ص ۵۲۷، ۳۵۸          شمس الدین امام بخش عاجز ص ۵۱۹          شمس الدین دہلوی ص ۱۶۳، ۱۹۷          (مولانا) شمس الدین دیانوی ص: ۲۸۱          شمس الدین فقیر ص ۱۴۷          (ڈاکٹر) شمس الرحمن فاروقی ص ۴۱، ۵۰          شمس الضحیٰ ص ۳۰۷          شہاب الدین ص: ۷۲          شہاب الدین احمد خفاجی ص ۲۹۶          (مرزا) شہسوار خاں ص: ۵۲۳          شیا م لال ص ۵۲۲          شیخ جیون نانوتوی ص ۵۷، ۶۲، ۶۳          شیخ محمد تھانوی ص ۸۲، ۹۳، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۹۳، ۱۹۵،          ۱۹۷، ۱۹۹، ۳۰۴، ۳۰۶، ۳۵۶، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴،          ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۱۵</p>
<p>(ض)</p> <p>(نواب) ضابطہ خاں ص ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳          ضیاء الدین ص ۷۳          (ڈاکٹر) ضیاء الدین ص ۱۸۱          (مولوی) ضیاء الدین دہلوی ص ۳۵۷، ۵۰۹، ۵۱۰</p> <p>(ط)</p> <p>(علامہ) طاہر پٹی ص ۴۲۴          (قاضی) ط ص ۷۲، ۶۹          (سید) ط کتانوی ص ۶۲، ۶۳، ۶۴</p>	<p>(ص)</p> <p>(سید) صابر علی ص ۵۷، ۵۹، ۶۱          (شیخ) صابر علی ص ۴۹۷          صادق ہمدانی ص ۵۹، ۵۷          صدرالدین ص ۷۲          (حکیم) صدرالدین ص ۱۹۷</p>



ع

(مولوی) عبدالحق دہلوی ص ۱۹۵، ۱۹۸، ۵۰۴  
 (شیخ) عبدالدین بن قطب الدین ص ۳۶۹  
 عبدالرحمن ص ۱۶۳، ۱۹۷  
 (خلیفہ) عبدالرحمن ص ۱۹۸  
 عبدالرحمن انصاری ص ۳۰۵  
 (قاری) عبدالرحمن پانی پتی ص ۹۳، ۱۱۵، ۱۲۶،  
 ۱۷۵، ۱۷۶، ۳۵۶، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹،  
 ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲  
 عبدالرحمن پرواز اصلاحی ص ۲۸۲  
 (مولانا) عبدالرحمن جلال آبادی ص ۸۱، ۸۲،  
 ۸۳، ۳۷۰، ۳۷۱  
 (حکیم) عبدالرحمن حیرت ص ۳۵۸، ۵۱۹،  
 ۵۲۰، ۵۲۱  
 (مولانا) عبدالرحمن کاندہلوی ص ۲۲۳  
 (مولانا) عبدالرحمن کلیانوی ص ۳۹۹  
 عبدالرحمان مبارک پوری ص ۲۸۱  
 عبدالرحمن (نامعلوم) ص ۳۵۸، ۵۲۷  
 عبدالرحمن نابینا ص ۲۲۰  
 (مولانا) عبد الرحیم تھانوی ص ۸۲، ۱۱۶،  
 ۲۰۱، ۲۰۲  
 عبدالرحیم ضیاء حیدرآبادی ص ۱۲۷، ۱۵۱  
 (شیخ) عبدالرحیم عثمانی ص ۳۹۸  
 (مولانا) عبدالرزاق بانپتی ص ۲۰۲  
 عبدالرزاق بن قاسم ص ۷۲  
 (مولانا) عبدالرزاق جھنجھانوی ص ۸۲، ۵۱۹  
 (مولوی) عبدالرزاق کانپوری ص ۵۰۴  
 عبدالسلام کشمیری ص ۱۱۸  
 عبدالمسیح ص ۶۹

(حاجی) عابد حسین ص ۳۲۹، ۳۲۸، ۵۰۰  
 (ڈاکٹر) عابد حسین ص ۱۳۹  
 (مولانا) عاشق الہی میرٹھی ص ۹۲، ۴۳۴،  
 ۴۳۵، ۴۳۹، ۴۹۹  
 (سید) عالم علی مراد آبادی ص ۳۵۶، ۴۱۸، ۴۲۱،  
 (بادشاہ) عالم گیر ص ۶۸، ۶۹  
 (حافظ) عبدالاحد ص ۳۹۳، ۳۹۷  
 (مولانا) عبدالباسط بلیاوی ص ۲۵۶  
 عبدالجلیل نعمانی ص ۲۸۷  
 (مولانا) عبدالحی بڈھانوی ص ۷۹، ۸۰، ۸۱،  
 ۱۲۰، ۱۲۱، ۵۰۱  
 (مولانا) عبدالحی حسنی ص ۸۰، ۹۳، ۹۹،  
 ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۸، ۳۶۳، ۳۶۶، ۳۶۸، ۴۳۹  
 (مولانا) عبدالحی فرنگی محلی ص ۴۳۶  
 (علامہ) عبدالحی کتانوی ص ۲۲۳  
 عبدالحق پور قاضوی ص ۳۳۷، ۳۶۹  
 (مولانا) عبدالحق خیرآبادی ص ۲۵۰، ۳۹۹  
 (مولوی) عبدالحق دہلوی ص ۹۶، ۹۷، ۱۰۰،  
 ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۸، ۱۷۹،  
 ۲۲۲، ۲۲۳، ۳۷۶، ۳۸۹، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۶،  
 ۵۰۲، ۵۲۸  
 (شیخ) عبدالحق محدث دہلوی ص ۵۹، ۶۰، ۲۳۸،  
 ۳۷۸، ۳۸۳، ۵۱۴، ۵۲۵  
 (مولانا) عبدالحلیم انصاری پانی پتی ص ۱۷۴،  
 ۱۷۵، ۴۱۸  
 عبدالحلیم النجار ص ۲۳۶  
 (مولانا) عبدالحمید خاں جلال آبادی ص ۳۵۷، ۴۳۰

۲۰۱، ۱۲۱، ۱۱۹، ۱۰۵، ۱۰۴	(دیوان) عبدالمسیح ص ۷۱
(شیخ) عبدالقدوس گنگوہی ص ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۲۰۷، ۵۰۳	(مولانا) عبدالرشید بستوی ص ۵۳۷، ۵۳۹
(مولانا) عبدالقدیر دیوبندی ص ۳۳۳	(شیخ) عبدالرشید قادری ص ۶۳، ۲۶۹
(مفتی) عبدالقیوم بڈھانوی ص ۴۹۳، ۵۰۱	عبدالصمد بن عبدالواحد ص ۸۸
عبدالکریم بن غلام فرید ص ۸۲	(شاہ) عبدالعزیز دہلوی ص ۷۸، ۸۰، ۸۵
عبدالکریم فروغ ص ۳۳۰	۱۱۸، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۹۸
(حاجی) عبدالکریم میرٹھی ص ۲۰۹، ۲۱۰	۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۷، ۱۳۶، ۱۸۶، ۱۹۱، ۱۹۲
(حکیم) عبداللہ ص ۶۹، ۷۰	۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۰۶، ۲۰۹، ۲۱۲، ۲۱۵، ۲۳۱
(مولانا) عبداللہ انصاری ص ۳۰۵، ۳۳۲	۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۲۴، ۲۸۰، ۲۳۳، ۲۳۲
۵۴۰، ۴۹۹، ۲۱۵	۴۸۷، ۴۴۷، ۴۴۶، ۴۱۹، ۴۱۶، ۴۰۳، ۳۶۴
(شیخ) عبداللہ انصاری ص ۲۳۲	۵۴۳، ۵۱۵
(مولانا) عبداللہ بایزید پوری ص ۳۹۱	(شیخ) عبدالعزیز شکر بار ص ۳۰۲، ۵۱۳
(مولانا) عبداللہ بلگرامی ص ۳۹۹	(مولانا) عبدالعلی پھلتی ص ۴۹۹
عبداللہ بن زکریا ص ۷۲	(مولانا) عبدالعلی میرٹھی ص ۳۲۴، ۴۰۳، ۴۱۵
(مولانا) عبداللہ خاں علوی ص ۸۵، ۹۹، ۱۰۰	۴۶۹، ۴۵۶، ۴۵۵
۱۰۵، ۱۱۷، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۹۵، ۱۹۶	(شاہ) عبدالعلیم لوہاروی ص ۸۲
(حافظ) عبداللہ خلف الہی بخش کیرانوی ص ۳۷۹	(سید) عبدالغفور ص ۴۱۲
(سید) عبداللہ دہلوی ص ۳۵۸، ۵۱۳	(شیخ) عبدالغفور بڈھانوی ص ۵۰۳
(خواجہ) عبداللہ دہلوی ص ۵۱۳	عبدالغنی ص ۶۷
(مولانا) عبداللہ سہارنپوری ص ۱۹۷	(شاہ) عبدالغنی مجدد دہلوی ص ۱۰۲، ۲۱۶، ۲۱۴
عبداللہ نانوتوی ص ۳۰۴	۲۱۷، ۲۱۶، ۲۱۵، ۳۱۱، ۳۱۰، ۲۶۶، ۲۱۷
(مولانا) عبدالمومن ص ۳۳۳	۴۸۲، ۴۷۹، ۴۶۱، ۴۵۷، ۴۵۶، ۴۳۸، ۴۳۶
(حافظ) عبدالوہاب ص ۱۹۸	۴۹۸، ۴۹۴، ۴۹۳
(حکیم) عبدالوہاب نابینا ص ۳۲۴	(حکیم) عبدالقادر ص ۱۰۹
(مولانا) عبیداللہ سندھی ص ۱۰۲، ۲۱۴، ۲۱۵	(شاہ) عبدالقادر ص ۸۰، ۱۱۰، ۱۱۹، ۱۹۱، ۱۹۸
۵۳۲، ۴۹۳، ۲۱۹، ۲۱۸	(مولوی) عبدالقادر بدایونی ص ۴۱۹
(مولانا) عبیداللہ غلام حسین ص ۱۹۹	(شیخ) عبدالقادر جیلانی ص ۳۷۸، ۳۸۰
عتیق احمد صدیقی ص ۱۸۶، ۱۸۴	(مولوی) عبدالقادر چیف رام پوری ص

(شیخ) عمر خنی رام پوری ص ۳۳۳	(شیخ) عثمان مانڈوی ص ۵۹
عنایت احمد گنگوہی ص ۲۳۳	(حافظ) عزیز الدین مراد آبادی ص ۲۳۳
(غ)	عزیز اللہ بن احمد اللہ ص ۵۱۱
(مرزا) غالب ص ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۹۲	عزیز اللہ کاندھلوی ص ۱۹۶
(حافظ) غلام احمد ص ۲۲۹	عزیز النساء ص ۵۳۳
(خواجہ) غلام یوعلیٰ ص ۲۱۶	(مولوی) عصمت اللہ ص ۱۲۵
(مولانا) غلام حسن ص ۸۷، ۸۸	عظمت اللہ ص ۵۲۲
(قاضی) غلام حسن بن غلام علی ص ۲۳۳	عظیم الدین (غالباً جھنجھانوی) ص ۱۹۷
غلام حسنین ص ۳۰۷	(مولانا) علاء الحسن کاندھلوی ص ۳۹۸
(مولانا) غلام حسین سہارنپوری ص ۸۷	(شیخ) علاء الدین ص ۶۹، ۲۵۱
غلام حلیم ص ۱۰۶	(مولوی) علاء الدین ص ۷۱
(مرزا) غلام حیدر ص ۱۹۸، ۵۳۴	(مولوی) علاء الدین نانوتوی ص ۳۵۱
(حکیم) غلام حیدر خاں ص ۴۲۱، ۵۳۷	(مولوی) علی احمد بجنوری ص ۳۵۸، ۵۱۵، ۵۱۶
(مولانا) غلام رسول خاموش ص ۳۶	علی اصغر ص ۲۵۲، ۳۵۹، ۴۹۳، ۵۲۷، ۵۳۰
(مولانا) غلام رسول مہر ص ۸۱، ۱۹۴	(قاضی) علی اکبر ص ۲۳۳
(حکیم) غلام سبحانی ص ۱۹۷	علی اکبر سونپتی ص ۱۲۸، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۹، ۱۶۴
غلام شرف ص ۷۱، ۷۲، ۳۰۴	۲۵۱، ۲۵۲، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۶، ۳۵۹، ۳۷۳
(شاہ) غلام علی ص ۱۵۹، ۱۶۹، ۳۶۴، ۴۳۳	۳۷۶، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۹۳، ۵۲۷، ۵۲۹، ۵۳۰
۵۳۳، ۵۳۷	علی بخش ص ۲۹۱
(مولانا) غلام علی انبھوی ص ۸۷، ۸۸	علی بن الحسن بن علی باخرزی ص ۲۹۴
(مرزا) غلام قادر ص ۲۸۸	(نواب) علی حسن ص ۳۶۸
(خواجہ) غلام محمد ص ۲۱۶	علی کبیر بناری ص ۱۱۹
(شاہ) غلام محمد نانوتوی ص ۵۷، ۶۰، ۶۱	(شیخ) علی محمد ص ۷۱
غلام علی مصطفیٰ رام پوری ص ۱۹۷	(نواب) علی محمد خاں ص ۲۱۴
(مولانا) غلام مصطفیٰ قاسمی ص ۵۳۲	(مولوی) علی نقی ص ۲۸۳، ۴۹۰، ۴۹۱
(مرزا) غلام نبی ص ۵۲۰	(مولانا) علیم اللہ بجنوری ص ۳۵۸، ۵۲۶
(مولانا) غوث علی قلندر ص ۹۳، ۱۱۵، ۱۱۷، ۴۳۴	(مولانا) علیم الدین کاندھلوی ص ۲۱۸
	عمر بن عبد اللہ ص ۳۸۰

ف

(شیخ) فتح علی ص ۳۲۱، ۳۹۵  
 (مولانا) فتح محمد تھانوی ص ۸۲، ۳۳۳  
 (مولانا) فخر الحسن گنگوہی ص ۳۵۹، ۴۷۵  
 (مرزا) فخر و ص ۳۷۹  
 فرحت اللہ بیگ ص ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۱۱۱، ۱۲۷، ۲۲۹، ۵۳۲، ۵۳۵  
 (مولانا) فرید الدین دیوبندی ص ۳۹۷  
 (مولانا) فرید الدین مراد آبادی ص ۹۹، ۵۳۳  
 فریڈرک جان موٹ ص ۲۷۲، ۲۷۵، ۲۷۷  
 ۳۲۵  
 (مولانا) فصیح الدین عثمانی ص ۳۵۷، ۳۹۷  
 فضل احمد جیوری ص ۵۸  
 (مولانا) فضل الرحمن عثمانی ص ۳۵۷، ۳۸۹، ۳۹۸  
 (حاجی) فضل حق ص ۳۲۲  
 (منشی) فضل حق ص ۳۲۹  
 (مولانا) فضل حق خیر آبادی ص ۱۲۵، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۶۹، ۲۰۲، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۸۸، ۳۹۷، ۵۲۳، ۳۹۹، ۴۰۲، ۴۰۳، ۵۲۳  
 (مولوی) فضل رسول بدایونی ص ۳۹۰، ۳۹۱  
 (شیخ) فضل علی خاں ص ۱۳۷، ۱۹۶  
 (مولانا) فضیل الرحمن ہلال عثمانی ص ۳۹۹  
 (شہزادہ) فیروز ص ۲۵۴  
 (حکیم) فیروز الدین لاہوری ص ۵۲۳  
 (مولانا) فیض الحسن سہارنپوری ص ۳۵۱، ۵۳۳، ۵۳۳  
 فیلکس بوترو ص ۲۳۷

ق

قادر بخش صابر دہلوی ص ۱۱۷، ۱۱۸، ۵۳۳، ۵۳۴  
 قاسم بن محمد ص ۳۶۳  
 قاسم علی بن محمد بصری ص ۲۹۵  
 قاسم علی خاں ص ۱۱۷، ۱۹۶، ۱۹۸  
 (مولوی) قطب الدین ص ۷۱  
 قطب الدین بن شیخ عبدالقادر ص ۳۹۶  
 قطب الدین دلاور علی ص ۳۵۸، ۵۲۳  
 (نواب) قطب الدین دہلوی ص ۲۰۵، ۲۱۶، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۳۱۶، ۳۳۵، ۳۷۸، ۳۸۱  
 ۳۸۵، ۳۸۴  
 قطب الدین کتانوی ص ۶۳  
 (حافظ) قطب بخش گنگوہی ص ۳۳۳  
 (حکیم) قمر الدین ص ۳۹۳

ک

(مسٹر) کارگل ص ۱۴۲  
 کرامت اللہ خاں دہلوی ص ۳۳۳  
 (مولانا) کرامت علی ص ۱۲۷  
 کریم الدین پانی پتی ص ۷۳، ۷۵، ۱۰۳، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۹  
 ۱۷۷، ۱۸۰، ۱۸۱، ۲۲۲، ۲۳۷، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۸۵، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۵، ۳۵۴  
 ۳۵۸، ۳۷۰، ۳۷۶، ۳۷۹، ۳۸۸، ۵۱۷، ۵۱۷  
 ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۹، ۵۳۳، ۵۳۷، ۵۵۲، ۵۵۴  
 کریم اللہ دہلوی ص ۱۲۷  
 (مولوی) کریم بخش دہلوی ص ۱۸۴، ۳۵۸  
 ۵۲۲، ۵۰۰، ۳۳۵

کفایت علی ص ۲۲۱

(نواب) کلب علی ص ۵۰۳

(شیخ) کمال سنبھلی ص ۶۰، ۶۱، ۵۸

(مولانا) کمال الدین کاندھلوی ص ۱۱۰، ۱۱۳

(خواجہ) کمال محمد ص ۲۱۶

کمال الدین نانوتوی ص ۶۷

(مولوی) کوثر علی خیر آبادی ص ۳۲۳

کوچک سلطان ص ۵۱۰

گ

گارسین دتاسی ص ۲۲۹، ۲۵۱، ۳۷۷، ۳۹۰

(مولانا) گل حسن سرحدی ص ۲۲۰

ل

لارڈ منٹو وائسرائے ہند ص ۱۳۲

لالہ رادھا کشن ص ۱۸۷، ۳۹۵

لالہ شری رام ص ۳۷۹

لطف اللہ کشمیری ص ۱۹۸

(شیخ) لطف اللہ عرف پیرنھو ص ۲۰۷

(حافظ) لطف علی ص ۷۱، ۲۶۶، ۲۶۸، ۲۲۲

۲۸۱، ۲۹۴

لطف علی راج گیری ص ۳۹۹

(پروفیسر) لطیف اللہ ص ۵۸

م

مارش مین ص ۳۸۷

مالک بن محمد رضا ص ۸۲

مالک رام ص ۱۷۹، ۲۲۲، ۳۹۲، ۵۲۵

(قاضی) مبارک ص ۶۹، ۷۲

مبارک النساء ص ۷۱، ۳۰۳، ۳۰۵

مٹھولال ص ۲۳۹، ۲۸۶

(حضرت) مجدد الف ثانی ص ۲۸۵

(شاہ) مجید علی ص ۳۰۵

(سید) محبوب رضوی ص ۲۹۷

محبوب علی جعفری ص ۱۹۶، ۲۸۰

(خواجہ) محمد ص ۲۱۶

(مولانا) محمد ابراہیم بڈھانوی ص ۵۰۱

(مولانا) محمد احسن مراد آبادی ص ۳۹۹

(مولانا) محمد احسن نانوتوی ص ۷۱، ۷۷، ۱۲۶

۱۲۸، ۱۷۶، ۱۹۷، ۲۶۶، ۳۱۸، ۳۳۸، ۳۵۷

۳۶۷، ۳۷۱، ۳۷۳، ۳۵۱، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۴

۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱

۳۹۲، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۷

(حافظ) محمد احمد ص ۷۱

(شاہ) محمد اسحاق ص ۸۰، ۹۹، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۶۹

۱۹۸، ۲۰۹، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۰، ۲۳۱

۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۷۹

۲۸۱، ۳۶۰، ۳۶۴، ۳۶۹، ۳۷۱، ۳۹۶، ۳۹۷

۳۹۸، ۴۰۰، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۱۸

۴۱۹، ۴۲۲، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۳، ۴۵۵، ۴۹۳

۵۰۱، ۵۲۳

(مولوی) محمد اسحاق بریلوی ص ۵۲۳

(مولانا) محمد ادریس کاندھلوی ص ۲۹۴

(قاضی) محمد رحم بن حافظ اعظم ص ۲۰۱

محمد اسلم انصاری ص ۲۳۳

محمد اسماعیل بن عبداللہ انصاری ص ۲۳۲

(شاہ) محمد اسماعیل شہید ص ۸۰، ۸۱، ۹۹، ۱۱۷

۱۲۰، ۱۹۴، ۱۹۶، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷

محمد تقی گنگوہی ص ۲۳۲	۲۹۳، ۲۹۰، ۳۶۲، ۲۸۰، ۲۱۲، ۲۰۸
(مولانا) محمد تقی نصیر آبادی ص ۳۹۹	(قاضی) محمد اسماعیل منگلوری ص ۲۰۵
(مولانا) محمد ثانی حسنی ص ۱۰۳	محمد اسماعیل نانوتوی ص ۱۲۱، ۷۵
محمد ثعالبی ص ۲۹۳	(مولانا) محمد اشرف کاندھلوی ص ۱۹۶، ۱۰۹
محمد جمیل ص ۲۰۷	(قاضی) محمد علی تھانوی ص ۲۹۰، ۲۶۵، ۲۶۳
(حاجی) محمد جونپوری ص ۱۵۵	محمد افضل بخاری ص ۳۸۸
(حافظ) محمد حسن ص ۷۱	محمد افضل سونی پتی ص ۱۹۷
(میاں) محمد حسن ص ۱۹۸	(ڈاکٹر) محمد اکرام چغتائی ص ۹۵، ۷۶، ۴۷
(مولانا) محمد حسن رام پوری ص ۸۷، ۸۳، ۸۱	۲۲۸، ۲۳۷، ۲۳۳، ۲۳۲، ۱۵۲، ۱۵۱، ۱۵۰، ۱۳۳
۵۰۰، ۴۹۹، ۴۳۳، ۳۵۷، ۳۰۶، ۲۲۵، ۲۲۳، ۱۹۷	۳۷۲، ۲۷۶، ۲۶۵، ۲۶۳، ۲۶۲، ۲۶۱، ۲۵۰
(مولانا) محمد حسن نانوتوی ص ۲۶۶	۵۱۸، ۵۱۷، ۴۹۵، ۴۸۴، ۳۹۵، ۳۷۷، ۳۷۳
(شاہ) محمد حسین الہ آبادی ص ۳۳۳	۵۲۳، ۵۲۲، ۵۲۱، ۵۲۸
(مولوی) محمد حسین ص ۳۳۶	(حکیم) محمد انور پھلتی ص ۴۹۳
محمد حسین آزاد ص ۳۰۸، ۱۸۱، ۷۴	(مولانا) محمد انوری ص ۴۲۷
(مولانا) محمد حسین بٹالوی ص ۳۶۳، ۳۹۹	محمد ایوب ص ۳۰۲
(مولانا) محمد حسین رام پوری ص ۳۲۹، ۳۵۶	(مفتی) محمد ایوب پھلتی ص ۴۹۳، ۴۹۳، ۳۵۷
(مولانا) محمد حسین فقیر دہلوی ص ۲۸۱، ۲۰۵	۵۰۱
۴۱۳، ۴۱۲، ۳۸۱، ۲۸۲	محمد ایوب قادری ص ۷۱، ۴۶، ۴۵
محمد حکیم دہلوی ص ۱۲۷	۴۸۲، ۴۲۲، ۳۳۸، ۲۳۳، ۲۳۳، ۱۴۳، ۱۲۱، ۱۰۴
(مولوی) محمد حنیف بہرائچی ص ۵۰	۵۲۳، ۴۹۲
محمد حیات پنجابی ص ۲۸۰، ۱۶۹	(مولانا) محمد بخش ص ۴۳۲
محمد خلیل ص ۲۰۷	محمد بخش بن غلام حسین دہلوی ص ۵۰۹
(مرزا) محمد رستم بدخشی ص ۱۱۸	محمد بخش بن غلام شرف سہارنپوری ص ۱۹۷
(شاہ) محمد رمضان ص ۴۳۴	محمد بخش فاروقی ص ۱۹۶
(قاضی) محمد زاہد ص ۸۸	(شیخ) محمد بن جعفر کتانوی ص ۲۲۳، ۲۲۳
(شیخ الحدیث مولانا) محمد زکریا ص ۱۷۲، ۱۰۳	(مولانا شیخ) محمد بن غلام رسول سورتی ص ۳۹۹
۴۲۵، ۴۲۸	(شیخ) محمد بن ناصر ص ۴۹۳
(مولانا) محمد سعید اندرابی ص ۲۲۹، ۳۵۷	(سید) محمد عشق دہلوی ص ۳۷۲

،۳۵۷،۳۳۵،۳۳۷،۳۳۶،۳۳۵،۳۳۴	(مولوی) محمد شاہ لڈھیانوی ص ۲۱۲
،۳۳۱،۳۲۸،۳۲۷،۳۲۳،۳۱۷،۳۱۴،۳۱۲،۳۰۸	(مولانا) محمد شریف کاندہلوی ص ۱۰۹
،۳۲۸،۳۳۱،۳۳۰،۳۳۸،۳۳۷،۳۳۶،۳۳۵	(مولانا) محمد شریف نقشبندی ص ۲۳۰
،۳۵۸،۳۵۷،۳۵۶،۳۵۵،۳۵۳،۳۵۲،۳۵۱	(مولوی) محمد شعبان بستوی ص ۵۰
،۳۶۵،۳۶۴،۳۶۳،۳۶۲،۳۶۱،۳۶۰،۳۵۹	(پروفیسر) محمد شفیع ص ۲۸۲
،۳۷۳،۳۷۱،۳۷۰،۳۶۹،۳۶۸،۳۶۷،۳۶۶	(مفتی) محمد شفیع دیوبندی ص ۱۰۳، ۱۰۲
،۳۹۰،۳۸۴،۳۸۱،۳۷۹،۳۷۸،۳۷۷،۳۷۴	(مولانا) محمد شکور مچھلی شہری ص ۱۲۷
،۵۳۲،۵۳۱،۵۲۶،۵۲۵،۴۹۸،۴۹۷،۴۹۲	محمد صادق گنگوہی ص ۶۱، ۶۰
۵۳۵،۵۳۰	(مولانا) محمد صادق لوہاروی ص ۸۲
۳۳۷،۳۳۳،۳۲۰ (منشی) محمد قاسم نیاگری ص	(حافظ) محمد ضامن شہید ص ۳۰۵، ۳۰۴
،۸۴،۸۱ (سید مولانا) محمد قلندر جلال آبادی ص	(قاری) محمد طیب دیوبندی ص ۹۸، ۷۵، ۷۱
،۱۱۶،۱۱۵،۱۱۴،۱۱۳،۱۰۵،،۹۴،۹۳،۸۷،۸۵	(شاہ) محمد عاشق پھلتی ص ۱۰۶
،۴۱۸،۴۰۳،۴۰۱،۱۹۷،۱۱۷	(شیخ) محمد عاقل ص ۷۹، ۷۱
محمد لیبیب البتونی ص ۲۶۸	(حکیم) محمد عرف شیخ الاسلام ص ۳۹۶، ۲۹۰، ۱۰۹
محمد مشتاق دیوبندی ص ۲۸۰	(سید) محمد عرفان ٹونکی ص ۳۳۳
(علامہ) محمد مصطفیٰ تھانیسری ص ۳۸۴	(مرزا) محمد عسکری ص ۵۱۱
(حکیم) محمد مصطفیٰ میرٹھی ص ۳۳۶	(مولوی) محمد علی مونگیری ص ۲۱۵
(مولانا) محمد مظہر نانوٹوی ص ۱۰۳، ۷۷، ۷۱	(شاہ) محمد عمر ص ۴۹۳
،۳۱۷،۲۷۱،۲۶۶،۱۷۶،۱۷۴،۱۵۳،۱۴۸،۱۴۷	محمد عمر چرتھاولی ص ۲۰۵، ۱۱۶
،۴۲۲،۴۱۸،۴۱۴،۴۱۲،۳۶۰،۳۵۶،۳۳۷	محمد غوث ص ۴۳۲
،۴۳۱،۴۲۸،۴۲۷،۴۲۶،۴۲۵،۴۲۴،۴۲۳	محمد غوثی شطاری ص ۵۹، ۵۷
۵۲۶،۴۹۴،۴۸۲،۴۸۱،۴۵۶،۴۵۱	(مولانا) محمد فاضل پھلتی ص ۲۶۹
(شیخ) محمد مفتی ص ۷۹	(مولانا) محمد قاسم نانوٹوی ص ۷۱، ۳۸، ۳۶
(مولانا) محمد میاں ص ۵۳۲، ۳۹۶، ۳۱۵	، ۱۵۵، ۱۰۲، ۹۸، ۹۷، ۸۵، ۷۷، ۷۵، ۷۲
(مولانا) محمد منیر نانوٹوی ص ۱۷۶، ۷۷، ۷۱	، ۲۳۶، ۲۲۴، ۲۲۰، ۲۰۵، ۱۷۶، ۱۷۵، ۱۷۲، ۱۵۸
،۴۸۹،۴۸۷،۴۸۴،۴۵۱،۴۵۷،۴۳۸،۴۶۶	، ۳۰۸، ۳۰۷، ۳۰۵، ۳۰۴، ۳۰۱، ۲۶۶، ۲۵۰
۴۹۴، ۴۹۲	، ۳۱۹، ۳۱۸، ۳۱۶، ۳۱۵، ۳۱۴، ۳۱۱، ۳۱۰، ۳۰۹
محمد مومن شیرازی ص ۹۰	، ۳۳۲، ۳۳۱، ۳۲۷، ۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۳، ۳۲۱

<p>(حافظ) محمود نانوتوی ص ۳۰۴، ۳۰۳</p> <p>(مفتی) محمود احمد نانوتوی ص ۶۷، ۶۶، ۶۵</p> <p>۸۵، ۸۴، ۷۵، ۷۲</p> <p>(شیخ الہند مولانا) محمود الحسن ص ۲۱۴، ۱۱۵، ۹۳</p> <p>۲۸۹، ۲۶۹، ۲۵۲، ۲۳۶، ۲۲۰، ۳۳۲، ۲۲۰، ۲۱۹</p> <p>۵۳۶، ۴۹۷</p> <p>(شیخ) محمود بخش ص ۴۹۷، ۷۲</p> <p>محمود حسن قیصر امردہوی ص ۱۰۴</p> <p>(سلطان) محمود غزنوی ص ۲۴۳</p> <p>(مولانا) محی الدین ص ۱۲۸، ۱۲۷</p> <p>(قاضی) محی الدین کاندھلوی ص ۱۹۶</p> <p>(مولانا) محی الدین مراد آبادی ص ۲۶۹</p> <p>(حکیم) محی الدین نانوتوی ص ۳۰۴، ۳۰۳</p> <p>مخدوم علی مہائی ص ۳۶۷</p> <p>(شاہ) مخصوص اللہ ص ۵۳۳، ۵۳۵، ۵۳۴</p> <p>(حاجی) مرتضیٰ خاں ص ۳۰۴، ۸۱</p> <p>(مولانا) مرغوب الرحمن ص ۳۹، ۳۸، ۳۶</p> <p>مشتاق احمد ص ۵۲۵، ۳۵۸</p> <p>(مولانا) مشتاق احمد انبھوی ص ۲۳۴، ۸۸</p> <p>۵۰۰، ۴۹۹</p> <p>مصاحب علی جعفری ص ۱۹۶</p> <p>(سید) مصطفیٰ نانوتوی ص ۶۰، ۵۹، ۵۶</p> <p>مظفر حسین صبا ص ۳۶۸</p> <p>(مولانا) مظفر حسین کاندھلوی ص ۲۱۴، ۲۰۵</p> <p>۲۶۱، ۲۶۰، ۲۵۷، ۲۲۴، ۲۲۳، ۲۱۶، ۲۱۵</p> <p>۵۲۰، ۴۹۳</p> <p>(شیخ) مظہر الدین ص ۷۲، ۶۵، ۶۶، ۷۲</p> <p>(حکیم) معین الدین نانوتوی ص ۳۵۲، ۷۱</p>	<p>مومن خاں مومن ص ۲۳۳، ۱۹۸، ۱۹۵، ۹۹</p> <p>۳۶۴، ۲۹۴</p> <p>(مولانا) محمد ناصر بلیاوی ص ۲۵۶، ۱۰۳</p> <p>(مولوی) محمد نواز ص ۲۵۲</p> <p>(مولوی) محمد ہاشم ص ۷۲، ۶۹</p> <p>(مولانا) محمد یحییٰ کاندھلوی ص ۲۳۵</p> <p>(مولانا شاہ) محمد یعقوب دہلوی ص ۱۶۹، ۹۹</p> <p>۱۹۵، ۱۹۷، ۲۱۴، ۲۱۴، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۵، ۳۶۲</p> <p>۵۰۱، ۴۹۳، ۳۶۴</p> <p>(مولانا) محمد یعقوب علی بدایونی ص ۳۵۸</p> <p>(مولانا) محمد یعقوب نانوتوی ص ۳۵، ۳۶</p> <p>۶۶، ۶۸، ۷۲، ۷۴، ۸۵، ۹۷، ۱۲۸، ۱۵۳، ۱۵۵</p> <p>۱۵۷، ۱۷۶، ۱۷۶، ۲۰۵، ۲۲۴، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۵</p> <p>۲۴۳، ۲۹۶، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۶، ۳۰۷</p> <p>۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵</p> <p>۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴</p> <p>۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۲، ۳۳۳</p> <p>۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۱</p> <p>۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰</p> <p>۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۷، ۳۷۴، ۳۷۴، ۳۷۴، ۳۷۴، ۳۷۴</p> <p>۲۵۲، ۲۵۷، ۲۶۹، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۹</p> <p>۵۴۰، ۵۰۰</p> <p>(مولانا) محمد یوسف بن مفتی عبدالقیوم بڈھانوی</p> <p>ص ۵۰۲، ۵۰۱، ۳۵۷</p> <p>(مولانا) محمد یوسف بنوری ص ۲۲۷، ۲۲۵</p> <p>(سید) محمود ص ۲۷۳</p> <p>(ملا) محمود ص ۲۳۷، ۳۲۸، ۳۲۶، ۳۲۵</p> <p>(مولوی) محمود ص ۲۲۹</p>
--	---



۳۶۳، ۳۶۲، ۳۶۱، ۳۶۰، ۳۵۹، ۳۵۶، ۳۵۵	(حکیم) معیث الدین ص ۸۰، ۱۹۷
۳۸۵، ۳۷۸، ۳۷۷، ۳۷۴، ۳۷۲، ۳۷۰، ۳۶۹	(نشی) ممتاز علی ص ۳۱۶، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸
۴۱۷، ۴۱۰، ۴۰۸، ۴۰۳، ۳۹۷، ۳۹۶، ۳۸۶	(مولانا) مملوک العلی ص ۳۶، ۳۹، ۴۱، ۴۲
۴۳۱، ۴۳۰، ۴۲۹، ۴۲۵، ۴۲۲، ۴۲۱، ۴۱۸	۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴
۴۵۳، ۴۵۲، ۴۵۱، ۴۴۸، ۴۴۶، ۴۴۵، ۴۴۴	۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹
۴۹۸، ۴۹۷، ۴۹۳، ۴۸۳، ۴۸۲، ۴۸۱، ۴۶۰	۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲
۵۱۲، ۵۱۱، ۵۰۹، ۵۰۴، ۵۰۲، ۵۰۱، ۵۰۰، ۴۹۹	۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲
۵۲۲، ۵۲۰، ۵۱۹، ۵۱۸، ۵۱۷، ۵۱۵، ۵۱۴، ۵۱۳	۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳
۵۳۱، ۵۳۰، ۵۲۸، ۵۲۷، ۵۲۵، ۵۲۴، ۵۲۳	۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹
۵۴۲، ۵۴۱، ۵۴۰، ۵۳۹، ۵۳۸، ۵۳۶، ۵۳۴	۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲
۵۵۲، ۵۴۹، ۵۴۷، ۵۴۶، ۵۴۵، ۵۴۴، ۵۴۳	۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲
۵۵۶، ۵۵۴	۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲
(مولانا) مناظر احسن گیلانی ص ۵۲، ۷۲، ۷۰	۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲
۳۶۸، ۳۵۷، ۳۴۳، ۳۱۲، ۱۰۰، ۹۹، ۹۶، ۸۴، ۷۶	۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱
(مولانا) منصور علی خاں مراد آبادی ص ۳۶۹	۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶
منظور احمد ص ۳۰۷، ۲۸۱	۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۰
(پروفیسر) منظور الحق ص ۴۳۴	۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸
(مولانا) منفعت علی دیوبندی ص ۳۳۲	۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸
(مرزا) منور علی ہاپوڑی ص ۵۲۳، ۳۵۸	۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷
موتی لعل ص ۳۸۹، ۱۸۴	۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷
(حافظ) موسیٰ مانک پوری ص ۵۱۴	۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷
(سید) مومن علی ص ۴۳۷	۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵
مؤید الدین ص ۱۲۷	۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴
(مولانا) مہتاب علی دیوبندی ص ۱۷۷، ۳۲۷	۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴
۴۵۲	۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴
(ڈاکٹر) مہر النساء ص ۱۲۶	۳۰۶، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۹، ۳۲۰
(قاضی) میراں ص ۷۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰	۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹
میر صاحب ص ۲۳۰، ۲۲۹، ۲۲۸	
میر یوسف ص ۱۹۸	

(ن)

(شیخ) ناصر علی ص ۳۸۳، ۳۸۲

(میر) ناصر علی ص ۱۸۱

(ڈاکٹر) نثار احمد فاروقی ص ۳۶۳

نجم الدین ص ۷۲

نجم الدین چشتی سونی پتی ص ۱۹۸

(قاضی) نجم الدین خاں کاکوروی ص ۸۹، ۹۰

(نواب) نجیب الدولہ ص ۱۱۰، ۱۱۳

نجیب الدین کاندھلوی ص ۱۹۶

(حکیم) نجیب الرحمان کیرانوی ص ۳۷۰، ۳۷۱

نجیب النساء ص ۷۱، ۳۰۳، ۳۰۵

نذر محمد فاروقی ص ۹۸

(مولانا) نذیر ص ۳۹۱

(ڈپٹی) نذیر احمد دہلوی ص ۱۷۷، ۱۸۱، ۱۹۸

۲۱۰، ۳۰۸، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۵۷، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۲

۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۲۲، ۵۲۵

(مولوی) نذیر حسین دیوبندی ص ۳۰۶، ۵۰۰

(مولانا) نذیر حسین محدث ص ۲۰۶، ۲۷۹

۲۸۰، ۲۸۱

(حکیم) نصر اللہ ص ۳۲۱

(مولانا) نصر اللہ خاں خویشگی ص ۸۷، ۹۹

۵۱۶، ۵۰۳

(شیخ) نصیر الدین چراغ ص ۳۳۲

نصیر الدین سونی پتی ص ۳۰۲، ۳۰۴

(مولانا) نصیر الدین منگوری ص ۱۹۸

(حکیم) نصیر الدین نصرتی ص ۱۲۶

(مولانا) نصیر الدین نقشبندی ص ۱۱۶

(علامہ) نظام الدین سہالوی ص ۳۳۲

نظام الدین عرف عباد اللہ ص ۶۷

(مولانا) نظیر احمد ص ۳۰۵

(مولانا) نعیم دیوبندی ص ۵۰۰

(ملا) نواب رام پور ص ۲۸۷

نوازش علی ص ۱۶۹، ۵۳۵، ۵۳۸

(شیخ) نور ص ۷۲

(نواب) نور الحسن ص ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۸

(مولانا) نور الحسن کاندھلوی ص ۶۱، ۱۲۵، ۲۸۷

۲۸۸، ۲۸۹، ۳۶۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹

۴۰۰، ۴۰۱، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۸

نور الحسن راشد کاندھلوی ص ۳۶، ۳۷

۳۹، ۴۲، ۴۳، ۵۰، ۲۶۶، ۳۰۷، ۳۵۶، ۳۶۳

نور الحق ص ۱۹۸، ۲۱۵

نور الدین ص ۷۲

نور الدین قادیانی ص ۳۶۳

نور الدین قتال ص ۷۲

نور الدین محمد قرشی ص ۲۷۳

(شاہ) نور اللہ بڈھانوی ص ۱۰۶

(ماسٹر) نور محمد ص ۳۸۷

نور محمد تھانوی ص ۸۷

(میاں جیو) نور محمد جھنجھانوی ص ۸۰، ۸۲، ۱۱۶

۱۹۷، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۴

(منشی) نول کشور ص ۳۲۶

(شیخ) نہال احمد دیوبندی ص ۳۵۲

نیاز احمد کیرانوی ص ۲۳۱، ۳۳۶، ۳۷۹

(و)

(قاضی) وجدی الحسنی ص ۳۹۴، ۵۰۲

(مولانا) وجیہ الدین سہارن پوری ص ۷۹

<p style="text-align: center;">(۵)</p> <p>(مولانا سید) ہاشم علی دہلوی ص ۵۱۵، ۳۵۸          (مولانا) ہدایت احمد ص ۲۳۳          (مولانا) ہدایت علی جوپوری ص ۲۰۸</p> <p style="text-align: center;">(یے)</p> <p>(مولانا) یعقوب علی بدایونی ص ۵۲۳          یوسف بن مظہر علی دہلوی ص ۱۲۷</p>	<p>۲۵۲، ۲۰۸، ۲۷۹، ۲۶۸، ۸۷، ۸۰          وجیہ اللہ ص ۵۲۶، ۳۵۸          وحید الدین کشمیری ص ۱۱۸          (مولانا) وزیر علی بجنوری ص ۹۸          (شاہ) ولی اللہ دہلوی ص ۷۷، ۷۳، ۷۷، ۷۷          ۱۱۸، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۶، ۱۰۳، ۱۰۱، ۸۰، ۷۸          ۲۱۹، ۲۱۵، ۲۱۲، ۲۱۱، ۲۰۵، ۱۹۳، ۱۹۰، ۱۲۳، ۱۲۳          ۳۰۲، ۲۸۵، ۲۸۰، ۲۷۹، ۲۳۳، ۲۳۸، ۲۲۰          ۲۸۶، ۲۸۳، ۲۳۸، ۲۳۳، ۲۱۸، ۲۰۳، ۳۶۷          ۵۲۳، ۵۳۶، ۵۳۲، ۲۹۱، ۲۹۰، ۲۸۷          ولیم میور ص ۲۱۰          (حکیم) ولی محمد ص ۷۱</p>
--	---

## اشاریہ مقامات

۵۳۵، ۴۹۵، ۴۹۲، ۴۹۰، ۴۸۹، ۴۸۸، ۴۸۶

برناوہ ص ۴۳۳

بڑوت ص ۴۳۲، ۶۲

بسی داراپور ص ۵۰۹

بغداد ص ۳۹۱

بلندشہر ص ۵۲۴، ۱۹۶

بمبئی ص ۴۲۹، ۳۲۳

بنارس ص ۴۸۳، ۴۲۳، ۴۳۵، ۴۳۲، ۲۶۶

بنولی ص ۴۳۲

بوڑیہ ص ۳۶۳

بونڈری ص ۵۲۸

بیروت ص ۹۶

بھ

بھاؤل پور ص ۳۴۵

بھوپال ص ۴۸۶، ۳۶۵، ۳۶۴، ۱۱۱، ۷۹

۵۰۱، ۴۹۳، ۴۸۹

پ

پانی پت ص ۵۱۷، ۴۲۱، ۴۲۰، ۴۱۹، ۴۱۶

پٹنہ ص ۳۶۹، ۱۳۴، ۱۰۵، ۱۰۴، ۵۸

پشاور ص ۴۰۹

پیلی بھیت ص ۵۶۱

پھ

پھلت ص ۴۹۳، ۱۹۰، ۷۸

پھولڑہ ص ۱۹۷، ۸۱

الف

آگرہ ص ۵۰۳، ۵۰۲، ۵۱۱، ۳۹۸، ۲۵۱، ۱۳

۵۳۴، ۵۲۹، ۵۱۸

اٹاوہ ص ۴۷۹

اجمیر ص ۳۱۳، ۳۱۲، ۳۱۱، ۱۵۷، ۱۲۰، ۱۰۴

۴۲۶، ۴۲۵، ۴۲۴، ۳۳۵، ۳۳۰

اسلام آباد ص ۳۹۲، ۳۲۴، ۲۶۵، ۲۹۲

اسلام نگر ص ۸۷

اعظم پور ص ۵۰۳

اعظم گڑھ ص ۵۰۴

الہ آباد ص ۵۱۰، ۵۰۵، ۴۷۷

الور ص ۴۰۰، ۳۹۹

امیرنگر ص ۱۱۲

اویچ ص ۳۶۹

اودھ ص ۵۲۹، ۳۹۴، ۱۴۹، ۱۴۷

اورنگ آباد ص ۳۷۷

ب

بارہ بنکی ص ۳۲۱

باغپت ص ۳۶۳

بانڈہ ص ۴۲۰، ۴۱۹

بجنور ص ۵۰۴، ۵۰۳، ۴۲۱، ۴۲۰، ۱۱۳

بخارا ص ۱۰۷

بڈولی ص ۵۹

بڈھانہ ص ۵۰۳، ۳۶۹، ۷۸، ۷۷

بریلی ص ۴۸۴، ۴۸۳، ۴۸۱، ۴۲۱، ۳۱۷، ۳۱۶

،۱۳۱،۱۲۱،۱۱۹،۱۱۸،۱۰۵،۱۰۱،۹۸،۹۷،۹۶	تھ
،۱۶۸،۱۶۷،۱۵۷،۱۳۶،۱۳۵،۱۳۴،۱۳۳	تھانہ بھون ص ۵۴، ۶۶، ۷۱، ۷۷، ۸۱، ۸۲، ۸۶
،۲۱۰،۲۰۸،۲۰۷،۲۰۶،۱۹۹،۱۹۰،۱۸۶،۱۶۹	،۳۲۶،۳۲۱،۳۱۹،۲۲۵،۱۱۱،۹۵،۹۴،۸۶
،۲۳۵،۲۳۳،۲۳۰،۲۳۵،۲۳۴،۲۳۲،۲۲۱،۲۱۴	۲۰۶،۲۰۴،۲۰۱
،۲۸۵،۲۸۰،۲۷۸،۲۷۱،۲۷۰،۲۶۸،۲۶۶	تھائیر ص ۲۰۱، ۲۲۸
،۳۲۳،۳۲۰،۳۱۹،۳۱۶،۳۰۷،۳۰۴،۲۸۷	ٹ
،۳۷۹،۳۶۹،۳۶۴،۳۶۳،۳۶۰،۳۳۸	ٹونک ص ۲۰۴
،۳۹۵،۳۹۳،۳۸۹،۳۸۵،۳۸۳،۳۸۲	ج
،۴۱۶،۴۱۴،۴۱۳،۴۰۸،۴۰۴،۳۹۷،۳۹۶	جام شورو ص ۲۰۲، ۲۳۲
،۴۳۰،۴۲۹،۴۲۶،۴۲۴،۴۲۲،۴۲۱،۴۱۷	جلال آباد ص ۵۴، ۸۱، ۱۱۳، ۳۷۰، ۴۱۸، ۴۷۰
،۴۶۶،۴۶۰،۴۵۳،۴۳۷،۴۳۶،۴۳۵	۵۱۹، ۴۳۰
،۴۹۶،۴۹۵،۴۹۳،۴۸۴،۴۸۱،۴۷۱،۴۶۹	جوہڑی ص ۲۳۲
،۵۱۰،۵۰۶،۵۰۵،۵۰۴،۵۰۳،۵۰۱،۴۹۹	جہان آباد ص ۶۵
،۵۲۹،۵۲۵،۵۲۴،۵۱۶،۵۱۴،۵۱۳،۵۱۱	چ
،۵۲۵،۵۲۹،۵۲۸،۵۲۵،۵۲۴،۵۲۳	چکوال ص ۲۳۵
،۲۸۵،۷۷،۵۳،۵۰،۴۹،۴۸	چھ
،۳۳۸،۳۳۱،۳۲۶،۳۲۵،۳۲۴،۳۲۳،۳۱۷	چھنچھانہ ص ۵۹، ۷۲، ۸۲
،۴۵۲،۴۴۷،۴۴۱،۴۴۰،۳۵۱،۳۵۰،۳۴۹	چھڑی ص ۵۰۶
،۵۳۲،۴۹۹،۴۹۸،۴۹۶،۴۹۵،۴۹۴،۴۸۹	چ
	حیدرآباد ص ۲۸۷، ۴۰۵، ۵۰۵
ر	خ
راجستھان ص ۷۹، ۱۱۱	خانیور ص ۱۹۶
رام پور ص ۱۰۴، ۲۵۰، ۳۱۸، ۴۲۱، ۵۰۴	د
رام پور منہیاران ص ۵۴، ۸۱، ۸۳، ۸۶، ۳۶۸	دہلی ص ۴۲، ۵۳، ۵۵، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۹۳، ۹۵
،۴۶۸،۸۶،۸۳،۸۱،۵۴	
،۵۰۰،۴۳۴،۴۳۳،۴۳۲،۴۲۹،۴۰۴	
رژکی ص ۳۰۴، ۳۲۴، ۳۲۴، ۴۷۵، ۴۸۰	
روہنگ ص ۵۳۴، ۵۳۵	
ریٹر ص ۵۰۴	

س

سرسل ص ۲۳۲

سندھ ص ۳۹۹

سونی پت ص ۵۲۹

سہارنپور ص ۵۱، ۵۳، ۵۵، ۵۶، ۵۹، ۷۵،

۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۱۱۱، ۱۹۳، ۱۹۹، ۲۰۴،

۳۰۴، ۳۹۸، ۳۶۸، ۳۶۳، ۳۰۵، ۳۰۴

۴۰۷، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۲، ۴۱۵، ۴۲۹، ۴۳۲،

۴۴۰، ۴۴۲

ش

شاہ جہاں آباد ص ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۸، ۲۲۸، ۲۸۲، ۳۰۴،

۵۵۶، ۵۴۳

شاہ پور ص ۳۶۹

شاہ جہاں پور ص ۴۷۲

شکار پور ص ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۵، ۳۸۱، ۳۸۳،

۳۹۳، ۳۹۵

شمس آباد ص ۱۱۷

شیخوپور ص ۲۹۱

ع

علی گڑھ ص ۱۰۴، ۱۰۵، ۳۲۷، ۳۶۰، ۳۶۸،

۵۲۱، ۵۳۲، ۵۲۱

غ

غازی پور ص ۶۷

غوث گڑھ ص ۱۱۰، ۱۱۳

ف

فرخ آباد ص ۱۱۷

فتح پور سیکری ص ۵۳۲

ق

قاہرہ ص ۲۴۴

قصارہ ص ۶۷

ک

کاندھلہ ص ۷۷، ۸۲، ۸۶، ۸۹، ۱۰۹، ۱۱۳، ۱۱۹،

۳۹۹، ۴۰۱

کانپور ص ۵۰۵، ۵۱۳

کتانہ ص ۶۲، ۶۳

کرسالی ص ۲۳۵

کراچی ص ۵۸، ۲۲۳

کڑہ مانک پور ص ۶۷

کشمیر ص ۲۳۰

کلکتہ ص ۱۲۲، ۱۲۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳،

۱۵۴، ۲۶۱، ۲۶۳، ۲۷۱، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۹۱،

۴۰۹، ۴۱۰، ۴۲۳، ۴۲۵، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۷،

کوٹہ ص ۱۱۱

کول ص ۲۰۴

کویت ص ۳۹۰

کیرانہ ص ۵۲، ۵۹، ۶۱، ۷۷، ۷۸، ۳۷۹،

گ

گڈھ مکٹیسر ص ۸۰

گلاؤٹھی ص ۲۷۶

گنگوہ ص ۶۱، ۷۷، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۷،

۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۹، ۲۵۱

گورکھپور ص ۵۰۵

<p>منگلور ص ۵۰۷</p> <p>میرٹھ ص ۳۱۶، ۳۱۱، ۲۲۹، ۱۹۳، ۶۲، ۵۵</p> <p>۳۳۲، ۳۰۹، ۳۰۴، ۳۶۳، ۳۳۶، ۳۲۳، ۳۱۷</p> <p>۳۶۶، ۳۶۶</p> <p>مین پوری ص ۶۲</p> <p>(ن)</p> <p>نانوتہ ص ۶۲، ۵۹، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۱</p> <p>۷۳، ۶۳، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰</p> <p>۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰</p> <p>۲۹۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۱۹، ۳۵۰، ۳۵۱</p> <p>۳۵۲، ۳۲۹، ۳۵۱، ۳۶۰، ۳۸۱، ۳۸۶، ۳۸۸</p> <p>۳۸۹، ۳۹۲</p> <p>نجیب آباد ص ۱۱۳</p> <p>نکوڑ ص ۳۹۸، ۳۳۷</p> <p>نگینہ ص ۳۲۱، ۵۰۴</p> <p>نیانگر ص ۳۳۶</p> <p>(د)</p> <p>ہاپوڑ ص ۵۲۳</p> <p>ہنگلی ص ۵۰۳</p>	<p>(ل)</p> <p>لاہور ص ۲۳۴، ۲۳۵</p> <p>لاٹل پور ص ۲۳۷</p> <p>لکھنؤ ص ۱۲۹، ۱۲۱، ۱۲۰، ۷۹، ۵۵، ۴۶</p> <p>۱۸۶، ۲۸۲، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۸۴، ۳۹۳</p> <p>۳۲۳، ۳۸۱، ۳۸۴، ۵۲۸، ۵۲۹</p> <p>لوہاری ص ۱۱۲، ۸۲</p> <p>(م)</p> <p>مالیرکوٹلا ص ۳۹۹</p> <p>ماوراءالنہر ص ۱۰۷</p> <p>مدینہ منورہ ص ۵۱۰</p> <p>مرادآباد ص ۴۲۱، ۴۲۲، ۵۱۰</p> <p>مصر ص ۱۰۷</p> <p>مظفرنگر ص ۱۹۳، ۱۱۱، ۱۰۹، ۹۴، ۵۹، ۵۵، ۵۳</p> <p>۱۹۹، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۵، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۹۳</p> <p>۳۱۸، ۳۳۰، ۳۷۶، ۵۰۱، ۵۰۳، ۵۰۴</p> <p>مکہ معظمہ ص ۳۲۱، ۳۳۴، ۳۳۸، ۳۶۸، ۳۲۱</p> <p>۳۲۲، ۳۰۸، ۳۱۰، ۳۶۴، ۳۶۶، ۳۷۹، ۳۹۳</p> <p>۵۱۰، ۵۰۱</p>
--	---

## اشاریہ کتابیات

<p>احیاء العلوم ص ۳۱۷، ۳۳۴، ۳۳۷، ۳۱۱، ۳۲۳، ۲۸۵</p> <p>اخبارات و دستاویزات ۱۸۵ء ص ۲۱۷</p> <p>اخبار الاخیار ص ۶۵</p> <p>اختر شہنشاہی ص ۲۸۸</p> <p>ادعیۃ القرآن ص ۵۰۸</p> <p>اذکار ابرار ص ۵۷</p> <p>اردو ترجمہ امداد السلوک ص ۳۳۳</p> <p>ارشاد محمدی ص ۳۰۵</p> <p>ارواح ثلاثہ ص ۹۸، ۱۱۷، ۲۵۰، ۳۵۱</p> <p>ازالیۃ الخفاء ص ۳۶۷، ۲۸۶</p> <p>ازالیۃ الاویام ص ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸</p> <p>۲۸۹، ۲۹۰</p> <p>اسرار الصلوٰۃ ص ۲۸۵</p> <p>اسرار قرآنی ص ۴۷۸</p> <p>اسرار یہ ص ۶۰</p> <p>اعانة الموحدين و اہانۃ الملحدين ص ۱۲۳</p> <p>اعمال الماثورة فی الايام المشہورة</p> <p>ترجمہ ما ثبت بالنسہ ص ۳۷۸، ۳۸۳، ۳۸۴</p> <p>اغصان اربعہ ص ۳۳۲</p> <p>افادات سنن نسائی ص ۲۰۲</p> <p>افضل البضاعة فی حقیقۃ الشفاعة ص ۲۸۱، ۲۰۵</p> <p>اقلیدس ص ۱۶۶، ۱۷۶، ۱۸۱، ۲۳۷، ۲۳۷، ۲۳۷</p> <p>۲۳۹، ۲۵۱، ۵۵۵</p>	<p>قرآن مجید</p> <p>ص ۲۸۲، ۶۸، ۳۰۷، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۹۶، ۳۹۷، ۴۰۷، ۴۰۹، ۴۱۶، ۴۲۰، ۴۵۳، ۴۹۹</p> <p>۵۰۶</p>
<p>(الف)</p> <p>آب حیات ص ۴۷۹</p> <p>آپ بیتی خودنوشت ظل حسین ص ۵۵</p> <p>آپ بیتی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب ص ۱۷۲</p> <p>آثار الصنادید ص ۹۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۶، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۵۵، ۱۶۹، ۱۹۸، ۲۳۲، ۳۰۰، ۵۳۳</p> <p>۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۵۶</p> <p>آداب الطالبین (قلمی) ص ۳۰۶</p> <p>آئین اکبری ص ۵۳</p> <p>آئین قیصری ص ۵۱۱</p> <p>ابطال الطغوی فی تحقیق الفتوی ص ۲۰۷</p> <p>ابطال جزء لا یتجزی ص ۴۷۸</p> <p>ابن الوقت (ڈپٹی نذیر احمد) ص ۲۱۱</p> <p>ابن الوقت (ایامی) ص ۵۰۹</p> <p>اجوبہ اربعین ص ۴۷۸</p> <p>احسن الاخبار ص ۲۸۸</p> <p>احکام الجمعہ ص ۴۷۸</p> <p>احکام العیدین ص ۲۳۲، ۲۳۳</p> <p>احوال علمائے فرنگی محل ص ۳۳۲</p>	<p>۵۸۴</p>



<p>الفہرست ص ۳۹۲          القول الفاعل بین الحق والباطل ص ۲۸۲          اللکوب الدرہ ص ۲۲۵          المختار فی الاخبار والآثار ص ۲۲۶، ۲۲۵          المکاتیب ص ۲۲۳، ۱۲۵          الهدیۃ السنیۃ فی ذکر المدرسۃ          دیوبندیۃ ص ۵۲۷، ۲۹۷          امتناع النظیر ص ۲۰۸          امداد المشتاق ص ۱۱۶، ۱۱۵          امہات الامہ ص ۵۰۸          امیر الروایات ص ۲۱۵، ۹۹          انتباہ المدرسین ص ۵۲۲          انتباہ المؤمنین ص ۲۷۸          انتخاب احادیث استبصار ص ۲۰۰          انصار الاسلام ص ۲۷۸          انسان العیون فی سیرۃ النبی الامین          المامون ص ۲۷۱          انشاء اردو ص ۵۱۰          انشاء فیض رحمانی ص ۵۲۱          انوار العاشقین ص ۵۰۰، ۲۹۹، ۲۳۲          انوار انوری ص ۲۲۷          انوار قاسمی ص ۲۶۲، ۲۲۸، ۷۵          انوار محمدی ص ۲۰۵، ۳۰۲، ۱۹۸، ۱۹۵، ۱۹۲          اوثق العری فی تحقیق الجمعۃ فی          القرنی ص ۲۲۲          ایضاح لطافۃ المقال ص ۱۲۲          ایک نادر مجموعہ مکاتیب ص ۱۰۳، ۹۵، ۷۶          ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲</p>	<p>الاتقان فی علوم القرآن ص ۲۵۶          الاجتہاد ص ۵۰۸          الاجوبۃ الكاملۃ فی الاسولۃ الخاملۃ          ص ۲۷۸          الارشاد علی بانہ سعاد ص ۲۹۷          الازدیاد السنی علی الیانع الجنی          ص ۱۰۳          الاعراف الجلی ص ۱۰۳          الاعلام ص ۲۷۱، ۲۳۳، ۹۶          الانصاف ص ۲۸۶          التعليقات علی السبع المعلقات          ص ۲۹۷          التہمید ص ۵۳۲، ۴۹۳، ۱۰۲          الجبرا ص ۳۹۶، ۱۶۶          الجبر او علم مثلث تحلیلی مستوی ص ۱۶۱          الحقوق والقراض ص ۵۰۸          (مجلہ) الدراسات الاسلامیہ (اسلام آباد شمارہ          ۲، ۲۰۰۰ء) ص ۳۲۲          الدلیل القوی علی قراءۃ المقتدی          ص ۲۱۲          الدلیل المحکم علی قراءۃ الفاتحۃ للمؤتم          ص ۲۷۸          الرائی النجیح فی عدد رکعات          التراویح ص ۲۲۲          الرحلۃ الحجازیہ ص ۲۶۸          الشمس اللامعۃ فی کراہۃ جماعۃ          الثانیۃ ص ۲۲۲          الفاظ الادویہ ص ۲۷۳</p>
---	---

(ت)

تاریخ الادب العربی ص ۲۳۶، ۲۳۳  
 تاریخ انگلستان ص ۵۱۱  
 تاریخ ابوالفداء ص ۵۱۹، ۱۶۲  
 تاریخ ادب اردو ص ۵۱۱  
 تاریخ تھانہ بھون (قلمی) ص ۸۲، ۱۹۶، ۲۰۶  
 تاریخ حلبی ص ۲۷۱  
 تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۳۹۷، ۳۹۸  
 تاریخ دربار تاج پوشی کے تراجم ص ۵۰۹  
 تاریخ دیوبند ص ۳۹۷، ۳۹۸  
 تاریخ ریاست الور ص ۴۰۰  
 تاریخ سہارنپور ص ۵۲  
 تاریخ شعرائے عرب ص ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۳۵  
 تاریخ صحافت اردو ص ۲۷۳  
 تاریخ قادریہ ص ۲۷۹  
 تاریخ قضاة و مفتیان بھوپال ص ۳۹۴، ۵۰۲  
 تاریخ محمدی ص ۱۱۸  
 تاریخ مسعودی ص ۱۶۷، ۱۸۱  
 تاریخ والتعلیم میجر باسو ص ۱۳۲، ۱۳۹  
 تاریخ ہند ص ۱۶۶، ۳۹۶  
 تاریخ یمینی ص ۱۶۱، ۱۶۷، ۱۸۱، ۲۳۳  
 ۲۳۳، ۳۲۷، ۵۲۲، ۵۲۸، ۵۲۹  
 تالیفات شریفی یا علاج الامراض ص ۱۸۶  
 تبرکات ص ۳۶۶  
 تبصیر الرحمن ص ۳۶۷  
 تبعید الشیطان بہ تقریب اغتہ اللہان  
 ص ۲۸۵  
 تحذیر الناس ص ۲۷۸، ۲۸۴

۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۹، ۱۶۴، ۱۸۷، ۲۳۰، ۲۳۳، ۲۳۴،  
 ۲۳۶، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۹۱،  
 ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۷، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۹۵، ۴۲۵،  
 ۴۲۶، ۵۱۷، ۵۲۳، ۵۲۷، ۵۲۸

(ب)

بائبل ص ۲۷۲  
 بخاری شریف ص ۷۹، ۸۰، ۲۳۹، ۲۶۷  
 ۳۰۹، ۳۱۱، ۳۲۷، ۳۳۲، ۳۳۵، ۳۹۷  
 ۳۹۸، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۲۲، ۴۲۵،  
 ۴۵۶، ۴۶۶، ۴۶۹، ۴۸۴، ۴۹۶، ۵۱۹  
 بروقی لامعہ ص ۲۸۶  
 بستان المحدثین ص ۴۲۶  
 بغیة الوعاة فی طبقات اللغویین والنحاة  
 ص ۹۶  
 بنات العیش ص ۵۰۹  
 بہار عجم ص ۱۸۶  
 بیاض حضرت مولانا احمد علی (قلمی) ص ۲۳۳  
 بیاض خیر آبادی (قلمی) ص ۱۳۰  
 بیاض دل کشا ص ۸۷، ۲۰۲  
 بیاض عملیات (بیاض محمدی) ص ۳۰۶  
 بیاض مولانا ابوالحسن (قلمی) ص ۱۱۴، ۲۹۱  
 بیاض یعقوبی ص ۵۹، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۳۱۰،  
 ۳۲۰، ۳۵۲، ۳۵۷  
 بیافرینکل ہسٹری ص ۳۹۲  
 بیضاوی شریف ص ۳۲۷  
 پندنامہ عطار ص ۲۲۹

(پ)

تذکرہ مولانا احمد علی ص ۲۶۹	تحفہ اشاعشریہ ص ۱۲۳
تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۳۵، ۳۷،	تحفۃ الحدائق ص ۱۸۲
۳۸۲، ۳۲۳، ۳۲۸، ۳۳۵، ۳۳۳، ۱۳۳، ۷۶، ۷۱	تحفۃ المحسنین ص ۲۲۰
۳۹۲، ۳۸۸، ۳۸۴	تحفۃ الیمن ص ۱۲۵
تذکرہ مولانا محمد مظہر نانوتوی ص ۳۲۳، ۳۲۹	تحفہ صادقہ ص ۸۸
تذکیر الاخوان ص ۱۲۰	تحفہ لحمیہ ص ۴۷۸
ترجمہ اردو تحریر اقلیدس ص ۲۳۷، ۲۳۷، ۲۳۸،	تحفہ نذریہ ص ۲۲۰
۲۳۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۹۶	تحقیق وحدة الوجود والشہود
ترجمہ اردو سنن ترمذی ص ۲۳۷	مع حالات شیخ محمد تھانوی ص ۲۰۱
ترجمہ تذکرۃ الحکماء ص ۳۷۷، ۳۹۰،	تذکرہ اسلاف ص ۲۳۰
۳۹۱	تذکرۃ الحافظ ص ۵۰۰
ترجمہ تذکرۃ الفقہاء ص ۳۹۰	تذکرۃ الخلیل ص ۲۸۰، ۲۹۹
ترجمہ تذکرۃ المفسرین ص ۳۷۷،	تذکرۃ الرشید (جلد اول) ص ۹۳، ۱۱۵،
۳۸۷، ۳۹۰، ۳۹۱	۱۷۰، ۲۳۲، ۲۳۶، ۲۸۳، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۵،
ترجمہ تزک تیموری ص ۳۸۷، ۳۸۸	۲۶۲، ۲۳۷
ترجمہ تواریخ ہند ص ۳۸۷، ۳۸۸	تذکرۃ الرشید (جلد دوم) ص ۲۲۲، ۲۳۵
ترجمہ رسالہ فقہ شافعی ص ۳۸۱	تذکرۃ الصالحین ص ۶۳
ترجمہ فلاح دارین ص ۳۸۲	تذکرۃ العابدین ص ۳۰۶، ۳۳۳، ۵۰۰،
ترجمہ وفيات الاعیان ص ۳۸۷	تذکرۃ العلماء ص ۳۸۷
تسہیل البیان ص ۳۹۶	تذکرہ حاجی امداد اللہ ص ۹۳
تسہیل الحساب ص ۳۹۶، ۳۹۷	تذکرہ رحمانیہ ص ۱۱۲، ۱۱۵، ۱۷۰، ۱۷۲، ۱۷۵،
تسہیل الدراسة فی شرح دیوان	۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱
الحماسۃ ص ۳۹۶	تذکرہ روز روشن ص ۳۶۸
تصحیح سنن ترمذی ص ۲۳۷، ۲۳۲	تذکرہ سرسید ص ۵۳۱
تصحیح و حواشی تاریخ یمنی ص ۲۳۷، ۲۳۳	تذکرہ علمائے پنجاب ص ۲۳۵
تصفیۃ الفواد من الکفر والارتداد	تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۲۳۲
ص ۴۰۶	تذکرہ غوثیہ ص ۱۱۷، ۲۲۰
تطیب الاخوان بذکر علماء الزمان ص ۳۹۴	تذکرہ فردوسیہ ص ۶۰

تعارفی کتابچہ براحوال مولانا مفتی عزیز الرحمان  
ص ۳۹۹

تجزیرات ہند ص ۵۰۹، ۵۰۵

تغلیب المطاعن ص ۲۸۶

تفسیر جلالین ص ۲۳۳، ۳۲۷، ۳۱۱، ۲۵۶

تفسیر عزیز ص ۱۸۶

تصانیف احمدیہ ص ۵۳۵

تصفیۃ العقائد ص ۳۷۸

تفضیل الاصحاب ص ۱۲۲

تقویۃ الایمان ص ۹۹، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸

۲۸۱

تقویۃ الایمان اور اسکے خلاف برپا شورش تاریخ

وحقیقت کے آئینے میں ص ۲۰۸، ۱۲۰

تلانذہ غالب ص ۵۲۲

تلخیص الصحاح ص ۱۲۸

توبۃ النصوح ص ۵۰۹

توضیح المرام ص ۵۱۶

توضیح مرکبات ص ۱۶۲

توضیح و تلویح ص ۳۲۷، ۵۱۵

تہذیب الایمان ص ۲۸۶

تیسیر الوصول الی جامع الوصول

ص ۵۰۶، ۱۲۸

ج

جامع التواریخ ص ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۵۲۲، ۵۲۹

جامع صغیر ص ۳۱۱

جزئیات رسالہ ہیئت ص ۱۶۳

جزئیات و کلیات ص ۵۲۲، ۵۲۹

جغرافیہ جہاں ص ۵۲۲

جغرافیہ ضلع سہارنپور ص ۵۲، ۵۳، ۶۰، ۶۲،  
۳۹۸

جغرافیہ ص ۱۶۶، ۲۹۶

جماعت مجاہدین ص ۸۱

جمال قاسمی ص ۳۵۹، ۳۷۹

جمیل الکلام ص ۳۲۱، ۳۲۲

جوہات اسولہ غیر مقلدین ص ۲۲۰

جواب نزہۃ اثنا عشریہ ص ۱۲۲

چ

چند پند سود مند ص ۵۰۹

ح

حاشیہ دیوان متنہی ص ۲۰۰

حاشیہ سنن نسائی ص ۲۰۶

حاشیہ شرح عقاید ص ۲۰۶

حاشیہ ہدایہ اولین ص ۲۰۰

(تذکرہ یا) حالات طیب مولانا محمد قاسم ص ۸۵،

۹۸، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۷۲، ۱۷۳، ۲۰۵، ۲۲۲، ۳۰۲،

۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۵، ۳۷۱، ۳۷۲

حالات محمدیہ (نثر) ص ۲۰۵، ۲۰۶

حالات مشائخ کاندھلہ ص ۲۶۵

حالات مفتی الہی بخش کاندھلوی (قلمی) ص ۲۰۷

حجۃ اللہ البالغہ ص ۳۶۷، ۳۸۶

حدائق البلاغہ ص ۱۲۷

حزب البحر ص ۲۳۳، ۵۰۰

حسام الاسلام ص ۱۲۲

حسامی ص ۵۱۵

حصن حصین ص ۸۱، ۲۸۷

دیوان متنبتی ص ۱۶۱، ۳۲۷، ۳۹۶، ۵۲۲  
دیوان مؤمن ص ۲۳۳

ڈ

ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی  
ص ۵۲۲

ڈپٹی نذیر احمد کے لکچروں کا مجموعہ ص ۲۱۰

ذ

ذاتی ڈائری ص ۲۲۰

ر

رجسٹرانسب صدیقیان نانوتہ ص ۸۰

رد الاشراک ص ۲۰۶

رد الطغیان فی اوقاف القرآن ص ۴۴۴

رد صوارم الہیات ص ۱۲۲

رسالہ اصول محصول ص ۵۲۲

رسالہ تذکرات دتاسی ص ۳۷۷، ۳۹۰

رسالہ تعدد جمعہ ص ۴۲۱

رسالہ جبر و مقابلہ ص ۵۲۲

رسالہ فرائض (میراث) ص ۴۰۰

رسالہ فضائل رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

ص ۴۲۱

رسالہ فضائل صیام ص ۴۲۱

رسالہ قراءت ضاد مجہ ص ۴۲۱

رسالہ گل ولالہ یعنی تنقیہ الاعتقاد ص ۴۰۵

رسالہ مناظرۃ الادیان ص ۱۲۵

رسالہ نکاح ثانی ص ۲۸۰

رسالہ وحدۃ الوجود والشہود ص ۴۰۵

رسالہ ہیئت ص ۵۲۲، ۵۲۹

حق الصریح فی اثبات التراویح ص ۴۷۸

حق المبین ص ۱۲۲

حماسہ ص ۱۶۱، ۱۶۷، ۲۵۱، ۲۵۲

حمایت الاسلام ص ۴۸۵

حیات النذیر ص ۵۱۶، ۵۰۴

حیات جاوید ص ۵۲۰، ۵۳۳، ۵۳۵، ۵۴۱

حیات خلیل ص ۱۰۳

حیات شاہ محمد اسحاق ص ۲۳۴

حیات شیخ الہند ص ۴۹۹

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۳۸۴،

۵۱۳

خ

خزینۃ الاسرار ترجمہ مجالس الابرار ص ۳۷۸،

۳۸۱، ۳۸۰

ختم خانہ جاوید ص ۳۷۹

خیر متین ص ۳۷۱، ۳۸۷

د

در مختار ص ۱۶۱، ۱۶۴، ۳۱۱، ۳۸۵

دلائل الاذکار ص ۱۱۶، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۵، ۵۱۵

دلائل الخیرات ص ۴۳۴

دلیل مخطوطات السیوطی و اماکن

وجودہا ص ۳۹۰، ۳۹۱

دمیۃ القصر ص ۲۹۴

دہلی اور اس کے اطراف ص ۱۲۸، ۴۴۹

دہلی کی آخری شمع ص ۷۴، ۷۵، ۲۱۱، ۲۲۷، ۲۲۸

دیوان ابن الفارض ص ۲۲۵

دیوان حماسہ ص ۱۶۴، ۳۹۶، ۵۲۸، ۵۲۹

سر سید احمد خاں ص ۵۴۲  
 سر سید احمد اور ان کا عہد ص ۵۴۲  
 سر سید احمد اور علوم اسلامیہ ص ۵۴۲  
 سر سید احمد، ایم اے او کالج اور دینی مشرقی علوم  
 ص ۵۴۲  
 سر سید احمد کی تعزیتی تحریریں ص ۱۲۸  
 سر سید احمد خاں فکر اسلامی کی تعبیر نو ص ۵۴۱  
 سر سید کا سفر نامہ پنجاب ص ۵۳۴  
 سفینہ رحمانی ص ۵۲۱  
 سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۶۵  
 سلسلۃ الزبرجد فی اسناد الشیخ  
 حسین احمد ص ۲۰۳، ۲۰۲  
 سلک مروارید ص ۲۸۵  
 سلك التنقیح فی اثبات جواز  
 التسبیح ص ۴۰۵  
 سلم العلوم ص ۲۳۶  
 سنن ابن ماجہ ص ۳۲۷  
 سنن ابی داؤد ص ۳۲۷، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۵۵  
 سنن ترمذی ص ۱۸۱، ۱۸۶، ۲۳۸، ۲۳۹،  
 ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۶۷، ۳۲۷، ۳۷۱،  
 ۳۷۸، ۳۷۹، ۴۰۸، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۵۶  
 سنن نسائی ص ۴۰۳، ۴۱۱، ۴۵۵  
 سوانح عمری مولوی سمیع اللہ دہلوی ص ۵۰۳،  
 ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳  
 سوانح قاسمی جلد اول ص ۵۲، ۷۰، ۷۶، ۸۴،  
 ۹۶، ۱۰۰، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۵۷، ۲۶۸  
 سہ ماہی احوال و آثار کاندھلہ (اشاعت خاص  
 مولانا انعام الحسن نمبر) ص ۳۹۶، ۴۰۰

رسالہ یک روزی ص ۲۰۷  
 رسم الخط ص ۵۰۹  
 رسوم دہلی ص ۵۱۰  
 رشید المومنین ص ۱۲۰  
 رفع الغواشی عن وجوه الترجمة  
 والحواشی ص ۵۰۷  
 رموز الاطباء ص ۵۲۴  
 روایات الطیب ص ۹۸  
 روداد مدرسہ عربیہ دارالعلوم دیوبند ص ۲۲۳،  
 ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۵۱، ۳۱۲  
 روداد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور ص ۴۱۱، ۴۲۷  
 رویائے صادقہ ص ۵۰۹  
 رہنمائے ضابطہ دیوانی ص ۱۶۱  
 ریحانۃ الالباء و زهرة الحیوة الدنیا  
 ص ۲۹۶

ز

زبدۃ المناسک ص ۴۴۴  
 زواید ثلاثہ ص ۴۵۳

س

ساقی نامہ ۵۲۱  
 سائنس ص ۱۶۱  
 سبیل الرشاد ص ۴۴۴  
 سخن شعرائے نساخ ص ۳۷۹  
 سراج المعرفت (قلمی) ص ۲۷۰  
 سراج النسب ص ۴۰۷  
 سراج السالکین ص ۳۳۸، ۳۹۵  
 سراجی ص ۳۲۷

سیر المنازل ص ۱۳۵، ۹۷

سیرت سید احمد شہید ص ۸۱، ۸۰

سیرت یعقوب و مملوک ص ۷۵، ۴۵

(ش)

شافیہ ص ۳۹۶

شاہنامہ ص ۲۵۲، ۹۸، ۸۵

شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۲۱۴،

۵۳۲، ۲۱۸

شجرہ فاروقیان تھانہ بھون (قلمی) ص ۱۷

شجرہ فیض علم و کمال ص ۸۳

شرح المعلقات السبع للزوزنی ص ۹۵

شرح ابوالبقاء ص ۲۹۵

شرح تشریح الافلاک ص ۱۲۵

شرح تہذیب یزدی ص ۴۲۱

شرح حزب البحر ص ۴۰۵

شرح رسالہ بہاء الدین (قلمی) ص ۹۱

شرح زوزنی (قلمی) ص ۹۵

شرح ضابطہ ص ۴۲۱

شرح عصمت اللہ ص ۱۲۵

شرح عقاید ص ۳۲۷

شرح ملا ص ۴۱۱

شرح نووی ص ۴۱۲

شرح وقایہ ص ۱۶۶، ۱۶۱

شفاء ص ۴۸۷

شامل ترمذی ص ۴۱۱

شائم امدادیہ ص ۳۱۰، ۳۰۴، ۱۱۶، ۸۲، ۸۱

شائم مشام افروز (مکتوبات فارسی) ص ۵۲۰

شش بازغہ ص ۲۵۳، ۱۶۷، ۱۶۰

شوکت عمریہ ص ۱۲۴

(ص)

صدرا ص ۴۵۳

صرف صغیر ص ۵۰۹

صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات ص ۱۸۴، ۱۶۸،

۲۴۹، ۱۸۵

صولت ضیغم ص ۱۲۵، ۱۰۴

صولت غنفریہ ص ۲۸۴، ۱۲۴، ۱۰۵، ۱۰۴

(ض)

ضمیمہ امداد المشتاق ص ۲۶۹، ۲۶۵، ۹۴، ۸۲،

۴۱۵، ۴۰۸، ۲۹۰

ضیاء القلوب ص ۳۳۹، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۴،

۴۴۹

(ط)

طبقات شعرائے ہند ص ۱۳۵، ۱۲۴، ۷۴،

۵۱۷، ۳۷۶، ۳۷۰، ۳۵۴، ۲۴۷، ۱۸۰، ۱۶۸

۵۵۵، ۵۴۵، ۵۴۳

(رسالہ) طہر متخلل ص ۴۳۰

طیف الخیال ص ۹۰

(ع)

عجائبات محنت شعاری ص ۵۲۲

عروس المؤمنین ص ۲۸۱، ۲۰۵

عزۃ الراشدین ص ۱۲۴

عطر الوردہ ص ۴۹۷

عقد الجید فی الاجتہاد والتقلید ص ۴۸۵

عقیدہ توحید و مسئلہ تقدیر ص ۳۷۱، ۳۷۰

علم جغرافیہ (شیام لال) ص ۵۲۲

علم مثلث ص ۱۶۱، ۱۶۲

علم مناظرہ فلپ ص ۱۶۱، ۱۶۲

علم و عمل ص ۱۰۲، ۱۲۱، ۱۹۸، ۲۰۱

علم ہندسہ تحلیلی ص ۱۶۲

علم ہیئت ص ۱۶۱، ۱۶۲

عمر ایگان ص ۹۸

(غ)

(مجلد) غالب نامہ جنوری ۱۹۸۳ء ص ۲۰۰

غایۃ الاختصار ص ۳۸۱

غایۃ الاوطار ص ۲۸۵

(ف)

فتاویٰ عزیز ص ۲۰۹، ۲۸۷

فتاویٰ میلاد ص ۲۲۲

فتاویٰ نذیریہ ص ۲۸۱

فتح الباری ص ۳۶۷

فتویٰ احتیاط الظہر ص ۲۲۲

فرائد الدھر ص ۲۰۷، ۱۲۵، ۱۲۶، ۲۲۲، ۲۳۷

۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۸۵، ۲۹۲، ۲۹۶

۳۲۵، ۳۵۵، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۲، ۵۲۷

فرائد قاسمیہ ص ۲۷۹

فرائض ص ۳۲۷

فرہنگ آصفیہ ص ۲۷۷

(علامہ) فضل حق خیر آبادی حیاتہ و آثارہ مع

تحقیق کتاب الثورة الہندیہ ص ۱۲۶

فقہ اکبر ص ۸۱

فوائد الناظرین (اخبار) ص ۱۸۲، ۱۸۵

فہرست ذخیرہ شیفٹہ کلکشن علی گڑھ ص ۱۰۲، ۱۰۵

فہرست مخطوطات فارسی رضا لائبریری ص ۱۰۴

فہرست مخطوطات اردو (رضالا لبریری راپور)

ص ۱۲۰

فہرست مجتہائی دہلی ص ۳۸۴

فیوض رحمانی ص ۲۲۰

فیوض قاسمیہ ص ۲۷۹

(ق)

قانون شہادت ص ۵۰۹

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی

، احوال و آثار، باقیات و متعلقات ص ۲۲۴،

۲۳۵، ۳۰۷، ۳۰۹، ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۱۷، ۳۲۵،

۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۶۲، ۲۶۹، ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۸،

قدیم دہلی کالج ص ۹۷، ۱۳۴، ۱۸۱، ۲۳۲،

۲۳۳، ۲۸۹، ۳۹۲

قدوری ص ۱۶۷، ۳۱۱

قران السعدین (اخبار) ص ۱۶۸، ۱۷۸،

۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۵۲۲

قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین

ص ۲۸۷، ۲۸۷

قسطاس فی موازنۃ اثر ابن عباس

ص ۲۰۵

قصص الاکابر ص ۱۵۶، ۲۲۵

قصیدہ بانٹ سعاد ص ۲۹۷

قصیدہ بردہ ص ۲۹۷

قطوف دانیدر کراہت جماعت ثانیہ ص ۲۲۲

قلائد العقیان للفتح بن خاقان

ص ۲۹۵

قومی تہذیب کا مسئلہ ص ۱۳۹



م

ماثر صدیقی یاسیرت والا جاہی ص ۳۶۳،  
 ۳۶۸، ۳۶۶، ۳۶۵، ۳۶۴  
 ماثبت بالنسۃ ص ۳۸۴، ۳۸۳، ۳۷۸  
 مائة مسائل ص ۴۰۰  
 ماسٹر رام چندر ص ۱۳۰، ۱۳۸، ۱۳۵، ۱۳۲، ۹۷  
 ما یغنیك فی الصرف ص ۵۰۹  
 مبادی الحکمت ص ۵۰۹  
 مبتلاء ص ۵۰۹  
 مثنوی بحر الحقیقت ص ۲۹۰  
 مثنوی جنگ عشق ص ۵۲۱  
 مثنوی دفتر ہفتم ص ۴۰۵  
 مثنوی شریف ص ۲۹۰، ۱۱۷، ۱۱۲، ۸۲  
 مثنوی فروغ ص ۳۳۰  
 مجمع البحار ص ۲۲۲  
 مجموعۃ الاسانید الحدیث ص ۳۱۲  
 مجموعۃ الاسانید العالیہ ص ۴۵۶، ۴۵۵  
 مجموعۃ المکاتیب ص ۱۲۵  
 مجموعۃ مکتوبات حضرت سید احمد شہید ص ۱۹۹، ۱۹۴  
 مجموعۃ مکتوبات بنام حاجی امداد اللہ (قلسی) ص ۳۲۲  
 محاورات ہند ص ۳۹۴، ۳۹۳، ۳۹۲، ۳۷۵  
 محبت ہند رسالہ ص ۱۸۵، ۱۸۲  
 محصنات ص ۵۰۹  
 محمود نامہ ص ۵۲۱  
 محو الفساد فی تلفظ الضاد ص ۴۲۰  
 مختصر المعانی ص ۴۲۲، ۴۱۷  
 مذاق العارفین ص ۲۸۵  
 مرآة الحرمین ص ۲۶۸

ک

کاروان ایمان و عزیمت ص ۸۱  
 کاملان رام پور ص ۵۰۳، ۴۲۱  
 کتاب الاغانی ص ۲۷۳  
 کتاب المختار فی الاخبار والآثار  
 ص ۲۳۵، ۲۳۷  
 کتابیات تراجم ص ۳۹۲  
 کشاف اصطلاحات الفنون ص ۲۶۵، ۲۶۴  
 ۲۸۶، ۲۹۱  
 کشتی نصیحت ص ۴۲۹  
 کشف الاستار عن رجال معانی الآثار  
 ص ۱۰۳  
 کشف الحجاب ص ۴۲۰  
 کشف الظنون ص ۳۹۱ (حاشیہ)  
 کلمات الصادقین ص ۵۷  
 کنز الدقائق ص ۴۸۶

گ

گلزار ابرار ص ۵۸  
 گلزار ابراہیم ص ۲۹۰، ۲۸۰  
 گلستاں ص ۴۱۰، ۴۰۸، ۳۰۷  
 گلستان سخن ص ۵۲۲، ۳۷۹، ۱۱۸، ۱۱۷  
 گوہرین نامہ ص ۱۱۷

ل

لامح الدراری ص ۴۲۵  
 لطائف قاسمیہ ص ۴۷۸

مقالات طریقت ص ۱۲۱، ۱۲۷، ۵۱۵	مرآة العروس ص ۵۰۹
مقامات حریری ص ۱۶۰، ۱۶۶، ۱۶۷، ۲۹۵	مرآة العلوم ص ۱۰۵
مقدمہ اوجز المسالك الی موطن مالک ص ۴۲۸	مرحوم دہلی کالج ص ۹۷، ۱۰۳، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۵
مقدمہ خواجہ احمد فاروقی (برتالیف رام چندر) ص ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۰	۱۶۶، ۱۶۷، ۱۸۰، ۲۲۲، ۲۲۴، ۲۶۷، ۳۷۲
مقدمہ سنن ترمذی ص ۳۷۱، ۴۱۱	مرقاة الیقین ص ۳۶۸
مقدمہ مکتوبات یعقوبی ص ۶۲، ۶۹، ۳۱۴، ۳۲۸	مرقومات امدادیہ ص ۲۲۳، ۳۳۰، ۳۶۳
مقرعة العملة ص ۵۱۰	مروج الذهب ص ۱۴۵
مکاتیب رشیدیہ ص ۳۵۰	مسلسلات مقدمہ ص ۱۰۳
مکاتیب سید احمد شہید ص ۱۹۴	مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۳۲
مکتوبات اکابر دیوبند ص ۴۴۹	مسلم شریف ص ۲۳۹، ۳۱۱، ۳۲۷، ۳۹۸
مکتوبات بنام دلدار علی خاں ص ۱۲۴	۴۰۸، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۵۶، ۴۶۹
مکتوبات حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی ص ۳۰۴	مشکوٰۃ شریف ص ۱۱۵، ۳۱۶، ۳۲۵، ۳۸۵، ۴۱۱
مکتوبات امدادیہ ص ۳۲۳	۴۱۲، ۴۱۳، ۵۳۵
مکتوبات قاسمیہ ص ۴۷۹	مصانح التراویح ص ۴۷۸
مکتوبات قدوسیہ ص ۴۰۷	مصائب غدر ص ۵۰۹
ملفوظات حسن العزیز ص ۱۵۶، ۲۲۴	مظاہر حق ص ۳۱۶، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۸۵
ملفوظات حضرت حاجی امداد اللہ ص ۸۲	مظہر الحق ص ۲۷۹
ملفوظات حضرت شاہ عبدالعزیز ص ۷۸، ۱۰۷	مظہر العلماء والکملاء ص ۵۲۳
مناظرہ احمدیہ ص ۴۹۱	معارف یعقوبی ص ۳۴۹
مناظرہ محمدیہ ص ۴۰۶	معیار البلاغت ص ۴۹۷
منہیات ابن حجر کندی ص ۳۷۸، ۳۸۲، ۳۸۳	مفتاح الارض ص ۵۱۰
منتخبات اردو ص ۵۱۰	مفتی صدرالدین آزرده (تالیف پرواز اصلاحی) ص ۲۸۲
منتخب الحکایات ص ۵۰۹	مفید الطالبین ص ۴۹۵
منظور السعداء (قلمی) ص ۸۱	مفید ہند ص ۱۸۲، ۲۸۴
منہاج العابدین ص ۳۳۸، ۴۹۵	مقالات شروانی ص ۴۱۹
مورج کوثر ص ۴۱۸، ۵۴۳	

موطا امام مالک ص ۲۲۲، ۳۲۷، ۳۱۱، ۲۷۷،  
 ۲۵۶، ۲۵۵، ۲۲۵  
 موطا امام محمد ص ۳۱۱  
 مومن شخصیت اور فن ص ۵۵  
 میڈی ص ۳۲۷  
 میرزا ہدیح حاشیہ عبدالعلی ص ۱۶۷، ۱۶۰  
 میر قطبی ص ۱۶۷  
 میرے والد میرے شیخ ص ۲۲۷  
 میزان ص ۳۰۷  
 میزان الحق ص ۲۸۶

(ن)

نافع خریداران ص ۲۸۲  
 نتیجہ فکر ص ۲۳۷  
 نثر الہمیان فی وفیات الاعیان ص ۳۹۱  
 نثر حالات محمدیہ ص ۲۰۱، ۱۱۶  
 (مولوی) نذیر احمد دہلوی احوال و آثار ص ۳۰۸،  
 ۵۰۹، ۵۰۴، ۳۱۲  
 نزہۃ الخواطر جلد ہفتم ص ۱۱۸، ۱۱۷، ۹۳، ۸۰،  
 ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۹۶، ۱۹۸، ۳۶۳،  
 ۵۱۱، ۵۰۳، ۴۹۴، ۴۲۱، ۳۶۸، ۳۶۶  
 نزہۃ الخواطر جلد ہشتم ص ۲۶۵، ۱۲۸، ۱۲۶  
 نسب نامہ صدیقیان نانوتوی ص ۶۸، ۶۷، ۶۵،  
 ۳۰۴، ۸۵  
 نسخہ ہنما (یعنی قانون مال) ص ۳۸۹  
 نصاب خسرو ص ۵۰۹  
 نفحة العنبر فی حیات امام العصر  
 الشیخ انور ص ۲۲۸، ۲۲۷  
 نفحة الیمن ص ۲۸۴، ۲۴۳، ۱۶۶، ۹۰

نکات نماز ص ۲۸۵  
 نوائے آزادی ص ۵۱۵، ۲۱۷  
 نور الانوار ص ۳۹۷، ۳۹۶  
 نور الایمان ص ۱۲۰  
 نیچرل فلاسفی ص ۲۸۴

(و)

واقعات دار الحکومت ص ۵۱۱، ۲۳۳  
 وصال الجلیل ص ۵۱۳، ۵۱۱، ۵۱۰، ۱۲۷  
 وضع قوانین ص ۱۶۱  
 وقائع و ملفوظات ص ۶۱

(ہ)

ہدایہ ص ۵۲۸، ۳۲۷، ۱۶۱  
 ہدایۃ المغتذی فی قرآن۔ المقتدی  
 ص ۴۴۴  
 ہدایۃ النحو ص ۲۵۳، ۲۳۵، ۲۱۶، ۹۸  
 ہدایۃ الشیعہ ص ۴۷۷، ۴۴۴  
 ہدایۃ الشیعہ ص ۴۷۷  
 ہندوستانی پینل کوڈ ص ۵۲۲  
 ہندوستانی مصنفین اور انکی تصانیف ص ۳۷۷

(کی)

یادایام (البرامکہ) ص ۵۰۴

(رسائل و جرائد)

الدراسات الاسلامیہ شمارہ (۲) ۲۰۰۲ء ص ۳۲۴  
 الہادی شمارہ شعبان ۱۳۵۱ھ ص ۱۵۶  
 بینات (کراچی) مولانا یوسف بنوری نمبر  
 ۱۳۹۸ھ ص ۲۴۶

<p>فکر و نظر (اسلام آباد) شماره اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۹ء                  ص ۲۶۵                  ماہنامہ برہان دہلی جلد ۱۴، شماره ۴ ص ۲۲۰                  ماہنامہ تہذیب الاخلاق جمادی الثانی ۱۳۰۲ھ                  ص ۳۳۱                  مجلہ شفاء الصدور جنوری ۱۹۵۸ء ص ۳۵۱</p>	<p>جرنل رضا لائبریری (رام پور) شماره (۱) ۱۹۸۹ء                  ص ۲۹۲                  جرنل کلکتہ ص ۴۲۵                  سہ ماہی احوال و آثار شماره جنوری تا مارچ ۱۹۹۸ء                  ص ۶۲                  سہ ماہی العلم کراچی اپریل تا جون ۱۹۸۷ء                  ص ۵۲۳</p>
<p style="text-align: center;"> </p>	

## فہرست مراجع

### القرآن کریم

#### قلمی

#### عربی

کتابت سنہ	تعارف نسخہ	مصنف	نام کتاب	نمبر شمار
۱۲۳۰ھ	نسخہ ذاتی	بقلم حضرت مولانا مملوک العلی	الشیخ المعلقات	۱
	نسخہ مصنف	حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی	شرح رسالہ بہاء الدین عالمی	۲
	بقلم مولانا مملوک العلی		نسخہ دوم	۳
۱۳۵۰ھ	مکتوبہ بخط مولف	مولانا ناصر بلیادی مؤلفہ ۱۳۳۳ھ	مجموعہ اسانید حدیث اساتذہ	۴
	مملوکہ رقم سطور		دیوبند	
	عکس نسخہ مؤلف	مولانا زید ابوالحسن فاروقی	مجموعہ الاسانید العالیۃ والشہادات السامیۃ	۵
<b>فارسی</b>				
	نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ	شیخ کمال سنہلی	اسرارہ (تذکرہ مشائخ علماء)	۶
	نسخہ ذاتی	حضرت مولانا احمد علی	بیاض مولانا احمد علی محدث دہلوی	۷
	نسخہ ذاتی	حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی	بیاض حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی	۸
		مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی	بیاض مولانا محمد ابوالحسن کاندھلوی	۹
	عکس نسخہ مصنف	مولانا فضل حق خیر آبادی	بیاض اول مولانا فضل حق خیر آبادی	۱۰
	عکس نسخہ مصنف	مولانا فضل حق خیر آبادی	بیاض ثانی مولانا فضل حق خیر آبادی	۱۱
	عکس نقل نسخہ مصنف	شیخ عبدالرشید قادری کیرانوی (مؤلفہ ۱۱۶۳ھ)	تذکرۃ الصالحین	۱۲
۱۳۰۸ھ	نسخہ مصححہ از نسخہ مصنف در	شیخ علاء الدین برتاوی (وفات ۱۰۸۸ھ)	تذکرہ چشتیہ فردوسیہ، ہاشمیہ	۱۳

عکس نسخہ مخزونہ خدا بخش لائبریری پٹنہ عکس نسخہ مؤلف	شیخ محمد صادق ہمدانی، دہلوی مکتوبہ بدست مولانا عبداللہ گنگوہی وغیرہ	کلمات الصادقین	۹	۱۴
مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ		مجموعہ مکتوبات بنام حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی	۱۰	۱۵
مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ		مجموعہ مکتوبات سید احمد شہید (نسخہ اول)	۱۱	۱۶
مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ		مجموعہ مکتوبات سید احمد شہید (نسخہ دوم)	۱۲	۱۷
نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ بقلم مولانا نور الحسن کاندھلوی	سید جعفر علی نقوی بستوی مملوکہ راقم سطور	منظورۃ السعداء وقائع و ملفوظات شیخ محمد صادق گنگوہی	۱۳	۱۸
	<b>اُردو</b>		۱۴	۱۹
عکس نسخہ مصنف	مولانا ناظر حسن تھانوی	تاریخ تھانہ بھون	۱۵	۲۰
نسخہ مصنف	مولانا ریاض الحسن، محمد سلیمان کاندھلوی	حالات مفتی الہی بخش کاندھلوی	۱	۲۱
مملوکہ راقم سطور	مفتی رحمت علی خاں دہلوی	سراج المعرفت	۲	۲۲
نسخہ مؤلف	مولانا ناظر حسن صاحب تھانوی	شجرہ فاروقیان تھانہ بھون	۳	۲۳
مملوکہ راقم سطور			۴	۲۴
		نسب نامہ صدیقیان سہارنپور	۵	۲۵
	<b>عربی مطبوعات</b>			
جام شور و سندھ	مولانا عبید اللہ سندھی مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی	التہمید لتعریف ائمتہ التجدید	۱	۲۶
مصر		الرحلۃ الحجازیہ	۲	۲۷
طبعہ رابعہ بیروت	خیر الدین الزرکلی	الاعلام جلد نمبر ۲	۳	۲۸
طبعہ رابعہ بیروت	خیر الدین الزرکلی	الاعلام جلد نمبر ۶	۴	۲۹
دارالاشاعت دیوبند		الاعرف الجلی من اسانید الشیخ اشرف علی	۵	۳۰

شعبان  
۱۳۶۶ھ

۱۳۹۶ھ

۱۳۲۹ھ

۱۹۷۹ء

۱۹۷۹ء

۱۳۳۹ھ

۱۳۰۶ھ	لاہور	ڈاکٹر مہر النساء	العلامہ فضل حق خیر آبادی حیاتہ و ماثرہ مع تحقیق کتاب الثورة الہندیہ	۶	۳۱
۱۳۱۱ھ	مطبع مجتہائی دہلی	مولانا رشید الدین دہلوی (مؤلف فقہ الیمین)	المکاتیب	۷	۳۲
۱۲۹۹ھ	بیروت	حضرت امام بخاری علامہ جلال الدین سیوطی تحقیق ابوالفضل ابراہیم	بخاری شریف بغیۃ الوعات فی طبقات الملغوبین والنحاة	۸	۳۳
۱۲۶۵ھ	اشرف المطابع	حضرت امام ترمذی	ترمدی شریف (طبع اول)	۱۰	۳۵
۱۲۶۵ھ	مطبع احمدی دہلی		الف: شرح وحاشیہ مولانا مملوک العلی		
۱۲۷۱ھ	فخر المطابع، دہلی		ب: و مولانا احمد علی محدث سہارنپوری شرح وحاشیہ مولانا سبحان بخش شکار پوری		
۱۹۷۷ء	قاہرہ	کارل بروکلیمان	تاریخ الادب العربی (عربی ترجمہ)	۱۱	۳۶
	اشرف المطابع، دہلی	حواشی مولانا مملوک العلی	تاریخ یمنی	۱۲	۳۷
۱۹۱۹ء	مطبع صدیقی لاہور		تاریخ یمنی	۱۳	۳۸
			سلسلہ التزیرجد فی اسناد الشیخ حسین احمد	۱۴	۳۹
۱۲۵ھ	مطبع سلطانی دہلی	بحوشی واقادات شاہ محمد الحق	سنن نسائی	۱۵	۴۰
۱۳۸۲ھ	دار صادر، بیروت	حسین بن احمد بن حسین زوزنی	شرح المعلقات السبع للوزنی	۱۶	۴۱
		ابراہیم رفعت پاشا	مرآة الحرمین	۱۷	۴۲
۱۳۵۸ھ	سہارنپور	شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی	مقدمہ مسلسلات شاہ ولی اللہ	۱۸	۴۳
۱۳۹ھ	دائرۃ المعارف حیدرآباد	مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی	نزہۃ النحواطر جلد ۷	۱۹	۴۴
۱۳۰۲ھ	طبع دوم، حیدرآباد	مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی	نزہۃ النحواطر جلد ۸	۲۰	۴۵
۱۳۷ھ	کراچی	مولانا محمد یوسف بنوری	فقہ العنبر فی حیات امام العصر الشیخ انور	۲۱	۴۶
<b>فارسی مطبوعات</b>					
۱۲۷ھ	مطبع احمدی دہلی	شیخ عبدالحق	اخبار الاخیار	۱	۴۷
۱۲۷ھ	سر سید ایڈیشن	ابوالفضل	آئین اکبری	۲	۴۸

۱۲۷۷ھ	فتح الاخبار، کول	مولانا نصر اللہ خویشگی	بیاض دلکشا	۳	۴۹
۱۹۶۰ھ	راپور	مرزا محمد رستم بدخشی	تاریخ محمدی	۴	۵۰
۱۲۹۲ھ	بھوپال	متر بہ مولانا امتیاز علی عرشی	تذکرہ روز روشن	۵	۵۱
۱۲۷۰ھ	مطبع فخر المطابع دہلی	منظر حسین صبا	دلائل الاذکار فی اثبات	۶	۵۲
۱۲۷۱ھ	مطبع سلطانی، قلعہ معنی دہلی	مولانا شیخ محمد تھانوی	الجبر والاسرار	۷	۵۳
۱۲۶۸ھ	مطبع مطبع الرحمن، دہلی	مومن خاں	دیوان مومن	۸	۵۴
۱۳۰۳ھ	مراد آباد	حضرت شاہ عبدالعزیز	رسالہ نکاح ثانی (مجموعہ فتاویٰ)	۹	۵۵
۱۲۸۲ھ	مطبع مجتہائی دہلی	و شاہ رفیع الدین وغیرہ	شامہ مشام افروز (مکتوبات فارسی)	۱۰	۵۶
۱۳۲۲ھ	مطبع مجتہائی دہلی	عبدالرحمن حیرت جھنجھانوی	ضیاء القلوب	۱۱	۵۷
۱۳۲۵ھ		حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی	فتاویٰ عزیز جلد اول		
۱۳۳۱ھ	لکھنؤ		جلد دوم		
۱۳۹۵ھ	خطی نسخہ کا عکس، لاہور	احسن اللہ خاں تاقب	گوہرین نامہ	۱۲	۵۸
۱۲۹۷ھ	دہلی	حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی	مجموعہ مکاتیب سید احمد شہید	۱۳	۵۹
۱۳۱۲ھ	مطبع مجتہائی میرٹھ		مکتوبات قدوسیہ	۱۴	۶۰
			ملفوظات حضرت شاہ	۱۵	۶۱
			عبدالعزیز دہلوی		
<b>اردو مطبوعات</b>					
۱۹۸۰ء	آپ بیتی نمبر فن اور شخصیت، بمبئی	ظ (طل حسین انصاری)	آپ بیتی خودنوشت	۱	۶۲
بلاسنہ	نذیر حسین، دہلی	ڈپٹی نذیر احمد	ابن الوقت	۲	۶۳
۱۸۳۷ء	مطبع سید الاخبار، دہلی	سر سید احمد	آثار الصنادید	۳	۶۴
۱۳۱۸ھ	مطبع نول کشور، لکھنؤ		آثار الصنادید	۴	۶۵
۱۲۹۰ھ	مطبع نول کشور، لکھنؤ	نواب قطب الدین	احکام العیدین	۵	۶۶
بلاسنہ	طبع اول مجتہائی لکھنؤ	شیخ الطاف الرحمن بارہ بنگوی	احوال علمائے فرنگی محل	۶	۶۷



۱۳۹۵ھ	لاہور	ترجمہ فضل احمد جیوری	اذکار برابر ترجمہ گلزار برابر	۷	۶۸
۱۳۵۲ھ	امداد القریاء سہارنپور	مرتبہ مولانا سید ظہور الحسن کسوی	ارواح ثلاثہ طبع اول	۸	۶۹
؟	مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون	مرتبہ مولانا سید ظہور الحسن کسوی	ارواح ثلاثہ طبع جدید	۹	
؟	مطبع دارالعلوم، میرٹھ	مولانا شیخ محمد تھانوی	ارشاد محمدی	۱۰	۷۰
۱۹۹۷ء	کاندھلہ	نور الحسن راشد کاندھلوی	اشاعت خاص سرمایہ احوال و آثار کاندھلہ (بیاد مولانا انعام الحسن کاندھلوی)	۱۱	۷۱
۱۳۱۶ھ	مطبع مجیبائی دہلی	مولانا شیخ محمد تھانوی	اقادات سنن نسائی	۱۲	۷۲
۱۳۵۳ھ	بارہ بنکی	وصل بلگرامی	افصل للموصل (سفرنامہ لکھنؤ) ولاء در حضرت تھانوی اور ان کے ملفوظات	۱۳	۷۳
۱۹۸۰ء	مکتبہ یرہان دہلی	مولانا اشرف علی تھانوی	امداد المشتاق	۱۴	۷۴
۱۳۳۳ھ	ماہنامہ الہادی، دہلی	مولانا حبیب احمد کیرانوی	امیر الروایات مجموعہ قصص و حکایات	۱۵	۷۵
۱۳۳۶ھ					
؟	لاہور	مولانا مشتاق احمد ابھوی	انوار العاشقین	۱۶	۷۶
۱۳۸۹ھ	لاہور	مولانا انوار الحسن شیرکوٹی	انوار قاسمی جلد اول (سوانح مولانا محمد قاسم)	۱۷	۷۷
۱۲۹۱ھ	مطبع مجیبائی، میرٹھ	مولانا شیخ محمد تھانوی	انوار محمدی	۱۸	۷۸
۱۳۸۷ھ	لاہل پور	مولانا محمد انوری لاہل پوری	انوار انوری (مجموعہ اقادات و ملفوظات علامہ انوار شاہ کشمیری)	۱۹	۷۹
؟	علی گڑھ	محمد عتیق صدیقی	اٹھارہ سو ستاون ۱۸۵۷ء اخبارات و دستاویزات ایک نادر مجموعہ مکاتیب (مکتوبات مشاہیر بنام اسپرنگر)	۲۰	۸۰
۱۹۸۵ء	سرمایہ اردو، کرچی	ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی		۲۱	۸۱
۱۹۸۷ء					
		(ب)			
۱۹۸۳ء	کراچی	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ترجمہ ہلال احمد زمیری	بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ	۲۲	۸۲

۱۹۲۹ء	دہلی	مرتبہ حکیم امیر احمد عشرتی	بیاض یعقوبی	۲۳	۸۳
		(ت)			
	طبع اول، لکھنؤ	رام بابوسکینہ	تاریخ ادب اردو (اردو)	۲۴	۸۴
	ماہنامہ البلاغ، کراچی	مولانا شیخ محمد تھانوی	تاریخ تھانہ بھون	۲۵	۸۵
		سید محبوب رضوی	تاریخ دارالعلوم دیوبند	۲۶	۸۶
		سید محبوب رضوی	تاریخ دیوبند	۲۷	۸۷
۱۸۴۷ء	مطبع العلوم، دہلی	کریم الدین پانی پتی	تاریخ شعرائے عرب	۲۸	۸۸
۱۹۶۷ء	دہلی	امداد صابری	تاریخ صحافت اردو جلد اول	۲۹	۸۹
۱۳۹۵ھ	کاندھلہ	نور الحسن راشد کاندھلوی	تبرکات (نادر مکتوبات حضرت حاجی امداد اللہ حضرت مولانا گنگوہی)	۳۰	۹۰
۱۳۲۹ھ	لاہور	مولانا مشتاق احمد انبھوی	تحفہ صادقہ (نسب نامہ انصاریان امیہ)	۳۱	۹۱
۱۹۶۳ء	کراچی	ترجمہ: ثناء الحق صدیقی	تحقیق وحدت الوجود والشہود	۳۲	۹۲
۱۹۷۶ء	کراچی	ترجمہ: وارث سرہندی	ترجمہ تاریخ التعلیم - مجرباسو	۳۳	۹۳
۱۸۴۳ء	طبع اول دہلی مطبوعہ احمدی میرٹھ	ترجمہ مولانا مملوک العلی	ترجمہ تحریر اقلیدس	۳۴	۹۴
۱۴۰۰ھ	لاہور	مولانا عبدالعلیم انصاری	تذکرہ رحمانیہ (سوانح قاری عبدالرحمن پانی پتی)	۳۵	۹۵
۱۹۷۷ء	سہارنپور	مولانا عاشق الہی میرٹھی	تذکرہ الرشید جلد اول	۳۶	۹۶
	یونائیٹڈ میٹریڈ، لاہور	مولوی محمد امین زبیری	تذکرہ ہر سید	۳۷	۹۷
۱۳۳۳ء	دہلی	حافظ نظیر حسین دیوبندی	تذکرہ العابدین	۳۸	۹۸
۱۹۹۸ء	لاہور	اختر راہی صاحب	تذکرہ علمائے پنجاب	۳۹	۹۹
۱۴۱۱ھ	عکس طبع اول کراچی	مفتی عنایت اللہ فرنگی محلی	تذکرہ علمائے فرنگی محل	۴۰	۱۰۰
بلاسنہ	دہلی	منسوب بہ مولانا گل حسن	تذکرہ غوثیہ	۴۱	۱۰۱
۱۳۹۰ء	دیوبند	مولانا نعیم دیوبندی	تذکرہ الحافظ (تذکرہ حافظ لطافت علی دیوبندی)	۴۲	۱۰۲

	پٹنہ	حافظ احمد علی خاں شوق	تذکرہ کاملان رامپور	۳۳	۱۰۳
	دیوبند	سید محبوب رضوی	[ تذکرہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری ]	۳۴	۱۰۴
۱۹۶۶ء	کراچی	محمد ایوب قادری	تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی	۳۵	۱۰۵
۱۳۰۰ھ	علی گڑھ	سر سید احمد خاں	تصانیف احمدیہ	۳۶	۱۰۶
۱۹۹۱ء	مالیر کوٹلہ	مفتی فضل الرحمن ہلال عثمانی	[ تعارفی کتابچہ براحوال مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی ]	۳۷	۱۰۷
۱۹۱۹ء تا	مطبع صدیقی، لاہور	مولانا محی الدین خاں دہلوی	[ تلخیص الصحاح ترجمہ جامع الاصول ]	۳۸	۱۰۸
بلاسنہ	طبع اول، نکودر	مالک رام	تلامیذ غالب	۳۹	۱۰۹
		(ج)			
۱۹۰۰ء	اتحاد پریس، سہارنپور	ذاکر بیگ نانوتوی	جغرافیہ ضلع سہارنپور	۵۰	۱۱۰
بلاسنہ	طبع دوم، لاہور	چودھری غلام رسول مہر	جماعت مجاہدین	۵۱	۱۱۱
	شامل الفصل للوصل	مفتی جمیل احمد تھانوی	جمیل الکلام (ملفوظات حضرت تھانوی)	۵۲	۱۱۲
		(ح)			
۱۲۹۷ھ	بھاو پور	مولانا محمد یعقوب نانوتوی	حالات طیب مولانا محمد قاسم نانوتوی (نیز دیکھئے تذکرہ مولانا محمد قاسم)	۵۳	۱۱۳
۱۳۱۷ھ	دارالاشاعت، کاندھلہ	مولانا احتشام الحسن کاندھلوی	حالات مشائخ کاندھلہ	۵۴	۱۱۴
۱۹۳۹ء	انجمن ترقی اردو دہلی	مولانا الطاف حسین حالی	حیات جاوید	۵۵	۱۱۵
۱۳۹۶ھ	لکھنؤ	مولانا محمد ثانی حسنی	حیات خلیل	۵۶	۱۱۶
۱۳۱۲ھ	دہلی	حکیم محمود احمد برکاتی	حیات شاہ محمد الحق	۵۷	۱۱۷
۱۹۷۷ء	لاہور	مولانا اصغر حسین میاں صاحب	حیات شیخ الہند	۵۸	۱۱۸
۱۳۷۳ھ	دہلی	پروفیسر خلیق احمد نظامی	حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۵۹	۱۱۹
۱۹۱۹ء	دہلی	سید افتخار عالم مارہروی	حیات النذیر	۶۰	۱۲۰

		(د)			
۱۹۵۸ء	دہلی	مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی	دہلی اور اسکے اطراف	۶۱	۱۳۱
۱۹۹۲ء	دہلی	مرزا فرحت اللہ بیگ	دہلی کی آخری شمع	۶۲	۱۳۲
		مرتبہ رشید حسن خاں	(۱۳۶۱ھ کا یادگار مشاعرہ)		
		(ڈ)			
۱۳۳۶ھ	آگرہ		ڈپٹی نذیر احمد کے لیکچروں کا مجموعہ	۶۳	۱۳۳
۱۹۹۲ء	دہلی	مرزا فرحت اللہ بیگ	ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ انکی زبانی	۶۳	۱۳۳
		مرتبہ رشید حسن خاں			
		(ذ)			
۱۹۳۶ء	لاہور	مولانا عبد القدوس قاسمی	ذاتی ڈائری مولانا عبید اللہ سندھی مع رسائل	۶۵	۱۳۵
		(ر)			
	لاہور	حکیم فیروز الدین	رموز الاطباء (جلد دوم)	۶۶	۱۳۶
۱۹۳۵ھ	تاج المعارف، دیوبند	قاری محمد طیب	روایات الطیب		
۱۲۸۲ھ		مہتممان مدرسہ دیوبند	روداد سال اول دارالعلوم دیوبند	۶۷	۱۳۷
			روداد مدرسہ عربیہ سہارنپور	۶۸	۱۳۸
		(س)			
۱۹۸۹ء	علی گڑھ	اصغر عباس	سر سید احمد کی تعزیتی تحریریں	۶۹	۱۳۹
۱۹۷۳ء	لاہور	سید اقبال علی	سر سید احمد کا سفر نامہ پنجاب	۷۰	۱۳۰
۱۹۷۱ء	پبلیکیشن ڈویژن	پروفیسر خلیق احمد نظامی	سر سید احمد خاں	۷۱	۱۳۱
	دہلی				
۲۰۰۱ء	علی گڑھ	پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی	سر سید احمد اور علوم اسلامیہ	۷۲	۱۳۲
۲۰۰۱ء	علی گڑھ	ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی	سر سید ایم اے او کالج اور دینی مشرقی علوم	۷۳	۱۳۳

۱۹۸۱ء	ندوة المصنفین، دہلی	پروفیسر خلیق احمد نظامی	سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات	۷۴	۱۳۳
۱۳۷۳ھ	دارالعلوم بک ڈپو دیوبند	مولانا مناظر احسن گیلانی	سوانح قاسمی	۷۵	۱۳۵
۱۹۹۷ء	لکھنؤ	غشی ذکاء اللہ	سوانح عمری مولوی سمیع اللہ دہلوی	۷۶	۱۳۶
۱۳۹۷ھ	لکھنؤ	مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی	سیرت سید احمد شہید	۷۷	۱۳۷
۱۳۹۴ھ	کراچی	مولانا انوار الحسن شیرکوٹی	سیرت یعقوب و مملوک	۷۸	۱۳۸
۱۹۸۲ء	دہلی	مرزا سنگین بیگ	سیر المنازل	۷۹	۱۳۹
		تحقیق و ترجمہ ڈاکٹر شریف قاسمی			
		(ش)			
۱۹۳۲ء	لاہور	مولانا عبید اللہ سندھی	شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک	۸۰	۱۴۰
			طبع اول		
			طبع دوم		
۱۹۳۵ء	لاہور				
۱۳۱۳ھ	قومی پریس، لکھنؤ	حاجی مرتضیٰ خاں	شائم امدادیہ	۸۱	۱۴۱
		(ص)			
۱۹۶۲ء	علی گڑھ	محمد عتیق صدیقی	صوبہ شمال و مغربی کے اخبارات و مطبوعات	۸۲	۱۴۲
		(ض)			
۱۹۸۱ء	مکتبہ برہان، دہلی	نور الحسن راشد کاندھلوی	ضمیمہ امداد المشتاق (شامل امداد المشتاق)	۸۳	۱۴۳
		(ط)			
۱۹۸۳ء	(عکس طبع اول دہلی ۱۸۳۷ھ) لکھنؤ	مولوی کریم الدین پانی پتی	طبقات شعرائے ہند	۸۴	۱۴۴
		(ع)			
۱۳۶۳ھ	مطبع دارالسلام، دہلی	نواب قطب الدین دہلوی	عروس المؤمنین	۸۵	۱۴۵
۱۹۷۰ء	کراچی	مرتبہ محمد ایوب قادری	علم و عمل	۸۶	۱۴۶

۱۹۸۷ء	دہلی	مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	(ترجمہ و تالیف عبدالقادر خاں)	۸۷	۱۳۷
			عمر رایگان آپ جی خواجہ احمد فاروقی (مشمولہ ارمان فاروقی)		
		(ف)			
۱۳۳۳ھ	طبع اول دہلی	مولانا شمس الحق ڈیانوی	قادی نذیریہ	۸۸	۱۳۸
		مولانا عبدالرحمن مبارکپوری			
۱۹۷۳ء	دہلی	مولوی سید احمد دہلوی	فرہنگ آصفیہ	۸۹	۱۳۹
۱۸۳۷ء	مطبع العلوم، دہلی	کریم الدین پانی پتی	فراند الدھر	۹۰	۱۵۰
		محمد حسن قیصر امر دہوی	فہرست ذخیرہ شیفہ کلکشن، علیگڑھ	۹۱	۱۵۱
۱۳۱۷ھ	راپور		[ فہرست مخطوطات فارسی (رضالا تبریری) راپور ]	۹۲	۱۵۲
۱۹۶۷ء	راپور	مولانا امتیاز علی عرشی	[ فہرست مخطوطات اردو (رضالا تبریری) راپور ]	۹۳	۱۵۳
		(ق)			
۱۳۲۲ھ	کاندھلہ	نور الحسن راشد کاندھلوی	[ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی احوال و آثار باقیات و متعلقات ]	۹۴	۱۵۴
۱۹۷۳ء	دہلی	مالک رام	قدیم دہلی کالج	۹۵	۱۵۵
۱۳۵۶ھ	طبع اول ماہنامہ	مرتبہ شہاب الدین	قصص الاکابر	۹۶	۱۵۶
۱۳۵۶ھ	الہادی دہلی				
۱۹۸۰ء	دہلی	ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین	قومی تہذیب کا مسئلہ	۹۷	۱۵۷
		(ک)			
۱۹۹۰ء	لاہور	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	کاروان امان و عزیمت	۹۸	۱۵۸
۱۹۹۵ء	کراچی	شیخ صادق ہمدانی، دہلوی	ترجمہ کلمات الصادقین	۹۹	۱۵۹
		ترجمہ پروفیسر لطیف اللہ			

		(گ)		
۱۹۶۶ء	لاہور	قادر بخش صابر مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی	گلستان سخن	۱۰۰ ۱۶۰
		(م)		
۱۳۳۲ھ	لکھنؤ	نواب نور الحسن خاں	مآثر صدیقی یا سیرت والا جاہی	۱۰۱ ۱۶۱
۱۹۶۱ء	دہلی	ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی	ماسٹر رام چندر	۱۰۲ ۱۶۲
۱۹۳۵ء	طبع دوم، دہلی	مولوی عبدالحق	مرحوم دہلی کالج	۱۰۳ ۱۶۳
۱۹۳۲ء	پٹنہ	مرتبہ عبدالمقتدر	مرآة العلوم (فہرست مخطوطات فارسی خدا بخش لائبریری)	۱۰۴ ۱۶۴
بلاسنہ	لاہور	اکبر شاہ خاں نجیب آبادی	مرقاۃ الیقین فی حیات نور الدین	۱۰۵ ۱۶۵
۱۹۳۸ء	طبع اول، بدایوں	مولوی طفیل احمد منگلوری	مسلمانوں کا روشن مستقبل	۱۰۶ ۱۶۶
۱۹۷۷ء	دہلی	عبدالرحمن پرواز اصلاحی	مفتی صدر الدین آزر دہ	۱۰۷ ۱۶۷
۱۲۹۲ھ	حیدرآباد دکن	عبدالرحیم ضیاء، حیدرآبادی	مقالات طریقت	۱۰۸ ۱۶۸
۱۳۲۳ھ	خیر المطابع، میرٹھ	مولانا عاشق الہی میرٹھی	مذہب رشیدیہ	۱۰۹ ۱۶۹
۱۹۷۶ء	لاہور	شیخ اسماعیل پانی پتی (قادیانی)	مکتوبات سرسید	۱۱۰ ۱۷۰
۱۹۸۰ء	دیوبند		مکتوبات اکابر دیوبند	۱۱۱ ۱۷۱
۱۳۲۷ھ	طبع اول، احمدی علیگڑھ مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون	مولانا محمد قاسم نیانگری عزیز الحسن مجذوب	مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتوی ملفوظات حسن العزیز جلد اول	۱۱۲ ۱۷۲ ۱۱۳ ۱۷۳
۱۹۷۵ء	لاہور	ڈاکٹر شیخ محمد اکرام	موج کوثر	۱۱۴ ۱۷۴
۱۹۷۱ء	لاہور	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	مولوی نذیر احمد دہلوی احوال و آثار	۱۱۵ ۱۷۵
۱۹۷۲ء	دہلی	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	مومن شخصیت اور فن	۱۱۶ ۱۷۶
۱۹۹۵ء	دہلی	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی	میرے والد میرے شیخ	۱۱۷ ۱۷۷

۱۲۹۷ھ	مطبع عثمانی، میرٹھ	(ن) حکیم محمد عمر چرچ تھاوی	نثر حالات محمدیہ (تذکرہ مولانا شیخ محمد تھاوی)	۱۱۸	۱۷۸
غالباً	دہلی	مفتی محمود احمد نانوتوی	نسب نامہ (صدیقیان نانوتہ)	۱۱۹	۱۷۹
۱۲۸۹ھ				۱۲۰	۱۸۰
۱۹۵۷ء	بمبئی	عبدالرزاق قریشی	نوائے آزادی	۱۲۱	۱۸۱
		(و)			
۱۹۱۹ء	آگرہ	مولوی بشیر الدین احمد	واقعات دارالحکومت دہلی ج: ۲	۱۲۲	۱۸۲
۱۳۳۳ھ	دہلی	شاہ امان الرحمن دہلوی	وصال الجلیل (احوال شاہ جمیل الرحمن راشد دہلوی)	۱۲۳	۱۸۳
		(ہ)			
۱۹۶۳ء	لاہور	پروفیسر منظور الحق صدیقی	ہادی ہریانہ (تذکرہ شاہ محمد رمضان)	۱۲۴	۱۸۴
		(ی)			
۱۹۳۶ء	حیدرآباد، دکن	عبدالرزاق (البراکہ) کانپوری	یادایام	۱۲۵	۱۸۵
	ماہنامہ بینات کراچی		مولانا یوسف بنوری نمبر	۱۲۶	۱۸۶
		رسائل			
۱۳۱۰ھ	نور الحسن راشد کاندھلوی	قاضی محمد علی تھاوی	سہ ماہی فکر و نظر اسلام آباد محرم تاریخ الاول	۱۲۷	۱۸۷
اگست ۱۹۶۲	لاہور	اورینٹل کالج میگزین		۱۲۸	۱۸۸
جنوری ۱۹۸۳ء	نور الحسن راشد کاندھلوی	باقیات آزرده	مجلد غالب نامہ، دہلی	۱۲۹	۱۸۹
۱۹۹۸ء	نور الحسن راشد کاندھلوی	حضرت سید طہ کتانوی	سہ ماہی احوال و آثار، کاندھلہ	۱۳۰	۱۹۰
۱۹۹۳ء	نور الحسن راشد کاندھلوی	تقویت الایمان اور اس کے خلاف برپا شورش تاریخ و حقیقت کے آئینہ میں	جنوری، فروری ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ اکتوبر دسمبر	۱۳۱	۱۹۱
				۱۳۲	۱۹۲
				۱۳۳	۱۹۳



۱۹۹۵ء	نورالحسن راشد کاندھلوی	حضرت میاں جیونور محمد چھنچھانوی اور ان کے پہلے پیر و مرشد شاہ احسان علی پٹنی	سہ ماہی احوال و آثار کاندھل	۱۳۳	۱۹۳
۲۰۰۲ء	حضرت مولانا حبیب الرحمن محدث اعظمی	تعارف جواد سابط سابطی	ماہنامہ المآثر اعظم گڑھ	۱۳۵	۱۹۵
۱۹۸۷ء	مرتبہ ایوب قادری نورالحسن راشد کاندھلوی	مولانا حسین احمد مدنی قاضی محمد علی تھانوی رحمتین الی البند	سہ ماہی العلم، کراچی ماہنامہ برہان، دہلی رضالا بیری جرنل رامپور مجلد الدراسات الاسلامیہ اسلام آباد	۱۳۶ ۱۳۷ ۱۳۸ ۱۳۹	۱۹۶ ۱۹۷ ۱۹۸ ۱۹۹
	ڈاکٹر محمد اکرام چغتائی	ایک نادر مجموعہ مکاتیب (یہ تمام کتابوں میں بھی آچکا ہے)	سہ ماہی اردو کراچی،	۱۴۰	۲۰۰
	نورالحسن راشد کاندھلوی	شجرہ فیض علم و کمال مطالعہ مفتی الہی بخش کاندھلوی		۱۴۱	۲۰۱

# مؤلف کی چند دیگر قلمی خدمات

- ۱۔ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی: احوال و آثار اور باقیات و متعلقات (دواڈیشن) ۷۷۵/صفحات
- ۲۔ مولانا عبداللہ انصاری: احوال و خدمات و علمی آثار ۲۵۰/صفحات
- ۳۔ تذکرہ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی ۲۲۲/صفحات
- ۴۔ تبرکات: حاجی امداد اللہ مہاجر مکی و مولانا رشید احمد گنگوہی کے غیر مطبوعہ مکتوبات مع حواشی وغیرہ: (تین ایڈیشن) ۸۸/صفحات
- ۵۔ حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی، امیر تبلیغی جماعت: شمارہ خاص مجلہ 'احوال و آثار، کاندھلہ'؛ جس میں حضرت مولانا اظہار الحسن کے مقام و مرتبہ اور شخصیت کا تعارف نیز تبلیغی تحریک کے قیام و فروغ اور اس کی برکات کا بھی جائزہ شامل ہے۔ (دواڈیشن) ۷۵۰/صفحات
- ۶۔ مختصر تذکرہ بحر العلوم، خاتم مثنوی مولانا روم، حضرت مفتی الہی بخش نشاط کاندھلوی ۸۶/صفحات
- ۷۔ معمولات رمضان المبارک (۸ ایڈیشن) ۸۸/صفحات

☆ مدیر و مرتب سہ ماہی مجلہ 'احوال و آثار' کاندھلہ۔ ہر شمارہ تحقیقی، تاریخی دستاویزی مقالات اور انتہائی نادر غیر مطبوعہ تبرکات سے مزین۔ (اجراء ۱۳۱۵ھ/۱۹۹۶ء)

☆ دینی، علمی، تاریخی اور ادبی موضوعات پر ۹۰ سے زائد مقالات ہندوپاک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

## اردو تراجم

۱۔ فضیلت قرآن: ترجمہ فضل القرآن: فارسی تالیف حضرت مفتی الہی بخش کاندھلوی  
(تین ایڈیشن) ۲۸۰ صفحات

۲۔ رسائل اصول حدیث: (عربی و فارسی) تالیف مفتی الہی بخش کاندھلوی: تمہید، ترجمہ،  
تعلیق، معہ عکس رسائل ۲۰۰ صفحات

## منتظر طباعت

۱۔ باقیات فتاویٰ رشیدیہ: مولانا رشید احمد گنگوہی کے ساڑھے نو سو نہایت اہم غیر مطبوعہ  
فتوے، مع حواشی و ضروری تصریحات ۷۰۰ صفحات

۲۔ کالا پانی۔ انڈمان کی سیلولر جیل میں جہاد حریت کے قیدیوں پر مظالم کی تاریخی دستاویز،  
سرگزشت مولوی محمد جعفر تھانیسری، خود مصنف کی شائع کی ہوئی دونوں طباعتوں کی مدد  
سے تصحیح و تکمیل متن اور اہم حواشی کے اضافوں کے ساتھ ۲۵۰ صفحات

۳۔ معرکہ شامی و تھانہ بھون: ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے تسلط کے خلاف مقامی علماء و  
قائدین کے زیر قیادت عظیم الشان معرکہ حریت کی دستاویزی داستان، جس میں انگریز  
افسران کی ڈائریوں اور نادر ترین مآخذ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے ۳۵۰ صفحات

۴۔ تذکرہ حافظ محمد ضامن شہید: معرکہ ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون تحریک کے ایک ممتاز قائد  
اور شہید کے حالات ۲۲۰ صفحات

۵۔ مظاہر علوم سہارنپور کے بانیان کرام اور ابتدائی دور کے محترم اساتذہ کرام کے حالات  
اور اہم واقعات ۴۰۰ صفحات

۶۔ متعدد دیگر اہم موضوعات پر چھ کتابیں زیر تالیف و تحقیق۔

## ناشر

حضرت مفتی الہی بخش اکیڈمی

محلہ مولویان، کاندھلہ ضلع مظفر نگر، (انڈیا)؛

Pin: 247775

استاذ الکل، حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی

Delhi College ke Sadar Madarris aur

Rooh-e-Rawan

**Ustazul Kul**

**Hazrat Maulana Mamlookul Ali (R.A.)**

Ahwal, Khidmat, Tasaneef, Trajim, Asar, Khandan aur Tlamiza

**Taleef**

**Noorul Hasan Rashid Kandhlavi**

**Nashir**

**Mufti Elahi Bakhsh Academy**

Kandhla, Distt: Muzaffar Nagar (U.P.) India

Pin: 217775

۶۱۲

